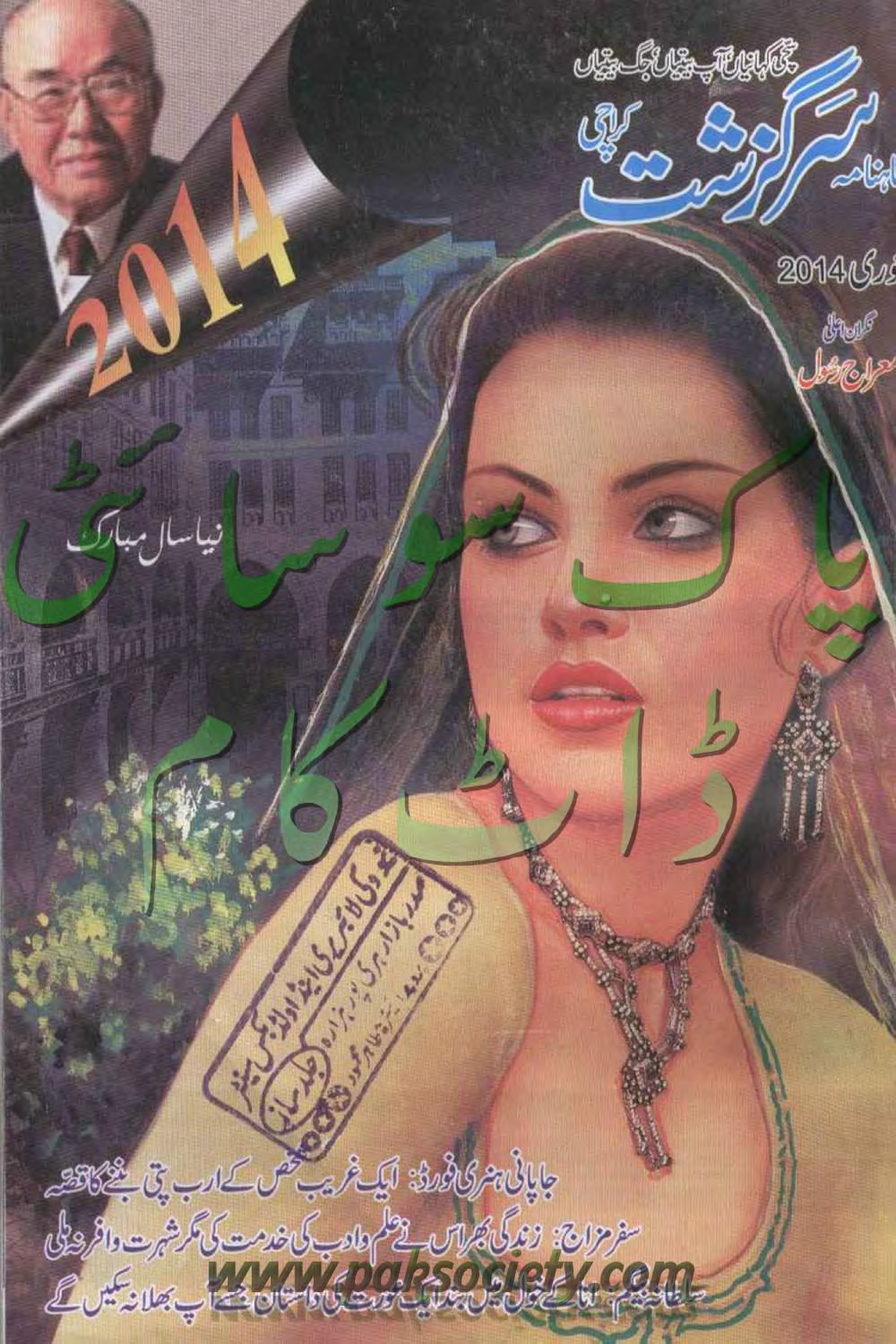
سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
اہنامہ
سرگزشت
کراچی
وری 2014
نگران اعلیٰ
معراج رسول
2014
نیا سال مبارک
جاپانی ہنری فورڈ: ایک غریب شخص کے ارب پتی بننے کا قصہ
سفر مزاج: زندگی بھر اس نے علم و ادب کی خدمت کی مگر شہرت وافر نہ ملی
سلطانہ بیگم: تاج کے خول میں بند ایک عورت کی داستان جسے آپ بھلا نہ سکیں گے
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

شعبہ	صفحہ	عنوان	مصنف	تعارف
سرگزشت	15	ناموراشتراکی	ادارہ	ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف
گفت وشنید	16	شہرِخیال	مدیراعلیٰ	آپ کی باتیں آپ کے خیال آپ کے مشورے اور آپ کے سوال
شخصیت	24	سفرمزاج	ڈاکٹرساجدامجد	اس صاحب قلم کی روداد جس نے تصنیف و تالیف کی مثال قائم کی
خراجِ تحسین	49	جاپانی ہنری فورڈ	ابنِ کبیر	غربت کے اندھیرے سے نکل کر اس نے دولتمندی کا عروج حاصل کیا
داستانِ عشق	69	مروہ کا مجنوں	ذوالفقارارشدگیلانی	عشق کا وہ اسیر جسے رومانوی داستانوں میں اوج کمال حاصل ہوا
تذکرۂ عشق	79	عشق حشر ساماں	محمد ایاز راہی	محبت کی اصل تعریف و تشریح، ایک تحقیق
تحریرِ خاص	84	جنوری	منظر امام	ماہ جنوری میں کب کیا ہوا مختصر سا جائزہ
سفرکہانی	93	ترکی نمی دانم	علی سفیان آفاقی	اچھے سفرنامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ سفر کہانی
تحقیق	109	تذکرۂ چین	انجم فاروق ساحلی	قدیم چین کی تہذیب کی ایک مختصر مگر جامع تحریر
قصص القرآن	119	ہاتھی والے	عائشہ جونیجو	وہ اپنی عبادت گاہ کی خاطر کعبہ کو ڈھانے آئے تھے
فلم وصحافت	125	فلمی الف لیلہ	علی سفیان آفاقی	فلم وصحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، معروف قلمکار کے حقیقی شب و روز
حالات	143	مارلن براندو	شکیل ادریس	بے مثل صلاحیتوں کی بدولت عالمی شہرت حاصل کرنے والا اداکار
عزم وحوصلہ	157	عزمِ مصمم	طارق عزیزخان	وہ خود میں عزم و حوصلے کا ایک سمندر رکھتا
مہم جوئی	163	برفانی ریگستان	امجد رئیس	ناممکن کو ممکن کر دکھانے والے باہمت کا قصہ
معاشرت	168	سراب	کاشف زبیر	بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان
پہلی سچ بیانی	212	سلطانہ بیگم	رخسانہ	انا کے خول میں بند ایک عورت کی جگ بیتی
دوسری سچ بیانی	221	روشنی	اکرام	اسے صحیح راستہ دکھانے والے نے عجب طریقہ آزمایا
تیسری سچ بیانی	229	اچانک	شازیہ	ایک دلچسپ سی آپ بیتی آپ کے لیے
چوتھی سچ بیانی	233	لاحاصل	ڈاکٹرعدنان	ایک لاحاصل محبت کا بیان وہ خیالوں میں اسے چاہتا رہا
پانچویں سچ بیانی	245	بیتے ہوئے دن	انجم	بڑھاپے میں عشق کی جنون خیزی اس کے راہ کی دیوار بنی
چھٹی سچ بیانی	253	محبت زندہ ہے	ڈاکٹرشاہینہ	محبت کرنے والے کسی کو خاطر میں کب لاتے ہیں
ساتویں سچ بیانی	261	انتہا	سجادحسین	شوہر کو حاصل کرنے کے لیے اس نے شوہر پر تیزاب پھینک دیا
آٹھویں سچ بیانی	267	عشق عشق ہے	منزہ	محبوب کی خاطر شوہر کو قتل کر کے وہ سرخرو ٹھہری
نویں سچ بیانی	281	یارعیار	نعمان	وہ دوست بن کر پشت میں خنجر گھونپتا تھا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوقِ طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورتِ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

جلد 24 ✿ شمارہ 02 ✿ جنوری 2014ء

ماہنامہ
سرگزشت
کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شفیق خان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
راجا محمد جنید 0323-2895528
نمائندہ لاہور فرزند علی بخش 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ✿ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول
مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER
APNS
CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

بالآخر ہم ایشیا میں پہلے نمبر پر آگئے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق پاکستان ایشیا کے مہنگے شہروں کی فہرست میں سب سے اوپر آگیا ہے۔ کرپشن میں بھی ہم پچاسوں ممالک سے آگے آگئے ہیں۔ دہشت گردی کے لیے بھی بدنامی کا کلنک لگتا جا رہا ہے جس کی وجہ سے سیاحوں کی آمد تو پہلے ہی کم تھی اب تو بزنس ٹور پر آنے والے بھی گھبرانے لگے ہیں۔ اس طرح دیگر شعبوں میں بھی ہم پیچھے مزید پیچھے ہوتے جا رہے ہیں جبکہ ہم سے بعد میں آزادی حاصل کرنے والے ممالک ہم سے سالوں آگے نظر آ رہے ہیں۔ ہمارا ملک زرعی ہے لیکن زراعت میں ہم دوسروں کے محتاج بنتے جا رہے ہیں۔ آلو پیاز ٹماٹر تک غیر ممالک سے منگوا کر استعمال کر رہے ہیں۔ گیس کے وافر ذخیرے موجود ہیں لیکن ہم اسے صحیح طور پر استعمال نہیں کر پا رہے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ پڑوسی ملک اسے اپنی طرف کھینچ کر ہمیں کنگال کر رہا ہے۔ "سر کریک" کا مسئلہ جوں کا توں پڑا ہے اور اسے حل کرنے کے لیے ہم انڈیا پر دباؤ بھی نہیں ڈال رہے ہیں کیونکہ ہم دہشت گردی کے عفریت سے الجھے ہوئے ہیں اور اس عفریت کو قوت ہمارے عاقبت نااندیش لوگ فراہم کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ہمیں "اسلام کا قلعہ" ملک پاکستان بنانے کی سزا دی جا رہی ہے کہ ہم نے اسلامی دنیا میں ایٹمی قوت کا اعزاز کیوں حاصل کیا، کیوں ہم نے اپنے ہاں اسلامی سربراہ کانفرنس کرا کر اسلامی دنیا میں بیداری کی لہر دوڑائی۔ کیوں ہم نے فلسطین کے مسئلے پر سخت موقف اختیار کیا۔
بقول عاصی رضوی ؎

بندۂ مومن تجھے کس کی ہے اب جستجو
راہ بھی منزل بھی تو، رہرو رہبر بھی تو

معراج رسول

نامور اشتراکی

سرگزشت

وہ 1913ء میں پانی پت کے اس گھرانے میں پیدا ہوا جس نے برصغیر کے مسلمانوں میں تعلیم حاصل کرنے کے احساس کو بیدار کیا تھا۔ اس کے پڑنانا کا نام پورے برصغیر میں جانا پہچانا تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالی کا نام کس نے نہیں سنا ہوگا؟! انہی الطاف حسین حالی کے نام پر بنے، حالی مسلم ہائی اسکول میں اسے داخل کیا گیا کہ وہ بھی پڑھ لکھ کر خاندان کے دیگر بزرگوں کی طرح نام پیدا کرے۔ اس اسکول کے بانی اور سیکریٹری اس کے نانا خواجہ سجاد حسین تھے جنہوں نے مسلمانوں میں پھیلی تعلیمی زبوں حالی دور کرنے کے لیے ہی محکمہ تعلیم میں جانا پسند کیا تھا اور ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے انسپکٹر جنرل آف اسکولز تک پہنچے تھے پھر خود ہی ریٹائرمنٹ حاصل کر کے پانی پت لوٹ آئے تھے اور اس اسکول کی بنیاد رکھ کر مسلمان بچوں کے مستقبل کو سنوارنے میں لگ گئے تھے۔ بچوں کی تعلیم کا انہیں اس قدر احساس تھا کہ 1946ء میں جب ان پر جانکنی کی کیفیت طاری تھی اور بے ہوشی کے عالم میں ایک لمحے کے لیے جب انہوں نے آنکھیں کھولیں تو انہوں نے اپنے اس نواسے پر نظر ڈالتے ہی سوال کیا "میٹرک کا نتیجہ کب نکلے گا۔" جس کے نانا کی تعلیم سے دلچسپی کا یہ عالم ہو وہ تعلیم میں دلچسپی کیوں نہ لیتا پھر اس کے والد خواجہ غلام السبطین بھی تعلیم میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ مسلم کانفرنس کے حامی تھے جو مسلم لیگ کی ہم پلہ جماعت تھی اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے تدارک میں دلچسپی رکھتی تھی مگر اس لڑکے میں مذہب کے کٹڑپن سے نفرت سی تھی۔ وہ مذہب کو شخصی زندگی تک محدود رکھنے کا حامی تھا اسی لیے وہ کمیونیزم کی جانب جھکتا جا رہا تھا۔ اس نے خاندانی روایت کو پس پشت ڈال کر ایک قدم آگے بڑھا دیا تھا۔ پانی پت سے نکل کر بمبئی آگیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں قلم تھا، الفاظ سے کھیلنے کا ہنر جانتا تھا اس لیے اس نے فلمی دنیا کا رخ کر لیا تھا مگر اتنے دنوں میں اس نے ادب کی دنیا میں خاصا نام پیدا کر لیا تھا اور ذہنی طور پر ترقی پسندی کی طرف بہت زیادہ جھک گیا تھا۔ وہ برصغیر کے نامور ترقی پسندوں میں شمار کیا جانے لگا تھا۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ بچپن کے واقعات نے اس کے ذہن پر جو اثر چھوڑا تھا وہ اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ جب وہ صرف دس سال کا تھا اور امرت سر میں جلیانوالہ باغ کا سانحہ ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے اپنی دھاک بٹھانے کی خاطر حکم صادر کیا کہ جی ٹی روڈ سے انگریز فوج کا دستہ گزرے گا۔ شہر بھر کے اسکولوں کے تمام بچے سڑک کنارے ہاتھوں میں جھنڈیاں لے کر استقبال کے لیے کھڑے رہیں گے۔ وہ بھی اپنے اسکول کے بچوں کے ساتھ سڑک کنارے کھڑا ہو گیا تھا۔ تپتی دوپہر دھوپ کی شدت، بچے بار بار بے ہوش ہو کر گر رہے تھے۔ کافی دیر بعد فوجی دستہ آیا۔ ان کے ساتھ ہر قسم کا سامانِ حرب تھا۔ وہ اسی ساز و سامان کا رعب ڈالنا چاہتے تھے تاکہ برصغیر کے لوگوں پر خوف طاری ہو لیکن اس بچے پر الٹا اثر ہوا۔ وہ انگریز سپاہ سے مرعوب کب ہوتا الٹے اس کے دل میں ان لوگوں کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی۔ اسی نفرت نے اسے اشتراکیت کی جانب جھکایا تھا۔ اس کا شمار نامور اشتراکی لکھاریوں میں ہونے لگا تھا۔ وہ بمبئی کرانیکل اخبار سے جڑ گیا تھا پھر وہ فلمی دنیا میں آگیا اور خوب نام کمایا۔ آج دنیا اسے خواجہ احمد عباس کے نام سے جانتی ہے جو اپنی موت کے بعد بھی اپنی تحریر کی وجہ سے زندہ ہے۔

شہر خیال

☆خالد کبیر لاہور سے سالانہ رپورٹ 2013ء کے ساتھ حاضر ہیں" سال 2013ء کے دوران یک صفحی سرگزشت کچھ اس طرح سے رہی، الفریڈ برنارڈ نوبل (بانی نوبل پرائز)، ڈاکٹر ملک غلام مرتضٰی، مولوی محبوب عالم، حسین اعظمی، میکش اکبر آبادی، غلام محمد (المعروف گاما پہلوان)، حیدر علی، طٰہٰ حسین، نذر محمد (المعروف ن۔م۔راشد)، نور الصباح بیگم، خواجہ شہاب الدین، اور مولانا خیر محمد ندوی گویا کچھ اس طرح تقسیم ہوئی۔ ادب 3 سائنس 1 سیاست 2 حکمران 1 مذہبی 2 صحافت 2 کھلاڑی 1۔ اب اہم شخصیت کی سرگزشت کی طرف آتے ہیں جو بالترتیب اس طرح سے تھیں۔ ڈپٹی نذیر احمد، وحید الدین، میاں عبدالعزیز، جیمز اینڈ ریو برون ریمزے (لارڈ ڈلہوزی)، سقراط، کارل مارکس، غلام جیلانی اصغر، شیخ محمد اقبال، راجا صاحب محمود آباد، چوہدری رحمت علی، غلام مصطفٰی صوفی تبسم اور اسٹیفن ہاکنگ۔ ان میں طویل ترین حالاتِ زندگی شیخ محمد اقبال کے بیان ہوئے، اور نسبتاً چھوٹی روداد کارل مارکس کی شائع ہوئی۔ رنگارنگ خطوط سے آراستہ شہر خیال کی حاضری رجسٹر پر نگاہ ڈالتے ہیں کہ کون کون غیر حاضر رہا ہے؟ اعجاز حسین سحّار، سدرہ بانو ناگوری، ایم خالق بھٹی بہترین لکھنے والے رہے۔ شہر خیال میں دیگر نمایاں لکھنے والوں میں، ابن مقبول صدیقی، احمد خان توحیدی، رانا محمد سجاد، رانا محمد شاہد، طاہرہ گلزار، رانا فیصل جاوید، محمد عمران جونانی، شاہد جہانگیر شاہد، احسان سحر، انجم فاروق ساحلی، سہیل عباس، معراج الدین، رانا فیصل جاوید رہے۔ اس سال کی خاص بات یہ رہی کہ بہت سے نئے باسی شہر خیال میں متعارف ہوئے۔ سال 2013ء کا بہترین خطوط لکھنے والے میری رائے میں اعجاز حسین سحّار رہے۔ جبکہ انفرادی طور پر بہترین خط شیخ محمد اقبال کا رہا۔ جنہوں نے اس سال کے خاص نمبر پر اپنا تبصرہ کیا، جہاں تک میرا علم ہے اب تک ایسا شاید کبھی نہیں ہوا کہ جس کی سرگزشت شائع ہو اور وہ ذاتی طور پر تبصرہ کرے۔ مرد اور خواتین کی تعداد کا تناسب بالترتیب 85% اور 15% رہا، خواتین میں بہترین لکھنے والی سدرہ بانو ناگوری رہیں۔ اس عمر میں ایسا علمی اور ادبی شوق قابلِ رشک ہے۔ طاہرہ گلزار بھی نمایاں رہیں، اب ذرا غیر حاضر احباب کا ذکر ہو جائے۔ سعید احمد چاند، ملک محمد جاوید خان سرکانی درانی، انور اعجاز خان، احتساب عباس، ماریہ خان، یونس بلوچ یہ تمام احباب کم نظر آئے یا غیر حاضر رہے۔ بیت بازی کا سلسلہ بھی اچھا جا رہا ہے۔ معروف و غیر معروف شعراء کے اشعار سامنے آرہے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرگزشت کو بہت باذوق قارئین پڑھتے ہیں۔ علمی آزمائش کا سلسلہ بھی جاری ہے، جس میں کراچی تا خیبر اوسطاً 200 قارئین درست جوابات بھیجتے ہیں۔ دیارِ غیر والے بھی پیچھے نہیں رہے۔ اب ماہ بہ ماہ شائع ہونے والے مضامین کا جائزہ لیتے ہیں۔ جنوری میں امریکا کے طوفان کے بارے میں سینڈی پڑھا، زور آور، ترک، نئی دنیا کی تلاش افریقا کی سیر بھی ہوئی، علی سفیان آفاقی صاحب اپنی فلمی الف لیلہ کی 11 قسط کے ساتھ حاضر رہے۔ فروری کے شمارہ میں جنوبی افریقا کے مایہ ناز بلے باز ہاشم آملہ کے بارے میں قابلِ فخر کھلاڑی میں پڑھا، رسوائے زمانہ میگزین پلے بوائے پر مضمون بھی اس شمارے میں شامل رہا۔ افریقا کی سیر بھی ہوئی، سمندر کے مکیں، تلاشِ ہند، چار گوپے، پیار کی آگ، جلال عشق بختی یہ بھی اسی ماہ میں شامل ہوئے۔ مارچ میں نصیب خفتہ ایک عالمی شہرت یافتہ مصنف کی کہانی، سپر اسٹار، تلاش مرقد جس میں قلوپطرا کے مدفن کی کھوج کا قصہ تھا، کالی قسمت میں تحریک پاکستان کی کارکن، اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کی استاد، اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کی دکھ بھری داستان بھی پڑھی جس نے زندگی کے آخری ایام ایدھی سینٹر میں گزارے، سسی پنوں، عمر و ماروی، نوری جام تماچی کی مختصر داستانیں لازوال محبتیں میں پڑھی، افریقا اور افریقا پڑھنے کو ملی سحر و ساحری کا مختصر تعارف بھی کروا دیا گیا۔ مشہور بھارتی اداکار دلیپ کمار (یوسف خان) کے بارے میں آفاقی صاحب نے فلمی الف لیلیٰ کی 213 قسط میں روشنی ڈالی۔ ماہ اپریل میں مسلم دوست میں عظیم قلبالر کرسٹیا نورونالڈو کے حالاتِ زندگی پڑھے اب وہ مصیبت زدہ مسلمانوں کی امداد... کررہا ہے، عظیم لوگ میں مشہور سائنسدانوں کے مختصر تعارف ہوئے، لنکن کی لاش میں اس کی لاش کی چوری کی روداد بیان ہوئی، آفاقی صاحب فلمی الف لیلیٰ میں پرانے کراچی کی یادیں تازہ کررہے تھے۔ تلاش، جلّت، شہر لاہور پر خصوصی تحریر ماضی تا حال بھی خوب تھی، شامل شمارہ رہی۔ مئی میں مشہور پاکستانی ہواباز

ایم ایم عالم کے بارے میں مضمون بعنوان غازی شائع ہوا، سندھ کے شہر شکار پور میں رہنے والے ایک منفرد قبیلہ کے بارے میں دو انگلیوں والے میں پڑھا۔ مجسم ساز، خواب گاہ میں چھپا، حقیقی اسلام، ملکہ وکٹوریہ کے عشق کی کیفیت کے بارے میں سچا عشق میں پڑھا، آفاقی صاحب اس مرتبہ فلمی الف لیلہ میں بلیوں کا تذکرہ چھیڑ بیٹھے، اور ترکی کی سیر بھی کراتے رہے۔ جون میں تسخیر خلا، نہایت پراسرار انداز میں تباہ ہونے والے ہوائی جہاز کی روداد پراسرار حادثہ میں پڑھی، ہاتھیوں سے بچ جانے والوں کی کہانی موت کے سائے میں پڑھنے کو ملی، جنجھی گڑھے، مسکراہٹوں کے سفیر میں پاکستانی فلم انڈسٹری کے مشہور مزاحیہ اداکار لہری کے حالاتِ زندگی پڑھے۔ جولائی میں مشہور مصور بشیر اے مرزا پر بات ہوئی، شطرنج جو مشکل کھیل ہے اس کا مختصر تعارف بھی ہوا، عفریت، ہمت مرداں، بینٹلی ریزر کی تاریخ پر معلوماتی مضمون بہت اچھا رہا، بے زبان ہمدرد، ترکی کی سیر جاری رہی، مہا شکاری میں مشہور زمانہ شیر کے شکاری جم کاربٹ کے حالاتِ زندگی پڑھنے کو ملے، واردات خونچکاں بھی پڑھی۔ اس سال کا خاص نمبر بینا نابینا اگست میں شائع ہوا جس میں باہمت لوگوں کی داستانیں پڑھیں۔ نیلام گھر کو لوٹنے والے حافظ نسیم الدین کے حالاتِ زندگی مشعل راہ میں لکھے گئے، میں نے خود وہ سارے پروگرام دیکھے ہیں۔ باغی شاعر، مفتی ہند، حوصلہ مند اور عظیم موجد لوئی بریل کے حالاتِ زندگی اس شمارے کی زینت بنے، چند مشہور نابینا افراد کا تعارف بڑے لوگ میں ہوا، مجاہد اعظم، بابا وینگا کے بارے میں بھی اس شمارے میں پڑھنے کو ملا۔ ستمبر میں الجھی ڈور، زندگی جیت گئی، اعتراف، لارڈ ڈفرن، سامی، ہر دل عزیز اور ایک معلوماتی و دلچسپ تحریر قلم کہانی بھی شامل شمارہ رہی، باذوق قارئین کے لیے تحریر عرب اور خوشبو، ہالی وڈ کے اداکار نارمن وزڈم بھی اسی شمارے میں آئے۔ ترکی کی سیر بھی ہوتی رہی۔ اکتوبر میں فسوں گر عظیم فٹبالر ڈیوڈ بیکھم کی داستان حیات لکھا گیا، آوازوں کا خزینہ مسکراہٹوں کا عکاس، گیت گاتا چل، موت سے فرار، حاکم ہند میں پرتگال سے تعلق رکھنے والے لفانسو ڈی البریک کے بارے میں مختصر تعارف ہوا، مشہور سائنسدان جو اپنی رباعیات کے حوالے سے زیادہ مشہور ہے یعنی عمر خیام کے مختصر حالات بھی پڑھے۔ آدم خور شیر کے شکار کی کہانی شکار میں پڑھی۔ نومبر میں جنگ عظیم میں قیدیوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے متعلق عقوبت خانہ میں پڑھا، چور، باہمت، بدحال قلعہ، آدم خور، قوت ارادی، مردہ رسوم اس شمارے میں رہے۔ اور آخر میں دسمبر کے شمارے پر ایک نظر اسٹیفن ہاکنگ جو اپنی معذوری کو پس پشت ڈال کر ایسے ایسے کائنات کے بارے میں نظریات پیش کر رہا ہے کہ انسان انگشت بدنداں رہ جائے۔ عقوبت خانہ (دوسرا حصہ)، شاہی سوتن، رجحان ساز، اندھا پن، جاسوس ادارے پڑھی۔

☆وحید ریاست بھٹی نے کلوسیداں، راولپنڈی سے لکھا ہے" آپ کا فکر انگیز اداریہ پڑھا دل سے ایک دعا نکلی کہ اب تو کم از کم ہمیں اور ہمارے معاشرے کو سدھر جانا چاہیے ورنہ ہماری داستان تک نہ ہوگی داستانوں میں۔ معراج صاحب میں ایک بینکر ہوں اور بینکر کا کام ہی جمع تفریق کرنا ہوتا ہے۔ اختتام سال کے پیش نظر اور نئے قارئین کی سہولت کی خاطر دل نے چاہا کہ پورے سال کے طویل سفر کو چند صفحات میں مقید کردیا جائے۔ شماریاتی جائزہ: جنوری 2013ء سے دسمبر 2013ء تک معراج رسول صاحب نے 12 عدد فکر انگیز اداریے لکھ کر سنجیدہ قارئین کو خوب خوب دعوت فکر دی کہ ہم اجتماعی طور پر نہ سہی مگر انفرادی طور پر تو اس ملک کے متعلق سوچ سکتے ہیں۔ اس سرزمین کو کشت و خون کے بجائے پیار اور محبت سے سیراب کرسکتے ہیں۔ جنوری 2013ء سے دسمبر 2013ء تک یک صفحی سرگزشت، کا جائزہ بالترتیب کچھ یوں پڑھنے کو ملا موجد (الفریڈ برنارڈ نوبل) نمایاں مدرس (ڈاکٹر ملک غلام مرتضٰی)، خود ساز (مولوی محبوب عالم)، زندگی کا زندانی (حسین اعظمی)، پیر صاحب (میکش اکبر آبادی)، مرد میدان (غلام محمد عرف گاما پہلوان)، جواں مرد (حیدر علی)، نابینا بینا (ڈاکٹر طٰہٰ حسین)، ناخدا (ن۔م۔راشد)، نور شرق (نور الصباح بیگم)، تیز دماغ (خواجہ شہاب الدین)، خواجہ خضر ثانی (مولانا خیر محمد ندوی)۔ شہر خیال کا احوال کچھ یوں تھا۔ جنوری سے دسمبر تک کل 239 خطوط شائع ہوئے سب سے زیادہ جس خوش نصیب کو یہ سعادت نصیب ہوئی اس کا نام ہے "رانا محمد شاہد" بورے والا۔ جن کے 11 مسلسل خطوط شاملِ اشاعت ہوئے دوسرا نمبر مشترکہ طور پر محمد عمران جونانی، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری اور طاہر الدین بیگ کو یہ شرف حاصل ہوا کہ ان کے سال بھر میں 10 خطوط شائع ہوئے۔ تیسری پوزیشن پہ مشترکہ طور پر سدرہ بانو ناگوری اور حاجی اعجاز حسین سحّار رہے جن کے شائع شدہ ناموں کی تعداد 9 رہی۔ تاخیر سے موصول شدہ خطوط کی تعداد سال 2013ء میں 258 رہی۔ ادبی تجزیہ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے سال 2013ء کے لیے 12 ادبی مقالے کچھ اس ترتیب سے نذرِ قارئین کیے۔ قصہ نذیر (ڈپٹی نذیر احمد)، وحید عصر (وحید الہ آبادی)، باب درخشاں (میاں عبدالعزیز)، فرزند فرنگ (جیمز اینڈریو میرون ایمرنے)، عقل کل (سقراط)، مفکر (کارل مارکس)، استادِ ادب (پروفیسر غلام جیلانی اصغر)، دیدہ ور (پروفیسر شیخ محمد اقبال)، ایک تھا راجا (راجا صاحب آف محمود آباد)، متاع کارواں (چوہدری رحمت علی)، زیر لب (صوفی غلام مصطفٰی تبسم)، جہان حیرت (اسٹیفن ہاکنگ)۔ یوں تو ڈاکٹر صاحب کے تمام مقالات ایک سے بڑھ کر ایک تھے لیکن میری دانست میں ستمبر 2013ء میں ان کا لکھا ہوا مقالہ "ایک تھا راجا" خاصے کی چیز تھا۔ دیگر معزز قلمکاروں کے مضامین کا تجزیہ مندرجہ ذیل ہے۔ محترم ابن کبیر کو ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کے بعد سب سے زیادہ مضامین لکھنے کا شرف حاصل ہوا، ان کے لکھے ہوئے مضامین کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ سینڈی (قدرتی آفت)، قابلِ فخر کھلاڑی (ہاشم آملہ، کرکٹر)، کالی قسمت (بی بی قریشی)، مسلم دوست (کرسٹیانو رونالڈو، عظیم فٹبالر)، غازی (ایم ایم عالم)، پُراسرار حادثہ (فضائی حادثہ)، عفریت (عجیب و غریب)، مشعلِ راہ (حافظ نسیم الدین)، الجھی ڈور (جرم و سزا)، فسوں گر (ڈیوڈ ایڈورڈ بیکھم، فٹبالر) رجحان ساز (میوزے سارا ماگو)۔ میری ناقص رائے میں ابن کبیر صاحب کی پورے سال میں سب سے بہترین کاوش کرسٹیانو رونالڈو کے متعلق لکھی گئی تحریر "مسلم دوست" قرار دی جاسکتی ہے۔ مکرمی محمد ایاز راہی نے سب سے زیادہ لکھنے والوں میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ ان کے مضامین اہلِ علم و ذوق کے لیے مشعلِ راہ قرار دیے جاسکتے ہیں۔ تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ ترک، جلال عشق، دورتن، شطرنج، قلم کہانی، عمر خیام، فرسودہ رسوم، میری ناقص رائے میں جناب محمد ایاز راہی کی سال بھر کی نہیں بلکہ زندگی بھر کی کمائی "جلال عشق" کے حوالے سے قرار دی جاسکتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ محترم طارق عزیز خان کے پختہ قلم سے ہم پڑھنے والوں کے لیے کچھ اس طرح کے شہ پارے نظر نواز ہوئے۔ نئی دنیا کی تلاش، تلاشِ ہند، تلاش، تسخیرِ خلا، بلند،

حاکم ہند، محترمی طارق عزیز خان کی تحریر "بلند حوصلہ" بہترین کہی جاسکتی ہے۔ عزیزم شکیل صدیقی نے چار گویّے (موسیقی)، نصیب خفتہ (حالات وواقعات)، شہنشاہ صحافت (آرٹ بکواللہ)، فنکار (بشیر مرزا)، موجد (لوئی بریل)، آوازوں کا خزینہ (لطف اللہ) شکیل صدیقی کی تحریر "موجد" کو ان کی سال کی بہترین تحریر قرار دیا جاسکتا ہے۔ محترمہ مریم کے خان صاحبہ علمی پیاس کچھ اس انداز میں بجھاتی نظر آئیں، مہم ساز (مہم جوئی)، موت سے فرار (واقعات)، باہمت (آرمیگا ہیرٹ)، شاہی سوتن (شہزادی کیلا) مریم کے خان کی بہترین تحریر "باہمت" ہی قرار پانے کی مستحق ہے۔ جناب شکیل ادوریس کی مندرجہ ذیل تحریریں نظر آئیں۔ بلے بوائے (ہیو ہیفنر) مصنف (ریچی ریمنڈ)، ہردل عزیز (ارل اسٹینلے گارڈنر)، مسکراہٹوں کا عکاس (جیری لوئس)، جیری لوئس پر لکھی گئی شکیل ادوریس کی تحریر مسکراہٹوں کا عکاس، ان کی تمام تحاریر پر برتری لیے ہوئے نظر آئی۔ محترمہ امیمہ سلیم کی کل 4 تحریریں لگیں۔ بے زباں ہمدرد (تذکرہ) زندگی جیت گئی (عزم وحوصلہ)، گیت گاتا چل (رویندر جین)، قوت ارادی (حادثات)، امیمہ سلیم صاحبہ کی تحریر "زندگی جیت گئی" سال کی خوبصورت ترین تحریر قرار دی جاسکتی ہے۔ محترم سید احتشام ہم پڑھنے والوں کے لیے کچھ اس قسم کے موتی پرونے میں کامیاب ہوئے۔ سزا (جرم وسزا)، لارڈ ڈفرن (پراسرار)، شکار (شکاریات)، شاطر نواب (جیرالڈ چیپ مین)۔ سید احتشام صاحب کی تحریر "لارڈ ڈفرن" ایک دلکش تحریر تھی۔ امجد رئیس کی یہ تحریریں شائع ہوئیں، بازی گر (مائیک رائن)، ہمت مرداں (والٹر وائٹ جونیئر) چیمپئن (انتھونی لارنس کلارک) چیمپئن کو بے شک چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ محترمہ صائمہ اقبال قارئین سرگزشت کے لیے کچھ اس قسم کی سوغات لیے حاضر ہوئیں۔ تسکین کی تلاش (حادثات وواقعات)، حقیقی اسلام (حقائق) جہنمی گڑھے (حیرت انگیز)۔ محترمہ کی تحریر حقیقی اسلام، ایک بہترین کاوش تھی جس نے قلوب واذہان پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ مختار آزاد کی خامہ فرسائی کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ سمندر کے مکیں (طرز زندگی)، تلاش مرقد (تحقیق)، سامی (تہذیب وثقافت)۔ جناب مختار آزاد صاحب کی تحقیقی تحریر، تلاش مرقد، بہت اعلیٰ انداز میں لکھی گئی تحریر تھی۔ سرگزشت کے لکھاری جناب زین مہدی نے کچھ زیادہ کرم نوازی نہیں فرمائی لیکن جو بھی لکھا خوب لکھا مثلاً دوانگلیوں والے (معلومات) مسافر ہوں یارو (احمد حسن)، زین مہدی کی تحریر "مسافر ہوں یارو" ایک ایسی تحریر تھی جسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ جناب آصف ملک سال میں صرف دوبار نظر آئے ان کی تحریری کاوشیں کچھ اس طرح ہیں۔ موت کے سائے (مہم جوئی)، باغی شاعر (بشار ابن برد) جناب آصف ملک صاحب کی تحریر "باغی شاعر" ایک دلکش تحریر تھی۔ محترمی اختر شہاب صاحب بھی کچھ کم کم جلوہ فرما ہوئے ان کی دو تحریریں پورے سال میں پڑھنے کو ملیں۔ سیفٹی ریزر (تحقیق)، عرب اور خوشبو (معلومات)۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی دو تحریریں زیر مطالعہ رہیں۔ زور آور جاسوس ادارے دسمبر 2013 تک 26 قلمکار کہکشاں سجائے نظر آئے ان تمام معزز مصنفین اور ان کے مضامین کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے

عائشہ بخاری، ماضی تا حال (تحقیق)، عائشہ جوینجو تحقیق (ہارلینڈ سینڈرس)، ذوالفقار ارشد گیلانی، پیاری آگ (تاریخی رومانس)، شاہد جہانگیر شاہد، سپر اسٹار (گل حمید قلم)، حمزہ قادری عطاری لازوال محبتیں (داستان سحر عشق)، امجد اوسلو تحریر وساحری (تحقیق)، نور بانو، عظیم لوگ (معلومات)، صبا شفیق، جبلت (حیوانات)، اسلم فرخی، خوابگاہ میں چیتا (شکاریات)، اسامہ عطاری، سچا عشق (تاریخی واقعہ)، تنویر ریاض، مسکراہٹوں کے سفیر (لہری قلم)، اقبال احمد، مہاشکاری (شکاریات)، نسرین عثمانی، واردات خونچکاں (جرم وسزا)، ظفر یوسف حوصلہ مند (حیرت انگیز)، ڈاکٹر ممتاز عمر، بصارت سے بصیرت (جہد مسلسل)، عارفہ کریم عثمانی، بڑے لوگ (شخصیات)، روبینہ نفیس انصاری، بابا وینگا (عجوبہ)، محمد اشرف عطاری مجاہد اعظم (شیخ احمد اسماعیل حسن یاسین)، وحید ریاست بھٹی مفتی ہند (قلم، کے سی ڈے)، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، اعتراف (حادثات)، سلیم فرخی، نارمن وزڈم (تعارف قلم)، افسر آذر، عقوبت خانہ دوحصے، (جنگ عظیم)، نسرین بٹ، چور (جرم وسزا)، ڈاکٹر سید وقار علی بدحال قلعہ (تاریخی ورثہ)، خالد قریشی، آدم خور (شکاریات)، ہوزے سارا ماگو، اندھاپن (ادبی شاہکار)۔ مجھ ناچیز کی دانست میں ان تمام 26 تحاریر میں شاہد جہانگیر شاہد صاحب کی کاوش سپر اسٹار، سب سے پہلے نمبر پر قرار دیے جانے کی مستحق ہے۔ سال بھر چلنے والے مستقل سلسلوں میں علی سفیان آفاقی کی فلمی الف لیلیٰ ہر دل عزیز رہی جو بلاناغہ پورا سال جن عظیم فلمی موضوعات وفلمی شخصیات کے متعلق آفاقی صاحب نے خامہ فرسائی کی اس کا احوال مختصراً لکھا جاتا ہے۔ وحید مراد، محمد علی، ندیم، کشور کمار، نبی احمد، آغا جی اے گل، دلیپ کمار، راجکپور، پشاور کی مختلف فلمی شخصیات، ضیا سرحدی، پریم ناتھ، شاہ رخ خان، بمبئی ٹاکیز، فلمستان، محبوب اسٹوڈیو، لالہ سدھیر، داؤد چاند، حبیب جالب، پرانا کراچی، مہناز، آغا طالش، چکرم، اے آر کاردار، ایم صادق، استاد فقیر حسین، میڈم نور جہاں، شباب کیرانوی، صادق پیانو نواز، شمشاد بیگم، مارلن منرو، وائٹ ہاؤس، ودیا بھارتی، جیا خان، گرودت، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، جگر مرادی، حفیظ جالندھری، سنجے دت، نصرت فتح علی خان، مرزا غالب، فضلی برادران، مصطفیٰ قریشی، سلطان راہی اور دلیپ کمار کے ساتھ ساتھ امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان کے انٹرویو سے مستفید فرمایا۔ آفاقی صاحب کی سال بھر کی کاوش میری نگاہ کوتاہ بیں میں "کشور کمار" کا انٹرویو قرار دی جاسکتی ہے۔ جناب الطاف شیخ صاحب نے ہمیں افریقا کے سفر کی روداد سنائی، افریقا او افریقا کے نام سے پھر جناب علی سفیان آفاقی ترکی یاترا پر ہمیں لے گئے۔ سفرنامے کا نام ہے "ترکی نمی دانم" جو تا حال جاری وساری ہے۔ ہمارے ہر دلعزیز لکھاری کاشف زبیر پورا سال "سراب" کے ذریعے قارئین سرگزشت کو منزل کی جانب لیے چلتے رہے۔ پورا سال شعروشاعری کی محفل سجی رہی سوائے دوماہ ناغے کے، اس محفل کے لیے شعروادب سے دلچسپی رکھنے والے محبین سرگزشت نے کل ملا کے 363 اشعار ارسال فرمائے۔ علمی آزمائش میں 3734 میزبان اس آزمائش پہ پورے اترے۔ اندرون ملک میں سے 3665 مہربان اور بیرون ملک سے 69 مہربان آزمائش میں سرخرو ٹھہرے۔ ان 3734 مہربانوں میں سے 55 مہربان انعام بھی لے اڑے۔ جنوری 2013 سے دسمبر 2013 تک 106 سچ بیانیاں شامل اشاعت ہوئیں پورے سال کی بہترین سچ بیانی بے شک 1۔ صلِ علیٰ، از شیخ انیس کہی جاسکتی ہے۔ (ماہ مئی) 2013۔ 2۔ میں زخم زخم ہوں، از ظفر صاحب (جنوری) 3۔ ہیر جی از ماہ نور، (اکتوبر)۔ پارچہ جات کا تجزیہ کچھ اس طرح ہے کہ کل 374 پارچے شامل اشاعت ہوئے جن میں سے بہترین پارچہ یعقوب عثمانی کراچی کا تھا جو کہ جولائی کے شمارے میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔"

☆ ناصر حسین کی آمد بہاولپور سے "بہترین اظہاریہ اکتوبر 2013 کا تھا۔ 2013 میں رانا محمد شاہد فل فارم میں تھے۔ 11 خطوں کے ساتھ دسمبر میں صرف نام کے ہمراہ شریک تھے۔ 3 دفعہ صدارت کے مستحق ٹھہرے ویل ڈن۔ حاجی اعجاز حسین سنجرانی کی ڈھیروں مبارک ہو حاجی صاحب۔ 10 خطوں کے ساتھ دو دفعہ صدارت کے حق دار ٹھہرے۔ دوسری پوزیشن پر رہے سدرہ بانو ناگوری 10 خطوں کے ساتھ، ایک دفعہ صدارت نومبر کے شمارے میں تاخیر سے پہنچی بہرحال نام شامل تھا اس لیے تیسری پوزیشن پر براجمان ہوئی۔ کم عمر اور لڑکی ہونے کے باوجود صدارت کی حق دار ہونا کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔۔۔ ارفع کریم، ملالہ یوسف زئی، مارٹ ایورسٹ کو سر کرنے والی پہلی پاکستانی خاتون' عائشہ فاروق پہلی پاکستانی فائٹر طیارے کی پائلٹ شرمین عبید چنائے، آسکر ایوارڈ یافتہ، ثناء میر، کرکٹ ٹیم کی کپتان۔ سامعہ خان ماہر علم نجوم کی طرح کسی نہ کسی فیلڈ میں ملک کا نام ضرور روشن کریں گی۔ سرگزشت نے پہلے بھی دو نام شہر خیال سے روبینہ نفیس انصاری ہومیو پیتھک ڈاکٹر و سرگزشت کی رائٹر، دوسری بیمرا ساجد کا پیش کیا ہے۔ بیمرا ساجد۔۔۔ شاعرہ بن چکی ہیں پچھلے دنوں ان کا شاعری مجموعہ آنکھ کا ساحل، نظروں سے گزرا۔ محمد عمران جونانی، 10 خطوں کے ساتھ ایک دفعہ صدارت پر چوتھے نمبر پر رہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری اور طاہر الدین بیگ پانچویں نمبر پر براجمان رہے۔ ڈاکٹر آر ایم ای صاحب آپ کے ڈاکٹر ہونے کی وجہ ہمیں اب سمجھ آئی کہ آپ نے محترم دلیپ کمار کی کردار کشی پر پی ایچ ڈی تو نہیں کی ہوئی ہے۔ ویسے شاہد جہانگیر اور عزیز اللہ بھائی نے دلیپ کمار کا جن خوب صورتی سے دفاع کیا ہے ہم انہیں محبت بھرا اسلام پیش کرتے ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب کا دسمبر میں سال کا طویل ترین خط تھا۔ حاجی اعجاز حسین سنجرانی، جنوری فروری، اعجاز حسین لدھیانہ مارچ۔ ڈاکٹر آر ایم ای اپریل، جون سدرہ بانو ناگوری مئی، محمد عمران جونانی اگست بینا ناچنا، آفتاب احمد نصیر، ستمبر، رانا محمد شاہد، جولائی، اکتوبر، نومبر، عبدالخالق بھٹی دسمبر' احمد خان توحیدی اکتوبر، 2013 کا بہترین خط تھا۔ محمد عمران جونانی اور شاہد جہانگیر لکھنے میں نہلے پہ دہلا ہیں۔ سہیل احمد عباسی صرف فروری کے شمارے میں آئے۔ مہوش رفیق صرف مارچ میں شریک ہوئیں کسی مصروفیات میں پڑ گئی ہیں۔ جنوری 2012 کو پراسراریت نمبر 2 شائع ہوا تھا۔ لیکن اس کی گونج ابھی باقی ہے۔ جس کا عکس 13-2012 میں بھی رہا۔ 2012 کو ہم بھی فارم میں تھے۔ ہمارے خطوط جس کا واضح ثبوت ہیں۔ پراسرار تحریریں پسند کرنے والے نوٹ فرمالیں! کہ نمبرز کے علاوہ بھی پراسرار تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ سامری 2012ء۔ مارچ 2012، پُراسرار مخلوق، پراسرار سیارہ، اپریل 2012 دوسری زندگی، انسان سے عفریت بن جانے کی کتھا۔ کاش، پراسرار کہانی۔ مئی 2012 سینٹ لوجی، پراسرار مذہب کا تذکرہ، سندھ کا ورثہ مکلی قبرستان پر معلوماتی کہانی' جون 2012 پراسرار بندے، نومبر 2012ء پراسرار گلاب، ناقابل یقین، مرنے کے بعد زندہ ہوجانے والے بچے کے واقعات، بھگوتا نروان، شوبز کی لڑکی کی دنیا بدل دینے والی ہستی کون تھی۔ نگینے، پراسرار خاصیت کے حامل پتھروں کا تذکرہ۔ جولائی 2012 جادوئی خزانہ۔ دسمبر 2012 سینڈی امریکا پر آنے والے طوفان پر ایک تحریر جنوری 2013 تسکین کی لاش' اپریل 2013 سحر و سامری مارچ 2013، دوانگلیوں والے، مئی 2013 جہنمی گڑھے اور پراسرار حادثہ جون 2013 عفریت جولائی 2013، بابا وینگا آنکھوں سے محروم پیش گو اگست، لارڈ ڈفرن ایک مشہور شخصیت کو پیش آنے والے پراسرار واقعات ستمبر 2013 منت، ایک پراسرار ملنگ کی کتھا۔"

☆ انور عباس شاہ دریا خان بھکر سے رقم طراز ہیں "فلمی الف لیلیٰ میں ویسے تو آفاقی صاحب نے کوئی کمی نہیں چھوڑی لیکن مجھے ان سے ایک چھوٹی سی شکایت ہے کہ سرگزشت میں انہوں نے اپنی کوئی تازہ تصویر نہیں چھپوائی۔ برائے مہربانی ان کی کوئی حالیہ تصویر ان کے مضمون کے ساتھ چھاپ دیں تا کہ ہم ان کا دیدار بھی کر سکیں اور ہمیں بھی پتا چلے کہ کیسے ہیں ہمارے آفاقی انکل (ان کی تصویر لگتی ہے) نیا سال 2014ء آنے والا ہے ہمارا اگلا شمارہ جنوری 2014ء نئے سال کا پہلا شمارہ ہوگا لیکن آپ نے کسی خاص نمبر کا اعلان نہیں کیا۔ ہمیں ایک اور پراسراریت نمبر کا شدت سے انتظار ہے۔ بہرحال اس دفعہ کے شمارے میں کہانی گندے انکل نے بہت متاثر کیا۔ مجرم تک پہنچنے والے مجاہد کو میں سلام پیش کرتا ہوں۔ قسط وار کہانی سراب بھی کافی دلچسپ ہے۔ عقوبت خانے نے تو دل دہلا کر رکھ دیا۔ پچھلے دنوں گلوکارہ ریشماں بھی ہم سے جدا ہو گئیں آپ سے گزارش ہے کہ ان پر کچھ لکھ دیں۔ (آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی)"

☆ محمد عامر ساحل کی ڈیرہ اسماعیل خان سے آمد "معراج رسول نے بجا فرمایا کہ آج کل مہنگائی نے ہم غریبوں کی کمر توڑ رکھی ہے۔ سیاستدانوں اور صنعت کاروں وغیرہ کا کیا جاتا ہے اس مہنگائی کے سانپ سے اگر نقصان ہوتا ہے تو وہ صرف اور صرف ہم جیسے غریب انسانوں کا اگر میں اپنی ہی بات کروں تو وہ بھی یہ کہ اگر کوئی چیز مارکیٹ سے ہم کو پہلے کی نسبت مہنگی مل رہی ہے تو ہمارے مالکان حضرات جو کہ تاجر اور دکاندار ہیں وہ بھی اپنی چیزوں کے ریٹ بڑھا کر خود کا گزارہ تو کر لیتے ہیں لیکن ہم جیسے مزدور لوگ جو کہ صبح سے لے کر رات تک جان توڑ محنت کرتے ہیں اس مہنگائی سے کیا مقابلہ کریں۔ وہ تو ریٹ بڑھا کر حساب برابر کر لیتے ہیں ہماری تنخواہ تو پھر بھی وہی رہتی ہے اور جب ضرورت زندگی کی اشیا لینے جائیں تو قیمتیں سن کر اکثر خالی ہاتھ ہی گھر لوٹ آتے ہیں کہ شاید کل قیمت کچھ گر جائے۔ اللہ پاک ہم کو ظالموں سے بچائے (آمین) شہر خیال میں دوستوں کے تبصرے پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ قیصر عباس شاہ کو خصوصی طور پر سلام ودعا۔ عبدالخالق بھٹی صاحب کو صدارت مبارک ہو۔ عبدالرؤف عدم آپ کو قاسیہ کی برتھ ڈے مبارک ہو۔ اللہ پاک آپ کی بیٹی کو لمبی زندگی اور صحت عطا کرے اور اس کے نصیب اچھے ہوں۔ آمین ثم آمین۔ اللہ پاک نے مجھے بھی 2 پیاری بیٹیاں عطا کی ہیں' میں نے لو میرج کی ہے اور وہ بھی اتنی دلچسپ کہ 7 سال کس طرح ہم ایک دوسرے کے لئے ترپتے رہے یہ ایک الگ کہانی ہے۔ ابن مقبول احمد صدیقی صاحب ہم شمارے میں ڈبکی تو ضرور ہی لگاتے ہیں پر کیا کریں مصروفیات کی وجہ سے شمارہ کچھ لیٹ ہی پڑھتے ہیں اور۔۔۔ جب سارا شمارہ ختم کرتا ہوں تو تب تک خط بھیجنے کی ڈیٹ گزر چکی ہوتی ہے۔"

☆ طاہر الدین بیگ، میر پور خاص سے لکھتے ہیں "خواجہ خضر ثانی پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا آگے چلے شہر خیال میں داخل ہوئے سب سے اوپر خالق بھٹی صاحب اپنے خوبصورت تبصرہ کے ساتھ نظر آئے وعلیکم السلام شیریں زادہ بڑی ہی جلدی میں تھی جب ہی اتنا مختصر تبصرہ ارسال کردیا جبکہ اس دفعہ تبصرے بڑے جامع اور کافی بڑے رہے جیسے ابن مقبول صاحب کا بے حد جامع اور خوبصورت تبصرہ جونانی عدم اور ریاست صاحب کے اچھے تبصرے رہے۔ آفاقی صاحب کا قلم اس دفعہ فلمی الف لیلیٰ میں زوروں پر رہا۔ مصطفیٰ قریشی صاحب اور دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ انڈو پاک فلمی صنعت پر خوب لکھا۔ آئندہ قسط کا ابھی سے انتظار ہے۔ کہانی عقوبت خانہ پڑھ کر عجیب سی کیفیت ہوئی اور اندھاپن پڑھ کر اس کیفیت سے باہر آئے۔ دنیائے ادب میں انقلاب لانے والے ناول کو بڑے ہی خوبصورت طریقہ سے لکھ کر سرگزشت کے صفحات کی زینت بنایا گیا ہے اور خوب ہی بنایا گیا ہے۔ مریم کے خان کی شاہی سوتن اور بھٹی صاحب کی جاسوس ادارے کافی دلچسپ معلومات آور ثابت ہوئیں۔ آپ بیتیوں میں خدارا اور گندے انکل بہت زبردست اور سبق آموز کہانیاں تھیں۔ کاش ان سے سبق حاصل کرلیا جائے۔ بٹوارا بھی خوب رہی۔"

☆ بشیر احمد بھٹی فوجی بستی بہاول پور سے لکھتے ہیں "دسمبر 2013 سال کا آخری شمارہ خریدا۔ شمارہ ہاتھوں میں لیا تو وزنی محسوس ہوا۔ وزن سابقہ شماروں سے کچھ زیادہ لگا۔ مجھے خیال آیا یا تو اس کی قیمت بڑھادی گئی ہے یا پھر اس کا کولیسٹرول بڑھ گیا ہے۔ کولیسٹرول بڑھنے سے ہی تو موٹاپا آتا ہے۔ میں نے ٹائٹل کی پشت پر نظر ڈالی۔ قیمت وہی 60 روپے۔ آپ نے 10 روپے بڑھا کر اس کی ضخامت کا خاص خیال رکھا ہے۔ سرگزشت ادب کی دنیا کا ادبی کہکشاں ہے۔ اس کی چمک دمک برقرار ہے۔ صفحات مناسب ہیں اور قیمت بھی۔ آپ نے ادب میں ڈنڈی نہیں ماری۔ میں نے ایک کہانی یعنی سچ بیانی "چارا" بھیجی تھی جو ایک سال بعد شائع ہوئی تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ آپ کے پاس سچ بیانیوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ چھ سات ماہ پہلے میں نے سنسنی خیز دو کہانیاں ارسال کی تھیں۔ لگتا ہے وہ اپنے نمبر کی منتظر ہیں۔ ایک کہانی قاتل "کالے خان" جو اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس کا مقدمہ بھی ختم ہوچکا۔ لہٰذا اسے من وعن شائع کیجیے۔ بلا جھجک (ہم معذرت خواہ ہیں)۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری کراچی سے رقمطراز ہیں "ایم اے خالق بھٹی اتنے دنوں بعد نظر آئے لیکن تمام ساتھیوں کو سلام دیتے وقت اپنی اس بہن کو بھول گئے۔ طاہر الدین بیگ کے لیے دعا ہے کہ رب تعالیٰ انہیں جلد صحتیابی عطا کرے۔ اعجاز حسین سٹھار ہمارے لیے دعا کیجیے گا کہ ہمیں بھی روضہ رسول کا دیدار نصیب ہو۔ عمران جونانی، محمد عامر ساحل اور ابن مقبول کا شکریہ کہ آپ کو تبصرہ پسند آیا۔ آپ کے تبصرے ہمیں اچھے لگے۔ ہر خط ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔ فلمی الف لیلہ میں آفاقی انکل سے کہنا چاہوں گی کہ آپ نے جو فلم انڈسٹری کی تباہی پر انا اللہ وانا الیہ راجعون، لکھا ہے کیا وہ درست ہے۔ میں طفل مکتب ہی سہی مگر میں بھی سمجھتی ہوں کہ یہاں اس قرآنی آیت کا استعمال غلط ہے۔ رجحان ساز، ابن کبیر نے بڑے سلیقے اور قرینے سے ہوزے سارا ماگو کا احوالِ زندگی بیان کیا۔ نوبل انعام حاصل کرنے والے اس ادیب کی کامیابیوں میں اس کے دادا کا بڑا اہم کردار رہا۔ "اندھاپن" جیسی شاندار اور بے مثال تحریر رقم کرنے والا یہ عظیم مصنف آنے والے ادیبوں کے لیے ایک روشن مثال بن گیا۔ "خدارا" پڑھ کر دل لرز گیا۔ یہ ایک ایسا حساس موضوع ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ ایمل بھابی کی بے پروائی اور نامناسب تربیت کی وجہ سے اس کی پھول سی معصوم بچی کو بے دردی سے مسل دیا گیا۔ جال، ایک فکر انگیز تحریر ہے۔ ہمارے معاشرے میں بے حسی بڑھتی جارہی ہے ایک ذرا سا ہنگامہ ہوتا ہے اور لوگ خبریں بن کر قبروں میں گم ہوجاتے ہیں اور پھر وہی سناٹا۔"

☆ بشریٰ افضل بہاولپور سے لکھتی ہیں "انکل کی باتیں سنیں کتنی کھری اور سچی ہوتی ہیں، پتا لگتا ہے دنیا کس ڈگر پر چل رہی ہے۔ "خواجہ خضر ثانی" پڑھ کر معلومات کے ذخائر میں اضافہ ہوا۔ اپنی محفل میں آکر رک گئے "عبدالخالق بھٹی" کو دیکھا کہ کرسی صدارت پر بیٹھے تھے۔ ہم مبارک باد دیتے ہیں۔ تبصرہ قابل ستائش تھا بڑی محنت سے لکھا تھا۔ روبینہ نفیس لوگوں کا تو کام ہی ٹینس کرنا ہے۔ بالکل دھیان نہ دیں پتا نہیں لوگ بیٹی کو ہوا کیوں سمجھتے ہیں حالانکہ آج کل کے دور میں لڑکے کب ماں باپ کا سہارا بنتے ہیں۔ خود ہی بیوی کو لے کر علیحدہ ہوجاتے ہیں۔ ایسے بیٹوں کا کیا فائدہ؟ اس سے تو اچھا ہے بیٹے کی خواہش ہی نہیں کرنی چاہیے۔ لوگوں کا بہت غلط خیال ہے۔ رانا محمد شاہد بیٹی کی آمد مبارک ہو ہمارے ساتھی اب سیاست کے انداز میں باتیں کرنے لگے ہیں۔ ابن مقبول جاوید احمد صدیقی آپ کا تبصرہ خاصا لمبا اور تفصیلی تھا اور خوبصورت پیرائے میں لکھا تھا پسند آیا اور ہمیں یاد رکھا شکریہ، آپ کی اس بات میں واقعی سچائی ہے خدا ہی ان کے قفل کھول سکتا ہے۔ "خدارا" پڑھی رزل کا تو کوئی قصور نہیں تھا ایمل اگر ثوبیہ کی باتیں سن کر عمل کرتی تو شاید رفیق جیسے بھیڑیوں کے ہتھے نہ چڑھتی اور زندگی سے ہاتھ نہ دھوتی مکمل نصیحت آموز کہانی تھی ان ماؤں کے لیے جو اپنی بیٹیوں کو ایسے لباس پہننے کی اجازت دیتی ہیں۔ بٹوارا میں احمر نے بیوی کی محبت کی خاطر خاموشی سے دوسرا راستہ اختیار کیا مگر مرنے کے بعد بیوی کو سب بتادیا کہ میں نے صرف تمہاری خاطر یہ سب کیا۔ محبت ہو تو ایسی! کباب، اس کہانی میں نصیحت کا پہلو نمایاں تھا اگر کوئی کسی غریب کے ساتھ ایسا سلوک کرے تو خدا دنیا میں ہی دکھا دیتا ہے۔ کنیز فاطمہ نے بیٹی کی فرمائش کے لیے کتنی بے بسی محسوس کی اگر مالکن اس کو خوش کردیتی تو خود اس پر کوئی پابندی نہ ہوتی۔ خدا کی خدا ہی جانے۔ محافظ نے صحیح محافظ ہونے کا حق ادا کیا اپنے فرائض کی ادائیگی میں باپ کی محبت کو بھی نہیں آنے دیا۔ جال کراچی کے حالات کے تناظر میں لکھی گئی ہے یہی کچھ ہورہا ہے۔ گندے انکل، ایجنسی کے آفیسر نے حکمت عملی سے اس درندے کو پکڑا! اگر اسی طرح ہمارے پاکستان کے ہر علاقے میں ایجنسیاں بنادی جائیں تو یہ واقعات ہی رونما نہ ہوں۔ محبت کی خاطر، صائمہ نے اپنی محبت حاصل کرنے کے لیے نوبی کو بیوقوف بنایا اور نوبی اس سے سچی محبت کی خاطر قربانی دیتا رہا۔ خدا نے اس کو اچھا صلہ دیا، انہونی، میں چاند بی بی نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے صحیح فیصلہ کیا اور منور علی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ لیڈی ڈیانا کی شاہی سوتن، میں اس کی سوانح حیات بڑے خوبصورت پیرائے میں بیان کی ہے۔ ترکی تمی وانم، میں علی سفیان آفاقی نے ترکی کے سفرنامے کی کہانی خوبصورت انداز میں تحریر کی۔ یہ ان کا ہی خاصہ ہے۔"

☆ قیصر عباس خان لکھتے ہیں "معراج رسول کے اداریہ نے ایک اہم اور بنیادی مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ غیر ملکی مسائل کو چھوڑ کر اپنے ملک کے مسائل پر بات کریں۔ گلوبل وارمنگ کی وجہ سے ٹماٹر کی فصل کو نقصان پہنچا؟ کبھی آٹا، کبھی چینی کبھی سبزیاں نایاب ہوجاتی ہیں؟ ہر حکومت کو صرف امریکا کی خوشنودی منظور ہے۔ مذہبی رنجش اور مذہبی اختلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کررہے ہیں۔ ٹھیک کہا معراج سر نے عفو و درگزر اور نفس کی طہارت کریں۔ سب مل جل کر رہیں۔ اللہ پاک ہمارے ملک کو ہر قسم کے مسائل سے نجات دے (آمین) محمد عمران جونانی نے تعریف کی تو مجھے نظر لگ گئی کیونکہ ایک بھی کہانی نہیں پڑھ سکا۔ مصروفیت بہت ہے مشکل سے شہر خیال پڑھ کر تبصرہ کررہا ہوں۔ سب دوستوں کا شکر گزار ہوں جنہوں نے یاد کیا اور ابن مقبول جاوید احمد صدیقی صاحب کا بہت طویل تبصرہ میں اپنا نام اور تعریف پڑھ کر حیرت ہوئی کہ یاد رکھتے ہیں اور بکھر سے فقیر غلام حسین صاحب حاضر تھے اور آپی طاہرہ گلزار غیر حاضر تھیں۔ دسمبر کے شمارے میں رانا شاہد صاحب تاخیر میں تھے۔ رانا اور آپی کے تبصرہ سے محروم رہے۔ آپی طاہرہ گلزار کے تبصرے میں سب پر بات ہوتی ہے۔"

☆ محمد عزیز مگسی نے لندن وہاڑی سے لکھا ہے "بات کچھ یوں ہے کہ میری ملازمت میں اٹھارہ گھنٹے کاغذ قلم سے تعلق رہتا ہے اور یوں میری بینائی کافی متاثر ہوئی جس وجہ سے بظاہر سرگزشت سے تعلق ٹوٹ گیا تھا لیکن حقیقت میں نہیں۔ اب بھی یہ صورت حال ہے کہ رسالہ لاتا ہوں، شہر خیال میں دوستوں کے خطوط پڑھ کر محظوظ ہوتا ہوں۔ لیکن خط لکھنے سے کتراتا ہوں کہ کہیں کسی اہمیت کے حامل قاری کی جگہ میرا فضول سا خط نہ گھیر لے۔ لیکن اس مرتبہ خط لکھنے سے خود کو روک نہ پایا۔ اس کی ایک وجہ رانا شاہد آف بورے وال اور ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کے خطوط ہیں۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مسلسل چھ بیٹیوں کے بعد بیٹے سے نوازا الحمدللہ اس وقت میرا بیٹا چار سال کا ہے اور سب سے بڑی بیٹی پندرہویں سال میں ہے۔ میں بیس سال کی عمر میں باپ بن گیا تھا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے بیٹیوں کے بعد بیٹے کی نعمت سے نوازا۔ الحمدللہ! میں نے کبھی بیٹیوں کو بوجھ نہیں سمجھا بلکہ ان کے ساتھ دوستانہ تعلق ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں بن مانگے ہی ان کی ہر خواہش پوری کردوں۔ میں نے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہی دعا مانگی ہے کہ الٰہی! مجھے کبھی شرمندہ نہ ہونے دینا اور میری اولاد کو میری عزت اور نیک نامی کا سبب بنا۔ ڈاکٹر روبینہ بہنا! آپ کو ایک وظیفہ بتا رہا ہوں کہ فجر کی سنتوں اور فرضوں کے درمیان میں اول آخر گیارہ بار درود شریف کے اکتالیس بار حضرت ذکریاؑ کی دعا قرآن سے دیکھ کر پڑھیے...... آپ بہت جلد صاحب اولاد ہوں گی انشاء اللہ! انکل بڑے عرصے بعد حاضری لگوا رہا ہوں اس لیے خصوصی شفقت فرمایئے گا۔"

☆ بشریٰ افضل بہاولپور سے لکھتی ہیں "رانا محمد شاہد بیٹی تو رحمت ہوتی ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔ طاہرہ گلزار شکریہ یاد رکھا آپ نے۔ میری صحت یابی کے لیے سب ساتھی دعا کیجیے۔ میری کمر میں تکلیف ہے، آپ کی دعاؤں سے جلد صحت یاب ہوجاؤں۔ رانا سجاد ظفر چھوڑیں کیا کریں گے پوچھ کر! روبینہ نفیس آپ مایوس نہ ہوں، لوگوں کی تو عادت ہے دل دکھانے والی باتیں کرنے کی۔ اعجاز احمد سٹھار حج کی سعادت نصیب ہوئی ہماری طرف سے مبارک۔ سدرہ ناگوری کا تبصرہ اچھا لگا۔ پارے بھی بہت اچھے اچھے تھے۔ فلمی الف لیلہ پڑھ کر معلومات کے خزانے میں اضافہ ہوا۔"

☆ محسن علی بالاکوٹ سے لکھتے ہیں "زندگی کا ایک اور قیمتی سال ہمیں داغ مفارقت دے گیا اور اپنے ساتھ کئی دکھ اور خوشیاں ماضی کا حصہ بنا گیا یہی زندگی ہے۔ ہم اندازہ نہیں کرسکتے کہ آنے والا سال کیسا رہے گا کیونکہ ماضی کا تو ہم جانتے ہیں لیکن مستقبل ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ ہم دعا ہی کرسکتے ہیں کہ نئی امید بن کر آنے والا یہ سال جو کہ امید کی ایک کرن ہے۔ پاکستان کے لیے اور پوری امت مسلمہ کے لیے بہترین ہو (آمین) انکل نے پاکستان کی کرنسی گرنے کی بات کی اور ساتھ ہی علماء سے شکوہ بھی، اب کیا کہا جائے کہ روپے کی قیمت گرتی ہے تو ملک پاکستان کو نقصان ہوتا ہے اور غریب سے ضروریاتِ زندگی دور سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ لیکن جن کی دولت ڈالروں میں ہو انہیں راتوں رات اربوں کا منافع ملتا ہے تو پھر کیسے روپے کی قیمت کم نہ ہو؟ پچھلے دنوں ہمارے وزیر خزانہ صاحب کا مضحکہ خیز بیان سننے کو ملا کہ سٹے بازوں کی وجہ سے روپے کی قدر میں کمی آرہی ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ تو پھر آپ کس مرض کی دوا ہیں۔ اور رہی بات علماء کی تو انکل ہی کیا ماضی میں اقبال جیسے دانشور نے جو کچھ کہا وہ کیا سچ نہیں تھا؟ وطن عزیز میں مذہب کے نام پر جو کچھ ہورہا ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں مذہب کے نام اس مذہب کے نام پر جس میں ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ کسی دانشور نے خوب کہا تھا کہ لوگ مذہب کے لیے لڑتے ہیں، مذہب کے لیے مرتے ہیں لیکن مذہب پر چلتے نہیں ہیں۔ اے کاش ان لوگوں کی آنکھوں سے نفرت کی پٹی کھل جائے اور پاکستان میں خون بہنا بند ہو کہ یہ دھرتی بہت سیراب ہوچکی بے گناہوں کے خون سے۔ ایک سچی سرگزشت میں مولانا خیر محمد ندوی کے بارے میں جن سے ہمیں ہمت جواں رہنے کا درس ملا کہ ہمت جواں رہے تو منزل آسان ہوتی ہے۔ شہر خیال میں سب کے تبصرے شاندار رہے، راولپنڈی سے ابن مقبول صاحب کا تبصرہ 1971ء سے شروع ہوا اور ختم 2013 کو ختم کرکے ہوا، کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کافی طویل تبصرہ تھا۔ جہانِ حیرت میں اسٹیفن ہاکنگ، کا زندگی نامہ پڑھا۔ اسٹیفن ہاکنگ واقعی میں سپر جینئس دماغ رکھنے والا ایک عظیم سائنس دان ہے جو مشینوں کے سہارے زندہ ہے لیکن اس کی زندگی رائیگاں نہیں جارہی۔ جو اپنی قوم اور پورے عالم کے لیے ایک زندہ اور روشن مثال ہے کہ جس حال میں جیو تم کچھ کرکے جیو۔ ایسا انسان کسی بھی قوم کا سرمایہ ہوتا ہے۔ سراب کی قسط بھی شاندار رہی۔ شہباز کی زندگی میں سکون نام کی چیز تو ویسے بھی نہیں ہے لیکن انڈیا میں وہ جب بھی جاتا ہے کوئی دھماکا ضرور کرتا ہے۔ شاہی سوتن بھی دلچسپ تحریر رہی۔ ڈیانا پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھا جاچکا ہے لیکن اس انداز میں پہلی بار پڑھا۔ فلمی الف لیلیٰ کی موجودہ قسط ہمیشہ کی طرح معلومات کا خزانہ تھی، آفاقی صاحب سے اس بار پھر گزارش کروں گا کہ وہ اشفاق احمد پر لکھیں۔"

☆ شاہد جہانگیر شاہد نے پشاور سے لکھا ہے "معراج رسول نے اداریہ میں امن وامان کی صورت حال حکام اور علما کی غیر ذمہ داریوں اور کمر

توڑ مہنگائی کا جامع احاطہ کر کے سبزیوں کی کمیابی کا ذکر کیا ہے۔ پاکستان جہاں مرغی کا گوشت سبزیوں سے زیادہ سستا ہے اور پاکستانی عوام کی اکثریت اب اسی پر پل رہی ہے مگر اس کے نرخ بھی بڑھ رہے ہیں۔ بھارت پاکستان سے رقبہ میں بڑا ملک ہے۔ جس کی آبادی ایک ارب سے زائد ہے اور وہاں کی اکثریت گوشت نہیں کھاتے۔ سبزیاں کھاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہاں اس کثرت سے سبزی پیدا ہوتی ہے کہ وہ بیرون ملک بھی سبزیاں برآمد کرتے ہیں۔ ہمارا ملک بھی ایک زرعی ملک ہے پھر سبزی اور ٹماٹر اتنے مہنگے کیوں ہیں؟ اس کی ایک وجہ تو کولڈ اسٹوریج ہیں جہاں ذخیرہ کر کے موسم گزرنے کے بعد پھل اور سبزیاں مارکیٹ میں لاتے ہیں۔ چیک اینڈ بیلنس نہ ہونے کے باعث سبزیاں بھی عام آدمی کی پہنچ سے دور ہو گئی ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا "جہان حیرت" واقعی حیرت کدہ ہے کہ معذوری کو خاطر میں نہ لایا جائے تو معذوری راہ کی دیوار نہیں بنتی بلکہ کامیابی کے نت نئے راستے سجھاتی ہے۔ سرورق کی کہانی "خدارا" ایک عبرت اثر اور سبق آموز کہانی ہے۔ یہ آج کی کہانی ہے۔ ثوبیہ فہد کی تحریر میں کوئی جھول نہیں ہے۔ ایسے واقعات اس تواتر سے وقوع پذیر ہو رہے ہیں کہ اب تو یہ عام سی بات ہو گئی ہے۔ بڑے سے بڑا حادثہ بھی چند دن میں ذہن سے محو ہو جاتا ہے۔ پتا اس وقت چلتا ہے جب خود پر بیتتی ہے۔ افسر آذر کی تحریر "عقوبت خانہ" جنگ عظیم کے واقعات پر مبنی دل دہلا دینے والی کہانی ہے۔ محترم آفاقی صاحب نے دلیپ کمار کے بارے میں بڑے بروقت مضامین لکھے۔ گیارہ دسمبر 2013 کو دلیپ صاحب کی 91 ویں سالگرہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ انہیں طویل اور صحت مند زندگی عطا فرمائے۔ مصروفیت کے باعث گزشتہ ماہ تبصرہ نہ لکھ سکا جس کے لیے شہر خیال کے دوستوں اور مکینوں سے معذرت خواہ ہوں۔ اس دوران فارسی کے سب سے بڑے شاعر مرزا عبدالقادر بیدل کے بارے میں ایک تحقیقی مضمون لکھنے میں مصروف رہا۔ محمد عمران جونانی، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ میرا خط عموماً آخر میں چھپنے کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ سرگزشت میرے شہر میں سب سے آخر میں پہنچتا ہے۔ جب تک خط بھیجنے کی آخری تاریخ سر پر نہیں آجاتی تبصرہ مکمل نہیں ہو پاتا۔ آپ کا مفصل تبصرہ بے حد پسند آیا عبدالرؤف عدم، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی اور وحید ریاست بھٹی کے تبصرے بھی بہت پسند آئے۔ طاہر الدین بیگ کا مختصر لیکن جامع تبصرہ پسند آیا۔ باقی دوستوں کے تبصرے بھی اپنی اپنی جگہ بہترین ہے البتہ رانا محمد شاہد بورے والا، رانا سجاد، طاہرہ گلزار اور سدرہ بانو ناگوری کی غیر حاضری بے حد محسوس ہوئی۔"

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری بھکر سے رقم طراز ہیں "سرورق کچھ خاص نہ تھا، شہر خیال میں سب اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے۔ بھائی میں تو آپ لوگوں سے اپنا دکھ درد شیئر کر کے مزید دکھی ہوئی، میرے نمبر پر رانگ نمبروں سے ایسے میسج آئے کہ میں بتا نہیں سکتی کچھ لوگوں نے ہمدردی بھی کی (یہی وجہ ہے کہ ہم کسی رائٹر کا نمبر شائع کرنے اور دینے سے منع کرتے ہیں) بہرحال جن لوگوں نے مجھے دعاؤں میں یاد رکھا میں ان کی ممنون ہوں۔ لکھنے والوں کو جب کوئی پسند کرتا ہے تو خوشی ہوتی ہے۔ حافظ آباد سے فرزانہ تبسم نے کال کر کے بتایا کہ اسے میری تحریر بہت پسند ہے تو مجھے بہت خوشی ہوئی ویسے بھی شہر خیال ایک خاندان کی طرح ہے۔ پاکستان کے حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ نواز شریف سے ہمیں بڑی امیدیں تھیں مگر سب خاک ہو گئیں۔"

☆ محمد ایاز راہی نے مانسہرہ سے لکھا ہے "شہر خیال کے باسیو یہ سرگزشت کو ایک مشورہ ہے۔ آپ بھی میرا ساتھ دیں۔ مشورہ یہ ہے کہ "رقص نمبر" نکالیں جس میں رقص درویش، کتھک، لوک ناچ، کلاسیکل رقص، فلمی رقص وغیرہ پر بھرپور روشنی ڈالی جائے۔"

☆ احمد چوہان اور رانا حبیب الرحمٰن کا مشترکہ خط سینٹرل جیل لاہور سے "وطن کے حالات تو ایسے ہیں جیسے کسی 65 تا 70 سال کے انسان بوڑھے کو بیماریاں لگ جاتی ہیں ایسے ہی اپنے ملک کی عمر کے مطابق مین وہی حال ہے ہر جگہ مہنگائی، کرپشن، لوڈ شیڈنگ، تیل کا بحران، پانی کا بحران، اور تو اور ملک میں ایک تو ہر چیز مہنگی ملتی ہے جو غریب کی پہنچ سے دور ہے اور دوسرا ٹیکس ہیں جسے بڑھا کر انسان کا خون چوسا جا رہا ہے۔ دنیا میں بڑھتی ہوئی کرپشن اور غربت کا آزار انسانی فلاح و بہبود کے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے۔ کم آمدنی والے ممالک میں بڑھتی کرپشن سے غربت و مفلسی کے خلاف جنگ کو شدید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ پاکستان میں کرپشن کم کرنے کے لیے ہر سطح پر سنجیدگی کے ساتھ قوائد و ضوابط کے نفاذ کی ضرورت ہے۔ اگر پڑوسی ممالک کا جائزہ لیا جائے تو گزشتہ دس سالوں میں ان کے ہاں کرپشن کم ہوئی ہے جتنی کرپشن کم ہوگی اتنی ہی معیشت بہتر ہو جائے گی۔ کرپشن ہی پاکستان کی ترقی میں بنیادی رکاوٹ ہے۔ پاکستان کرپشن کے لحاظ سے 33 سے بڑھ کر 34 نمبر پر آ گیا ہے سروے کے مطابق ڈنمارک، فن لینڈ، جاپان، اسپین، کینیڈا، ناروے اور آسٹریلیا میں کرپشن کی سطح 5 فیصد سے بھی کم ہے۔ جبکہ افغانستان میں 46 بنگلہ دیش میں 39 اور سری لنکا میں 19 فیصد ہے۔ اگر حکومت اداروں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا چاہتی ہے تو ڈیپوٹیشن کے نظام کو ختم کرنا ہوگا۔ کرپٹ اہلکاروں کی پشت پناہی کرنے والوں کے خلاف سخت ترین کارروائی ہونی چاہیے۔"

☆ سلیم رشید نے لاہور سے لکھا ہے "ماہنامہ سرگزشت کا قاری ہوں اور باقاعدگی سے اس کے اجراء سے اب تک اس خوبصورت معلوماتی رسالے سے فیض یاب ہو رہا ہوں۔ اس سے پیشتر میں قلم فیئر، شمع دہلی، پکچر، مصور وغیرہ سے فلمی معلومات حاصل کرتا تھا۔ لیکن آپ کے رسالے میں فلمی معلومات کے علاوہ تقریباً ہر علوم پر بہت خوبصورت مضامین شائع ہوتے ہیں اور آئندہ بھی یہی معیار قائم رہے گا (انشاء اللہ) آپ کے رسالے کے قاری اتنی اچھی معلومات مہیا کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان کی تحریروں میں گم ہو جاتا ہے۔ اس دفعہ کے شمارہ میں دلیپ کمار کے بارے میں بذریعہ انٹرویو بہت کچھ معلوم ہوا۔ اگرچہ ان کے اور راجکپور کے بارے میں پہلے رسالوں میں وہ انڈین ہوں یا پاکستانی ہمیشہ ان کے اختلافات کا ذکر پڑھا ہے۔ کسی رسالے نے تحریر کیا کہ انداز کے ایک سین میں راجکپور نے دلیپ کمار کے سر میں ریکٹ مار دیا تھا اور راجکپور نے نرگس کے ساتھ جوڑی بنانے کے لیے اس کو دلیپ کمار کے ساتھ فلموں میں کام سے روک دیا تھا۔ جبکہ نرگس اور دلیپ کمار کی فلمیں "میلہ، دیدار، انداز، بابل، جوگن، انوکھا پیار یادگار فلمیں ہیں۔ اسی طرح مدھوبالا کے ساتھ، سنگدل، ترانہ، امر اور مغل اعظم، میں کام کے باوجود ان دونوں کے درمیان پریم ناتھ بطور ولن موجود رہا اور سائرہ بانو سے شادی سے پہلے راجندر کمار کا کردار موجود ہے جو سائرہ بانو سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح پریم ناتھ نے تحریر کیا کہ اس نے دلیپ کمار کی پہلی محبت کامنی کوشل کو حاصل کر کے مدھوبالا کو ٹھکرا دیا۔ دلیپ کمار اور ثریا کے اختلافات بتلائے گئے۔ نوتن کے ساتھ بحیثیت ہیرو جوانی میں کام نہیں کیا بعد میں اولڈ کردار میں اکٹھے ہوئے۔ اب شاہ رخ اور امیتابھ بچن سے اختلاف کا ذکر کیا گیا۔ ان باتوں کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ دلیپ کمار نے راجکپور، بلراج ساہنی، اشوک کمار، دیو آنند، راجکمار جو کہ عروج پر تھے بطور ہیرو کام کر کے اپنی اداکاری کا سکہ منوایا۔ محترم آفاقی صاحب نے ان تمام حالات پر پہلے کافی تفصیل سے سرگزشت، میں بیان کیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک اخبار میں محترمہ زاہدہ حنا نے کچھ حوالہ جات لوگوں کی ناقدری کے دیئے تھے جن کو نقل کر رہا ہوں۔ ابن حزم کا مدرسہ اور کتب خانہ جلایا گیا۔ اشبیہ میں ان کی تحریریں سربازار نذر آتش کی گئیں۔ کبھی قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے۔ کبھی ابن تیمیہ کی کتابیں نذر آتش کیں۔ قید کیا گیا اور ان کی تصنیف اور تالیف کی آزادی سلب کر لی۔ اور ان کی کتابیں اور مسودے ضبط کر لیے۔ آج ہم ان کو "امام" لکھتے نہیں تھکتے۔ کاغذ اور قلم سے محروم ہونے والے ابن تیمیہ نے اپنے قید خانے کی دیواروں پر ناخنوں سے کھرچ کر لکھا تھا کہ میری اصل سزا یہ ہے کہ مجھے کاغذ اور قلم سے محروم کر دیا گیا۔ ان کے شاگرد ابن القیم کو بندی خانے میں رکھا۔ اونٹ پر بٹھا کر شہر بھر میں یوں پھرایا جیسے وہ کوئی مجرم ہو اور مسلم دنیا کا آخری نادر روزگار اور عظیم ہیئت داں، عالم اور فلسفی ابن رشد جو اپنے خیالات و افکار کی وجہ سے ذلیل کیے گئے اور مسجد قرطبہ کی سیڑھیوں پر نمازیوں کے جوتے صاف کرنے کی سزا دی گئی۔ جسے جلاوطن کیا گیا اور قرطبہ کے چوک میں ان کی کتابیں الاؤ میں جھونکی گئیں۔ جبکہ راجر بیکن نے 1230ء میں ابن رشد کی کتابوں کے لاطینی ترجمے کو یورپ کی علمی تاریخ کا ایک عظیم واقعہ قرار دیا تھا۔ ابن رشد کو ذلت آمیز جلاوطنی دی گئی مگر ہسپانیہ کے یہودیوں نے انہیں سینے سے لگایا اور ان کے خیالات و افکار یورپ کی علمی اور سائنسی ترقی کا نقطہ آغاز بنے۔ اس طرح پاکستان کے بہت سے کرکٹ کے کھلاڑی غیر ممالک چلے گئے اور نام کیا۔"

☆ آخر وقت میں موصول اعجاز حسین سٹھار، نور پور تھل کا نامہ "جہان حیرت .... میرے لیے پھیکا رہا اور سچی بات ہے سرسری دیکھتے اور ورق الٹتے گئے۔ "عقوبت خانہ" گزشتہ سے پیوستہ کڑی تھی جسے پڑھنے کے لیے بھی ہمت اور دل گردہ مضبوط چاہیے تھا میں ڈاکٹر کے حوصلہ اور اس یقین پر حیران ہوں جس کے لیے ہر صبح نئی اذیت، بربریت اور سفاکی لے کر طلوع ہوتی تھی، لاکھوں انسانوں کی موت اپنی آنکھوں دیکھنے کے باوجود زندگی کی معمولی امید لے کر خون کے سیلاب سے گزرتا رہا کہ آخر بھی امن بھری صبح طلوع ہوگی وہ آخر کامیاب رہا، عزم کو فتح حاصل ہوئی۔ فلمی الف لیلہ، میں اکثر آفاقی بھائی پاکستانی فلمی صنعت کی تباہی کا ذکر کرتے ہیں۔ جس پر تباہی نہیں آئی بلکہ پورا ڈھانچا ہی ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے۔ سچ بیانیوں میں پہلی کہانی "خدارا" میں ایک قابل غور اور سنجیدہ مسئلے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ عورت کے جسم کا کوئی حصہ بھی ننگا دیکھ کر مرد کی نظریں بھٹکنے لگتی ہیں اس میں عمر کی قید نہیں ہے۔ لڑکیاں ناسمجھی اور بھولپن میں دعوت گناہ کا موجب بنتی ہیں، یہاں والدین کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ کڑی نظر رکھیں اور محلّہ کے دکاندار اور ریڑھی پر کھانے پینے کی اشیاء بیچنے والے کوئی بھی حرکت کرنے کے لیے آزاد ہوتے ہیں اور انہیں کچی عمر کے بچوں کو بہکانے کے کئی مواقع ملتے ہیں۔ بچے کھانے پینے کے لالچ میں غیر اخلاقی عادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں اگر تھوڑی توجہ دی جائے تو کسی بڑے سانحہ اور بری خبر سننے سے بچا جا سکتا ہے۔ "بٹوارا" کے احمر شریف اور بزدل فطرت تھے جو حالات کے ردوبدل سے گھبراتے تھے وہ زندگی ایک روٹین سے گزارنے کے قائل تھے۔ "کباب" واقعی موجودہ حالات کے حساب سے المیہ کہانی ہے جب کسی کو ترسایا جائے تو برسوں کی ایمان داری داؤ پر لگ جاتی ہے لیکن جس کا بینک بیلنس جتنا بڑھتا جاتا ہے وہ لالچ میں اتنے قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔ جب کسی غریب کے سامنے کھانے کی میز پر دنیا کی نعمتیں جمع کر لی جائیں اور غریب کے حصے میں صرف حسرت سے دیکھنا ہی آئے تو اس کے دل سے نکلی آہیں بے فکری سے کھانے والوں کے لیے ناشکرے پن کے نیزے بن جاتے ہیں۔ یہ سراسر قہر خداوندی کو دعوت دینے والی بات ہے بلکہ نوکروں کو پہلے کھلایئے یوں اس صدقہ سے رزق کی نحوست ٹل جائے گی۔ "گندے انکل" پڑھ کر بحیثیت بزرگ اور مسلمان سر شرم سے جھک گیا ہے۔ صفحہ نمبر 156 پر میمونہ رضی اللہ عنہ کے متعلق جو کچھ چھپا ہے سو فیصد درست ہے آپ کی قبر مبارک مدینہ جاتے ہوئے بائیں طرف مکہ سے باہر مضافات میں ہے۔ اردگرد انسانی کندھے کے برابر سفید رنگ کی چار دیواری ہے۔ کئی بار دوران سفر زیارت اور فاتحہ پڑھنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ سید امتیاز حسین بخاری چک 36 شمالی سرگودھا والے زندگی کے ہنگاموں اور روزمرہ کی مصروفیات میں کھو گئے ہیں۔ اس کے ساتھ محمد عمران، ذکی نامدار بھی اپنی خیریت سے آگاہ کریں۔"

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں "یک صفحی سرگزشت میں لیاری کی ایک معروف شخصیت کی مثالی جدوجہد پڑھی۔ آخر میں غالباً آپ نے 1909ء میں پیدا ہونے والی شخصیت لکھنا تھا۔ 1969ء لکھ دیا۔ (ہم معذرت خواہ ہیں کہ پروف ریڈنگ کی غلطی سے ایسا ہوا) شہر خیال میں عبدالخالق بھٹی کافی عرصے بعد آئے ہیں۔ اعجاز حسین سٹھار حج سے واپس آ گئے حج کی سعادت اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ ملک جاوید مبارک یاد کا شکریہ۔ محمد عمران جونانی دعاؤں کا شکریہ۔ سنڈے میگزین جنگ میں آپ کی یادداشتیں پڑھیں قمر علی عباسی مرحوم کے ساتھ آپ نے اپنی یادیں شیئرز کی تھیں۔ علمی وادبی شخصیات سے وابستہ یادیں۔"

تاخیر سے موصول خطوط:

انور اعجاز خان، (یکہ توت پشاور) جویریہ خان، (گورنمنٹ کالج بھکر) رانا محمد سجاد (مظفر گڑھ) محمد انوار، محمد عمران جونانی، احمد خان توحیدی، رضوان تنولی، فخر عالم، شاہد حیات خان (کراچی) زیب النسا (بہاولپور) طاہرہ گلزار (پشاور)

سفر مزاج

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ کامل تھے بزم تحقیق کے چراغ گویا محکوم تھی زبان اردو تو تابع تھا اس زباں کا ان کا دماغ، یعنی کہ وہ اردو کے مجتہد العصر تھے۔ بلاغت میں لطیف اور فصاحت میں نفیس تھے۔ فصاحت وبلاغت کا دریا بہایا مگر انہیں معاصران وطن نے وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ حقدار تھے۔اس ناقدری کی وجہ کیا تھی؟

اس مرد قلندر صفت کا شور بار قلم جولانی پر تھا

گورنمنٹ مڈل اسکول خان پور کی وسیع عمارت میں کلاسوں کا آغاز ہونے کو تھا۔ اسکول کی گھنٹی سے عمارت گونج رہی تھی۔ بچے پہلے ہی اپنی اپنی کلاسوں میں جا چکے تھے۔ چند اونگھتے سوتے بچے اب بھی اسکول کے دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ گھنٹی کی آواز سن کر وہ بھی تیز تیز قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

جب تمام بچے اپنی اپنی کلاسوں میں جا چکے اور اسکول کا دروازہ بند کر دیا گیا تو معلم حضرات نے کلاسوں کا رخ کیا۔ انہی میں قاضی سراج الدین احمد صدیقی بھی تھے۔ دبلا پتلا جسم، چوڑے پائنچوں والا پاجامہ، سیاہ شیروانی میں ملبوس چہرے پر علمیت اور شرافت کے آثار۔

کلاس میں پہنچے اور نہایت شفقت سے بچوں کو کتابیں نکالنے کا حکم دیا اور پڑھانا شروع کر دیا۔ ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دروازے پر کسی کی آہٹ محسوس ہوئی۔ انہیں یہ برداشت نہیں تھا کہ دورانِ تدریس کوئی مخل ہو۔ انہوں نے ناگواری سے دروازے کی طرف دیکھا۔ نیم وا دروازے کے باہر انہوں نے چپراسی کو کھڑے دیکھا جو اندر آنے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ انہوں نے چپراسی کو اندر بلانا مناسب نہیں سمجھا اور خود باہر آ گئے۔

''تم دیکھ نہیں رہے میں پڑھا رہا ہوں، یہاں کیوں چلے آئے، کیا بات ہے؟''

''آپ کے گھر سے کوئی آیا ہے، آپ کو بلایا گیا ہے، مبارک ہو بیٹے کی ولادت ہوئی ہے۔''

''گھر سے جو کوئی بھی آیا ہے اس سے کہو میں اتنے بچوں کو چھوڑ کر ایک بچے کو دیکھنے نہیں آ سکتا۔ جب تدریس سے فارغ ہو جاؤں گا تو آ جاؤں گا۔''

''جی بہت بہتر۔''

انہوں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ چپراسی کھڑا ہے چلا گیا اس مرتبہ دروازہ بالکل بند کر دیا کہ کوئی اور نہ آ جائے اور سبق وہیں سے پڑھانا شروع کر دیا جہاں سے منقطع ہوا تھا۔

فرائض کی بجا آوری کا احساس تھا جو انہیں گھر جانے سے روک رہا تھا۔ ان کے طرزِ عمل میں نہ کوئی گھبراہٹ تھی نہ جلدی۔ وہ اسی طرح دل جمعی سے پڑھا رہے تھے جو ان کا معمول تھا۔

اسکول کا وقت ختم ہوا تو انہیں یاد آیا کہ انہوں نے کیا خبر سنی تھی۔ دل میں خوشیوں نے چٹکیاں لیں اور وہ گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ مبارک بادیں دینے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ انہیں مردانے ہی

میں رکنا پڑا۔ اندر سے باہر بار بار بلاوے آرہے تھے بالآخر بہت سے لوگوں کو مردانے میں بیٹھا چھوڑ کر انہیں اندر جانا پڑا۔ نومولود کی خالہ اسے گود میں لیے کھڑی تھیں۔ قاضی صاحب نے ایک نظر بچے کو دیکھا۔ اس کی سلامتی اور صحت کے لیے دعا کی۔ زوجہ قریب ہی بستر پر لیٹی تھیں۔ قاضی صاحب نے بچے کو گود میں لے لیا۔ خاندان کے ایک بزرگ نے بچے کے کان میں اذان دے دی تھی لیکن قاضی صاحب نے دوبارہ اذان دی۔

''اس کا نام ہم نے پہلے ہی سوچ لیا تھا۔ فضل الرحمٰن صدیقی، کہو بیگم یہ نام آپ کو پسند آیا؟''

''بہت اچھا نام ہے، اللہ مبارک کرے۔ بس یہ دعا کرو یہ ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا رہے۔''

''انشاءاللہ۔'' انہوں نے بچے کو ماں کے پہلو میں لٹا دیا۔

سب نے دیکھا کہ انہیں خوشی تو ہوئی ہے لیکن الجھ سے گئے ہیں۔ چہرے پر پریشانی صاف عیاں ہے۔ مردانے میں پہنچ کر ان کی بشاشت پھر لوٹ آئی تھی لیکن جب مہمان رخصت ہوچکے اور وہ مردانے میں اکیلے رہ گئے تو نومولود فضل الرحمٰن کی خالہ ان کے پاس آئیں۔

''بھائی صاحب، میں دیکھ رہی ہوں آپ پریشان ہیں۔''

''میری پریشانی کا سبب تم بھی جانتی ہوگی لیکن شاید کہنا نہیں چاہتیں۔ میں فضل الرحمٰن سے پہلے چھ اولادوں کا داغ دل پر لیے بیٹھا ہوں۔ فضل الرحمٰن میں کچھ ایسی کشش ہے کہ اسے دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے یہ مجھ سے نہ چھن جائے۔ بس یہی دکھ ہے جو میری خوشی کو کم کر رہا ہے۔''

''بھائی صاحب، اللہ کی رضا میں ہم سب کو راضی رہنا ہے پھر بھی ایک بات کہوں؟''

''کہو کیا کہنا ہے۔''

''گاؤں میں ایک ہندو حکیم آیا ہے۔ آپ کہیں تو فضل الرحمٰن کو اسے دکھا دیا جائے۔ میری ایک جاننے والی ان کی بہت تعریف کررہی تھیں۔ علاج کے لیے ہندو مسلمان کیا دیکھنا۔ آپ کہیں تو کسی طرح اسے بلوایا جائے۔''

''بلوالو، دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔''

قاضی سراج کی چھ اولادیں شیرخوارگی میں ہی فوت ہوگئی تھیں۔ بچے پیدائش کے پانچویں دن فوت ہوجاتے تھے۔ یہی خوف تھا جو اس وقت ان کے دامن گیر تھا۔

ایک ہندو حکیم کہیں سے گھومتا پھرتا اس علاقے میں آنکلا تھا۔ اس وقت اسی کی باتیں ہورہی تھیں۔ جوگیوں کا کیا بھروسا کس وقت آگے بڑھ جائیں۔ صبح کا انتظار بھی نہیں کیا گیا۔ رات ہی میں اسے بلوالیا گیا۔

وہ حکیم ایک چوکی پر آکر بیٹھ گیا۔ چند جڑی بوٹیاں اپنے ساتھ لایا تھا جو اس نے ایک طرف رکھ دیں۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ بچے کو اس کے پاس لایا جائے۔

قاضی سراج بچے کو گود میں لے کر اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ حکیم نے بچے پر سے کپڑا ہٹایا۔ کچھ دیر بچے کی طرف دیکھتا رہا پھر بچے کے ہاتھ اور پیٹ کو چھوا، آنکھیں، پاؤں کے تلوے دیکھے اور کہا''اسے لے جاؤ اور ایک پیالی میں اس کی ماں کا دودھ لے کر آؤ۔''

دودھ اس کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اس نے اپنے تھیلے سے کوئی بوٹی نکالی اور دودھ میں ڈال دی۔ چند منٹ بعد اس بوٹی کو پیالی سے نکالا۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر اس بوٹی کو دوبارہ تھیلی میں رکھ دیا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی شیشی تھی جس میں زندہ چیونٹے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے چند چیونٹے دودھ میں ڈال دیے اور پیالی کو دیکھتا رہا۔

''لو اب اس دودھ کو پھینک دو۔'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا پھر قاضی سراج سے مخاطب ہوا۔ ''بچے کی ماں کے دودھ میں نقص ہے۔ اسی وجہ سے بچے زندہ نہیں رہتے۔ اس بچے کو کسی اور عورت کا دودھ پلایا جائے تو بچہ زندہ رہ جائے گا۔''

قاضی سراج کی گاؤں میں بہت عزت کی جاتی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کو جب معلوم ہوا کہ صدیقیوں کے خاندان میں بچے کو دودھ پلانے کے لیے کسی عورت کی تلاش ہے تو جتنی عورتیں شیرخوار بچوں کی مائیں تھیں اور جن کی چھاتیوں میں دودھ تھا وہ بضد ہوئیں کہ فضل الرحمٰن کو وہ دودھ پلائیں گی۔ ہر عورت کا دودھ تو پلایا نہیں جاسکتا تھا لہٰذا ایسے گھروں کا انتخاب کیا گیا جن کے ہاں صفائی کا معیار عمدہ تھا۔ یہ تین عورتیں باری باری آکر فضل الرحمٰن کو دودھ پلانے لگیں۔

فضل الرحمٰن کے خانوادے میں تعلیم وتدریس کی دیرینہ روایت چلی آرہی تھی۔ گھر کے مردوں کا بڑا پیشہ تعلیم وتدریس تھا۔ خواتین بچوں اور بچیوں کو قرآن پاک پڑھاتیں۔ اس خاندان پر تحریک آزادی کے اثرات بھی تھے اور آباواجداد کے علمی ودینی کارنامے بھی خاندان بھر میں کہانیوں کی طرح گردش میں تھے۔

فضل الرحمٰن جب ذرا بڑا ہوا اور باتوں کو سمجھنے کے لائق ہوا تو قاضی سراج اکثر اسے اپنے پہلو میں لٹا کر اپنے بزرگوں کے قصے سنایا کرتے۔

''محمد بن قاسم ایک زبردست مجاہد تھا۔ وہ بغداد سے آیا اور صرف سترہ سال کی عمر میں اس نے سندھ فتح کرلیا۔ سندھ فتح ہوتے ہی دین حق کی تبلیغ کے لیے مسلمانوں کے قافلے حدودِ عرب سے نکل کر سندھ پہنچنے لگے۔ ہمارا خاندان بھی بصرہ سے سندھ آیا۔ اس خاندان کے کچھ لوگ گجرات کاٹھیاواڑ کی طرف ہجرت کرگئے۔ بعد میں پھیلنے اور بکھرنے کا عمل شروع ہوا تو کچھ لوگ شمالی پنجاب تک پہنچے۔

عرب سے ہندوستان آنے والوں میں تین طرح کے لوگ تھے۔ اوّل وہ لوگ جو تجارت کی غرض سے آئے اور یہیں بس گئے۔ دوسرے وہ لوگ جو سپاہی پیشہ تھے، مسلم سپاہ میں شامل ہوکر آئے۔ تیسرے گروہ کا تعلق ایسے اہلِ علم سے تھا جو تدریسی فرائض انجام دینے، عدالتوں میں مختلف مناصب پر کام کرنے آئے۔ بیٹا ہمارے خاندان کا تعلق اسی تیسرے گروہ سے تھا۔ مختلف اوقات میں ہمارے خاندان کے مختلف افراد قضا، مدرسی اور خطابت وغیرہ کے مناصب پر مامور رہے۔

مسلم سلاطین کے عہد میں عدالتی کارروائی اور دیگر معاملات کے فیصلے قرآن وسنت کے مطابق کرنے کے لیے جس علم کی ضرورت تھی وہ اس دور میں اہلِ عرب کو حاصل تھا۔ ہمارے خاندان کے لوگوں کو قاضی کا لقب یہیں سے ملا۔ میرے بزرگوں میں سے کوئی صاحب خان پور میں آکر آباد ہوئے۔ ہمارے خاندان کے کچھ دیگر لوگ بھی یہاں آکر آباد ہوئے۔

ہمارے خاندان کی سب سے نامور شخصیت مجذوب درویش شاہ مراد گزرے ہیں۔ وہ اپنے عہد کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ ہم لوگ ان کی ساتویں پشت سے ہیں۔

ہمارے خاندان کی علمی روایات ان بزرگوں کی ہی دین ہے۔ آج بھی ہمارے خاندان میں اہلِ علم کی کمی نہیں۔ مولوی عبدالعزیز ہی کو دیکھ لو۔ تم نے تو انہیں دیکھا ہے۔ شعلہ بیاں مقرر اور مناظر ہیں۔ تمہارے چچا ابن یمین بھی نہایت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ تمہارے خالو محمد کامل بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔''

''میں بھی بہت سی کتابیں لکھوں گا۔'' فضل الرحمٰن بیچ میں بول پڑا۔

''اسی لیے تو ان بزرگوں کے قصے تمہیں سنا رہا ہوں تاکہ تم بھی ان جیسے بننے کی کوشش کرو۔ اچھا اب سوجاؤ باقی باتیں کل ہوں گی۔ تمہیں بھی اسکول جانا ہے اور مجھے بھی۔''

خان پور ضلع جہلم کا ایک گاؤں تھا جو چکوال سے بیس کلومیٹر مشرق میں واقع تھا۔ اب آبادی کے بڑھ جانے کی وجہ سے یہ ایک قصبہ بن چکا تھا جو اب ضلع چکوال میں شامل ہے۔

اسے کیا معلوم تھا کہ ان قصوں میں ایک قصہ اور شامل ہونے والا ہے۔ وہ ابھی پرائمری کلاسوں میں تھا کہ گاؤں میں طاعون پھیل گیا۔ موت کا فرشتہ ہر رات ایک دروازے پر دستک دیتا اور صبح اس گھر سے جنازہ اٹھتا۔ اس کا معصوم ذہن سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ کیا ہورہا ہے پھر ایک دن اس نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا۔ اس کے دروازے پر دستک ہوئی ہے۔ اس کی ماں دروازے پر گئی ہے۔ کسی نے ان کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ وہ صحن میں کھڑا روتا رہ گیا۔

صبح کو اٹھ کر یہ خواب اس نے اپنی ماں کو سنایا۔ ماں نے کہا۔ ''بیٹا جب ایسا خواب دیکھا کرو تو لاحول پڑھ لیا کرو۔ یہ شیطان ہے جو ایسے ڈراؤنے خواب دکھاتا ہے تاکہ بچے ڈر جائیں۔''

اس نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی اور کھیل میں لگ گیا۔ ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ اس کی والدہ کا بدن بخار میں جلنے لگا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو اسے محض بخار سمجھا جاتا لیکن گاؤں میں طاعون پھیلا ہوا تھا۔ طاعون میں مبتلا شخص کو پہلے بخار ہی چڑھتا تھا۔ قسمت ہوئی تو بچ گیا ورنہ......

قاضی سراج کی جان میں جان آئی کہ رات گزر گئی۔ خطرہ ٹل گیا بخار میں بھی کچھ کمی آگئی تھی لیکن دوپہر کے بعد بخار میں پھر تیزی آگئی اور شام ہوتے ہوتے مریضہ نے دم توڑ دیا۔

صدیقیوں کے خاندان میں چھ سات موتیں پہلے ہی ہوچکی تھیں۔ ایک جنازہ قاضی سراج کے گھر سے بھی اٹھا۔ فضل الرحمٰن کو اپنا خواب یاد آگیا۔ اس کی ماں کا جنازہ اٹھا تو وہ صحن میں کھڑا رو رہا تھا۔ خواب سچ ثابت ہوگیا۔

وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ قاضی سراج نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے دو بیٹیاں تھیں۔ اس کے مرنے کے بعد دوسری شادی کرلی تھی۔ چھ اولادوں کے مرنے کے بعد فضل الرحمٰن ہی زندہ بچا تھا۔ اس کی ماں اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے بڑا ہونے کی خوشی بھی نہ دیکھ سکی۔
طاعون کی وبا تو ختم ہو گئی لیکن اس کی ماں اب واپس نہیں آسکتی تھی۔ بن ماں کا بچہ تھا۔ اس کی کم سنی پر سب کو پیار آتا تھا۔ خاندان بھر میں سب کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہو گئیں۔ خالہ، بہنوئی، بہن، ماموں سب اس کی ناز برداریاں کرتے۔ سب اسے بہلاتے رہتے کہ اسے ماں کی یاد نہ آئے۔ اس بے جا لاڈ پیار نے اس میں کچھ بگاڑ کی صورتیں بھی پیدا کر دیں۔ بے جا ضدیں ہر چیز پر مچل جانا، پڑھنے لکھنے سے جی چرانا اس کی عادت سی بن گئی۔ اس سے اس کی ماں چھن گئی تھی۔ اس صدمے نے اسے زود حس بنا دیا۔ ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جانا اس کا معمول بن گیا تھا۔ طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا۔ اس کی نفسیاتی حالت سے یوں لگتا تھا جیسے وہ ماں کے چھن جانے کا انتقام لے رہا ہو۔
اس کی اس حساسیت نے ایک مثبت اثر یہ مرتب کیا۔ اس نے اپنے دل کی باتیں کہنے کے لیے تک بندی شروع کر دی۔ اپنی دانست میں شعر کہتا اور پھاڑ کر پھینکتا رہا۔
اس کے خاندان میں شعری روایات پہلے سے موجود تھیں۔ مجذوب شاہ مراد اسی کے خاندان کے صاحب دیوان شاعر تھے۔ اس کے والد بھی شعر کہتے تھے۔ گھر کی خواتین تک شبلی، حالی اور اقبال وغیرہ کی نظمیں اپنی مجالس میں بے تکلفانہ پڑھتی تھیں۔ یہ نغمے اس کے کانوں میں گونجتے رہے تھے۔ قدرت سے طبع موزوں ملی تھی، ذہانت فطری تھی چنانچہ شعر کہنے لگے۔

تجھے بتاؤں میں کیا اپنا عالمِ احساس
کہ جیسے کوئی اکیلا درختِ صحرائی

☆☆

بہت سے چاہنے والے تھے ساتھ چھوڑ گئے
نہ پوچھ ان سے بچھڑ کے جیا تو کیسے جیا

☆☆

دریا کے موتیوں کا بگاڑے گی موج کیا
کتنی ہی تند حرکت طوفاں ہوا کرے

وہ ساتویں کلاس میں تھا تو اسکول میں ایک شعری مقابلہ ہوا۔ اس نے بھی اس مقابلے میں شامل ہونے کے لیے ایک نظم کام سے پہلے خدا کا نام لو کہی۔
ایک بڑے عوامی مجمع میں یہ تخلیقات پڑھ کر سنائی گئیں۔ اس کی نظم اس کے ایک ہندو استاد نے پڑھ کر سنائی۔ مجمع میں مقامی تھانے دار صاحب بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی جیب سے اسے پانچ روپے انعام دیے۔
یہ اس کی شاعری کا پہلا نمایاں سنگِ میل تھا۔ اب اسے یقین آ گیا کہ وہ شاعری کر سکتا ہے۔ اسے شاعری کرنی ہے تو کوئی تخلص بھی رکھا جائے۔ نہ جانے کیسے اس کے ذہن میں نعیم تخلص آیا اور وہ فضل الرحمٰن سے نعیم صدیقی ہو گیا اور پھر پوری زندگی اسی نام کے ساتھ بسر کی۔
شاعری کا شوق ہوا تو مطالعے کی بھی فکر ہوئی۔ اخبارات اور متعدد رسائل گھر میں آتے تھے۔ کچھ ادبی رسائل گاؤں کے اسکول میں آتے تھے۔ ان میں نیرنگ خیال، ہمایوں، ادبی دنیا، نگار جیسے معیاری پرچے شامل تھے۔ اسکول کی لائبریری میں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود تھا۔ یہ کتابیں بھی زیرِ مطالعہ رہنے لگیں۔ اس مطالعے کے طفیل بڑے بڑے شعرا کا کلام ازبر ہو گیا۔ انہی چراغوں سے وہ اپنے چراغ جلانے لگا۔
اس اسکول کا معیار بہت مثالی تھا۔ اس کے والد اسی اسکول میں پڑھاتے تھے اس لیے اسے بہت سی سہولتیں حاصل تھیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پڑھنے کے لیے لائبریری سے کتابیں مل جاتی تھیں۔ یہاں رہ کر اس کی صلاحیتوں کو جِلا ملی۔
خان پور کا یہ مڈل اسکول اپ گریڈ نہیں ہوا تھا۔ جب اس نے مڈل پاس کر لیا تو مزید تعلیم کے لیے ہائی اسکول میں داخلہ لینا تھا۔ اسے کلر سیداں میں نویں جماعت میں داخلہ لینا پڑا۔
اس کا بھانجا گورنمنٹ ہائی اسکول کلر سیداں میں پڑھتا تھا۔ اس نے بھی کلر سیداں میں نویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ یہ دور اس کی شاعری کے جنون کا دور تھا۔ ہر وقت مشقِ سخن میں ڈوبا رہتا۔
یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں تحریک آزادی کی لہریں اٹھ رہی تھیں خصوصاً پنجاب میں احرار نے عوامی سطح پر بڑا تحرک پیدا کر رکھا تھا۔ جگہ جگہ عوامی جلسے ہوتے تھے۔ وہ نوجوانی کے جوش میں گھنٹوں کا سفر کر کے قصبات میں پہنچتا اور مقررین کی تقریریں سنتا جو یقیناً انگریزوں کے خلاف ہوتیں۔ زمیندار اخبار گھر میں آتا تھا اس میں بھی انگریزوں کے خلاف تقریریں شائع ہوتی تھیں۔ مولانا ظفر علی کی باغیانہ نظمیں بھی وہ بڑے اشتیاق سے سنتا تھا۔
تحریک آزادی کا یہ ماحول اسکولوں کی فضا کو بھی متاثر

کر رہا تھا۔ اس کے اسکول میں بھی ایک استاد تھے جو کلاس کو جلسہ گاہ بنا دیا کرتے تھے اور بچوں پر جو اثرات ہوتے سو ہوتے نعیم صدیقی یہ سوچنے لگا کہ جب انگریز کی نوکری حرام ہے تو یہ اسکول بھی تو حکومت کا ہے اور حکومت انگریزوں کی ہے۔ یہاں کیوں پڑھا جائے، پھر یہ بھی کہ جب انگریز کی نوکری کرنی ہی نہیں تو تعلیم کیوں جاری رکھی جائے۔ گھر کے لاڈ پیار نے اسے ویسے ہی تساہل پسند بنا دیا تھا۔ انگریز دشمنی سونے پر سہاگا بن گئی۔ اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا۔ والد نے اس کے لیے کیا کیا خواب دیکھ رکھے تھے سب زمین بوس ہو گئے۔ یہاں بھی ان کی نرمی اور بیٹے سے بے پناہ محبت سامنے آئی۔ انہوں نے اس سے زبردستی نہیں کی، سمجھانے کی حد تک سمجھایا پھر ہاتھ کھینچ لیا۔
اسکول چھوڑنے کے بعد سب نے دیکھا کہ اسے اسکول سے اور نصابی کتب سے نفرت ہوئی ہے حصول علم سے نہیں۔ کلر سیداں سے واپس آتے ہی ذوقِ مطالعہ نے وہ صورت اختیار کی کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہی سب پڑھنے کے لیے اسکول چھوڑا ہے۔ دن دیکھا نہ رات نہ صحت کی پروا کی۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں رہنے لگی۔ اس طرح مطالعہ کرنے لگا جیسے کوئی امتحان پاس کرنے کی تگ و دو ہے یا کسی مقابلے میں شریک ہونے والا ہے۔ شعر و ادب، تاریخ، اسلامیات، الحادی نظریات، انگریزی زبان کی اخباری اور کتابی تحریریں، فارسی کتب کا مطالعہ، غرض کیا کچھ نہ تھا جو پڑھ نہ ڈالا ہو۔
دوستوں کے کہنے پر منشی فاضل کر لیا۔ فارسی تو پہلے ہی اچھی طرح سیکھ لی تھی اب عربی اور انگریزی بھی پڑھنے لگا۔ عربی کا دریا گھر ہی میں بہہ رہا تھا وہ اس کے کنارے جا بیٹھا۔ والد نے اسے عربی پڑھائی۔
شبلی، حالی اور اکبر کی شاعری کے ساتھ ساتھ اقبال کی نظموں کا اثر بہت گہرا ہوا اور پڑھتے پڑھتے ایک وقت ایسا آیا کہ اقبال چاروں طرف سے اس کے ذہن کو محیط ہو گیا۔ بانگِ درا، ضرب کلیم، بالِ جبریل، پیام مشرق، زبور عجم اور جاوید نامہ کے بیشتر حصے ازبر ہو گئے۔ وہ کلام اقبال کی تقلید میں شعر کہنے لگا۔

وہ قوم اثر لے نہ سکی خون و رجز سے
جس قوم کو مرغوب ہوا نغمہ و بادہ
شوخی بھی، تغافل بھی توجہ بھی حیا بھی
اک راز بنی جاتی ہے ہر دخترِ سادہ

سوانحی خاکہ

نام...... فضل الرحمٰن صدیقی
تخلص...... نعیم صدیقی
پیدائش...... خان پور، ضلع چکوال
سن پیدائش...... 5 جون 1916ء
سن وفات...... 25 ستمبر 2002ء

..........☆..........☆..........

مدیر

چراغ راہ، 1956ء...... 1948ء
ہفت روزہ ایشیا، 1958ء...... 1957ء
ہفت روزہ شہاب، 1960ء
ماہ نامہ سیارہ، 1996ء...... 1962ء
ماہ نامہ ترجمان القرآن، 1991ء...... 1977ء

..........☆..........☆..........

شعری مجموعے

شعلہ خیال، خون آہنگ، پھر اک کارواں لٹا، بارود اور ایمان، وہ سورج بن کر ابھرے گا، نور کی ندیاں رواں، شعاع جمال، اذان دعوت حق، ایک ویران وادی میں پہلا قافلہ، عورت کا خزینہ، ملت کا اسلحہ خانہ، نور کی ندیاں رواں۔

..........☆..........☆..........

تصانیف

ذہنی زلزلے (افسانے)، ٹھنڈی آگ (افسانے) تنقیدات، اسلامی سیاست، ملت کا اسلحہ خانہ، ابلیس کا روزنامچہ، قومی ملکیت اسلامی نقطۂ نظر سے، اسلام اور قومی ملکیت، تعمیر و تخریب، معروف و منکر، دفتر بے معنی، فکر و نظر، اپنی اصلاح آپ، وقت کا تقاضا، بیمۂ زندگی، مولانا مودودی ایک تعارف، تعمیر سیرت کے لوازم، اقبال مغربی مادیت اور سوشلزم، سرخ جنت کو سلام، نیکی کے سپاہی، پھول اور ستارے، عشق رسولؐ کے حقیقی تقاضے، سید انسانیت، رسولؐ اور سنت رسول، محسن انسانیت، اقبال کا شعلہ نوا، سیاسی آزادی اور تہذیبی آزادی، اقبال اور نظریۂ پاکستان، معرکۂ دین و سیاست۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆☆

ہوا میری خودی کے امتحاں کا اہتمام آخر
ملے گا خود شناسائی کا گم کردہ مقام آخر

☆☆

دنیا جسے کہتی تھی کبھی تیغ الٰہی
گردن جو جھکاتا تھا فقط پیش الٰہی
وہ مرد ہے کسریٰ کے شبستاں کا نگہباں
وہ مرد ہے فرعون کے لشکر کا سپاہی
عزت تری بکتی ہے سرِراہ گزر دیکھ
ہاں ایک نظر دیکھ ادھر دیکھ ادھر دیکھ

اس نے اپنی شاعری کا معیار جانچنے کے لیے اپنی تخلیقات کلیم، ادب لطیف، نگار اور تاج کو بھجوائیں جو شائع ہوگئیں۔ اس کی تشفی پھر بھی نہیں ہوئی۔ شاید اسے احساس تھا کہ اس کی نظموں میں اس کا اپنا رنگ نمایاں نہیں۔ یہ اقبال کی تقلید کے محض بہترین نمونے ہیں۔ وہ ان نظموں پر کسی ماہرِ فن کی رائے کا خواہاں تھا۔ اس نے کئی سو اشعار کا ایک مجموعہ مولوی عبدالحق کی خدمت میں بھیجا اور ان کی رائے طلب کی۔ عبدالحق نے نہایت مناسب جواب اسے ارسال کیا۔

"اس میں تقلید اقبال کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ اقبال کے بعد اب ایسی کسی چیز کو قبول کا راستہ نہ مل سکے گا۔" دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اگر قبولیت عام کا درجہ حاصل کرنا ہے تو انفرادیت پیدا کرو۔ بھیڑ میں وہی شخص پہچانا جاتا ہے جو دوسروں سے الگ ہو۔ اصل اصل ہوتی ہے نقل نقل رہتی ہے۔

اس نے اس رائے سے اتفاق کیا اور اپنے رنگ شاعری کو بدلنے کی فکر میں لگ گیا۔ اس نے حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، جگر اور اصغر جیسے شعرا کا مطالعہ کیا۔ کلاسیکل شعرا میں میرو غالب کو پیش نظر رکھا۔ جوش کی انقلابی شاعری سے بھی وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ان شعرا کے اثر سے وہ نظموں کے ساتھ ساتھ غزلوں کی طرف بھی راغب ہوا لیکن اپنے خاص نظریات کی بدولت وہ محض رومان تک محدود نہیں رہا۔ یوں بھی اس عہد تک آتے آتے غزل نگاروں نے غم جاناں سے غم دوراں تک کا راستہ طے کرلیا تھا۔ اس کی غزلیں بھی محض رومان کا کھیل نہیں۔

نئے خیالوں کے چمن کے تنکے نئے نشیمن سجا رہا ہوں
پرانی تعمیر ڈھے رہی ہے نئی بنیادیں اٹھا رہا ہوں
خمیر الہام سے اٹھایا پھر اس کو ایماں کی چاشنی دی
خیال میں ہے کوئی ہیولا وجود میں جس کو لا رہا ہوں
نہیں یہ روماں کا کھیل کوئی یہ اِک فریضہ ہے سخت بھاری
ترس گیا ہے جسے زمانہ وہ آدمِ نو بنا رہا ہوں

☆☆

شب مے خانے کی محفل میں ارباب وفا کا ذکر چلا
چپ سنتے رہے، ہم ڈرتے تھے تیرا بھی نہ ان میں نام آئے

☆☆

اس دوران مطالعہ بھی جاری رہا۔ طبیعت فلسفہ کی طرف متوجہ ہوئی تو فلسفے کی سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان کتابوں نے اس کے دل میں مذہب کی طرف سے بغاوت پیدا کردی۔ کچھ سیاسی، مذہبی اور معاشی حالات ایسے رہے کہ وہ آزادخیالی سے آگے بڑھ کر مذہب کا باغی ہوگیا۔ اب وہ مذہب کا مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتا۔ مذہب کے نظریات پر مذہبی آدمیوں سے بحثیں کرتا پھرتا۔ لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھتے کہ کس دینی گھرانے کا فرد ظلمت کی کن وادیوں میں اتر گیا ہے لیکن اس کی یہ بحثیں محض جذباتی بیانات نہیں تھیں۔ ان کے پیچھے اس کا بے پناہ مطالعہ تھا۔ اس کے دلائل سے لوگ لاجواب بھی ہوجاتے تھے۔ اس کی ان کامیابیوں نے اس کا حوصلہ اتنا بڑھا دیا کہ وہ اس قسم کی بحثیں اپنے والد سے بھی کرنے لگا۔ والد اس سے محبت بھی کرتے تھے اور اس کی ذہنی ساخت اور مزاج سے بھی واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس کے مزاج میں ضد ہے۔ اگر اسے روکا گیا تو وہ اس راہ پر اور آگے بڑھ جائے گا۔ انہوں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ کسی دوست کی طرح افہام وتفہیم کا راستہ اختیار کیا۔ کچھ دلائل اس کے تسلیم کیے کچھ اپنے منوائے۔ بحث ومباحث کا یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔

اس کی آزادخیالی نے اسے مصوری کی طرف راغب کردیا حالانکہ اس کے گھرانے میں اس شوق کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن وہ رنگوں اور برش سے کھیلنے لگا۔ کسی رہنما کے بغیر مصوری کی کوششیں شروع کردیں۔ یہ شوق بھی غالباً شاعری کی طرح خداداد تھا۔ جس طرح شاعری میں اس کی استاد اس کی طبع سلامت تھی۔ اسی طرح بیل بوٹے اور خاکے بنانے میں اس نے کسی کی رہنمائی حاصل نہیں کی۔ وہ موسیقی بھی سیکھنا چاہتا تھا لیکن یہاں اس کا ماحول مانع

آگیا۔

جب والد نے اس کی آزادروی کو روکنا چاہا تو انہوں نے بہتر سمجھا کہ اس کی شادی کردی جائے۔ انہوں نے اس کی خالہ سے بات کی۔

"خالی دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ فضل الرحمٰن شاعری کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہا ہے۔ الٹی سیدھی کتابوں نے اس کا دماغ خراب کردیا ہے۔ اب مصوری کر رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کی شادی کردی جائے۔ ذمے داریاں پڑیں گی تو خود بخود سیدھی راہ پر چل پڑے گا۔"

خالہ نے بھی ان سے اتفاق کیا۔ اب سوال یہ تھا کہ شادی کہاں کی جائے۔ ان کی نظر اپنے ایک قریبی رشتے دار محمد حسین کی طرف گئی۔ ان کی لڑکی نعیم صدیقی کے لیے نہایت مناسب تھی۔ وہاں رشتہ بھیجا گیا۔

شادی کے بعد اسے روزگار کی فکر ہوئی۔ گاؤں کا دستور تھا کہ جو نوجوان کم تعلیم یافتہ ہوتے تھے وہ فوج میں چلے جاتے اور جو معقول حد تک تعلیم یافتہ ہوتے وہ تدریس کا پیشہ اختیار کرلیتے۔ اس کے ایک رشتے دار نے اسے بے روزگار دیکھ کر فوج میں کلرک بھرتی کروانے کے لیے فارم بھجوادیے۔ اس کے والد کو علم ہوا تو انہوں نے مخالفت کی۔

"میں تمہارے فوج میں جانے کا مخالف ہوں۔ تمہیں تدریس کا آبائی پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ تم کہو تو میں تمہارے لیے کوشش کروں۔"

"مجھے تو ملازمت سے غرض ہے ہرچند کے ملازمت کے جھنجٹ میرے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے۔"

"تدریس کا پیشہ یقیناً تمہارے مزاج کے مطابق ہوگا۔ اس میں آدمی پڑھتا بھی ہے پڑھاتا بھی ہے۔"

قاضی سراج گورنمنٹ اسکول خان پور میں پڑھاتے رہے تھے۔ انہوں نے اس اسکول میں اس کی ملازمت کا بندوبست کردیا۔ سرکاری ملازمت کا وہ قائل نہیں تھا لیکن مجبوری تھی۔ پڑھاتا رہا، دن کاٹتا رہا پھر اس کا تبادلہ ایک دوسرے اسکول میں کردیا گیا۔ یہاں کا ہیڈ ماسٹر ایک سکھ تھا جس سے اس کی بن نہ سکی۔ اس نے تنگ آکر ملازمت چھوڑ دی۔

اسے ملازمت کی ضرورت تھی لیکن ملازمت اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھی۔ وہ خان پور ہی میں برتنوں کی دکان کھول کر بیٹھ گیا۔

مطالعہ اس دور میں جاری رہا۔ حقّہ نوشی کی عادت

تالیفات

افشاں (منظومات) سیرت سرور دو عالمؐ، یہودیت و نصرانیت۔

اقتباس

حضورؐ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپ کی دعوت نے پورے کے پورے اجتماعی انسان کو اندر سے بدل دیا اور صبغۃ اللہ کا ایک ہی رنگ مسجد سے لے کر بازار تک، مدرسہ سے عدالت تک اور گھروں سے لے کر میدان جنگ تک چھا گیا۔ ذہن بدل گئے، خیالات کی دنیا بدل گئی، نگاہ کا زاویہ بدل گیا۔ خیروشر کے معیارات اور حلال و حرام کے پیمانے بدل گئے۔ جنگ وصلح کے اسالیب بدل گئے۔ تمدن کے ایک ایک ادارے اور ایک ایک شعبے کی کایا پلٹ گئی۔

(محسنِ انسانیت)

اقتباس

میرا تاثر یہ ہے کہ ہماری شاعری میں جن وجوہ سے فنی جمال پیدا ہوتا ہے وہ ان ترجموں میں کام نہیں کرسکتے۔ شاعری میں مبالغہ ہوتا ہے۔ ہماری شاعری میں محاسن پیدا کرنے کے لیے کچھ خاص طریقے ہیں جن کی وجہ سے تضاد میں بھی حسن پیدا ہوجاتا ہے۔ الفاظ کی بڑی مرصع کاریاں اور تخیل کی بلند پروازیاں ہوتی ہیں۔ کبھی رومانی پرتو ڈالا جاتا ہے، کبھی خیالی اصنام تراشے جاتے ہیں۔ جلال وجمال سے بھری ہوئی تحریر کیسے ترجے میں منتقل کی جاسکتی ہے۔

خراج

شعروادب وصحافت اور دنیائے تصنیف وتالیف کی ایک قدآور شخصیت جناب نعیم صدیقی 86 برس کی عمر میں 24 اور 25 ستمبر 2002ء کی درمیانی رات طلوع فجر سے قبل خالقِ حقیقی سے جاملے۔ وہ ممتاز اہلِ قلم میں سے تھے جن کے رشحات قلم سے فیض پاکر کئی نسلیں گہرے اثرات قبول کرتی ہیں اور ایسے لوگ یقیناً قوموں کا سرمایہ ہوتے ہیں۔

(حفیظ الرحمٰن احسن)

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑ گئی تھی۔ دکان پر بھی یہ عالم رہتا کہ ایک طرف حقہ رکھا ہے، ہاتھ میں کتاب ہے صفحہ در صفحہ پڑھتے ہوئے حقّے سے دل بہلانے کا شغل جاری ہے۔ ان دنوں طبیعت پر فلسفے کا زور تھا۔

ایک دن وہ دکان پر آتے ہوئے اپنے ساتھ پرانے رسائل لیتا آیا کہ دکان پر بیٹھے بیٹھے ان کی ورق گردانی کرتا رہے گا۔ ان میں شامل مضامین اس نے پڑھ ضرور لیے تھے لیکن چند سنجیدہ مقالوں کو چھوڑ بھی دیا تھا۔ اس نے انہیں پڑھنا شروع کیا تو اندازہ ہوا کہ اصل پڑھنے کا میدان تو یہ تھا۔ اس ٹھوس مطالعے نے اس کے اندر زندگی کے مسائل پر فلسفیانہ انداز میں سوچنے کی عادت ڈالی۔

اب تک شاعری اس کا میدان تھا۔ ان مضامین کے مطالعے کے بعد وہ خود بھی ٹھوس مضامین لکھنے لگا۔

ان رسائل کی الٹ پھیر میں ایک رسالہ پیغام حق اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس رسالے میں سید مودودی کا ایک مضمون پڑھنے کو ملا۔ خود بھی بار بار پڑھا اور والد صاحب کو بھی پڑھ کر سنایا۔ وہ سید مودودی کی قوتِ استدلال اور انداز بیان سے بے حد متاثر ہوا۔ محض اس ایک مضمون سے اس کی ذہنی کشمکش ختم ہو گئی۔ وہ مسلم قومیت کی روح کو پا گیا۔ رفتہ رفتہ الحاد کا وہ راستہ اسے تاریک نظر آنے لگا جس پر انجانے میں وہ چل پڑا تھا۔ شعوری اسلام کی صبح اس کی روح کے عالمِ ظلمات سے طلوع ہونے لگی۔

اس خوش گوار حادثے نے اس کی زندگی کے رخ کو موڑ دیا۔ اسے ایک جنت مل گئی۔ اب وہ یہ سوچنے لگا کہ جب میں مسلمان ہوں تو میرے قلم کو بھی مسلمان ہونا چاہیے۔

اس نے اپنے ادبی سفر کو آگے بڑھانے کے لیے راستے کا انتخاب کرنا چاہا تو اس کی نظر اپنے دور کی ادبی تحاریر پر گئی۔ عصری ادبی اشخاص کی کاوشوں کا مطالعہ کیا۔ اس میں اسے ترقی پسند ادیبوں کی تحریک کا تعارف ہوا۔ ترقی پسند تحریروں کو پڑھتے ہوئے اسے لطف تو بہت آیا لیکن اسے یوں لگا جیسے خوب صورت پیرایوں میں یہ ہمارے تہذیبی وجود پر ایک قسم کا حملہ ہے۔ اس حملے سے اسے بچنا ہے۔ اس انداز سے کام کرنا ہے کہ پیرایۂ اسلوب بھی جدید اور خوب صورت ہو اور مقصد بھی صحیح ہو۔ اس کے بعد سے آخری دم تک وہ ترقی پسند خیالات پر مسلسل تنقید کرتا رہا۔

1932ء میں احمد علی کے مرتبہ مجموعے ''انگارے'' نے اردو افسانے کے لیے نئی راہیں متعین کر دیں لیکن اس کے ساتھ ہی مذہبی و سماجی اقدار پر طنز بھی کیا۔ ایک طرح سے یہ افسانے ترقی پسند رجحان کا اعلامیہ تھے۔

اس تحریک سے وابستہ ادیبوں کی بے باکیاں اور مذہبی اقدار سے نفرت نے ردعمل بھی پیدا کیا۔ نعیم صدیقی نے افسانے کبھی نہیں لکھے تھے لیکن افسانے کی صنف مقبول ہوتی جا رہی تھی۔ نعیم صدیقی کو ترقی پسند تحریک کے اندازِ فکر سے اختلاف تھا۔ یہ اس کے اسلامی نظریۂ ادب سے متصادم تھا لہٰذا ترقی پسند تحریک کے ردعمل میں اس نے افسانہ نویسی شروع کر دی۔ بعد میں یہ افسانے مختلف رسائل کی زینت بنے اور پھر 1940ء میں اس کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ذہنی زلزلے'' اور پھر ٹھنڈی آگ شائع ہوا۔

نعیم صدیقی فطری افسانہ نگار نہیں تھا۔ اس کے چند ایک افسانے ہی معیاری کہے جا سکتے ہیں لیکن اس نے اپنے مقصد کو پا لیا۔ ترقی پسند تحریک نے جب اشتراکیت کو ادبی نصب العین بنایا تو اس کا ردعمل ہوا اور وہ لوگ جو اسلامی افکار و نظریات کے حامی تھے انہوں نے تحریک اسلامی کی بنیاد رکھ دی۔ ان میں سب سے فعال اور نمایاں نام نعیم صدیقی کا تھا۔

اشتراکیت کے ردعمل سے اس کی شاعری بھی متاثر ہوئی۔ اس کے نظریات نظموں اور غزلوں میں جھلکنے لگے۔ وہ نعت گوئی کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ صنف اردو کے فروغ کے ساتھ ہی وجود میں آ گئی تھی۔ امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعتیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ اقبال کا نعتیہ کلام بھی نعیم صدیقی کے پیش نظر تھا۔ ظفر علی خاں کی نعتیں بھی وہ پڑھتا رہا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر نعت گوئی کا آغاز کر دیا کہ وہ لادینیت کے خلاف خدا پرستی کے محاذ کو مضبوط کر رہا ہے۔ اس لیے اس کی نعتیں ایک خاص مقصد کی ترجمانی کرنے لگیں۔ بقول اس کے اس کی نعت گوئی کے تین مقاصد تھے۔ حضورؐ کی دعوت انقلاب کو ابھارنا۔ اس انقلاب کی روح کو کارفرما کرنے کے لیے نعت کے پیرایوں میں نئے اضافی تجربے کرنا اور فنی و لسانی حسن کی لطافتوں کا تحفظ کرنا۔

ہے مضطرب سی تمنا کہ ایک نعت لکھوں
میں اپنے زخموں کے گلشن سے تازہ پھول چنوں
پھر ان پر شبنم اشکِ سحر گہی چھڑکوں
پھر ان کی لڑیاں پرو کر تمہاری نذر کروں
میں ایک نعت کہوں سوچتا ہوں کیسے لکھوں

☆☆

بن باپ کے عاجز بچے جب افلاس کے گھر میں پلتے ہیں
اور ان کے فسردہ چہرے جب اس پیٹ کی آگ میں جلتے ہیں
کچھ جھوٹی امیدوں سے ان کو جب بیوہ ماں بہلاتی ہے
ایسے میں تڑپتا ہے یہ دل ایسے میں تری یاد آتی ہے

☆☆

وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے ساتھ ساتھ مطالعہ جاری رکھے ہوئے تھا۔ پیغام حق کے پرچے برابر آ رہے تھے۔ ان میں مولانا مودودی کے مضامین بھی نظر سے گزرتے تھے۔ وہ ان کا غائبانہ معتقد ہوتا چلا گیا۔ ایک مضمون ایسا نظر سے گزرا جس میں انہوں نے دارالاسلام جیسی آبادی کے قیام کی تجویز دی تھی۔

دارالاسلام پٹھان کوٹ کے قریب ایک وقف ادارہ تھا۔ اس کے لیے زمین اور دیگر سہولیات ایک صاحب دل چوہدری نیاز علی نے مہیا کیں۔ انہوں نے علامہ اقبال اور کئی دیگر علما سے مشورے کے بعد یہ جگہ جدید خطوط پر اسلامی تعلیمات کے لیے وقف کی تھی۔ علامہ اقبال کی تجویز پر سید مودودی کو کہا گیا کہ وہ اس وقف ادارے کے انتظامات سنبھالیں چنانچہ مولانا مودودی حیدرآباد دکن سے یہاں اٹھ آئے۔

نعیم صدیقی کے دل میں علامہ اقبال سے ملاقات خواہش کروٹیں لے رہی تھی۔ علامہ اقبال کی محبت اسکول کے زمانے ہی سے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ اب اس خواہش کو پورا کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ ہفتہ بھر کا پروگرام بنا کر لاہور آ گیا۔ مدعا یہی تھا کہ اقبال سے ملاقات کی جائے۔ یہ ملاقات ہوئی ضرور لیکن اس وقت جب علامہ بستر علالت پر تھے۔ یہ ملاقات آخری ملاقات ثابت ہوئی کیونکہ چند ہفتے بعد علامہ سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔

اس کا قیام لاہور میں سید محمد شاہ مدیر پیغام حق کے گھر پر تھا۔ اس قیام میں مولانا مودودی کی فکر و نظر کے بارے میں گفتگو ہوتی رہتی تھی۔

''میری دو حسرتیں تھیں۔'' ایک روز نعیم صدیقی نے سید محمد شاہ سے کہا۔ ''ایک خواہش یہ تھی کہ علامہ اقبال سے ملاقات نصیب ہو دوسری تمنا یہ تھی کہ مولانا مودودی کی رفاقت نصیب ہو۔ ایک آرزو تو پوری ہو گئی۔ علامہ کی زیارت سے فیضیاب ہو چکا اب ایک خواہش ہے کہ کسی طرح مولانا سے ملاقات ہو جائے۔''

''ایسا لگتا ہے تمہاری یہ خواہش پوری ہونے والی ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''ترجمان القرآن میں منیجر کی اسامی خالی ہے۔ تم اس اسامی کے لیے درخواست دے دو۔ مجھے یقین ہے تمہارے کوائف اس اسامی کے لیے پورے اتریں گے اور دارالاسلام میں مستقل ٹھکانا مل سکے گا۔ مولانا سے ملاقاتیں بھی رہیں گی۔''

اس نے درخواست دے دی جو منظور بھی ہو گئی۔ معقول تنخواہ تھی، شرائط بھی طے ہو گئیں لیکن فوری طور پر دارالاسلام نہیں جا سکتا تھا۔ بیوی خان پور میں تھیں اس کے علاوہ دکان تھی۔ قرضوں کی وصولیابی تھی۔ اس نے دو ماہ کی مہلت لے لی۔ اس نے دکان کا مال اونے پونے فروخت کیا۔ کچن کے منقش برتن دوستوں اور عزیزوں میں تقسیم کیے۔ جن لوگوں پر ادھار تھا ان سے تقاضے کر کے قرض وصول کیا۔

ستمبر 1938ء کے شروع میں خان پور سے دارالاسلام منتقل ہو گیا۔

کچھ عرصے بعد ادارے کے ٹرسٹیوں اور سید مودودی کے درمیان اختلافات پیدا ہو گئے۔ دارالاسلام ٹرسٹ جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا وہ چاہتے تھے کہ مولانا ان کی ہدایات کے تحت کام کریں۔ اس کے لیے مولانا تیار نہیں تھے۔ اس لیے انہوں نے دارالاسلام چھوڑ دیا اور لاہور چلے آئے۔ نعیم صدیقی کو بھی واپس آنا پڑا۔ اب عجیب حالات تھے۔ دکان پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اب بے کاری ہی بے کاری تھی۔ مطالعے کے سوا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔ اس دور میں فلسفے کی طرف رجحان رہا۔ اردو ادب، اسلامی نظام حیات اور دیگر ٹھوس علمی کتابیں زیر مطالعہ رہیں۔ فرصت ملی تو شاعری نے بھی زور باندھا۔ نظمیں، غزلیں، رباعیات ہر صنف میں اتنا سرمایہ جمع کر لیا کہ پانچ چھ سو صفحات کا ایک مجموعۂ کلام بہ آسانی شائع ہو سکتا تھا۔ اس کا ارادہ بھی کیا لیکن تنگ دستی آڑے آ گئی۔ اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ مجموعہ شائع ہوتا۔ یہ صورت بہت بعد میں جا کر مکمل ہو سکی۔

شاعری پیٹ نہیں بھرتی اور یہاں کاروبار کی کوئی صورت نہیں بن رہی تھی۔ یہ اس کی نہایت تنگ دستی کا زمانہ تھا۔ ڈوب رہا تھا ایسے میں تنکے کے سہارے کی ضرورت

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ مولوی فضل حسین کی طرف سے خط آیا۔ وہ کوئی کاروبار کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اسے شریکِ کار کریں گے۔ وہ راول پنڈی چلا گیا۔ یہاں پہنچ کر بہت سے کاروبار زیرِ غور آئے۔ مولوی فضل حسین کو ہر کام میں نقصان کا اندیشہ تھا۔ نعیم صدیقی نے انہیں لاکھ سمجھایا کہ نقصان تو کاروبار کا حصہ ہوتا ہے۔ اگر ہم یہی سوچتے رہے تو کوئی بھی کاروبار نہیں کرسکیں گے۔ مولوی فضل حسین اس کے سمجھانے پر تیار ہوجاتے لیکن دوسرے ہی دن کوئی اور تجویز لے آتے۔ رفتہ رفتہ ہر تجویز دم توڑ گئی پھر انہوں نے صاف انکار کردیا کہ کاروبار ان کے بس کا نہیں۔ وہ اپنا سرمایہ پھنسانا نہیں چاہتے۔

دھوپ اس کے سر پر آگئی۔ خان پور میں کیا رکھا تھا جو واپس جاتا۔ ایک دوست خواجہ احمد حسن منٹو کے گھر قیام تھا۔ وہ ان پر بوجھ بننا نہیں چاہتا تھا۔ دو ماہ وہاں گزارے پھر ایک مسجد کے بالاخانے میں رہنے لگا۔ روزی کے طور پر چند ٹیوشنیں پکڑلیں۔ ان سے اتنا ہوگیا کہ کھانے پینے کا خرچ نکلنے لگا۔ پہلے دس روپے پھر بیس روپے یافت ہونے لگی۔

ٹھیکے دار کالے خان مری میں مقیم تھے۔ انہیں اپنے بچوں کے لیے ایک صاحب علم اتالیق کی ضرورت تھی۔ ایک دوست کی کوششوں سے یہ نوکری اسے مل گئی۔ وہ راول پنڈی سے مری چلا گیا۔ اب سہولتوں کے علاوہ 45 روپے کمارہا تھا اور مطمئن تھا۔ اتنا وقت بھی مل جاتا تھا کہ دل جمعی سے مطالعہ کرسکے۔ مری جیسے سرد مقام پر ایک چھوٹی سی خوب صورت لائبریری بھی۔ پڑھنے والے کم آتے تھے اس لیے کتابیں بھی تھیں اور تنہائی بھی۔ وہ بیٹھا مطالعہ کرتا رہتا۔ وہ یہاں اتالیق بن کر آیا تھا۔ اس لیے تعلیم کے موضوعات پر کتابیں اس کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ اس سنسان مقام پر شاعری کرنے کا بھی اپنا ایک مزہ تھا۔ مری کی آب و ہوا اسے راس نہیں آرہی تھی لیکن روزگار کی طرف سے مطمئن تھا اس لیے ٹکا ہوا تھا۔

اسی دوران اسے مولانا مودودی کا خط ملا۔

1941ء میں لاہور میں جماعت اسلامی عمل میں آئی۔ مولانا مودودی نے اسے اس جماعت میں شمولیت کی دعوت دی تھی۔ وہ تحریک اسلامی میں شمولیت کے لیے لاہور آگیا۔

لاہور سے ملک نصر اللہ خاں عزیز نے سہ روزہ اخبار ”مسلمان“ نکالا تھا۔ اس کے لیے انہیں نائب مدیر کی ضرورت تھی۔ اس نے اس اسامی کے لیے درخواست دے دی جو منظور ہوئی۔ اس نے باقاعدہ صحافت کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔

اس وقت کی صحافت ادبی اہمیت کی حامل تھی۔ بڑے بڑے معتبر ادیب صحافت کے علم بردار بھی تھے۔ ہر اخبار میں شعبۂ ادارت کے طور پر ایک بڑی ادبی شخصیت کی وابستگی لازمی تھی۔

نعیم صدیقی کا تعلق ایک علمی و ادبی گھرانے سے تھا۔ گھر میں اخبارات و جرائد آتے تھے۔ وہ بچپن ہی سے ان کا مطالعہ کرتا چلا آیا تھا۔ اس کے اردگرد جو ادیب تھے، ان کی ناموری اخبارات کے ذریعے ہی ہوئی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر معتبر صحافی تھے۔ اس نے بھی اپنا نام اس فہرست میں شامل کرلیا۔

ابتدا میں اس کے ذمے ایک آدھ کالم تھا۔ وقت کے ساتھ کام کا دائرہ پھیلتا گیا اور پھر اخبار کا بڑا حصہ خود ہی تیار کرتا ہوتا تھا۔ نثر لکھنے کی ابتدا وہ خان پور ہی میں کرچکا تھا۔ اخبار سے منسلک ہوکر ساری حسرتیں پوری ہوگئیں۔ اس کے قلم میں بڑا تنوع تھا جس کے رنگ اداریوں میں نظر آتے تھے۔ سیاسی مسائل، اسلامی افکار و نظریات پر مشتمل اداریے جو اخلاقیات کے بگڑے نظام کو سنوارنے کے لیے لکھے گئے۔ لادین اور ملحدانہ نظریات کے خلاف لکھے گئے۔

اس مرتبہ لاہور کے قیام کو وہ اپنی خوش قسمتی سمجھ رہا تھا۔ اب اس کے ذوق صحیفہ نگاری کی تکمیل بھی ہورہی تھی اور ہر دوسرے تیسرے ماہ دارالاسلام جا کر سید مودودی سے بھی مل آتا تھا لیکن کبھی کبھی یہ بھی سوچتا تھا کہ یہ دوسرے تیسرے مہینے کی قید کیوں کوئی سبیل ایسی نکل آئے کہ دارالاسلام جا کر رہوں۔

1941ء میں جب جماعت اسلامی وجود میں آئی تو سید مودودی نے چوہدری نیاز علی سے ٹرسٹ کی عمارت مستعار لے کر کام شروع کردیا۔ ٹرسٹیوں نے استعفے دے دیے اور مولانا کے ساتھیوں نے ٹرسٹ کا انتظام سنبھال لیا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ اسے کوئی کام دے دیا جائے اس طرح وہ ہمہ وقت مودودی صاحب کی خدمت میں رہ سکے گا۔ اس سلسلے میں اس کی خط و کتابت ہوتی رہی۔ مودودی صاحب اس کی قلم کاریوں سے نا آشنا نہیں تھے۔ اس کے اسلوب کے بھی قائل تھے، بسیار نویسی کو بھی جانتے تھے اور اس کے

نظریات بھی ان کی تحریک سے قریب تر تھے۔ انہوں نے اسے دارالاسلام آنے کی دعوت دی جو اس نے قبول بھی کرلی لیکن دارالاسلام تک جانے میں دارالحرب کی مجبوریاں آڑے آتی رہیں۔ اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ والدہ کو تو اس نے بہت کم دیکھا تھا والد ہی اس کے لیے سب کچھ تھے۔ والدہ کے انتقال کے بعد انہوں نے ہی اس کی پرورش کی تھی۔ اس کے ناز اٹھائے تھے۔ اس کی فرمائشیں پوری کی تھیں۔ محض اس کی پرورش کی خاطر انہوں نے بیوی کے انتقال کے بعد شادی نہیں کی۔ ایسی شفیق ہستی کا اٹھ جانا اس کے لیے حادثۂ عظیم تھا۔

ایک مہینے بعد اس کا بیٹا نویدالاسلام پیدا ہوگیا۔ بالآخر وہ 15 جون 1942ء کو دارالاسلام منتقل ہوگیا۔

”مولانا، میں آگیا ہوں۔ اب تاحیات آپ کے قدموں میں رہوں گا۔“

”ہم تمہیں قدموں میں نہیں پہلو میں جگہ دیں گے۔“

”مجھے جو مقام ملے گا اپنی سعادت سمجھوں گا۔“

”مجھے ایسے ہی تحریکی ساتھیوں کی ضرورت ہے۔ تمہارا قلم ہمارا ہتھیار ہوگا۔“

مولانا نے اس کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے خط کتابت کی ذمے داری دے دی۔ وہ ترجمان القرآن کے کام میں بھی معاونت کرنے لگا۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز کی طرف سے مسلسل تقاضے موصول ہورہے تھے کہ سہ روزہ مسلمان کے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتے رہو۔ تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں لیکن وہ اول و آخر ادیب تھا، شاعر تھا، ڈراما نگار تھا، وہ یہیں سے مسلمان کے لیے لکھ کر بھیجتا رہا۔

وہ بچوں کو بھی یہاں لے آیا تھا اس لیے کہا جاسکتا تھا کہ اسے اس کی منزل مل گئی۔ اب وہ یہاں سے کہیں اور نہیں جائے گا۔ دارالاسلام اس کے لیے اسلامک یونیورسٹی بن گئی تھی۔ مولانا سے نہ صرف ملاقاتیں رہتی تھیں بلکہ وہ ان سے قرآن و حدیث کا درس بھی لینے لگا۔

وہ مسلمان میں پابندی سے لکھ رہا تھا کہ ملک نصر اللہ خاں عزیز کے اپنے ناشر سے تعلقات کشیدہ ہوگئے انہوں نے یہ پرچہ اسے واپس کردیا اور 1944ء میں سہ روزہ ”کوثر“ جاری کیا۔ نعیم صدیقی اس سے منسلک ہوگیا۔ ترجمان القرآن کی ایڈیٹری ابھی اس کے حصے میں نہیں آئی تھی لیکن اس کے مضامین برابر شائع ہوتے رہے۔

جنوری 2014ء ...... نئے سال کا آغاز اور سسپنس کا دلکش انداز

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل

محفل شعر و سخن ...... اور

مرزا امجد بیگ کے دھواں دھار ڈائل

تقسیم محبت

سچ ہے کہ تمام جذبات میں شراکت داری قابل برداشت ہے لیکن ...... محبت کی تقسیم کسی طور قابل قبول نہیں ہوتی ...... آخری صفحات پر **نشور ھادی** کے قلم کی شتر زنی

مٹی کا فساد

مٹی پتھر اور گارے سے مل کر بننے والا یہ خاکی پتلا زمین پر کیسے کیسے فساد کا باعث بنا ...... ابتدائی صفحات پر **الیاس سیتاپوری** کا یادگار تحفہ

کشکول

زندہ رفتہ انجام کی جانب بڑھنے والے سلسلے کی آخری کڑی ...... **انوار صدیقی** کے خیالات کی پرواز

ماروی

محبت کے تلاطم سے نبرد آزما ایک عاشق کا دلربا انداز ...... جسے چاہت میں پھوار بن کر برسنا اچھا لگتا تھا ...... **محی الدین نواب** کا نیا سلسلہ

اس کے علاوہ

منظر امام، کاشف زبیر، زوبینہ رشید، تنویر ریاض، سلیم انور، مریم کے خان اور امجد رئیس کی تحاریر آپ کی منتظر

ان دنوں اس کا قلم چوکھی لڑ رہا تھا۔ اس کی نظریاتی نظمیں مسلمان اور پھر کوثر میں اپنی جگہ بنا رہی تھیں۔

ہر ایک دور وقت کا، خود اپنا اک یزید ہے
ہر ایک دور کا حسین، بے گنہ شہید ہے
جدھر جدھر گرا ہے خوں یہی رہ امید ہے

☆☆

ہم لوگ اقراری مجرم ہیں
سن ہم سے اے دورِ طاغوتی
طاغوتوں سے بے زار ہیں ہم
جب نگری اندھی نگری ہے
تو اے راجا غدار ہیں ہم
ہم سرکش ہیں ہم طاغی ہیں
انگریز کے ترکے میں جو ملا
اس مذہب کے ہم باغی ہیں

☆☆

تحریکِ اسلامی میں شامل ہونے کے بعد اسے یک سوئی بھی حاصل ہوئی اور اس کے سفر کا ایک رخ بھی متعین ہوگیا۔ اب اس کی تخلیقات تحریکِ اسلامی کے نظریات کے گرد گھوم رہی تھیں لیکن اس نے اسے پروپیگنڈا نہیں بنایا بلکہ ادبیت قائم رکھی۔

یکسوئی ملنے کے بعد اس نے اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ ذہنی زلزلے 1945ء میں شائع کیا۔ یہ اس کی پہلی باقاعدہ نثری تصنیف تھی۔ اس مجموعے میں افسانوں کے علاوہ ڈرامے، خاکے اور ایک انشائیہ بھی شامل تھا۔

1946ء کے پہلے ہفتے میں اسے جماعت کا ذمے دار بنا دیا گیا۔ ادھر تحریک آزادی اپنے آخری مراحل میں تھی۔ سیاسی بساط پر یہ طے پایا کہ ملک کی تقسیم ہوگی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ملک میں خونیں فسادات پھوٹ پڑے۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ بلوائی دارالاسلام پر نہ چڑھ دوڑیں۔ دفاع کا بندوبست بھی ضروری تھا۔ وہ ایسے کڑے اور پرآشوب دور میں امرت سر گیا اور کسی نہ کسی طرح برچھیاں لانے میں کامیاب ہوگیا۔ دارالاسلام کسی فوجی چھاؤنی کا منظر پیش کرنے لگا۔ سالار رات کے وقت پہرا دیتے تھے۔ وہ ان سرگرمیوں میں آگے آگے تھا۔ یہ اس کی شخصیت کا ایک نیا روپ تھا۔

☆☆☆

نعیم صدیقی جس تحریکِ اسلامی سے وابستہ ہوگیا تھا اس کی نظریاتی ساخت میں فکرِ اقبال کا کردار بھی تھا۔ وہ بچپن سے اقبال کا شیدائی تھا۔ ایک دور میں اس نے اقبال کے رنگ میں ہزاروں اشعار کہے تھے۔ یہ عقیدت محض زبانی نہیں تھی۔ اس نے اقبال کی شعری اور نثری تصنیفات اور اقبال پر اہم کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ اس کا ذہن فکرِ اقبال کی تہ تک پہنچا تھا۔ اس نے فکرِ اقبال کو عام کرنے کے لیے کام کرنا شروع کیا لیکن تقسیم ہند کی ہنگامہ آرائیوں نے اس کام کو ادھورا چھوڑ دیا۔ یہ کام شاید بعد میں ہونا تھا اور نعیم صدیقی کو اقبال شناسوں کی صف میں کھڑا ہونا تھا۔

وہ دارالاسلام سے اس حالت میں فیملی سمیت لاہور پہنچا کہ تن پر کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ دوست نہ احباب، نہ رہنے کا ٹھکانا۔ سنا کرتے ہیں کہ میدان حشر میں کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہوگا یہی منظر اس وقت لاہور پیش کر رہا تھا۔ جو مدد کر سکتے تھے وہ خود مدد کے محتاج تھے۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے مہاجرین کی حالت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ ٹرینوں میں کٹی پھٹی لاشیں آرہی تھیں۔

پاکستان آکر چند دن سوہن لال کالج میں گزارے۔ ٹیمیں بنا کر خدمتِ مہاجرین میں لگے رہے۔ مہاجرین کو پانی، خوراک اور ادویات بہم پہنچانا، لاشوں کو دفنانا، ان کی آبادکاری میں ان کی مدد کرنا۔

کچھ دن بعد کالج کی عمارت خالی کرنا پڑ گئی۔ اب اسلامیہ پارک میں خیمے لگا کر رہنا پڑا۔ وہ کیا کوئی بھی اس قسم کی زندگی گزارنے کا عادی نہیں تھا۔ چھوٹے بچے ساتھ تھے۔ اس نے بیوی بچوں کو راولپنڈی عزیزوں کے پاس بھیج دیا اور خود مہاجرین کی خدمت میں لگ گیا۔

چند ماہ اسی آپا دھاپی میں گزر گئے۔ زندگی آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگی۔ کیمپوں میں مہاجر اب بھی تھے لیکن بیشتر کو ٹھکانے مل گئے تھے۔

بیوی بچوں کو راولپنڈی بھیجنے کے بعد اسے اتنی فرصت مل رہی تھی کہ وہ روٹی روزی کا بندوبست کرنے کے لیے خیمے سے باہر نکلے اب وہ دوبارہ سہ روزہ کوثر سے منسلک ہوگیا۔

جماعت کا دفتر قائم ہوا تو وہ منشور کمیٹی کا رکن منتخب ہوگیا۔ روزنامہ تسنیم جاری ہوا تو اس نے اس میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔

چوہدری غلام محمد کراچی سے ماہ نامہ "چراغِ راہ" نکالتے تھے۔ انہوں نے نعیم صدیقی کو اس کا مدیر مقرر

کر دیا۔ وہ لاہور میں تھا اور کراچی جانے کو تیار نہیں تھا لہٰذا یہ طے ہوا کہ وہ لاہور میں بیٹھ کر پرچہ تیار کرے گا اور شائع کراچی سے ہوگا۔

یہ پرچہ ہاتھ میں آیا تو اسے فکرِ اقبال کو عام کرنے کا خیال آیا۔ عرصہ پہلے اس نے یہ کام شروع کر دیا تھا لیکن فسادات کی آندھی نے اس کے اوراق خیال کو اڑا دیا تھا۔ اس نے یہ اوراق پھر سے سمیٹے اور اقبال پر کام کرنے بیٹھ گیا۔ دیدار رسالت اور اقبال، اقبال کا مطلوب انسان، اقبال کے قدردان وغیرہ چراغ راہ میں شامل ہوئے۔

وہ عربی اور فارسی زبان میں مہارت رکھتا تھا۔ ایک روز یہ خیال آیا کہ یہ بھی اقبال شناسی کا حق ادا کرنے کے مترادف ہوگا کہ اقبال کے فارسی کلام کو اردو کا لباس پہنا کر اردو داں طبقے میں فکرِ اقبال کو عام کیا جائے۔ وہ علامہ کے فارسی کلام کا اردو ترجمہ کرنے بیٹھ گیا۔

یارب دعا ہے مجھ کو دلِ باخبر ملے
مے میں نشہ کو دیکھ سکون وہ نظر ملے
اغیار کی عطا شدہ سانسوں پہ کیوں جیوں
اک خانہ زاد آہ مثالِ سحر ملے

☆☆

یہ جہاں کیا ہے؟ صنم خانہ افکار مرا
صد جلوؤں کو کرے دیدۂ بیدار مرا
سارا آفاق مری ایک نظر جس کو محیط
ہے فقط دائرہ گردشِ پرکار مرا

☆☆

منظوم ترجمہ ایک مشکل فن ہے۔ اسے کلام اقبال کو ترجمہ کرنے میں آسانی اس لیے ہوگئی کہ ایک تو اسے فارسی پر عبور حاصل تھا دوسرے یہ کہ وہ اپنے ابتدائی دور شاعری میں اقبال کے رنگ میں شاعری کر چکا تھا۔ اس نے ہزاروں اشعار اقبال کے انداز میں کہے تھے۔ اسے ترجمہ کرتے ہوئے کسی خاص دقت کا سامنا نہیں ہوا۔

اس کی تحریکی معروفیات آڑے آئیں۔ وہ اس کام کو پورا نہ کر سکا۔ کچھ فارسی کلام ہی کو اردو میں ڈھال سکا ورنہ اس سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ تمام فارسی کلام کا اردو میں ترجمہ کر لے گا۔

اقبال شناسی کا یہ کام وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ اس نے اپنا ادبی پرچہ سیارہ جاری کیا تو اس میں بھی اقبال پر اس کے اداریے اور مقالات شائع ہوتے رہے۔ اقبال کے لیے گوشۂ اقبال مقرر کیا۔ اقبال نمبر شائع کیا۔ ایک نہیں تین اقبال نمبر نکالے۔

اقبال اور اقبالیات پر تین درجن سے زیادہ مضامین و مقالات تحریر کیے۔ ان میں سے دو طویل مقالات "اقبال اور نظریۂ پاکستان" "اقبال مغربی مادیت اور سوشلزم"۔ مقالات کا مجموعہ "اقبال کا شعلہ نوا" کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

اقبال کا شعلہ نوا 36 مضامین و مقالات پر مشتمل ہے۔ ان میں اقبال کے فکری ارتقا پر ایک نظر۔ حکیمے نے

فتح نامہ

فتح و نصرت کا سرکاری اعلان۔ اس تعریف کی حدود سے فتح ناموں کی بیشتر تعداد خارج ہو جاتی ہے جن کے مصنف غیر سرکاری افراد تھے اور جنہوں نے یہ فتح نامے محض ادبی ذوق کی تسکین کے لیے لکھے تھے۔ عام طور پر فتح نامہ پندرہ اجزا میں منقسم ہوتا ہے:

1۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا
2۔ آنحضورؐ پر درود و سلام
3۔ ظلم و ستم سے نجات دلانا سلطان کا فرض ہے
4۔ ظلم کے استیصال کی وجوہ
5۔ سلطان کی روانگی
6۔ سلطان افواج کی کثرتِ تعداد
7۔ غنیم کے حالات
8۔ غنیم کی جرأت
9۔ جنگ کا بیان
10۔ سلطان کی فتح
11۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شکرگزاری
12۔ دشمن کے علاقے پر قبضہ
13۔ بحر و بر کے راستوں سے فتح کا اعلان
14۔ ان مقامات کے نام جہاں فتح نامہ بھیجا گیا، اور فتح نامہ بھیجنے والے کا نام
15۔ فتح پر سلطان کا اظہارِ مسرت۔ مرسل الیہ کو خوشخبری کی اطلاع اور طلبِ دعا۔

مرسلہ: نثار اختر، پشاور

WWW.PAKSOCIETY.COM

نوازے، اقبال ایک معما، سوشلزم اقبال کی نظر میں اور اقبال کا مطلوب انسان وغیرہ اہم ہیں۔

دفاع فکرِ اقبال کے لیے بھی اس کی کاوشوں نے ادب میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ اس نے سیکولر عناصر، ترقی پسندوں، اشتراکیوں اور تہذیب مغرب سے مرعوب دانش وروں سے جو فکر اقبال کی غلط توجیہہ کے مرتکب ہو رہے تھے جو کھی لڑائی لڑی۔

''آخر اقبال کا کیا گناہ تھا۔ اس نے مغرب کی مادہ پرستانہ اور خواہشات کی غلامی سکھانے والی تہذیب کے خلاف اعلان جنگ کیا تھا اور اس تہذیب کے فرزند آج تک اس سے خفا ہیں۔ انہوں نے اقبال کو سزا دینے کا یہ دلچسپ ڈھنگ نکالا کہ اقبال کی قصیدہ خوانیاں کرتے ہوئے اور ان کی روح پر عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے اس کا پیغام پیروں میں روندتے ہیں۔''

ان مقالات میں اس نے شعرا کے اس طبقے کا بھی ذکر کیا جن کے حسن کلام کا انحصار ذکر قیس پر ہے اور وہ اسے شاعری کا اہم جزو سمجھتے ہیں جبکہ اقبال نے اپنی شاعری کو اس سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ اس کے باوجود ان کا فن عظیم ہے۔

☆☆☆

پاکستان کی تشکیل کے ساتھ ہی یہ سوال سامنے آیا کہ کیا ایک نظریاتی مملکت کا ادب غیر نظریاتی ہو سکتا ہے؟ جواب نفی میں تھا۔ نظریہ کیا ہو؟ یہ سوال اٹھا، ضرورت اس بات کی تھی کہ ان نظریات سے کام لیا جاتا جو اسلام اور پاکستان کی اساس ہیں۔ اس طرح قوم اس یکجہتی سے آشنا ہوتی جو پاکستان کا مقصد ہے۔ ادیبوں میں ایک بحث چھڑ گئی۔ ایک طرف ترقی پسند تھے دوسری جانب اسلامی ادب کے داعی حسن عسکری، صمد شاہین، ممتاز شیریں وغیرہ نے پاکستانی ادب کا نعرہ بلند کیا۔ ان کے نزدیک پاکستان سے متعلقہ ادب اسلامی ادب تھا۔ پاکستان ایک نظریے کے تحت ہی وجود میں آیا تھا۔ اس لیے اس پر اب مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی لیکن اشتراکیت پسندوں نے اسلامی ادب یا ادب میں مذہب کے حوالے سے اختلاف کیا۔ اس پر اسلامی سوچ رکھنے والے ادیبوں نے متحد ہو کر تحریک ادب اسلامی کی بنیاد رکھ دی اور یہ دلیل پیش کی کہ ادب کا مذہب نہ سہی ادیب کا تو مذہب ہوتا ہے۔

نعیم صدیقی اپنے اسلامی ذہن کے سبب اس تحریک میں شامل ہوا اور صف اول کے ادیب کی حیثیت سے سامنے آیا۔ اسلامی ادب کا نعرہ لگانے والوں میں کوئی بڑا شاعر شریک نہ ہو سکا۔ ایسا شاعر جو زبان و بیان پر قدرت رکھتا ہو۔ اس بات کا ثبوت دے سکتا ہو کہ اسلامی نظریات کے دائرے میں رہ کر بھی بڑی شاعری کی جا سکتی ہے۔ حسن عسکری نظریہ ساز تھے لیکن شاعر نہ تھے اس کے باوجود فراق سے لے کر ترقی پسندوں تک کا مقابلہ مردانہ وار کیا۔

نعیم صدیقی کی کوششیں قابلِ تعریف تھیں۔ اس نے نہ صرف اسلامی ادب کے مباحث اٹھائے بلکہ اسلامی ادب کی تخلیق میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ وہ چراغ راہ کا مدیر تھا۔ اس پرچے کے صفحات اس تحریک کے لیے مخصوص کردیے۔ سوال اٹھتے رہے، نئے لکھنے والوں کی تحریریں شامل ہوتی رہیں۔

اس نے واشگاف الفاظ میں اپنے نقطۂ نظر کا اعلان کیا۔

''ہمیں ایسے ادب کی ضرورت ہے جس کے اوراق کا مطالعہ کر کے جب ہم فارغ ہوں تو محسوس کریں کہ فکر و کردار کی راہوں پر ترقی کا کوئی نہ کوئی قدم بڑھا لیا ہے۔ کسی افسانے اور نظم کسی اداریے اور تنقید نے ہمیں ہمارے حیوانی رجحانات اپنی نفسیاتی الجھنوں، معاشرے کی بے انصافیوں اور بین الاقوامی تشدد و جارحیت کے خلاف نئی قوت سے مسلح کردیا ہے۔''

یہ تحریک زیادہ دیر سفر نہ کرسکی لیکن نعیم صدیقی کی کوششوں کے اثرات مرتب ہوئے۔ اس نے ادب میں مقصد اور دینی ادب کی اہمیت کو تسلیم کروالیا۔ اس نے دینی ادب کو بھی ادب کی صنف تسلیم کروایا۔ خود بھی فقہی ادب تخلیق کیا حالانکہ وہ معروف معنوں میں عالم دین نہیں تھا۔ دینی موضوعات کے وسیع مطالعہ نے اس میں یہ صلاحیت پیدا کردی کہ وہ موقع محل کی مناسبت اور عصری تقاضوں کے پیش نظر فقہی معاملات و مسائل پر لکھنے لگا۔

ابھی تحریکِ ادب اسلامی کے اجلاس جاری تھے کہ مولانا مودودی کو 1948ء میں گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے جیل چلے جانے کے بعد ترجمان القرآن کی ادارت کا بوجھ بھی اس کے کاندھوں پر آن پڑا۔ اس کی کفالت کی ذمے داری تحریک اسلامی نے اٹھائی اور بیس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ یہ دور اس کی نہایت مصروفیت کا زمانہ تھا۔ کبھی سرگودھا جانا پڑتا کبھی کراچی میں تقریر کرنی ہوتی۔ ادب

اسلامی کے جلسوں میں الگ شریک ہونا پڑتا۔ تخلیقی مصروفیات اپنی جگہ۔

قادیانیوں کے خلاف تحریک نے پاکستان کی سیاست میں تحرک پیدا کردیا۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ قلم کے دھنی ہوتے ہیں وہ اچھے مقرر نہیں ہوتے البتہ کچھ لوگ دونوں حیثیتوں کے مالک ہوتے ہیں جیسے مولانا ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد، شورش کاشمیری وغیرہ۔ نعیم صدیقی انہی میں سے ایک تھا۔ وہ بچپن میں دور دراز کے قصبات میں جا کر تحریک خلافت کے عروج کے دور میں مقررین کی تقاریر سنا کرتا تھا۔ بچپن کے یہ اثرات اس وقت جوان ہو کر سامنے آئے جب قادیانیوں کے خلاف تحریک کا آغاز ہوا اور اس نے جگہ جگہ جلسوں سے خطاب کیا۔ وہ ایک بے باک مقرر کی حیثیت سے سامنے آیا۔

اس کے بعد بھی کئی ایسے مواقع آئے جب نعیم نے فن خطابت کے جوہر دکھائے۔

موچی دروازے (لاہور) میں تحریک اسلامی کا ایک بڑا جلسہ تھا۔ سیاسی مخالفین نے ہنگامہ آرائی شروع کردی۔ کارکنوں کو حکم دیا گیا کہ جو شور کرے اسے پکڑ کر بٹھا دیا جائے مگر حالات قابو سے باہر ہوگئے۔ ایسے میں نعیم صدیقی کو تقریر کے لیے بلایا گیا۔ اس نے تقریر شروع کی تو مخالفین لذتِ تقریر میں ایسے کھوئے کہ گھنٹا بھر تقریر سنی اور خاموشی سے واپس چلے گئے۔

ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب ایک سیاسی مخالف پارٹی نے اچھرہ میں مولانا مودودی کی قیام گاہ پر جلوس لے جا کر ہنگامہ آرائی شروع کردی۔ صورت حال سنبھالنے کے لیے وہ دیوار پر چڑھ گیا اور وہاں سے تقریر شروع کردی۔ کچھ دیر نعرے لگتے رہے اور پھر لوگ تحمل سے تقریر سننے لگے۔

قادیانیوں کے خلاف تحریک چلی تو اس کی تقریریں بے نیام ہوگئیں۔ لاہور میں مارشل لا نافذ ہوگیا۔ مولانا مودودی اور عبدالستار نیازی کو پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ جماعت کے دیگر علما بھی گرفتار ہوئے۔ ان میں وہ بھی شامل تھا۔

وہ ابھی ابھی کسی جلسے سے واپس آیا تھا اور سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اسے گھر کے باہر گاڑیوں کے رکنے کی آوازیں آئیں۔ اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ چند روز پہلے مولانا مودودی کو گرفتار کیا جاچکا تھا۔ خبریں یہ تھیں کہ جماعت کے دیگر رہنماؤں کو بھی گرفتار کرلیا جائے گا پھر یہ خبریں آئی تھیں کہ چھاپے مارے جارہے ہیں۔ احباب نے مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ روپوش ہوجائے لیکن وہ روپوشی کے لیے تیار نہیں تھا۔

''اگر میں سچائی پر ہوں تو مجھے گرفتاری سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ جہاد یہ نہیں کہ فرار کا راستہ اختیار کیا جائے۔''

وہ دروازے پر دستک ہوئے بغیر ہی ذہنی طور پر تیار ہوچکا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ خود دروازے پر پہنچا۔ فوجی گاڑیاں اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ اس نے لکھنے پڑھنے کا کچھ سامان ساتھ لیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس وقت تک گھر میں سب جاگ چکے تھے۔

سب کو یہ احساس ضرور تھا کہ مارشل لا ایکٹ کے تحت گرفتاری ہورہی ہے۔ نہ جانے کب رہائی نصیب ہو لیکن یہ خیال بھی تھا کہ وہ کسی بڑے مقصد کے لیے جیل جارہا ہے۔ بڑا بیٹا نویدالاسلام قریب کھڑا تھا۔

''ہر نماز کے بعد خدا سے دعا کرنا کہ وہ پاکستان کو اسلامی نظام نصیب کرے۔'' اس نے بیٹے کو نصیحت کی اور گاڑیاں چل دیں۔

بورسٹل جیل کی ڈیوڑھی میں ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی کوٹھری میں پہنچا تھا کہ جیل کی مسجد سے نماز فجر کی اذان بلند ہوئی۔ اس نے سامان کوٹھری میں چھوڑا اور نماز میں شریک ہوگیا۔

قید و بند تخلیق کو تحریک دیتی ہے۔ اس کی کئی مثالیں خود برصغیر میں موجود تھیں۔ غالب ہو، بہادر شاہ ظفر، فیض ہوں یا حسرت موہانی سب نے عالم قید میں شاندار شاعری کی، حسرت کا یہ شعر تو ضرب المثل بن گیا ہے۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اِک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

فاطمہ رضی اللہ عنہا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی تھیں۔ ان سے آنحضرت کو بہت الفت تھی۔ ان کی پیدائش بقول ابن جوزی نبوت سے پانچ برس پہلے ہوئی اور نکاح پندرہ برس پانچ مہینے کی عمر میں حضرت علیؓ سے غزوۂ احد کے بعد ہوا۔ امام حسن و حسین آپ ہی کے بطن سے ہیں۔

مرسلہ: نعمان فردوس، کراچی

اس نے بھی مشقِ سخن اور چکی کی مشقت ساتھ ساتھ جاری رکھی۔

سیاہ خانہ زنداں میں آنکھ جونہی کھلی
مری صبوحی شعاعوں میں ڈھل کے آنے لگی

☆☆

سیوالٹ دیے گئے، دیے بجھادیے گئے
جو لوگ روحِ بزم تھے وہی اٹھادیے گئے

☆☆

آمدِ سخن کا بہاؤ اس قدر تیز تھا کہ صرف غزلوں تک جاکر بات نہیں رکی کئی طویل نظمیں بھی اس دورِ قید وبند کی یادگار ٹھہریں۔ وہ اسلامی نظامِ حیات کے علمی نفاذ کا داعی تھا۔ جیل میں بھی وہ اسی آوازِ حق کو بلند کررہا تھا۔

میں پھر آرہا ہوں
وہ میں جو ہمہ راستی ہوں
ہمہ زندگی ہوں
ہمہ کش کش ہوں ہمہ آشتی ہوں
میں حکمِ خدا ہوں میں دینِ نبی ہوں
میں بے لاگ انصاف ہوں
میرے ہاتھوں میں میزانِ تقدیر ہے
میں درسِ مساوات ہوں
میری آنکھوں میں انسانوں کی تنویر ہے
میں پھر آرہا ہوں
رجز گا رہا ہوں
نئی اِک قیادت کو پھر لارہا ہوں
کہ تاریخ کا ارتقا رک نہ جائے

☆☆

قید میں رہ کر اس نے اتنی تعداد میں نظمیں اور غزلیں تخلیق کرلی تھیں کہ جیل سے نکلنے کے بعد ایک مجموعہ شعلہ خیال کے نام سے مرتب کرکے شائع کروادیا۔

جیل میں رہ کر اس نے "ڈائری" بھی لکھی "چراغ راہ کے عنوان سے وہ قسط وار "جیل کا مسیحائی نظام" کے نام سے شائع ہوتی رہی۔

سہ روزہ کوثر اس کی روزی کا سہارا اور صحیفہ نگاری کی تکمیل کا ذریعہ تھا۔ حکومت نے اس کا ڈیکلریشن منسوخ کردیا۔ کوثر سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

اب صحافت کی دنیا کے لوگوں کے لیے اس کا نام نیا نہیں تھا۔ اس کا نام ادبی اور سیاسی پرچوں کے لیے ترقی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ اس نے ہفت روزہ ایشیا جوائن کرلیا۔ بعد میں اس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس پرچے کا مزاج سیاسی اور تحریکی تھا اس لیے اس میں اس نے جو اداریے لکھے وہ بھی دینی اور سیاسی تھے۔ اس کے لکھے ہوئے اداریوں میں ہمیشہ تنوع رہا تھا۔ سیاسی اور تحریکی مسائل، اسلامی افکار ونظریات پر مشتمل اداریے مگر اس تنوع میں اس کا اسلوب یکساں رہا۔ ادبی رنگ سب پر غالب نظر آتا تھا۔

مالی حالات دگرگوں ہونے لگے تھے۔ مکان کا کرایہ ادا کرنا مشکل ہورہا تھا لہٰذا وہ بچوں کو گاؤں چھوڑ کر آگیا۔ انہی دنوں ایوب خان نے ملک میں مارشل لا لگادیا۔ تحریکی کام سرد پڑ گئے تو اسے کچھ فرصت میسر آئی۔ اس فرصت کو کارآمد اور بابرکت بنانے کے لیے اس نے سیرت رسولؐ پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کرلیا۔ اس روز اس کی نماز لمبی ہوگئی تھی۔ یہ کام توفیق خداوندی کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ خداوند تعالیٰ کے حضور دعا گو تھا کہ الٰہی مجھے توفیق دے۔ آخرت کا سامان درست کرنے کی توفیق، عشقِ حضورؐ کا حق ادا کرنے کی توفیق۔

وہ اب تک مختلف جرائد ورسائل میں سیرت رسولؐ پر کئی مضامین لکھ چکا تھا۔ مضمون لکھنے اور بھرپور کتاب لکھنے میں فرق ہے۔ وہ جیسے جیسے غور کرتا گیا کام مشکل نظر آتا گیا۔ اس لیے مشکل نظر آتا تھا کہ وہ پہلا شخص نہیں تھا جو اس موضوع پر لکھ رہا تھا۔ جب سے اردو نے پر پرزے نکالے تھے اس موضوع پر کتابیں لکھی جاتی رہی تھیں۔ بہتوں کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کی تصنیف ایسی ہو جو دوسری تصانیف میں الگ پہچانی جائے۔ اس نے حافظے پر زور دیا تو مختلف کتابیں اس کے ذہن کے نہاں خانے سے باہر آگئیں۔ ان میں وہ ابتدائی دور کی کتابیں بھی تھیں جن میں تحقیق کا پہلو عنقا ہوتا تھا۔ ان کا مقصد صرف اظہارِ عقیدت ہوتا تھا۔ غیر ثقہ روایات ان کتابوں کا غالب حصہ تھا۔ ایک رجحان یہ بھی نظر آتا تھا جن میں حضورؐ کی ذاتِ بابرکات کو مافوق الانسان ثابت کیا جائے۔ اس کے برعکس اسے وہ تصانیف بھی یاد آئیں جن میں تحقیق کا کڑا معیار ملتا تھا۔

اسے اپنی تصنیف کو ایسی علمی کتابوں کے مقابلے پر رکھنا تھا۔ اسے اس کتاب کو ان خطوط پر تحریر کرنا تھا کہ یہ محض ایک انسانِ عظیم کی سوانح نہ ہو بلکہ ایک ایسے عظیم اور پاکیزہ انقلاب کی کہانی ہو جس کی کوئی مثال تاریخ انسانی میں نہ ملتی ہو۔ اس انقلاب کا مرکزی کردار نبی اکرمؐ کی شخصیت ہو۔

اس کتاب سے اس اندازِ فکر کا پتا چلتا ہو کہ حضور اکرمؐ کو مکہ اور طائف میں حق بات اور تبدیلی کی بات کرنے پر مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا نظریہ تھا کہ حضورؐ نے قائد انقلاب بن کر افراد کو ایک لڑی میں پرودیا۔ ان کے اندر انقلاب کا شعلہ روشن کیا، ہجرت کی مملکت قائم کی اور اصول وضوابط کے تحت امورِ مملکت انجام دیے اور 23 سال کے مختصر عرصے میں دنیا میں ایک تبدیلی لائے۔

اسے اپنی کتاب کے ذریعے انہی مقاصد کو حاصل کرنا تھا۔

اس نے قرآنِ حکیم، کتب احادیث، تفاسیر، قدما اور متاخرین کی کتابوں کو سامنے رکھا اور کام شروع کردیا اور پھر وہ معرکتہ الآرا کتاب سیرتؐ وجود میں آئی جسے اس نے محسنِ انسانیت کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد اس نے مولانا کوثر نیازی کے ساتھ مل کر ہفت روزہ شہاب نکالا۔

1962ء میں اس نے ادبی پرچے سیارہ کا اجرا کیا۔ یہ پرچہ ادبی تھا لیکن اس کے نظریہ کے مطابق اسلامی ادب کا ترجمان یا اقبال پر مضامین کا ترجمان یا مسائل حاضر کے اسلامی حل کا ترجمان۔ یہی کام اس نے چراغِ راہ کی ادارت کے زمانے میں کیا تھا یہی وہ اب کررہا تھا۔ یہ پرچہ اس کا اپنا تھا اس لیے زیادہ آزادی سے لکھ رہا تھا۔

وہ ایک پختہ کار قلم کار کی حیثیت سے پہلے ہی سامنے آچکا تھا لیکن چراغِ راہ اور سیارہ کی ادارت کے زمانے میں اس کی نثر نگاری کا ایک نمایاں پہلو طنز ومزاح کی شکل میں سامنے آیا۔ اس کے انشائیوں، اداریوں، خطوط اور تبصروں میں یہ عنصر نمایاں نظر آتا تھا۔ اس طنز نگاری کی وجوہات ذاتی بھی تھیں اور اجتماعی بھی۔ اس نے ہزاروں صفحات لکھے تھے۔ ہزاروں اشعار کہے تھے۔ ہر موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ نامور پرچوں کا مدیر رہا تھا۔ اسلامی ادب کی جنگ میں صفِ اول کا سپاہی تھا۔ اقبال شناسی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ اتنی خدمات کے بعد بھی وہ ناقدین کے لیے اجنبی رہا۔ کسی نے اس کے فن کا جائزہ لینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس کی سیاسی ومذہبی جماعت سے وابستگی آڑے آئی یا وہ سامراج پسند ادیبوں کے دھارے میں نہ بہہ سکا۔ بہت سے ادیبوں کو ایوارڈ ملے لیکن وہ محروم رہا۔ اس ناقدری نے اسے ایک جھنجلایا ہوا شخص بنادیا۔ اندر کا غصہ جب مہذب ہوکر باہر نکلتا ہے تو طنز بن جاتا ہے۔ اس کی تحریروں میں بھی طنز کے نشتر نمایاں ہونے لگے۔ اس نے اپنے اردگرد سماجی ناانصافیوں کو دیکھا۔ کھل کر لکھنے سے اہلِ اقتدار خفا ہوسکتے تھے۔ طنز میں کڑواہٹ بہت ہوتی ہے لہٰذا اس نے طنز میں مزاح بھی شامل کردیا۔ مثبت پہلو یہ رہا کہ اس نے طنز کو مقصد کے حصول کے لیے استعمال کیا۔ اس کا طنز اصلاح کے لیے تھا نہ کہ کسی کا مذاق اڑانے کے لیے۔ طنز ومزاح پر مشتمل تحریروں کا مجموعہ "دفترِ بے معنی" کے نام سے شائع کروایا۔ ہفت روزہ شہاب اور ماہ نامہ سیارہ میں اس کے طنزیہ مضامین ومقالات تواتر سے شائع ہوئے۔ طنز کا یہ رویہ اس کے اسلوب کا حصہ بن گیا تھا۔

1964ء میں وہ پھر گرفتار ہوگیا۔ اس مرتبہ وہ نو مہینے تک قید وبند کی صعوبتیں جھیلتا رہا۔ اسے پھر شاعری کا موقع مل گیا۔

سیوالٹ دیے گئے، دیے بجھادیے گئے
جو لوگ روحِ بزم تھے وہی اٹھادیے گئے

اس دورِ اسیری میں جو کلام کہا گیا اس میں بھی وہی تاثرات موجود ہیں جو قید کے دوران میں ایک قیدی کے ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں۔ غصہ، جھنجلاہٹ، جذبے کی شدت، بغاوت، احتجاج وغیرہ۔

نو مہینے بعد وہ جیل سے باہر آیا تو دورِ اسیری کی شاعری کا ایک اور مجموعہ "شعاعِ روزن" کے نام سے اپنے پڑھنے والوں کو دیا۔

پاکستان کی قومی وملی تاریخ میں 6 ستمبر 1965ء کا دن امتحان حریت بن کر طلوع ہوا اور ہماری ادبی تاریخ پر دوررس اثرات چھوڑ گیا۔ یہ وہ الم ناک تاریخ ہے جب ہمسایہ ملک بھارت اپنے معاندانہ رویے کی انتہا کو چھوتے ہوئے بزدلانہ طور پر رات کی تاریکی میں ہماری زمین پر حملہ آور ہوا۔ اس حملے کو ہمارے مجاہدوں اور قوم کے اتحاد نے ناکام بنا کر تاریخِ سرفروشاں میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ پاکستان کی تاریخ میں ایک ایسا دن تھا جب پاکستانیوں نے اپنی قوتِ گم گشتہ کو دریافت کرلیا تھا۔ ان کے دوست اور دشمن دونوں ہی اس دن واضح ہوگئے اور درحقیقت یہی وہ دن تھا جب پاکستان اور بھارت کے درمیان نظریاتی لکیر واضح طور پر کھینچ دی گئی۔ ہمارا ادب بھی اس روز تقسیم ہوا۔ ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کا ذہنی بحران یا تعطل وقتی طور پر سہی ختم ہوا۔ ادیبوں نے محسوس کیا کہ اپنی سیاسی اور ثقافتی آزادی برقرار رکھے بغیر ہمہ گیر انسانی قدروں کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تحفظ نہیں کیا جاسکتا۔

سترہ دن کی اس جنگ میں وہ ملّی شعور جو سرد پڑ گیا تھا ابھر کر اوپر آگیا۔ شعرا نے ملی نغمے اور ترانے تخلیق کیے۔ بعض شعرا نے اتنی تعداد میں اس واقعہ کو موضوع بنایا کہ باقاعدہ مجموعے تیار ہوگئے۔ نعیم صدیقی کا تو ذہنی مزاج ہی قومی وملی وحدت کی ترجمانی کرتا تھا۔ قوم پر وقت پڑا تو اس کا قلم حرکت میں آگیا۔ جنگی ترانے اور نظمیں ابل پڑیں۔ ان میں سے کچھ نظمیں ریڈیو پاکستان سے انہی کی آواز میں نشر بھی ہوئیں۔

مظفر آباد اور میر پور کا دورہ کیا اور کشمیریوں کے دکھوں اور حالتِ زار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بعد میں کہی گئی نظموں میں ان مشاہدات کی جھلک نظر آتی ہے۔ عالم اسلام کے نام سے تقریروں کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

وہ قوم اور ملت کو الگ الگ خانوں میں رکھنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ پوری امتِ مسلمہ کو ملتِ واحدہ سمجھتا تھا۔ یہی اسلامی تصور ہے۔ پاکستان کی حد تک یہ تصور اس لیے بھی اہم ہے کہ یہاں کئی قومیں آباد ہیں۔ ان سب کے درمیان اگر کوئی رشتۂ اتحاد ہوسکتا ہے تو وہ یہی ملی تصور ہے۔ مصر ہو یا انڈونیشیا، سوڈان ہو یا افغانستان، کشمیر ہو یا فلسطین۔ ملت کا کوئی حصہ مبتلائے درد ہو تو درد سب کو ہونا چاہیے۔ وہ اسی فلسفے کا قائل تھا۔

میرا وطن لاہور بھی ہے اور نجد بھی ہے تہران بھی ہے
غزنی استنبول بھی ہے اور مصر بھی ہے سوڈان بھی ہے
خون کشمیر میں بہے یا فلسطین میں، اس کا خون ہے۔

ملّی تصور کا تقاضا تھا کہ ہر جگہ کے مسلمان ایک دوسرے کو اپنی برادری سمجھتے ہوئے مظلوم انسانوں کی حمایت کریں اور پھر کشمیر تو ہماری زمین کا حصہ بھی ہے۔ اس نے کشمیری مسلمانوں سے یکجہتی اور بھارتی مظالم کے خلاف نہ صرف خود نظمیں لکھیں بلکہ دوسروں کو دعوت سخن وری دی اور سیارہ کا کشمیر تا یروشلم نمبر نکالا۔ سیارہ ہی کے تحت جہاد نمبر نکالا۔

اسرائیل کی جارحیت اور مسلمانوں کی بے بسی کا استغاثہ بہ حضور رسالت مآب پیش کیا۔

احسان و عدل امن کے نعروں کے باوجود
تہذیب ساری جنگ کا میداں ہے اے حضورؐ
مجروح کتنی غیرتِ آدم ہے آج کل
مظلوم کتنی عظمت انساں ہے اے حضور

اخوان المسلمین پر دورِ ابتلا آیا تو اے نیل کی موجو! کے عنوان سے مرثیہ لکھا۔

تم مہدی سوڈان کی دعوت کی امیں ہو
بربر کی شجاعت کی حمیت کی امیں ہو
اور آج تو اخواں کی اخوت کی امیں ہو
تاریخ کی ہر زندہ روایت کی امیں ہو
تم زندہ روایت کو کرو زندہ دوبارہ
اے نیل کی موجو نہ کرو خوف کنارہ

اس طرح سقوط ڈھاکا کا الم ناک واقعہ پیش آیا تو ڈھاکا کے مہاجر سے، سقوط ڈھاکا اور ٹوٹ گئی تلوار جیسی نظمیں لکھیں۔

میرا وطن مجھ سے چھن گیا
یہ آنکھیں دیکھی ہوئی ہیں میری
مگر نگاہیں بدل گئی ہیں
اذیتوں کی مسرتوں کی
تمام راہیں بدل گئی ہیں
شبوں کے نالے ہوئے دگرگوں،
دنوں کی آہیں بدل گئی ہیں

☆☆

1965ء کی جنگ بندی ہوئی تو اس نے آیندہ کا لائحہ عمل ان لفظوں میں پیش کیا۔

اٹھا ہوں ظلم کے خلاف ظلم سے کیسی آشتی
میرا محاذ برقرار رک نہ سکے گی میری جنگ

جنگ ختم ہوتے ہی قوم پھر اپنی روش پر آگئی۔ اتحاد پارہ پارہ ہوگیا۔ اس حقیقت نے اسے مایوس بھی کیا اور دکھی بھی۔

لال خاں
جنگ بند ہوگئی
نعرہ ہائے حیدری کیا ہوئے کدھر گئے
ناگہانی امن یہ جیت ہے کہ ہار ہے
نور ہے کہ نار ہے
فخر ہے کہ عار ہے
کچھ بتاؤ لال خاں
کس لیے لڑے تھے ہم
کیوں یہ سب تباہیاں
کیا تھا اپنا مدعا

☆☆

صحافیوں کا ایک وفد سعودی عرب جارہا تھا۔ اسے

اس وفد کا سربراہ بنایا گیا۔ اس دورے کے دوران اس نے عمرے کی سعادت حاصل کی۔ واپسی میں سیارہ کا سفر حجاز نمبر شائع کیا۔ یہ سفر اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز تھا۔

"اپنا حال تو یہ ہے کہ جب سے خدا کو جانا اور مانا اور رسول پاک کو اپنا محبوب اور رہبر حیات تسلیم کیا ہے تب سے اپنا وجود ایک ہی منزل کی طرف ایک ہی سفر مسلسل میں مصروف ہے۔"

سفر زندگی کی ضرورت اور سفر نامہ ایک فن ہے جس میں مشاہدات بھی ہوتے ہیں اور اسلوب کی دلکشی بھی۔ سفر نامہ لکھنے والا صرف سیاح نہیں ہوتا اس کے لیے ایک اچھا ادیب ہونا بھی ضروری ہے تاکہ سفر نامہ تخیلاتی نہ بن جائے حقیقت سے قریب ہو جائے۔

اب تک ہزاروں سفر نامے لکھے جاچکے ہیں لیکن ان میں وہ قابلِ ذکر ہیں جن میں اسلوب کی دلکشی ہے۔ اس کے سفر نامہ حجاز میں یہ دلکشی موجود تھی۔ یہ سفر ایک ایسی سرزمین کا سفر تھا جس کی کیفیات ناقابل بیان ہیں جس سے ہر زائر کو واسطہ پڑتا ہے لیکن وہ لکھ نہیں سکتا۔ وہ لکھ سکتا تھا اس لیے اس نے وارداتِ قلبی کو الفاظ بنا دیا۔

اس سرزمین پر رہ کر اس نے چند نظمیں بھی کہیں۔ ان میں بھی وہی سوز وگداز ہے۔

حضور کیسے کہوں میں کہاں سے آیا ہوں
دروغ و فکر و فسوں کے جہاں سے آیا ہوں

نعیم صدیقی نے کم از کم تین سفر نامے لکھے۔

دوسرا سفر نامہ انگلستان کا ہے۔ وہ چار ہفتوں کے دورے پر انگلستان روانہ ہوچکا تھا جہاں اسے جلسوں سے خطاب کرنا تھا اور ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شریک ہونا تھا۔ برمنگھم، بریڈفورڈ اور مانچسٹر کی خاک چھاننے کے بعد واپس آیا تو اس نے "خدا کی شان دیکھ آئے" کے عنوان سے سفر نامہ لکھا اور سیارہ میں شائع ہوا۔

تیسرا سفر امریکا کا ہے جو امریکا میں ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں منعقد ہونے والی اسلامی یونیورسٹی کانفرنس میں شرکت کے لیے کیا۔ ان دنوں مولانا مودودی علاج کے لیے امریکا میں مقیم تھے۔ اس سفر کا ماحصل یہ بھی تھا کہ مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

☆☆☆

بچوں کے ادب کی ہر زبان میں اہمیت محسوس کی گئی ہے۔ اردو زبان میں بھی بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں

کیا آپ
موذی مرض شوگر
سے نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے بیزار پریشان فکر مند ہے۔ ہم نے ایک طویل عرصہ دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا ہربلز شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جو کہ انشاء اللہ آپ کو شوگر سے نجات دلا سکتا ہے۔ شفا منجانب اللہ پر ایمان رکھیں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ یاد رکھیں شوگر کی مرض تو انسان کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھوکھلا کمزور بے جان بنا دیتی ہے۔ اگر آپ بھی شوگر سے نجات چاہتے ہیں تو آج ہی فون پر تمام علامات بیان کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ خدارا ہمارا شوگر کورس آزما کر تو دیکھیں

المُسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون اوقات
صبح 9 بجے سے دوپہر 1 بجے تک
عصر 4 بجے سے رات 10 بجے تک
آپ صرف فون کریں شوگر کورس ہم پہنچائیں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

لکھی جاتی رہی ہیں۔ محمد حسین آزاد اور اسمٰعیل میرٹھی کے لیے درسی کتب میں نظمیں اور دوسرا دلچسپی کا مواد اکٹھا کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے بچوں کے لیے باقاعدہ کتابیں لکھیں۔ موجودہ دور میں صوفی تبسم کی بچوں کے لیے نظمیں زبان زد عام ہیں۔ اس نے بھی بچوں کے لیے متعدد کہانیاں لکھیں اور ایسی نظمیں تخلیق کیں جو ان میں نیکی کے جذبات پیدا کریں۔

اسے اس بات کا ادراک تھا کہ بچوں کے ادب میں بچوں کی نفسیات اور ضرورتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کے لیے ایسا ادب تخلیق ہو جو ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے اور ان میں اخلاقی خوبیاں پیدا کرے۔ یہ ادب دراصل بچوں کی تربیت کا حصہ ہوتا ہے۔ نعیم صدیقی کا مقصد بھی یہی تھا کہ ان بچوں کو ایسے فرزندانِ اسلام کی کہانیاں سنائی جائیں جنہیں پڑھ کر ان میں اخلاقی جوہر پیدا ہوں۔

بچوں کے لیے اس نے دو مختصر تصانیف پیش کیں "پھول اور ستارے" اور "نیکی کے سپاہی"۔ پھول اور ستارے میں دس کہانیاں اور ایک نظم شامل ہے۔ نیکی کے سپاہی میں دس صحابۂ کرام کے حالات تحریر کیے۔

ان دونوں کتابوں میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ بچوں کو اوٹ پٹانگ تفریح فراہم کرنے کے بجائے انہیں سادہ لفظوں میں اپنی تاریخ سے واقف کرادیا جائے۔ یہ کہانیاں لکھتے ہوئے اس کے پیش نظر بچہ نہیں مسلمان بچہ تھا۔

جہاں بچوں کی تربیت کا سوال آئے وہاں عورت کا خیال آنا ضروری ہے۔ ایک اچھی ماں ہی اچھی نسل بنا سکتی ہے۔

نعیم صدیقی اس بات کا پورا ادراک رکھتا تھا کہ عورت کی ذمے داریوں سے قومیں سنورتی ہیں اور ان کے غیر ذمے دارانہ رویوں سے بگڑتی ہیں چنانچہ جدید تہذیب کی چکاچوند میں عورت کو سنہری خواب دکھا کر عورت کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس نے اپنی تحریروں میں اسے موضوع بنایا۔

"یہ پیکرِ حسن و لطافت اور یہ سرچشمۂ محبت، نسائی کردار پوری تاریخِ انسانی میں (چند ادوار کے سوا) ہمیشہ مظلوم رہا۔ میں جب بھی اپنے دل کا جائزہ لیتا ہوں، اپنے اندر عورت کے لیے جذبۂ رحم کے سوا کچھ نہیں پاتا۔"

اس نے ایک آدھ نظم یا چند مضامین لکھ کر اپنا فریضہ ادا نہیں کر دیا بلکہ اتنے مضامین لکھے کہ پورا ایک مجموعہ تیار ہو گیا "عورت معرضِ کشمکش میں۔"

اس مجموعے میں معاشرے میں عورت کے مقام و مرتبے۔ اسلام میں اس کی انقلابی اہمیت، مرد و زن کے اختلاط کے نتائج، بے پردگی، خواتین کے حقوق وغیرہ بہت سے موضوعات کا احاطہ کیا۔ اس نے ان مضامین میں قرآن و سنت کی روشنی میں مرد اور عورت کی برابری کو ثابت کیا اور دوسری طرف جدید علوم اور میڈیکل سائنس سے دلائل دے کر مرد اور عورت کے درمیان فرق بھی ثابت کیا کہ برابری کے باوجود دونوں کے حقوق و فرائض مختلف ہیں۔ مغرب کی یلغار سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ عورت مغرب کے دلکش نعروں سے آگاہ ہو اور اسلام کی روشنی میں اپنے کردار سے آگاہ رہے۔

عام طور پر ادیب ان مضامین پر لکھنا کسرِ شان سمجھتے ہیں یا اپنے فرائض میں شامل نہیں سمجھتے لیکن اس نے اپنی ادبی تحریروں میں عورتوں کو خاص جگہ دی۔

اس نے اپنے ایک مضمون میں خواتین یونیورسٹی کی تجویز بھی پیش کی۔ اس یونیورسٹی میں دو شعبوں کی تجاویز اس کے زرخیز ذہن کی علامت ہیں، ایک گھر کا انتظام اور دوسرا تربیتِ اطفال۔

اس کے نزدیک یہ یونیورسٹی اس لیے ضروری تھی کہ دنیا میں قوموں کا بگاڑ دو شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایک دولت کے بارے میں غلط رویہ اور دوسرا عورت کا صحیح مقام متعین نہ کر سکنا اور ان دونوں خرابیوں کی جڑ یہ ہے کہ انسان کا تعلق خدا سے ٹھیک نہیں۔

1971ء میں بھارت نے پاکستان پر حملہ کیا تو اس کا قلم ایک مرتبہ پھر نظمیں اور ترانے اگلنے لگا۔ ریڈیو سے اس کی تقاریر نشر ہوتی رہیں۔ اسی سال اسے حج کی سعادت نصیب ہوئی۔

کثرتِ کار سے اس کی آنکھیں جواب دینے لگی تھیں۔ کام ایسا ویسا نہ تھا۔ سیارہ کا آدھا پرچہ خود اس کے قلم کی کارستانی تھی — صریرِ خامہ، اداریہ، باتیں، آفاق مریخی کا کالم، کتابوں پر تبصرے۔ یہ سب وہ خود کرتا تھا۔ آنکھوں کی دھندلاہٹ بڑھ گئی تو آپریشن کروانا پڑا۔ ڈاکٹروں نے کچھ دنوں کے لیے لکھنے پڑھنے کو منع کر دیا۔ کام رک گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ مالی خسارہ بے انتہا بڑھ گیا اور پرچے کو مجبوراً بند کرنا پڑا۔

1972ء میں ترجمان القرآن کا مدیر مقرر ہوا۔ یہ گویا صحافتی دنیا میں اس کی معراج تھی۔ آئندہ چند برسوں

تک ترجمان القرآن کے ذریعے اس کے افکار تو سامنے آتے رہے لیکن باقاعدہ تصانیف کی شکل میں کوئی بڑا کام سامنے نہ آسکا۔ البتہ اس عرصے میں ترتیب و تدوین کے کچھ ایسے کام کر گزرا کہ اگر وہ نہ کرتا تو شاید یہ کام یونہی پڑے رہ جاتے۔

مولانا مودودی کے قلم سے نکلا ہوا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کے بارے میں بہت سا مواد ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ اسے یکجا کرنے کی ضرورت تھی لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ تفہیم القرآن کی چھ جلدوں کو پڑھنا، دیگر تصانیف کا مطالعہ اور موضوع کی مناسبت سے تحریریں ڈھونڈنا اور پھر انہیں ابواب اور فصول میں مرتب کرنا اور عنوان بندی کرنا، تصنیف سے زیادہ مشکل کام تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ سارا کام اتنی محنت اور سلیقے سے کیا کہ جب سیرت سرور عالمؐ کا عنوان دے کر اس نے تالیف کو مولانا کی خدمت میں پیش کیا تو نہ صرف انہوں نے حیرت کا اظہار کیا بلکہ یہ تالیف اتنی مکمل تھی کہ انہوں نے کسی اضافے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

سیرت سرور عالمؐ کا اصل منصوبہ چار مجلدات کا تھا مگر صرف دو جلدیں مرتب ہوئیں۔ پہلی جلد کا دیباچہ نعیم صدیقی نے تحریر کیا دوسری جلد کا خود سید مودودی نے لکھا۔

اس کام سے نمٹنے کے بعد اس تالیف کے دوران ہی یہودیت اور نصرانیت کے موضوع پر مولانا کی کچھ تحریروں پر اس کی نظر پڑی اور اس کام کو مفید سمجھا کہ ان تحریروں کو ایک کتاب میں جمع کر دیا جائے۔ وہ ان موضوعات کی تلاش میں مشغول ہو گیا۔ جہاں جہاں بھی اس موضوع پر کوئی تحریر ملی ان حصوں پر نشان لگائے، ان کی نقلیں تیار کیں پھر اقتباسات کو مضمون وار جمع کیا گیا۔ متفرق مقامات سے مباحث کے اجزا جمع کر کے کتاب کی شکل دی اور یہودیت و نصرانیت کا عنوان دیا۔ یہ کتاب 1976ء میں پاکستان میں اور بعد میں بھارت میں شائع ہوئی۔

اس کتاب کے پہلے حصے میں دس ابواب ہیں۔ ان میں یہودیت کے بارے میں مواد دیا گیا جبکہ دوسرے حصے میں نو ابواب ہیں جو نصرانیت کے موضوع پر ہیں۔

اس کے دامنِ فکر میں خواتین کی اصلاح و ترقی کی بڑی گنجائش تھی۔ اس کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ تھا کہ کسی قوم کی ترقی خواتین کی ترقی و تربیت سے مشروط ہے کیونکہ یہی وہ گہوارہ ہے جس میں نسلیں پلتی ہیں۔ مغربی تہذیب کی یلغار نے جس طرح عورتوں میں بگاڑ کی صورت پیدا کی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی اصلاح کی جائے۔ اس سلسلے میں اس نے لاتعداد مضامین و مقالات لکھے تھے۔ اب اس نے سوچا کہ ایک ایسا مجموعہ مرتب کیا جائے جس میں خواتین کے لیے لکھی گئی نصیحت آموز نظمیں شامل کی جائیں۔

شاعری کے جنگل میں ایسی نظمیں تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ دن رات کے مطالعے کے بعد اس نے چند شاعروں کا انتخاب کیا۔ ان میں علامہ اقبال، مولانا حالی، جوش، قتیل شفائی، چند ہندو شعرا اور کچھ خواتین شاعرات تھیں۔ ان شاعر و شاعرات کی 45 نظمیں منتخب کیں اور

فتوہ

ایک اصطلاح، جو آٹھویں صدی عیسوی میں "مروہ" کے مترادف کے طور پر ایجاد کی گئی اور اس سے ایک پختہ سن کے آدمی کی صفات مراد ہوتی ہیں۔ فتوہ سے اس چیز کا اظہار مقصود تھا جسے "فتی" یعنی جوان آدمی کی خصوصیت سمجھا جاتا تھا۔ عام طور پر اس اصطلاح کو ان مختلف تحریکوں اور تنظیموں کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے جو عصر حاضر کے آغاز تک تمام مشرقی ممالک کے شہری حلقوں میں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی تھیں۔

فتویٰ

اس سے مراد وہ حکم ہے جو کسی عالم دین نے دیا ہو جسے اصطلاحی زبان میں فقیہہ یا مفتی کہا جاتا ہے۔ لفظ فتویٰ صرف دینی و شرعی مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مسائل بھی وہ جن کا حل عام انسان نہ نکال سکے اور مفتی اپنے علم و فقاہت اور قوت استدلال سے کام لیتے ہوئے ایک حکم واضح و منع کر دے جیسا کہ ایسے مواقع پر کہا جاتا ہے۔ "میں نے اس سے فتویٰ دریافت کیا تو اس نے مجھے یہ فتویٰ دیا۔ چنانچہ فتویٰ "مدلل ثبوت والا جواب" ہوا جو کسی عالم وقت نے اپنے اجتہاد و استنباط کی روشنی میں دیا۔

مرسلہ: زاہد خان، العین یو اے ای

افشاں کے نام سے شائع کروائیں۔

یہ ایک بالکل ہی منفرد نوعیت کا کام تھا۔ عورت اردو شاعری کا اہم موضوع ضرور رہا ہے لیکن عورتوں اور لڑکیوں کی تربیت کے نقطۂ نظر سے اشعار تلاش کرنا الگ بات ہے خصوصاً اس لیے کہ ایسے انتخاب کی کوئی دوسری مثال بھی نہیں ملتی تھی۔

اس دوران ملک میں پھر مارشل لا نافذ ہوگیا۔ انتخابات میں بے قاعدگیوں کے خلاف احتجاج ہوا۔ حکومت نے اسے دبانے کی بہت کوشش کی لیکن یوں لگتا تھا کہ پورا ملک سڑکوں پر آگیا ہے۔ مذہبی جماعتوں کے اتحاد نے اس احتجاج کو اتنا پُراثر بنا دیا کہ حالات قابو سے باہر ہوگئے۔ اس وقت کے چیف آف آرمی جنرل ضیاالحق نے ملک میں مارشل لا نافذ کرکے ذوالفقار علی بھٹو کو گرفتار کرلیا بعد میں انہیں پھانسی دے دی گئی۔

ضیاالحق کی ذاتی پالیسیاں ایسی تھیں کہ اسلامی نظام کا غلغلہ بلند ہوا۔ سرکاری سطح پر سیرت کانفرنس منعقد ہونے لگیں۔ ایسے اجتماعات منعقد ہونے لگے جن میں اسلامی اسکالرز کی شرکت لازمی تھی۔ اسلام آباد میں سیرت کانفرنس ہوئی۔ اس نے بھی شرکت کی اور معرکتہ الآرا مقالہ پڑھا۔ اسی سال 78ء میں ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب میں تعلیمی کانفرنس میں تعلیم کا تہذیبی نظریہ پیش کیا۔ کل پاکستان تعلیمی کانفرنس، تنظیم اساتذہ پاکستان میں "تعلیمی نظام میں تبدیلی کیسے لائی جائے" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ جامعہ پنجاب میں "تعلیمی انقلاب ممکنہ طریقے" کے موضوع پر تعلیمی کانفرنس سے خطاب کیا۔ اسے اکیڈمی آف لیٹرز میں بھی مدعو کیا گیا۔ وہاں اس نے "نظریاتی ریاست میں ادیب کا کردار" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔

1982ء میں وہ ادارۂ معارف اسلامی سے منسلک ہوگیا۔ تحقیقی و تصنیفی کام میں تیزی آگئی حالانکہ اس کی صحت اب گرتی جارہی تھی۔ اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی کہ عمر سے کم دکھائی دیتا تھا لیکن بڑھتی ہوئی عمر تو اپنا کام دکھا ہی رہی تھی۔

وہ غیر جانب دار ممالک کی سربراہی کانفرنس میں بطور صحافی شرکت کے لیے دہلی گیا ہوا تھا کہ گردن کے مہروں میں تکلیف جو غالباً پہلے بھی تھی بڑھ گئی۔ کچھ عرصے کے لیے ہر قسم کی سرگرمیاں معطل ہوکر رہ گئیں۔ ریڑھ کی ہڈی کے کامیاب آپریشن کے بعد چار ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔

☆☆☆

وہ جماعت اسلامی سے وابستہ تھا لیکن اپنی صاف گوئی کی بدولت اپنی پارٹی پر بھی تنقید سے باز نہیں رہتا تھا۔ 1988ء کے انتخابی نتائج سامنے آئے تو اس نے ترجمان القرآن میں لکھا۔

"صرف ایک بحث کہ ہمارا پارٹ بہ حیثیت جماعت اسلامی کیا رہا۔ ہمارے مورچے پیچھے ہی پیچھے کیوں جا رہے ہیں۔ ہمارا اساسی و توسیعی کام کیسا ہے۔ ہمارے اصول پسند تشخص کا کیا حال ہے۔ ہمارے دینی، معاملاتی اور اخلاقی رویوں کا درجہ کیا ہے...... اصلی کام اپنا کڑا احتساب کرکے اور اپنی خامیوں کا کشادہ دلی سے اعتراف کرکے کام کی نقشہ بندی کرنا ہے۔"

جس بات کو اس نے ضروری سمجھا کہہ دیا لیکن بعض لوگوں کو اس کی یہ صاف گوئی ناگوار گزری۔ اس کے خلاف سازشوں کا جال بُنا جانے لگا۔ 1990ء کے انتخابات کا غلغلہ بلند ہوا تو انتخابی مہم اس انداز سے شروع ہوئی جو اس جماعت کا طریقہ کار نہیں رہا تھا۔ شاید اسے عوامی جماعت کا رنگ دینے کے لیے عوامی اور بازاری نعرے لگائے گئے۔ جلسے جلوسوں میں وہ ہلا گلا کیا گیا جو اس جماعت کا شیوہ نہیں تھا۔ جگہ جگہ جو کیمپ لگائے گئے ان میں موسیقی کی دھنوں میں نغمے بجائے گئے۔

جماعت کے بزرگ ارکان نے اس حرکت کو جماعتی تشخص کے خلاف سمجھا۔ اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ ان تمام نمائشی نعروں کے باوجود جب الیکشن میں ناکامی ہوئی تو تنقید نے بلند لہجہ اختیار کیا۔ نعیم صدیقی نے بھی کھل کر تنقید کی اور امیر جماعت (قاضی حسین احمد) کو براہِ راست تنقید کا نشانہ بنایا۔

"امیر جماعت، مولانا مودودی کی فکر سے ہٹتے جارہے ہیں۔ جو کچھ وہ کررہے ہیں اسلامی فکر کے بھی خلاف ہے، جماعت کی روایات کے بھی خلاف ہے اور کارکنوں کے مزاج کے بھی خلاف ہے۔ دستور جماعت کے بھی خلاف ہے۔" اس تنقید سے اس کے خلاف ایک محاذ اٹھ کھڑا ہوا۔ معاملات بڑھے اور تلخیاں بڑھتی گئیں۔ اس کی خدمات اور خلوص کو کسی نے نہیں دیکھا۔ نوبت یہ آئی کہ اسے ترجمان القرآن کی ادارت سے ہٹنا پڑا۔ منصورہ میں جماعت کی دی گئی رہائش گاہ بھی چھوڑ دی۔ ادارۂ معارف

اسلامی سے بھی الگ ہوگیا۔ اب وہ اقبال ٹاؤن میں کرائے کے مکان میں رہنے لگا۔

اس کے ساتھ بہت سے دوسرے اراکین نے بھی جماعت کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ ان سب نے مل کر ایک علیحدہ تنظیم تحریکِ اسلامی کے نام سے بنالی۔ نعیم صدیقی کو تین سال کے لیے اس کا امیر مقرر کردیا گیا۔

جماعت سے علیحدگی کوئی معمولی حادثہ نہیں تھا۔ برسوں کی رفاقت تھی، ترجمان القرآن سے وابستگی لڑکپن کا خواب تھا۔ پوری زندگی نظریات کی جنگ لڑی تھی۔ یہ کوئی کچا دھاگا نہیں تھا۔ اس نے استعفیٰ نہیں دیا لیکن وابستگی بھی نہیں رہی۔ اسے ادیبوں سے گلہ تھا کہ اس کی قدر نہیں کی گئی۔ وہ شاعر تھا، صحافی تھا، ڈراما نگار تھا، انشائیے اس نے لکھے، خاکے اس نے تحریر کیے، فقہی ادب اس نے تحریر کیا، مصنف وہ تھا، مولف وہ تھا، اسکالر وہ تھا، افسانہ نویس وہ تھا لیکن کسی ناقد نے اس پر توجہ نہیں دی۔ یہ معاملہ غیروں کا تھا۔ اسے دکھ ہوا لیکن جان کا روگ نہیں بنا حالانکہ یہ ناقدری بھی اس کی سیاسی وابستگی کی وجہ سے تھی۔ وہ اگر ادیبوں کے کسی دوسرے گروہ میں شامل ہوتا تو اسے صفِ اول میں رکھا جاتا۔ یہ بڑی قربانی تھی جو اس نے دی تھی۔ اس جماعت سے وابستہ ہوکر اپنی شہرت کو داؤ پر لگایا تھا اور اپنوں ہی نے اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور پھر یہ حادثہ عمر کے اس حصے میں پیش آیا جب صدمے جھیلنے کی طاقت نہیں رہتی۔

وہ اس پر بھی شکر بھیج رہا تھا اور تحریکِ اسلامی کے تحت اپنے اسلامی نظریات کو آگے بڑھا رہا تھا۔ اسے تین سال کے لیے امیر مقرر کیا گیا تھا کہ ایک اور تلخ واقعہ رونما ہوگیا۔ اسے ایک سال بعد ہی "امارت" سے الگ کردیا گیا۔ اب کے وہ نہ سنبھل سکا۔

فشارِ خون اور سخت قسم کا اعصابی اضمحلال لاحق ہوگیا۔ صحت کے دنوں میں اس کے معمولات میں شامل تھا کہ صبح کی نماز کے بعد چائے کی پیالی ضرور پیتا تھا۔ ناشتے کے بعد گھر والوں کو اکٹھا کرکے درس قرآن دیتا یا درس حدیث سے سماعتوں کو منور کرتا۔ اس کے بعد تحریکی کاموں میں مشغول ہوجاتا۔ نماز ظہر کے بعد کھانا اور پھر کچھ دیر قیلولہ۔ نماز عصر سے مغرب تک کا وقت احباب سے ملاقات یا ہوا خوری کے لیے مخصوص تھا۔ رات کو دیر تک تخلیقی کام کرتا یا کتب و رسائل کا مطالعہ کرتا۔

گردن توڑ بخار (Meningitis)

وہ بخار جو دماغ کی جھلیوں میں ورم کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس مرض میں گردن سخت ہوجاتی ہے۔ یہ ایک خطرناک بیماری ہے۔ مریض کو اسپتال میں داخل کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ گھر پر پوری دیکھ بھال نہیں ہوسکتی۔ اس کی علامات ہیں کہ سر میں شدید درد ہوتا ہے، ناقابلِ برداشت درد کی وجہ سے مریض چیختا اور چلاتا ہے۔ بے چینی حد سے زیادہ ہوتی ہے، دماغ کام نہیں کرتا۔

مرسلہ: نجمہ فصیح، لاڑکانہ

صحت خراب ہوئی تو معمولات کی عمارت گرگئی۔ زیادہ تر وقت گھر پر گزرنے لگا۔ بستر ہی لکھنے کی میز بن گئی۔ دماغ حاضر ہوتا تو تکیے کے سہارے بیٹھ کر لکھتا یا مطالعہ کرتا۔ مطالعہ کی جو عادت جوانی میں پڑگئی تھی آخر عمر تک قائم رہی۔ جب کرنے کو کچھ نہ ہوتا تو آنکھیں بند کرکے ماضی کے اوراق الٹنے لگتا۔ یہ وقت اس کی خودکلامی کا ہوتا۔ وہ اپنے آپ سے گھنٹوں باتیں کرتا رہتا۔ کبھی کبھی اس کا بیٹا بھی اس گفتگو میں شریک ہوجاتا۔

"میرا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا۔ درس و تدریس ہماری دیرینہ روایت تھی۔ والد شاعر، تایا عربی زبان کے ماہر۔ میں ان کا پاسنگ بھی نہ بن سکا۔ اسکول کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ بارہ تیرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کردیے۔ تعلیم جاری نہ رہ سکی لیکن کثرتِ مطالعہ نے مجھے ہر علم پر حاوی کردیا۔ علامہ اقبال سے ملاقات کے بعد سید مودودی کے زیرِ تربیت میں نے بہت کچھ سیکھا۔ ان کی تربیت اور کثرتِ مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مسلمانوں کی بقا کے لیے سامراج کی حاکمیت سے نجات ضروری ہے۔

میں نے حتی الامکان اچھی اور پاکیزہ شاعری کی۔ نظم اور غزل دونوں کو اختیار کیا۔ ایک عرصہ بعد نعت گوئی کو اپنا شعار بنایا۔ نثر میں افسانہ، خاکہ، ڈراما، تنقید، طنز و مزاح، انشائیہ، سوانح نگاری کو اختیار کیا۔ بچوں کا ادب تخلیق کیا۔

میں نے اسلامی نظریۂ حیات کو دل کی گہرائیوں سے قبول کیا اور پھر زندگی بھر اس پر قائم رہا۔

میں اپنی تصنیف "محسنِ انسانیت" کو اپنی نجات کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ذریعہ سمجھتا ہوں (اس کتاب کے 70 سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے) میرا دوسرا بڑا کام مقالہ نویسی ہے۔ یہ مقالہ جات مختلف النوع ہیں۔ ان میں معیشت، اقبالیات، نسوانیات، تعلیم، شخصیت نگاری اور اسلامی ادب نہایت اہم ہیں۔

اقبالیات میرا ایک بڑا شعبہ ہے۔ میں نے مطالعہ کی طرح اقبال کا مطالعہ کیا۔ فارسی زبان کی مہارت کی وجہ سے مجھے اقبال کو سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ میں اقبال پر تین درجن سے زیادہ مقالات لکھ چکا ہوں۔ اقبال کے فارسی کلام کا کچھ حصہ اردو میں ترجمہ کیا۔ ماہ نامہ سیارہ کے تین اقبال نمبر شائع کیے۔

تاریخ میرا پسندیدہ موضوع رہا۔ مجھے جن دوسرے موضوعات سے دلچسپی رہی ان میں تعلیم کو خصوصیت حاصل ہے۔ میں قرآن کو کتابِ تعلیم سمجھتا ہوں۔ یہی ہمارا نصاب ہے۔

روپیا پیسا میرا کبھی مقصود نہیں رہا۔ مجھے کئی مرتبہ پیش کش ہوئی کہ معاوضے پر کتاب لکھ دیں لیکن میں نے معاوضے پر کبھی کتاب کو ترجیح نہیں دی۔ ایوبی دور میں مجھے پریس لکھوا کر دینے کی پیشکش ہوئی۔ میں نے اس سیاسی رشوت کو ٹھکرا دیا۔ میں نے بلا مبالغہ ہزاروں صفحات لکھے۔ ہر موضوع پر قلم اٹھایا لیکن کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی جو میرے فن کا جائزہ لیتا۔ میں نے جس بات کو درست سمجھا وہ کہا۔ سچ سننے کی کسے توفیق ہے۔ مجھے اس تحریک سے دور کر دیا گیا جس کے قریب آنے کے لیے میں نے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ یہاں تک کہ جوانی بھی، خیر اللہ جس حال میں رکھے۔"

بیماریوں کا سلسلہ چل ہی رہا تھا۔ جماعت سے علیحدگی ایسا صدمہ تھا جس نے اسے نڈھال کر دیا۔ خصوصاً فشارِ خون اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ کئی کئی دن دماغ ناکارہ ہو کر رہ جاتا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جاتی رہتی۔

16 اگست 2001ء کو اس کا پراسٹیٹ کا آپریشن ہوا۔ آپریشن کامیاب ہوا تھا لیکن انفیکشن ہو گیا۔ چند ماہ نہایت تکلیف میں گزرے۔ ابھی اس تکلیف سے پوری طرح نجات نہیں ملی تھی کہ واش روم میں پھسل گیا۔ کولھے کی ہڈی میں فریکچر ہو گیا۔ بڑھاپے کی ہڈی کا جڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپریشن ہوا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اب وہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا۔ ایسی متحرک شخصیت بستر سے لگ کر رہ گئی۔

چھ مہینے ہو گئے تھے۔ وہ بستر سے لگا ہوا تھا۔ 17 اگست 2002ء کو طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ اسے منصورہ اسپتال داخل کرنا پڑا۔

اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا تھا جو ملنے والے آ رہے تھے ان سے وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ "یہ مرض الموت ہے اب میں زندہ نہیں رہوں گا۔"

"آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بس ذرا بخار اتر جائے۔"

"نہیں، مجھے یقین ہو گیا ہے میں کچھ خاص خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں نے 18 اگست کو خواب دیکھا کہ مجھے ویران جگہ چھوڑ آئے ہیں جہاں ایک پُرنور شکل وصورت والے بزرگ آئے اور مجھے وضو کروایا اور تین نمازیں پڑھائیں۔"

20 اگست کو بخار 102 درجے سینٹی گریڈ تک جا پہنچا۔ عموماً غشی طاری رہتی۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتا اور پھر آنکھیں بند کر لیتا۔ اب وہ گھر جانے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔

"مجھے گھر لے چلو میرا گھر بہت خوب صورت ہے۔ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔" ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا اور لواحقین اسے گھر لے آئے۔

اسپتال سے گھر آئے بیسواں دن تھا کہ 24 ستمبر 2002ء کی درمیانی رات کے آخری لمحوں میں سانس اکھڑنے لگی۔

گھر والے جمع تھے۔ ان کے سامنے اٹک اٹک کر چھ کلمے سنائے اور جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔

سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا کہ سورج غروب ہو گیا۔

تمہاری محفل سے اٹھ رہا ہوں مثالِ دردِ چراغ محفل
خیال شعروادب کی شمعیں یہاں فروزاں نہیں کروں گا

ماخذات

نعیم صدیقی، علمی و ادبی خدمات
ڈاکٹر عبداللہ شاہ ہاشمی
مجلہ نقوش، شخصیات نمبر 1955ء

جاپان کا ہنری فورڈ

ابن کبیر

اس نے ایک لوہار کے گھر میں جنم لیا تھا۔ غربت میں پرورش پائی تھی۔ شہر سے دور ایک پسماندہ علاقے میں پروان چڑھا تھا۔ تعلیمی استعداد بھی بہت کم تھی لیکن دل میں حوصلے کا سمندر موجزن تھا۔ کچھ کردکھانے کی لگن تھی، اس نے اپنے خواب کو تعبیر دے ہی دی اور اس کی مصنوعات دنیا کے ہر گوشے میں مقبول ہوتی چلی گئیں۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا بھر میں اس کا نام ہر سیکنڈ میں دس بار لیا جاتا ہے کیونکہ اس نے اپنی مصنوعات کا نام اپنے نام پر رکھا ہے۔

موٹر سائیکل کو مقبولیت دلانے والی شخصیت کا تذکرہ

یہ سو برس پہلے کی بات ہے۔

فیوجی کی برفیلی چوٹی کو بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ پہاڑ کے زیرِ سایہ ایک چھوٹا سا گاؤں آباد تھا۔ گاؤں کے پہلو سے دریا بہتا، جو آگے جا کر جنگلوں میں گم ہو جاتا۔

فیوجی ایک آتش فشاں پہاڑ تھا مگر صدیوں سے یہ شانت اور خاموش کھڑا تھا اور اس کی چپ سے ایک پُراسرار کہانی وابستہ تھی۔

گاؤں کے بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ کبھی یہ ایک غصیلی اور تباہ کن ہوا کرتا تھا جو وقفے وقفے سے لاوا اگل کر اپنے جلال کا اظہار کرتا اور زندگیاں نگلتا رہتا تھا۔ پھر ساتویں صدی کے وسط میں ایک راہب نے اسے سر کرنے کا پُرخطر فیصلہ کیا۔ وہ پہلا موقع تھا جب کسی انسان نے اس ساڑھے تین ہزار میٹر بلند پہاڑ سے ٹکر لی۔

بزرگ بتاتے ہیں کہ جس صبح راہب عصا ٹیکتا ہوا پہاڑ

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی سمت روانہ ہوا، وادی کو دھند نے گھیر رکھا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی دکھائی نہیں دیتی تھی اور گھنے درختوں میں پُراسرار سائے حرکت کر رہے تھے۔

راہب کی روانگی کے بعد۔ کئی روز تک وادی میں دھند چھائی رہی اور گاؤں والے اس اندیشے میں مبتلا ہوگئے کہ شاید راہب زندگی کی بازی ہار گیا ہے۔

اور پھر ایک تاریک رات... زمین لرز اٹھی۔ گاؤں والے صدمے سے زمین پر گر پڑے۔ پہاڑ کی چوٹی پر دھماکوں کی آواز سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے آتش فشاں اپنا قہر نازل کرنے کو ہے مگر پھر... سب پُرسکون ہوگیا۔ ہر سُو خاموشی چھا گئی۔ اگلی صبح جب سورج کی حسین کرنیں دریا کے پانی پر رقص کر رہی تھیں، راہب عصا ٹیکتے ہوئے لوٹ آیا۔

اس کے چہرے پر آفاقی سکون تھا۔ ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ تھی۔

گاؤں والوں نے اسے گھیر لیا۔ ہر زبان پر سوال تھا۔ ہر کوئی جاننا چاہتا تھا کہ اس نے دشوار گزار راستہ کیسے طے کیا؟ راہ میں کئی رکاوٹیں آئی ہوں گی، سنگلاخ چٹانوں نے راستہ روکا ہوگا، آخر وہ کس قوت کے سہارے آگے بڑھتا رہا؟

جواب میں اس نے ایک ہی بات کہی۔ ”میں آگے بڑھتا رہا کیونکہ میں فیصلہ کر چکا تھا۔ حتمی فیصلہ اور یہی فیصلہ میری قوت تھی۔“

لوہار کا بیٹا سوئشیرو ہنڈا یہی کہانی سنتے ہوئے پروان چڑھا۔ یہ قصہ اس کے کم سن ذہن میں رچ بس گیا۔ لاشعور کا حصہ بن گیا..... اور آنے والے برسوں میں اس کی رہنمائی کرتا گیا۔

یہ قصہ اس وقت بھی اس کے ساتھ تھا جب پے در پے حادثات نے اس کی زندگی ادھیڑ ڈالی اور جاپان کو تباہی کی کھائی میں دھکیل دیا۔

☆☆☆

گاؤں میں سائیکلوں کی وہ اکلوتی دکان تھی۔

ایک جانب پرانے ٹائر اور ٹوٹی پھوٹی سائیکلیں پڑی تھیں۔ دوسری طرف چھوٹی سی میز پر اوزار دھرے تھے۔ دکان کا مالک جی ہو ایک گاہک سے کھڑا باتیں کر رہا تھا جو اپنی سائیکل کی مرمت کروانے آیا تھا۔

وہ ایک عام سی صبح تھی۔ سورج آسمان پہ چمک رہا تھا۔ کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ عورتیں باورچی خانوں میں دوپہر کا کھانا تیار کر رہی تھیں اور بچے کچی سڑک پر کھیل رہے تھے۔ جی ہو کا بیٹا اُن بچوں میں شامل نہیں تھا۔ وہ اس وقت دکان میں باپ کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔

اور اُس کا ایک ہی سبب تھا۔ غربت نے اُس کے خاندان کو گھیر رکھا تھا۔ نومبر 1906 کی سرد رات جس جھونپڑی میں اس نے آنکھ کھولی وہاں عسرت کا اندھیرا پھیلا تھا۔ معاشی مسائل کسی عفریت سے کم نہیں تھے جن سے نبرد آزما ہونے کے لیے اُس کی ماں گھر میں کپڑا بُنا کرتی جس سے کچھ پیسے ہاتھ آجاتے۔

باپ خاندانی لوہار تھا مگر سال بھر کاروبار مندا رہتا۔ خال خال ہی بڑے آرڈر ملتے۔ آخرکار حالات اتنے بگڑ گئے کہ اسے لوہا کوٹنے کے کاروبار سے کنارہ کش ہوکر سائیکلوں کی مرمت کا دھندا شروع کرنا پڑا۔ مالی حالات میں کوئی خاص تبدیلی تو نہیں آئی مگر یہ کام پھر بھی بہتر تھا۔ اب جاپان کے دیہی علاقوں میں سائیکلیں استعمال ہونے لگی تھیں۔ جب کاروبار پھیلا تو اس نے بیٹے کو بھی دکان بٹھا لیا... اور اس روز بھی وہ دکان کے کاؤنٹر پر بیٹھا تھا جب گاؤں کا پُرسکون ماحول یک دم گڑگڑاہٹ سے بھر گیا۔

اس اجنبی شور نے سوئشیرو کو چونکا دیا۔ وہ سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ اُس کا باپ اور گاہک سڑک کی سمت دیکھ رہے تھے۔ کچھ میٹر دور دھول کا بادل تھا۔ آواز اُسی سمت سے آرہی تھی۔

”شاید موٹر گاڑی ہے۔“ جی ہو نے کہا۔

”ہاں۔“ دوسرے آدمی نے گردن ہلائی۔ ”کل ہی کوئی بتا رہا تھا کہ میئر نے موٹر خریدی ہے۔ شاید وہی ہو۔“

دھول کا بادل قریب آتا جا رہا تھا۔ آواز بڑھ رہی تھی اور ننھے سوئشیرو کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اُس نے کبھی موٹر گاڑی نہیں دیکھی تھی، بس بڑوں سے اس کا تذکرہ سنا تھا۔

اس کی پُرتجسس نگاہیں کچی سڑک پر ٹکی تھیں اور پھر آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

دھول کے بادل کو چیرتے ہوئے ایک بڑا سا سیاہ ڈھانچا نمودار ہوا جو چار پہیوں پر ٹکا تھا۔ پہیے جو دھیرے دھیرے حرکت کر رہے تھے۔ ڈھانچے کے پچھلے حصے میں ایک پائپ دھواں اگل رہا تھا، جس میں تیل کی بو تھی۔

موٹر گاڑی شور مچاتی ہوئی جی ہو کی دکان کے نزدیک سے گزری۔ کھڑکی سے میئر کا سر دکھائی دیا جو ایک گول پہیہ تھامے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔

جی ہو نے گردن ہلا کر سلام کیا۔ میئر نے مسکراتے ہوئے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

گاڑی دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہی اور پھر دھول کے بادل میں گم ہوگئی۔ جی ہو اور گاہک باتوں میں لگ گئے۔

ننھا سوئشیرو کرسی پر ساکت بیٹھا تھا۔ اُس نے گہری سانس لی۔ ماحول میں تیل کی تیز بو تھی جس میں عجیب سا نشہ تھا۔

سوئشیرو اس بو کے عشق میں مبتلا ہوچکا تھا۔

☆☆☆

اسکول کے بچے آج کل بہت خوش تھے۔ البتہ اساتذہ تھوڑے پریشان رہنے لگے تھے۔ وہ اکثر ایک دوسرے سے سوال کرتے۔ ”آخر ماں باپ کو کیا ہوگیا ہے۔ انہیں اپنے بچوں کی ناقص کارکردگی کی پروا ہی نہیں۔ پہلے تو وہ ایسے نہیں تھے۔“

واقعہ کچھ یوں تھا کہ گاؤں کے ہر خاندان کے پاس اپنے نام کی ایک مہر تھی۔ سالانہ اور ششماہی امتحانات کی رپورٹ دیتے ہوئے اساتذہ بچوں کو ہدایت کرتے کہ جب وہ اسے لوٹائیں تو اس پر خاندانی مہر ثبت ہونی چاہیے ورنہ اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔

اس عمل کا مقصد یہ تھا کہ والدین بچوں کی کارکردگی سے آگاہ رہیں۔

یہ لگ بھگ سو برس پہلے کی بات ہے۔ اُس زمانے میں تربیت کے لیے سزا دینا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ جب باپ بیٹے کو اسکول میں داخل کرواتا تو استاد سے صاف صاف کہہ دیتا۔ ”گوشت آپ کا، ہڈیاں میری! غلطی کرے تو سزا دینے میں کسی قسم کا تامل نہیں کیجیے گا۔“

اساتذہ تو اساتذہ، اس زمانے میں والدین بھی بچوں کو سزا دینے میں تامل نہیں کیا کرتے۔ پڑھائی میں کمزور بچوں کی نہ صرف اسکول میں درگت بنتی بلکہ گھروں میں بھی ٹھیک ٹھاک مار پڑتی۔ اسی وجہ سے بچے امتحانی نتائج سے خوف زدہ رہا کرتے۔

مگر اس برس وہ بہت خوش تھے اور اس کا سبب ذہین سوئشیرو تھا۔

سوئشیرو اوسط درجے کا طالب علم تھا۔ پڑھائی میں اس کا بالکل دل نہیں لگتا۔ کتابیں دیکھ کر اسے چکر آنے لگتے۔ جب استاد کوئی سوال پوچھتا تو گلا خشک ہوجاتا تھا۔ وہ بہ مشکل امتحانات پاس کرتا۔ ناقص کارکردگی کے باعث جہاں اسکول میں سزا کا مستحق قرار پاتا، وہاں باپ کے ہاتھوں بھی خوب پٹائی ہوتی تھی۔

پڑھائی میں دل لگانا تو مشکل تھا، مگر اس کے شاطر ذہن نے اس مسئلے کا ایک دلچسپ حل ضرور تلاش کرلیا۔

اس نے اپنی خاندانی مہر کی نقل تیار کرلی تھی۔ یہ جعلی مہر اس نے ربر کے ایک ٹکڑے پر تیار کی جو سائیکلوں کی دکان پر ملا تھا۔ چند شامیں اس ٹکڑے کو چاقو سے چھیلنے میں صرف ہوئیں۔ کچھ روز بوسیدہ کاغذات پر تجربہ کیا اور پھر مہر کو ایک گھنے پیڑ کی جڑ میں چھپا دیا۔

اب اُس کا اعتماد آسمان کو چھو رہا تھا۔

ششماہی امتحانات میں ناقص کارکردگی کے باعث استاد نے تو اس کا کان مروڑا، مگر جی ہو کو یہ موقع نہیں ملا کیونکہ بیٹے نے باپ کو رپورٹ کارڈ کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔ خاموشی سے پیڑ کی جڑ سے مہر نکالی۔ اسے سیاہی میں بھگو کر رپورٹ کارڈ پر ٹھپا لگایا اور چند روز بعد اسکول کو لوٹا دیا۔

کچھ عرصے تک وہ یہ عمل دہراتا رہا۔ پھر ایک روز چند دوستوں کو بھی راز میں شریک کرلیا۔ وہ اصرار کرنے لگے کہ سوئشیرو انہیں بھی ایک مہر بنا دے۔ کچھ تو اس کے بدلے اسے پھل اور میوے پیش کرنے کو بھی تیار ہوگئے۔

سوئشیرو نے بخوشی یہ کام سرانجام دیا جس کے بدلے اگلے موسم گرما میں اس نے جی کھول کر سیب کھائے۔ سرما میں بادام سے اُس کی جیبیں بھری رہنے لگیں۔

کچھ ماہ تو سکون سے گزر گئے مگر پھر اسکول انتظامیہ کو محسوس ہونے لگا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔ قابل طلبا کے والدین تو اُن سے ملنے آتے ہیں اور اپنے بیٹے کی کارکردگی سے متعلق تفصیلی گفتگو کرتے ہیں البتہ نالائق طلبا کے والدین نے ایک بار بھی اسکول کا رخ نہیں کیا۔

اس ضمن میں ایک میٹنگ ہوئی جہاں بچوں کی رپورٹ کارڈز بھی موجود تھیں۔ ایک کلرک نے مہروں میں ظاہر ہونے والی گڑبڑ کی نشان دہی کی۔ جب باریک بینی سے جائزہ لیا گیا تو واضح ہوگیا کہ یہ کسی ناتجربے کار شخص کی بنائی ہوئی مہریں ہیں۔

جلد ہی انہوں نے مجرم تلاش کرلیا۔ جی ہو کے گھر کارندہ روانہ کیا گیا۔

اس دوپہر لوہار کے بیٹے کے ساتھ اسکول میں جو ہوا سو ہوا، گھر میں جو کچھ اس پر بیتی اس کا ذکر دشوار ہے۔

اگلے تین روز تک وہ بستر پر پڑا کراہتا رہا... اور جھونپڑی کی کھڑکی سے فوجی کی چوٹی تکتا رہا۔

اس واقعے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کبھی دھوکا

دہی سے کام نہیں لے گا۔

اور اُس پُراسرار راہب کی طرح وہ ساری زندگی اس فیصلے پر قائم رہا۔

☆☆☆

عقابی نگاہیں راستے پر ٹکی تھیں اور کُل قوت ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی۔ وہ تیزی سے پیڈل مار رہا تھا اور سائیکل ہوا کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔

یہ مارچ 1917 کی خوشگوار صبح کا ذکر ہے۔ پو پھٹتے ہی سوئیشیر و نے بستر چھوڑ دیا تھا۔ کنویں کے پانی سے نہانے کے بعد اس نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور پھر ایک بار سائیکل کا تنقیدی جائزہ لیا۔ اس کی سیٹ تھوڑی اونچی تھی اور ہینڈل تھوڑا سخت مگر اس کے پاس اُنہیں دُرست کرنے کا وقت نہیں تھا۔ دراصل یہ اس کے باپ کی سائیکل تھی جو اَب گیارہ سالہ سوئیشیر و کے استعمال میں رہتی تھی۔

گھر سے نکلتے ہوئے ماں نے ایک تھیلا تھما دیا جس میں کچھ پھل اور پانی تھا۔ ساتھ ہی کچھ سکے بھی جیب میں ڈال دیے۔ سوئیشیر و نے شکریہ ادا کیا۔ اسے واقعی ان کی ضرورت پڑنے والی تھی کیونکہ اسے بیس میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔

اُس طویل سفر کا سبب امریکا سے تعلق رکھنے والے مشہورِ زمانہ ہواباز آرٹ اسمتھ کی جاپان آمد تھی۔

اُس وقت پوری دنیا میں اسمتھ کے نام کا ڈنکا بج رہا تھا۔ ہلکے ہوائی جہاز اُڑانے میں وہ بے مثل تھا۔ خصوصاً رات کے وقت پرواز میں کوئی اُس کا ثانی نہیں تھا۔ ہواباز ہونے کے ساتھ وہ ایک موجد بھی تھا۔ اپنے ہوائی جہاز کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے وہ نئی نئی اختراع کرتا رہتا تھا۔ اسمتھ ملکوں ملکوں گھوما کرتا تھا جہاں وہ اپنے ہوائی کرتبوں کا مظاہرہ کرتا اور ساتھ ہی سیکھنے کے خواہش مند افراد کے لیے ورک شاپس کا اہتمام کیا کرتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس نے ہوابازی کو ایک فن کی شکل دے دی تھی۔

سوئیشیر و نے کبھی ہوائی جہاز نہیں دیکھا تھا۔ اس نے ریڈیو پر اسمتھ سے متعلق سن رکھا تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ اسمتھ جاپان آرہا ہے تو اس عظیم ہواباز کو دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں پنپنے لگی اور جب یہ اطلاع ملی کہ وہ مرکزی شہر میں ورک شاپ منعقد کر رہا ہے تو ایک نئی خواہش نے سلگنا شروع کر دیا۔ بدقسمتی سے اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ ورک شاپ میں حصہ لے سکتا۔ البتہ وہ ہوائی جہاز کو پرواز کرتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔

اس کی عقابی نگاہیں راستے پر ٹکی تھیں۔ وہ تیزی سے پیڈل مار رہا تھا کیونکہ اسے بیس میل کا فاصلہ طے کرنا تھا۔

بالآخر وہ اس مقام تک پہنچ گیا جہاں اس عہد کا عظیم ہواباز اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والا تھا۔

وہاں خاصے پولیس اہل کار تھے۔ رن وے کے اطراف جنگلا لگا تھا۔ تماش بینوں اور اخباری نمائندوں کی بڑی تعداد جمع تھی۔ سر ہی سر دکھائی دے رہے تھے۔

سوئیشیر و ایک پیڑ پر چڑھ گیا۔ اب رن وے اس کی آنکھوں کے سامنے تھا جہاں ایک چمکتا دمکتا ہوائی جہاز کھڑا تھا۔

اچانک شور بلند ہوا۔ اسمتھ رن وے کے ایک کونے میں کھڑا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ سوئیشیر و نے اپنا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔

اسمتھ اعتماد کے ساتھ چلتا ہوا جہاز تک پہنچا۔ جست لگا کر سوار ہوا۔ کچھ دیر بعد انجن کی گڑگڑاہٹ سنائی دی جس نے نوجوان کو مبہوت کر دیا۔

جہاز میں حرکت ہوئی۔ وہ رن وے پر دوڑنے لگا اور کچھ ہی لمحوں بعد جادوئی منظر کا ظہور ہوا۔ جہاز بلند ہونے لگا تھا۔ اس نے زمین چھوڑ دی۔ اب وہ فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا اور سیکڑوں لوگ عالمِ حیرت میں اسے تک رہے تھے۔

اُس سہ پہر سوئیشیر و کی نظریں بھی جہاز پر ٹکی رہیں جو آسمان میں قلابازیاں کھا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جہاز زمین پر اتر آیا۔ اسمتھ کاک پٹ سے برآمد ہوا۔ پُرجوش تماش بینوں نے تالیوں کے شور میں اس کا استقبال کیا۔

سوئیشیر و بھی پوری قوت سے تالیاں بجا رہا تھا۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ پیڑ کی ایک شاخ پر کھڑا ہے، اگر توازن بگڑا تو وہ زمین پر جا گرے گا۔

ہوائی کرتب کے بعد اسمتھ نے ایک پریس کانفرنس کی۔ میز پر لوہے کا ایک بڑا سا ڈھانچا دھرا تھا جس میں طرح طرح کے پرزے لگے تھے۔

"کسی زمانے میں وسعتوں تک رسائی... پرواز انسان کے لیے ایک ناقابلِ یقین عمل تھا، مگر آج یہ ممکن ہے۔" اس کی آواز میں یقین کی قوت تھی۔ "اور یہ ممکن ہوا سائنس کے طفیل۔ ایک انجن کے طفیل۔" اس نے میز پر رکھے ڈھانچے کو تھپتھپایا۔ "انجن کی قوت نے لوہے کے ڈھانچے کو پر عطا کر دیے۔ اسے اُڑن کھٹولا بنا دیا۔ یہ انجن..."

اسمتھ لوگوں کو انجن اور اس کے پرزوں کے بارے میں معلومات فراہم کر رہا تھا اور سوئیشیر و سراپا کان بنا ہوا تھا۔ اسمتھ کا ایک ایک لفظ روح میں اتر رہا تھا۔

اس کی دھڑکن... اس کی قسمت... اس کی زندگی، انجن کے پرزوں سے جڑ چکی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک خواب تھا جو اُسے بے کل رکھتا، کچھ کر گزرنے کا تقاضا کرتا۔ مگر یہ ممکن نہیں تھا... وہ ایک چھوٹے سے گاؤں کا باسی تھا جو ایک بلند پہاڑ کے پہلو میں واقع تھا۔ وہاں کسی کے پاس گاڑی نہیں تھی۔ کوئی اُسے انجن کے متعلق نہیں بتا سکتا تھا اور یہ بات اِسے مایوس کر دیتی۔

کبھی کبھار اسے لگتا کہ اس کا خواب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو جائے گا مگر پھر ایک واقعہ ہوا۔

فیوجی پہاڑ ہونشو میں دارالحکومت ٹوکیو کے مغرب میں واقع تھا۔ یہ جاپان کی بلند ترین چوٹی تھی۔ مشہور سیاحتی مقام۔ جاپان اور دیگر ممالک سے سیاح یہاں آیا کرتے۔ اصولی طور پر انہیں سوئیشیر و ہی کے علاقے سے گزرنا چاہیے تھا وہ اس پہاڑ تک رسائی کے لیے قریبی قصبے کا نسبتاً طویل راستہ استعمال کرنے پر مجبور تھے، کیونکہ اس گاؤں میں کوئی سڑک نہیں تھی۔ خال خال ہی کوئی یہاں سے گزرتا۔

مگر پھر ایک صبح... اس کی نظر ایک موٹر گاڑی پر پڑی جو پہاڑ کی سمت جانے والے رستے پر کھڑی تھی۔

پندرہ سالہ سوئیشیر و کسی سحر کے زیرِ اثر گاڑی کی سمت بڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ آگے بڑھ رہا تھا تیل کی بو تیزی ہوتی جا رہی تھی۔

بالآخر وہ اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ گاڑی سیاہ رنگ کی تھی۔ اس کے ٹائروں پر کیچڑ لگی تھی۔ بونٹ کھلا ہوا تھا اور ایک شخص سر جھکائے اس میں جھانک رہا تھا۔ حلیے سے وہ شہری معلوم ہوتا۔ اس کے ہاتھ میں چند اوزار تھے جنہیں وہ مختلف پرزوں پر استعمال کرتا اور پھر رک کر کچھ سوچنے لگتا۔

اچانک اس شخص کو اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے سر اٹھایا۔ سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا جس کے چہرے پر حیرت رقم تھی۔

"کیا چاہیے لڑکے؟" اس نے سوال کیا۔

"اوہ... کچھ نہیں... میں تو... اسے دیکھ رہا..." سوئیشیر و بوکھلا گیا۔

آدمی مسکرا دیا۔ "تم نے پہلے کبھی گاڑی نہیں دیکھی؟"

"جی دیکھی تو ہے... مگر میں... دراصل اس کے انجن... کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔" وہ ہکلا رہا تھا۔

"انجن... پہلی بار کوئی ایسا دیہاتی دیکھا ہے جو گاڑی سے زیادہ انجن میں دلچسپی لے۔ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے۔"

اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ کچھ دیر آدمی خاموش کھڑا رہا۔ پھر دوستانہ انداز میں قریب آنے کا اشارہ کیا۔ نوجوان اس کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔

"دیکھو نوجوان، میں کوئی مکینک تو نہیں البتہ تھوڑا بہت کام جانتا ہوں۔" اس نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اور ابھی گاڑی ٹھیک کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر تمہیں دلچسپی ہے تو یہیں کھڑے رہو۔ میں تمہیں اس کے پرزوں کے نام وغیرہ بتا دیتا ہوں۔"

"میں آپ کا ممنون ہوں جناب۔" اس نے مہذب انداز میں کہا۔

اگلے چند منٹوں تک اس آدمی کے ہاتھ اور زبان دونوں ہی حرکت میں رہے۔ ایک جانب جہاں وہ انجن چیک کر رہا تھا وہیں پرزوں کے نام اور ان کے کام کرنے کے طریقوں سے متعلق سوئیشیر و کو آگاہ کر رہا تھا۔

یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ وہ انجن کی جادوگری سمجھ تو نہیں سکتا تھا مگر وہ اُس کی ہر بات غور سے سنتا اور اسے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

"چلو اب اسے چالو کرتے ہیں۔" آدمی نے بونٹ بند کر دیا اور ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔

کچھ دیر بعد فضا پُراسرار گڑگڑاہٹ سے بھر گئی۔ انجن حرکت میں آگیا۔ ماحول میں تیل کی بو پھیلنے لگی۔

"سیر کرنا پسند کرو گے دوست۔" آدمی نے اونچی آواز میں کہا۔

"سیر... کون میں؟" حیرت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"اب یہاں تمہارے علاوہ کوئی اور تو ہے نہیں۔" آدمی ہنس دیا۔ "چلو۔ گاڑی میں آجاؤ۔ تمہیں بتاتا ہوں کہ یہ چلائی کس طرح جاتی ہے۔"

وہ سوئیشیر و کی زندگی کے حسین ترین پل تھے۔ وہ موٹر گاڑی کی آرام دہ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اردگرد کے مناظر دوڑ رہے تھے۔ درخت، جھاڑیاں، ٹیلے... ہر شے پیچھے کی سمت جا رہی تھی اور وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نوجوان پر سرشاری طاری تھی۔ وہ وقت سے ماورا ہوگیا۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ مگر یہ خوشی دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ ایک مقام پر پہنچ کر گاڑی رک گئی۔

''اب مجھے جانا ہوگا دوست۔'' آدمی نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''جی... جی ضرور۔'' اس نے دھیرے سے کہا۔ مایوسی لہجے سے عیاں تھی۔ وہ گاڑی سے باہر آ گیا۔

کچھ دیر وہ اجنبی اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے لب وا ہوئے۔ ''مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے لڑکے؟''

''جی مستقبل!'' وہ چونکا، جیسے خواب سے جاگا ہو۔

''کچھ خاص نہیں۔ وہ، میرے والد کی... سائیکلوں کی دکان ہے۔ لیکن میں... ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا... دراصل...'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ماحول پر خاموشی چھا گئی۔

''تم شہر کیوں نہیں آجاتے؟'' بالآخر آدمی نے کہا۔

''میرا گاڑیوں کا چھوٹا سا کاروبار ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے اپنے گیراج میں ملازمت کا انتظام کر سکتا ہوں۔ تنخواہ تو معمولی ہوگی، مگر تمہیں گاڑیوں کے بارے میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔''

''شہر.. وہ تو بہت...'' نوجوان کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ آدمی نے بات کاٹ دی۔

''یہ لو میرا کارڈ، اس پر میرا پتا ہے۔ شہر آؤ، تو میرے پاس چلے آنا۔ اچھا پھر ملتے ہیں۔ خدا حافظ۔''

گاڑی کے پہیے حرکت میں آئے۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگی۔ سوبشیر و کھڑا دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ غائب ہوگئی۔ پیچھے فقط دھول کا بادل رہ گیا۔

سوبشیر و نے ایک نظر کارڈ کو دیکھا۔

اس پر ایک کنجی چھپی تھی۔ ایسی کنجی جو اس کے خوابوں کا دروازہ کھول سکتی تھی۔

☆☆☆

کثیر المنزلہ عمارتیں۔ بھرے پُرے بازار۔ کشادہ سڑکیں۔.. اور سڑکوں پر دوڑتی برق رفتار گاڑیاں۔

خواب کی سی کیفیت تھی۔ وہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہوا تھا اور اس وقت ایک بڑے شہر میں تھا۔ ایک اجنبی شہر میں۔ جہاں وہ ایک خواب کا تعاقب کرتے آن پہنچا تھا۔

رستے انجان تھے اور گلیاں پُرپیچ، مگر اس کے پاس واپس جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ گھر والوں سے لڑ کر آیا تھا۔ یہ کہہ کر... کہ وہ کچھ بن کر دکھائے گا۔ اس کی جیب میں ایک کارڈ تھا جس پر درج پتا اس کا اکلوتا سہارا تھا۔

اس نے گہری سانس لی اور خود کو شہر کی چہل پہل کے حوالے کر دیا۔ اس نے چند لوگوں سے راستہ دریافت کیا جنہوں نے بڑی شائستگی سے اسے پتا سمجھایا مگر وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر رہا اور سمجھتا بھی کیسے... جن سڑکوں کے وہ نام لے رہے تھے، جن عمارتوں کا حوالہ دے رہے تھے، جن بازاروں کا تذکرہ کر رہے تھے، ان سے وہ یکسر ناواقف تھا۔

جیب میں چند ہی سکے تھے۔ اس نے گھوڑا گاڑی میں سوار ہونے کے بجائے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس فیصلے نے اسے اگلے ساڑھے تین گھنٹے حرکت میں رکھا۔ بالآخر وہ متوسط طبقے کے اس علاقے تک رسائی میں کامیاب رہا جہاں ایک گیراج کے ماتھے پر ٹھیک وہی کنجی بنی تھی، جو کارڈ پر چھپی تھی۔

گیراج کا مالک اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم شہر چلے آؤ گے۔'' لہجے میں تھوڑی پریشانی تھی۔ ''سچ تو یہ کہ میں تمہیں بھول گیا تھا۔''

''لیکن میں آپ کو نہیں بھولا تھا جناب۔'' سوبشیر و نے دھیرے سے کہا۔ ''میں امید کرتا ہوں کہ آپ کے ہاں مجھے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔''

''اوہ ہاں کیوں نہیں مگر...'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر گہرا سانس لیا۔ ''دیکھو نوجوان۔ تمہیں ملازمت دینے میں مجھے کوئی تامل نہیں۔ البتہ میں تمہیں زیادہ تنخواہ نہیں دے سکوں گا۔ دو وقت کا کھانا البتہ تمہیں مل جائے گا۔ رہائش فی الحال اسی گیراج میں ہوگی۔ اور کوئی چارہ نہیں۔ میرا سرونٹ کوارٹر خالی نہیں، ورنہ میں...''

''اس کی ضرورت نہیں۔'' اس نے فوراً کہا۔ ''میں یہاں ٹھیک ہوں۔''

''اوہ، یہ تو اچھی بات ہے۔'' آدمی نے دھیرے سے کہا۔ پھر مسکرایا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ تم شہر چلے آؤ گے۔ مگر اب آ گئے ہو تو میں تمہیں خوش آمدید کہنا چاہوں گا۔''

1922 کے موسم خزاں میں اس دیہاتی کی نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس رات وہ خستہ حال گاڑیوں کے درمیان سویا۔ جس بینچ پر لیٹا تھا اس کے ایک جانب پرانے پرزے پڑے تھے۔ دائیں طرف گریس سے لتھڑے دو انجن رکھے تھے۔ سامنے ایک ڈھانچا تھا اور گریس کی بو پھیلی تھی۔

یہ وہ مقام تھا جہاں اس کی زندگی کے اگلے چند برس گزرنے والے تھے۔ اسی تاریک اور سیلن زدہ مقام پر وہ مستقبل کے خواب بُننے والا تھا۔ ایسے خواب، جن کی تکمیل دنیا بدل دینے کی قوت رکھتی تھی۔

☆☆☆

''تمہاری ملازمت کا دور ختم ہوتا ہے۔ بہ طور ہیلپر اب ہمیں تمہاری ضرورت نہیں!''

آدمی کا چہرہ سپاٹ تھا۔ کمرے میں زرد روشنی پھیلی تھی۔ باہر سے کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دی رہی تھیں اور سوبشیر و کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

گیراج میں اس کا چھٹا مہینا تھا۔ اس دوران وہ تھوڑا بہت کام سیکھ گیا تھا، مگر اب بھی بہت کچھ جاننا باقی تھا۔ وہ یہاں رہنا چاہتا تھا اور ایسے میں گیراج کے مالک کے الفاظ اس کے لیے کسی صدمے سے کم نہیں تھے۔

''مگر جناب میں... ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا...'' اس نے خود کو سنبھالا۔

''میری بات غور سے سنو۔'' آدمی نے تیزی سے کہا۔ ''اب بہ طور ہیلپر ہمیں تمہاری ضرورت نہیں۔''

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیری۔ خواب کی زمین پر دراڑیں پڑنے لگیں۔

اور تب گیراج کا مالک چہکا۔ ''اب مزید ہیلپر کام کرنے کی ضرورت نہیں رہی دوست۔ ہم تمہیں مستقل ملازمت کی پیشکش کر رہے ہیں۔''

اسے لگا جیسے کئی من وزنی بوجھ سینے سے اتر گیا ہو۔ یک دم وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور خوشی سے سرشار محسوس کرنے لگا۔

''ہم تمہاری تنخواہ میں فوراً اضافہ کر رہے ہیں۔ تمہارے رہنے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ گاؤں جانے کے لیے چھٹی بھی...''

گیراج کا مالک نہ جانے کیا کیا کہتا رہا، مگر وہ سن نہیں رہا تھا۔ وہ تو کہیں آسمانوں میں تھا۔ ایک بڑا مرحلہ طے ہو چکا تھا۔

''لیکن ہماری ایک شرط ہے۔'' یہ جملہ اسے لمحۂ حال میں لے لیا۔

''جی کیسی شرط؟'' اس نے سوال کیا۔

''تمہیں ہمارے ساتھ پانچ برس کا معاہدہ سائن کرنا پڑے گا۔''

''اوہ ضرور جناب، کیوں نہیں۔ بتائیں کہاں سائن کروں۔'' اس نے فوراً کہا۔

اس وقت وہ نہیں جانتا تھا کہ کل اُسے اپنے فیصلے پر پچھتانا پڑے گا۔

ابتدائی دو برس تو ٹھیک ہی گزرے۔ اُسے اپنی صلاحیتیں برتنے کا بھرپور موقع ملا۔ پرزوں کو وہ سمجھنے لگا تھا۔ اس دوران گاؤں کے تین چار چکر بھی لگائے۔

گاہکوں سے بھی اچھی سلام دعا ہوگئی اور وہ بھی ایک گاہک ہی تھا جس نے اسے سوچنے کے نئے زاویے عطا کیے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک دوپہر نفیس سوٹ میں ملبوس ایک شخص اپنی گاڑی دھکیلتا ہوا گیراج میں داخل ہوا۔ اسے فوری ایک میٹنگ میں پہنچنا تھا اور گاڑی عین وقت پر خراب ہوگئی۔

چونکہ گاڑی نئے ماڈل کی تھی، اس لیے دیگر مکینکوں نے اُسے ہاتھ لگانے سے انکار کر دیا البتہ اس کی پریشانی دیکھتے ہوئے سوبشیر و نے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔

بونٹ اٹھاتے ہی وہ چکرا گیا۔ انجن بالکل الگ قسم کا تھا۔ کچھ ایسے پرزے بھی تھے جن کے ناموں سے وہ ناواقف تھا۔ کچھ دیر تک وہ یوں ہی کھڑا رہا پھر اپنے وجدان پر بھروسا کرتے ہوئے اس نے کام شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے اُسے تاروں اور پرزوں کے درمیان تال میل نظر آنے لگا۔

پندرہ منٹ بعد گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔

آدمی نے اس کے معاوضے سے تین گنا زیادہ رقم ادا کی اور اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''تم بہت باصلاحیت ہو۔ یہ گیراج تمہاری پرواز کے لیے ناکافی ہے۔ تمہیں نئے آسمان تلاش کرنے ہوں گے۔''

تعریف کے لیے نوجوان نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ شاید وہ چند روز میں یہ واقعہ بھول جاتا مگر آٹھ دن بعد... ایک اور شخص اپنی جدید ماڈل کی گاڑی لیے گیراج میں آیا۔

حسب روایت دیگر مکینکوں نے ہاتھ اٹھا لیا۔ اس پر وہ شخص بہت برسا اور سب کو بے نقط سنائی۔ ایسے میں سوبشیر و آگے بڑھا۔ وجدان نے اس بار بھی ساتھ دیا۔ کچھ دیر بعد گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔

جاتے ہوئے اس نے سوبشیر و کا کاندھا تو نہیں تھپتھپایا مگر یہ ضرور کہا کہ اُسے اپنی صلاحیتوں کو نئی ماڈل کی گاڑیوں سے ہم آہنگ کرنا ہوگا۔

''اگر تم لوگوں نے ایسا نہیں کیا تو چند برس بعد تم سب بے روزگار ہو جاؤ گے۔'' اس نے بہ آواز بلند کہا۔

یہ جملہ سینے میں کھب گیا جس نے جلد ایک خدشے کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

شغل اختیار کرلی۔ وہ سپنوں سے لدا ہوا شہر آیا تھا، اگر وہ بے روزگار ہوگیا تو کس منہ سے گاؤں لوٹے گا۔ رات بھر وہ اس بارے میں سوچتا رہا۔

جب سورج کی پہلی کرن ٹوکیو کے افق پر نمودار ہوئی، وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرچکا تھا۔

☆☆☆

گیراج کے باہر ایک نئی دنیا تھی۔

عمارتیں آسمان چھونے کی جستجو میں تھیں۔ محلے اور گلیوں میں کاروبارِ زندگی جاری تھا اور ٹریفک سڑکوں پر دوڑ رہا تھا۔

وہ اپنی شامیں گیراج ہی میں گزارا کرتا تھا۔ اب جو باہر آیا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سڑکوں پر موجود بیشتر موٹریں نئی ماڈل کی ہیں۔ پرانی ماڈل کی گاڑیاں کم ہوتی جارہی تھیں۔

شہر کا چکر لگاتے ہوئے وہ پوش علاقے میں آن پہنچا۔ وہ پہلے بھی یہاں آچکا تھا مگر اس بار ایک مقصد اسے یہاں کھینچ لایا تھا۔ مزید سیکھنے کی خواہش۔ آگے بڑھنے کی آرزو۔

پوش علاقے میں کئی بڑے شوروم تھے جن میں جدید ٹیکنالوجی کی حامل چمکتی دمکتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ایسے گیراج بھی تھے جہاں ان گاڑیوں کی مرمت کی جاتی۔

اس نے ایسی ہی ایک ورکشاپ کا چکر لگایا... اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ مستری روایتی طریقوں کے بجائے اب جدید انداز میں، نئے اوزاروں کے ساتھ گاڑیوں کی مرمت کرتے ہیں۔

چند شاموں تک وہ یونہی شہر میں گشت کرتا رہا۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ دنیا بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور اگر اس نے رفتار کا ساتھ نہیں دیا تو وہ پیچھے رہ جائے گا۔

ایک روز ہمت کرکے اُس نے گیراج کے مالک سے بات کرلی۔ ”میں آپ کا ممنون ہوں، مگر اب میں یہ ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔“

مالک نے گہری نظر اس پر ڈالی۔ پھر کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”نوجوان‘ جب تم آئے تھے، ہمارا کاروبار بہت اچھا جارہا تھا مگر اب دھندا خاصا مندا ہے۔ مالیاتی بحران سر اٹھانے لگا ہے جس نے مجھے تھوڑا چڑچڑا بنادیا ہے۔“

اس نے ایک لمحہ کا توقف کیا اور پھر بات کا سرا پکڑا۔ ”تم نے ہمارے ساتھ پانچ برس کا معاہدہ کیا تھا جسے پورا ہونے میں دو سال باقی ہیں۔ میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ البتہ تمہاری تنخواہ میں معمولی اضافہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔“

”لیکن میں مزید سیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے ہلکا سے احتجاج کیا۔ ”اور یہاں رہتے ہوئے...“

”میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“ مالک نے بات کاٹ دی۔ ”میں تمہارے جذبے کا احترام کرتا ہوں، مگر ہمارے بھی چند مسائل ہیں۔ سنو، میں تمہیں ایک تجویز دیتا ہوں۔ شہر میں کئی ایسے ادارے ہیں، جو موٹر مکینکوں کے لیے تربیتی پروگرام کا اہتمام کرتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم کسی ایسے ہی ادارے میں شام کی شفٹ میں داخلہ لے لو۔ تربیتی عرصے کے دوران تمہاری اس معاہدے سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔“

بات سوئیشیرو کے دل کو لگی۔ اگلے ہی روز اس نے ایک چھوٹے سے ادارے میں داخلہ لے لیا مگر جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہاں روایتی باتیں سکھائی جارہی ہیں۔ پھر کسی نے مشورہ دیا کہ اسے موٹر سازی کی صنعت سے منسلک کسی بڑے ادارے کا رخ کرنا چاہیے۔

”جو لوگ جدید ٹیکنالوجی استعمال کررہے ہیں وہی تمہیں اس سے متعلق بتاسکتے ہیں۔“

”ہاں یہ درست ہے۔“ اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

بدقسمتی سے کسی بڑی کمپنی کے پاس ایک ان پڑھ موٹر مکینک کی تربیت کے لیے وقت نہیں تھا۔ انہیں تو اعلیٰ تعلیم یافتہ انجینئر درکار تھے۔ سوئیشیرو جس کمپنی کے پاس گیا وہاں سے انکار ہی سننے کو ملا۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ آخر کار ایک نسبتاً نئی کمپنی کا مالک مویان اُسے رات کی شفٹ میں ملازمت دینے پر راضی ہوگیا۔

سوئیشیرو نے فوراً ہامی بھرلی۔ ”کوئی مسئلہ نہیں۔ میں جہاں ملازم ہوں، وہ گیراج شام میں بند ہوجاتا ہے۔ رات میں یہاں آجایا کروں گا۔“

”اور نیند کب پوری کروگے؟“ کمپنی کے مالک نے سوال کیا۔

وہ مسکرایا۔ ”نیند پوری کرنے کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔“

اگلے دو برس جدوجہد سے عبارت تھے۔ اس نے کڑی محنت کی۔ دن رات ایک کردیے۔ وہ کئی کئی گھنٹوں کھڑا رہتا۔ فقط کچھ پہر ہی سو پاتا اور خواب میں بھی اسے گاڑیوں کے انجن ہی دکھائی دیتے۔

وقت گزرتا رہا۔ موسم بدلتے رہے اور فیوجی کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والے نوجوان کی صلاحیتوں میں نکھار آتا گیا۔ اتنے پیسے بھی ہاتھ آگئے کہ وہ آٹوموبائل انڈسٹری کے چند بڑے سیمینارز میں شرکت کرسکے۔ چند میں تو اسے عملی تجربے کا بھی موقع ملا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اب فقط ایک مکینک نہیں تھا، بلکہ ایک انجینئر کی طرح سوچنے لگا تھا۔ انجن کے پرزے اس سے بات کرتے تھے۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ کون سا پرزہ مشکل میں ہے اور کون سے پرزے کی وجہ سے انجن پر منفی اثر پڑ رہا ہے۔

اس کا ذہن فقط انجن کی درستی تک محدود نہیں رہا، بلکہ اب وہ انجن کی تیاری کے مراحل، پرزوں کو ڈھالنے کے عمل کو بھی تھوڑا تھوڑا سمجھنے لگا تھا۔ اس عمل میں پختگی کے لیے اس نے معاہدہ پورا ہونے کے بعد مزید ایک برس ٹوکیو میں قیام کا فیصلہ کیا۔

یہ عرصہ اس نے آٹوموبائل کمپنی کے ان شعبوں میں گزارا جہاں گاڑیوں کے پرزے تیار کیے جاتے۔ اس نے ان مشینوں کا جائزہ لیا جو یہ پرزے ڈھالا کرتیں۔

الغرض 22 سالہ سوئیشیرو نے خود کو آٹوموبائل انڈسٹری میں جھونک دیا تھا۔

☆☆☆

فیوجی کی چوٹی برف سے ڈھکی تھی۔ دریا جم گیا۔ صبح کے وقت اتنا پالا پڑتا کہ کھلی فضا میں آنا محال ہوجاتا۔

سوئیشیرو گاؤں لوٹ آیا تھا، نئی امیدوں، نئے ولولوں کے ساتھ۔ وہ اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا۔ گزشتہ چھ برسوں میں اتنی رقم اکٹھی کرلی تھی کہ گاؤں میں ایک ورکشاپ شروع کرسکے۔

”زبردست خیال ہے۔“ باپ نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ ”اب تو ہمارے گاؤں میں بھی چار چار موٹریں ہیں۔ یہی معاملہ ساتھ والے گاؤں کا ہے۔ قصبے میں تو اب باکثرت موٹر گاڑیاں نظر آنے لگی ہیں مگر مرمت کے لیے مالکان کو شہر کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ اگر گھر کے قریب ہی گیراج ہوگا تو کوئی شہر کیوں جائے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ گیراج شروع کرنا زبردست خیال ہے۔“

”میں بھی ایسا ہی سوچتا ہوں۔“ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ مسکرایا۔ مگر حقیقتاً وہ یہ نہیں سوچ رہا تھا۔ گیراج تو بہانہ تھا، اصل میں تو وہ جدید قسم کے پرزے تیار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے سرمایہ درکار تھا۔ اگر گیراج ہوگا، تو گزر بسر ہوتی رہے گی۔ کچھ رقم اکٹھی ہوجائے گی، بس یہی سوچ کر اس نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

”میرے پاس بھی ایک زبردست منصوبہ ہے۔“ ماں چائے کی کیتلی لیے کمرے میں داخل ہوئی جس سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ”ہم نے تمہارے لیے ایک لڑکی دیکھی ہے۔“

”مگر ابھی...“ وہ بوکھلا گیا۔ ”میرا مطلب ہے کہ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“

”جلدی! کیا تم مذاق کررہے ہو۔“ اس کے باپ نے ہنستے ہوئے چائے کی چسکی لی۔ ”تم 22 برس کے ہوگئے ہو۔ میری تو انتہائی کم عمری میں شادی ہوئی تھی۔ تمہاری ماں تو شادی کے وقت فقط 15 برس کی تھی۔“

”اب چھوڑیں بھی۔“ عورت دھیرے سے مسکرائی۔

سوئیشیرو نے اپنی ماں کو غور سے دیکھا۔ گو اس کے حسین چہرے پر جھریاں ظاہر ہونے لگی تھیں، موسم کے تھپیڑوں نے جلد کو گہنا دیا تھا مگر وہ اب بھی بے حد خوبصورت تھی۔ پھر وہ اپنے باپ کی جانب متوجہ ہوا جس کی رنگت پر تمازت کے اثرات واضح دیکھے جاسکتے تھے، جس کے ہاتھ شب و روز کی محنت سے سخت ہوگئے تھے، جس کی ایڑیاں پھٹ گئی تھیں مگر وہ مسکرانے کا ہنر نہیں بھولا تھا۔

اس کا دل ماں باپ کے لیے محبت سے بھر گیا۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ”میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ ان برسوں میں آپ لوگوں کی بہت کمی محسوس ہوئی۔“

دونوں نے اپنے بیٹے کی جانب دیکھا۔ وہ جوان اور محنتی تھا اور دنیا بدلنے کی قوت رکھتا تھا۔

”ہم نے بھی تمہاری بہت کمی محسوس کی بیٹا۔“ عورت نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

چوٹی برف سے ڈھکی تھی۔ باہر پالا پڑ رہا تھا مگر محبت کا لافانی جذبہ ان تین محنت کشوں کو حدت فراہم کررہا تھا۔

☆☆☆☆

وقت کو جیسے پر لگ گئے۔

کاروبار جلد ہی جم گیا۔ جوں ہی خبر پھیلی کہ ٹوکیو سے تربیت حاصل کرنے والے نوجوان نے اپنا گیراج کھولا ہے، گاہک اپنی گاڑیوں کا علاج کرانے اس کے پاس آنے لگے۔

ماہر تو تھا ہی۔ جو ایک بار اس کے پاس آتا اسے پھر کہیں جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس نے دو ملازم بھی رکھ لیے جنہوں نے اس کی تربیت میں جلد ہی یہ کام سیکھ لیا۔

تین برس میں اس نے اتنا سرمایہ اکٹھا کرلیا کہ ورکشاپ کے ساتھ والی دکان خرید سکے۔ مگر اس حصے کو وہ گاڑیوں کی مرمت کے لیے نہیں بلکہ پرزوں کی تیاری کے لیے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کام کے لیے جو مشینیں درکار تھیں وہ خاصی مہنگی تھیں۔ اسے ایک برس مزید انتظار کرنا پڑا۔ جب مطلوبہ رقم اکٹھی ہوگئی تو اس نے شہر کا رخ کیا اور ایک ٹرک میں مشینیں لاد کر گاؤں لے آیا۔

گو اس نے کسی کو اپنے منصوبے کی بھنک نہیں پڑنے دی مگر چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں کہ لوہار کا بیٹا کچھ انوکھا کرنے جا رہا ہے۔

اسی عرصے میں اس کی شادی ہوئی۔ اس کی بیوی سوچی ایک سگھڑ اور سمجھ دار لڑکی تھی۔ اس نے چند جماعتیں پڑھ رکھی تھیں۔ سوچی کی آمد نے زندگی میں توازن پیدا کیا۔ اگلے ہی برس گھر میں معصوم قلقاریاں گونجنے لگیں۔ قدرت نے اسے بیٹے سے نوازا تھا۔

بچے کی آمد نے اس کے ماں باپ کو ایک کُل وقتی مصروفیت سونپ دی۔ دادا دادی بن کر وہ بہت خوش تھے۔ دن بھر اپنے پوتے کے اردگرد گھومتے رہتے۔

یوں وقت گزرتا رہا۔

اب سوئشیرو پرزوں کی تیاری میں مہارت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے چند پرزے ٹوکیو کی مختلف کمپنیوں کو فروخت کرنے کی بھی کوشش کی مگر بات نہیں بنی۔ کمپنی مالکان کا کہنا تھا کہ اس کے تیار کردہ پرزے کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں مگر انہیں اُن کی ضرورت نہیں کیونکہ فی الحال انہیں اپنے تیار کردہ انجنوں سے متعلق کسی شکایت کا سامنا نہیں۔

"مشکل نوجوان مشکل..." ایک بڑی کمپنی کے ڈائریکٹر نے اس سے کہا۔ "تمہیں پہلے ایک مشکل تلاش کرنی ہوگی۔ ایسی مشکل، ایسا مسئلہ، جس نے آٹوموبائل انڈسٹری کو پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہو۔ اور پھر تمہیں اس کا حل تلاش کرنا ہوگا۔ ایسا پرزہ جو بگاڑ کو فوراً ترتیب میں لے آئے۔ تب ہی وہ کارآمد ہوگا۔ جاؤ پہلے مشکل تلاش کرو۔"

بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے چند روز ٹوکیو میں قیام کیا۔ مختلف کمپنیوں کے دورے کیے۔ چند ماہرین سے ملاقات کی۔ اس دوران اسے یورپ سے آئے کچھ انجینئرز سے بھی تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔

اس سرگرمی کا کُل مقصد ایک مشکل کی تلاش تھی۔ ایسی مشکل جس نے آٹوموبائل کمپنی کی ناک میں دم کر رکھا ہو۔

اور وہ کامیاب رہا... اس نے ایک مشکل ڈھونڈ نکالی۔

اس زمانے میں ٹیوٹا کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کی گاڑیوں کی بڑی مانگ تھی، تاہم اس کمپنی کو ایک مسئلے کا سامنا تھا۔ ان کے نئے ماڈل کا پسٹن صحیح کام نہیں کر رہا تھا جس کی وجہ سے مسلسل شکایت موصول ہو رہی تھیں۔

سوئشیرو نے ٹیوٹا کی گاڑیوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا۔ یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ پسٹن کیا مسئلہ پیدا کر رہا ہے۔ پرزوں سے بات کرنے کا وہ ہنر جانتا تھا، اس لیے جلد اندازہ ہوگیا کہ پسٹن کو انجن سے ہم آہنگ ہونے میں کیا مشکل پیش آرہی ہے۔

اگلے چند روز اس نے مختلف انجینئرز اور ماہرین سے گفتگو کرنے میں صرف کیے۔ گاؤں لوٹتے وقت وہ بہت پُرجوش تھا۔ کچھ کر گزرنے کی آرزو سے دل لبریز تھا۔

جب وہ گاؤں لوٹا، موسم میں تبدیلی کی ابتدائی علامات ظاہر ہونے لگی تھیں۔

☆☆☆

بادل گرج رہے تھے۔ آسمان پر روشنیاں ظاہر ہوئیں۔ بادلوں میں حرکت ہونے لگی۔ کچھ ہی دیر میں بارش شروع ہوگئی۔ سب جل تھل ہوگیا۔

بازاروں میں ہلچل مچ گئی۔ گلیاں خالی ہونے لگی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے مگر کونے والی دکان اب تک کھلی تھی۔ کھڑکی سے روشنی جھانک رہی تھی۔ شاید کوئی آج بہت مصروف تھا۔

عورت دروازے میں کھڑی تھی۔ بچہ گود میں تھا۔ چھت پر بارش جل ترنگ بجا رہی تھی اور اس کا شوہر اب تک نہیں لوٹا تھا۔ اس کے لوٹنے کی امید بھی نہیں تھی کیونکہ وہ ایک اہم منصوبے پر کام کر رہا تھا۔

برسات کی اس شام سوئشیرو چھوٹی بڑی مشینوں سے گھرا تھا۔ ایک جانب میز تھی، جس پر کاغذات رکھے تھے۔ ان پر کچھ خاکے بنے تھے۔ کچھ فارمولے درج تھے۔ ایک جانب اوزار دھرے تھے۔ ہاتھ اس کے گریس سے سنے تھے۔

وہ ٹیوٹا کے لیے پسٹن تیار کر رہا تھا۔ ایسا پسٹن جو کمپنی کے نئے ماڈل میں پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو سلجھا دے۔

گزشتہ چند ماہ سے اس نے خود کو اس منصوبے کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ دن رات ایک کر دیے۔ نیند خود پر حرام کر دی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنے منصوبے کے بے حد نزدیک پہنچ گیا ہے۔

سوئشیرو اسی ہفتے کام مکمل کرنا چاہتا تھا مگر شاید قدرت کے منصوبے کچھ اور تھے۔

کچھ دیر بعد بارش نے طوفانی شکل اختیار کر لی۔ چوٹی

سے آنے والا پانی وادی میں پھیلنے لگا۔ دریا میں طغیانی آگئی۔ ہواؤں نے یلغار کر دی۔

آفت کے ان لمحات نے ٹرانسمیٹر پر حملہ کیا۔ وہ ایک دھماکے سے اُڑ گیا۔ سوئشیرو کا گیراج اندھیرے میں ڈوب گیا۔

اس نے گہری سانس لی اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر تاریکی میں بارش کا شور تھا۔ گلی دریا کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ٹرانسمیٹر کی جلد درستی کا امکان نہیں تھا کیونکہ راستے مسدود ہوگئے تھے۔ اس کے کام میں تعطل پیدا ہوگیا تھا۔

سوئشیرو بالکل خاموش کھڑا رہا۔ چہرے پر پریشانی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ جلد یہ تاریک رات ختم ہو جائے گی۔ سورج نکل آئے گا، جس کے بعد ہر سُو روشنی ہوگی۔

☆☆☆☆

برسات کا موسم چلا گیا اور ہر بار کی طرح اپنے پیچھے ہریالی چھوڑ گیا۔ پیڑ کچھ اور سبز ہوگئے۔ ٹہنیاں جھولنے لگیں۔ فصلیں لہرانے لگیں۔

اس کا منصوبہ مکمل ہوگیا تھا۔ اس نے پسٹن تیار کر لیا۔ اب اسے ٹوکیو کا سفر کرنا تھا تاکہ اسے ٹیوٹا کارپوریشن کے سامنے پیش کر سکے۔

روانہ ہونے سے قبل وہ قصبے کے ٹیکنکل کالج گیا۔ وہ پروفیسرز کے سامنے یہ پسٹن رکھنا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس کی حوصلہ افزائی کریں گے، شاید چند مفید مشورے بھی دیں مگر کالج کے پرنسپل نے یہ کہتے ہوئے کہ ہمارے پاس ان فضول باتوں کے لیے وقت نہیں، اُسے دروازے ہی سے لوٹا دیا۔

اسے دکھ تو ہوا مگر اس نے مایوس ہونے کے بجائے آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ بیگ کاندھے پر ڈالا۔ ضروری کاغذات اکٹھے کیے اور ٹوکیو روانہ ہوگیا۔

اگلے روز وہ ٹیوٹا کارپوریشن میں تھا۔ سامنے کمپنی کا ڈائریکٹر اور چند انجینئرز بیٹھے تھے۔ میز پر پسٹن رکھا تھا۔

"بکواس، بالکل بکواس!" ڈائریکٹر نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ "اس پرزے کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے، پہلے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ تمہارا گفتگو کا ڈھنگ، لہجہ الغرض پوری تقریر بہت ہی ناقص تھی۔ لگتا ہے کہ تم بالکل ہی ان پڑھ ہو۔"

سوئشیرو کے دل پر جیسے گھونسا لگا۔ وہ اتنے تلخ ردِعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ "جناب میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے ہے۔ مالی وسائل کی وجہ سے میں تعلیم مکمل نہیں کر سکا، مگر میں نے عملی..."

"تم نے کبھی کالج کی شکل نہیں دیکھی، اور یہاں یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے انجینئرز کو یہ باور کروانے چلے آئے کہ تمہارا یہ پسٹن، جسے تم نے گاؤں کے ایک گیراج میں تیار کیا ہے، بہت کارآمد ہے۔ ٹیوٹا کو چاہیے کہ اسے فوری خرید لے۔ کمال ہے!" ڈائریکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ پرزہ خود اپنے آپ کو ثابت کر دے گا۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"تم دیہاتی آدمی ہو۔" ڈائریکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "نہ کبھی یونیورسٹی گئے، نہ کسی بڑی کمپنی میں کام کیا۔ شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ شے، جسے تم پسٹن کہہ رہے ہو، دیکھنے ہی میں کتنی بدنما ہے۔"

"میرے خیال میں ہمیں مسٹر ہنڈا کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کرنا چاہا۔" یہ جملہ ایک نوجوان انجینئر کی زبان سے ادا ہوا۔ "ہم جانتے ہیں کہ ٹیوٹا کے نئے ماڈل کو چند پریشانیوں کا سامنا ہے۔ اگر انہوں نے پسٹن تیار کیا ہے تو ہمیں انہیں اسے آزمانے کا موقع دینا چاہیے۔"

سوئشیرو نے نوجوان کی سمت دیکھا۔ اس کا چہرہ اسے مانوس لگا۔

"مگر تم جانتے ہو کہ یہ کام نہیں کرے گا۔" انجینئرنگ ہیڈ نے کہا۔

"جانتا ہوں۔" نوجوان نے جواب دیا۔ "لیکن میں اس دیہاتی کو موقع دینا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے بہ خوبی اندازہ ہے کہ یہ شخص کتنا محنتی ہے۔"

وہ سوئشیرو کی سمت دیکھ کر مسکرایا اور تب اس نے پہچان لیا۔ وہ مویان تھا۔ جس زمانے میں وہ ٹوکیو میں ملازمت کر رہا تھا، وہ اسی شخص کی کمپنی میں رات کی شفٹ میں کام کیا کرتا تھا۔

"میں مسٹر ہنڈا کو ٹیسٹنگ ڈیپارٹمنٹ لے جا رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے نوجوان نے پسٹن اٹھا لیا۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے اس نے سوئشیرو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"میں آپ کا شکر گزار ہوں مسٹر مویان۔" اس نے باہر آ کر کہا۔ "شاید آپ کو یاد ہو میں آپ کی کمپنی..."

"یاد ہے۔" نوجوان نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میں تمہیں یہ بھی بتانا چاہتا ہوں کہ یہ کام نہیں کرے گا۔"

"میں نے بہت محنت کی ہے جناب۔"

"یہی اصل نکتہ ہے۔" آدمی نے دھیرے سے کہا۔ "تم نے محنت کی ہے، اسی لیے میں تمہیں یہ موقع دے رہا ہوں۔ اسے ٹیسٹ کرو۔ دیکھو اس میں کہاں خامی ہے۔ اور لوٹتے ہی پھر کام میں لگ جاؤ۔ اگلی بار پوری تیاری سے لوٹنا۔"

وہ آدمی صحیح تھا۔ پسٹن کام نہیں آیا۔ سچ تو یہ ہے کہ سوئشیرو اسے بہ مشکل انجن میں فٹ کرسکا اور جب فٹ ہوگیا تو اس نے کام کرنے سے انکار کردیا۔

اس تجربے کی ناکامی نے سوئشیرو پر مایوسی طاری کر دی۔ اسے دنیا تاریک دکھائی دینے لگی۔ آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ایسے میں ایک شفیق ہاتھ اپنے کاندھے پر محسوس ہوا۔

وہی آدمی سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ "تمہاری کوشش اچھی تھی دوست۔ اس ناکامی سے تمہیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا۔ میرے ساتھ لنچ کرو۔ امید ہے ہم کچھ نئے آئیڈیاز ایک دوسرے سے بانٹ سکیں گے۔"

ظہرانے کے دوران آدمی نے اس سے کہا۔ "دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم جانتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور یہ سب سے اہم ہے۔ تو اس کام میں جٹ جاؤ۔ خود میں لچک رکھو۔ اگر کوئی مسئلہ پیدا ہو، تمہارا طریقہ ناکام رہے تو نیا طریقہ اپناؤ۔ تمہارا مقصد مسئلے کا حل ہونا چاہیے، چاہے طریقہ کوئی بھی ہو۔"

اس رجائیت پسند شخص کی صحبت نے سوئشیرو پر انتہائی مثبت اثرات مرتب کیے۔ لوٹتے وقت وہ بہت پُرجوش تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ سمجھ چکا تھا، اس نے کہاں غلطی کی۔ اگلی بار وہ یہ غلطی نہیں دہرانے والا تھا۔

اس کے شب و روز گیراج میں گزرنے لگے۔ جلد ہی اسے احساس ہوگیا کہ یہ منصوبہ دو چیزوں کا متقاضی ہے۔ اسے مزید مشینیں اور چند انجن خریدنے ہوں گے، جن کے لیے سرمایہ درکار ہوگا۔ ساتھ ہی چند اسسٹنٹ بھی رکھنے ہوں گے۔ اپنے ارادے کو ایک مشن کی شکل دینی ہوگی۔

"میں ایک کمپنی قائم کرنا چاہتا ہوں۔" ایک روز سوئشیرو نے اپنے باپ سے کہا۔

بوڑھا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تمہیں بڑی جگہ کی ضرورت ہوگی۔" کچھ دیر وہ خاموش رہا۔ پھر لب وا ہوئے۔ "سرمائے کا انتظام تو کسی نہ کسی طرح ہو جائے گا۔ کچھ زمین ہے، وہ ہم بیچ دیں گے، مگر اصل طاقت، کامیابی کی کنجی دولت یا بڑی کمپنی نہیں، بلکہ انسانی سرمایہ ہے۔"

"انسانی سرمایہ؟" اس کے چہرے پر تذبذب تھا۔

"ہاں انسانی سرمایہ۔" بوڑھا مسکرایا۔ "تمہیں چند ہم خیال دوستوں کا تعاون درکار ہوگا۔ ایسے دوست جو تمہارے ساتھ کھڑے ہوں۔ تمہاری خوشی میں شریک ہوں۔ غم بانٹ سکیں۔"

"اوہ... آپ کا یہ مطلب تھا۔" اس نے گردن ہلائی۔ "مگر میرا کوئی دوست نہیں۔"

"تو دوست بناؤ۔ انسان سماجی جانور ہے۔ اسے سماجی طور طریقوں کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ قصبے کے کالج میں کچھ قابل اساتذہ ہیں، مجھے امید ہے کہ چند طلبا بھی میرے بیٹے کی طرح سپنے دیکھتے ہوں گے۔ ان سے ملو۔ ان کے قریب جاؤ۔ وہیں سے تمہیں مسائل کا حل ملے گا۔"

بوڑھے کی بات درست تھی۔ سوئشیرو کو واقعی دوستوں کی ضرورت تھی۔ پچھلی بار جب اس نے کالج کا رخ کیا تھا تو پرنسپل کے درشت رویّے کی وجہ سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا مگر اس بار حالات مختلف تھے۔ ایک نسبتاً کم عمر شخص نے کالج کا چارج سنبھالا تھا جس نے سوئشیرو کی باتوں کو نہ صرف دلچسپی سے سنا بلکہ اگلی دوپہر اس کے گیراج بھی پہنچ گیا۔ چند طلبا بھی ساتھ تھے جو بڑے اشتیاق سے میز پر بکھرے خاکے دیکھ رہے تھے۔

یہ مرحلہ بڑی سہولت سے طے ہوگیا۔ سوئشیرو کو چند دوست مل گئے تھے اور وہ اس بات پر بے حد خوش تھا۔ اس وقت اُسے اندازہ نہیں تھا کہ جلد جاپان پر ایک افتاد ٹوٹنے والی ہے۔

☆☆☆

موت کے سیاہ بادل چھا گئے۔ تباہی کے عفریت نے انسانیت پر لرزہ طاری کردیا۔ دریا خون سے سرخ ہوگئے۔

دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوگیا تھا۔ جاپانی فوج اگلے محاذ پر تھی۔ وہ نازیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

کسی نے سچ ہی کہا ہے، جنگ ایسی بھٹی ہے جس کا ایندھن ہمیشہ غریب بنتا ہے!

جنگ کساد بازاری ساتھ لائی۔ سہولیات کو تو بھول جائیں، روزمرہ استعمال کی اشیا بھی نایاب ہوگئیں۔ قیمتوں کو تو جیسے پر لگ گئے۔ غریب، مزید غریب ہوگیا اور اس پوری صورتِ حال نے براہِ راست سوئشیرو کو متاثر کیا۔

اس نے فیکٹری کے لیے جگہ خرید لی تھی مگر اب اس

قطعۂ اراضی پر عمارت کھڑی کرنا لگ بھگ ناممکن تھا۔ جنگِ عظیم نے کنسٹرکشن کے کاروبار کو شدید نقصان پہنچایا۔ بجری، سیمنٹ، لوہا... سب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگئے۔ خام مال محاذوں پر بنکرز کی تعمیر، اسلحے کی تیاری میں کام آرہا تھا۔

یہ انتہائی اذیت ناک صورتِ حال تھی۔ جگہ تھی، سرمایہ تھا مگر خام مال دستیاب ہی نہیں تھا۔ اس نے بہت بھاگ دوڑ کی مگر ہر کوشش ناکام گئی۔ اس کا خواب ٹوٹنے لگا۔

ایسے میں دوست اور رشتے دار مدد کے لیے سامنے آئے۔ اُنہوں نے دیگر قصبوں میں مقیم اپنے شناساؤں سے رابطے کیے۔ باپ نے لوہار برادری کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

اِس کوشش کے مثبت نتائج سامنے آئے۔ چند ایسے افراد سے رابطہ ہوگیا جنہوں نے خام مال ذخیرہ کر رکھا تھا۔ جب انہیں نوجوان سوئشیرو کے خواب کا پتا چلا، اُنہوں نے اُس کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اسے پرانی قیمتوں پر سامان مل گیا۔ البتہ مقررہ مقام پر سامان پہنچانا ایک گمبھیر مسئلہ تھا کیونکہ مال بردار گاڑیاں فوراً حکام کی نظروں میں آجاتیں۔

اِس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ سورج غروب ہونے کے بعد گوداموں سے گدھا گاڑیوں پر سامان لادا جاتا جو پو پھٹنے سے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جاتا۔ اگلے دن کا سورج غروب ہونے کے بعد پھر یہ سفر شروع ہوتا۔

یہ ایسے قافلے تھے، جو رات کی تاریکی ہی میں سفر کرتے۔

یوں دھیرے دھیرے سامان سوئشیرو تک پہنچنے لگا۔ اِس طرح سامان اکٹھا کرنے کا عمل سست تو تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

سامان وہ خندقوں میں چھپا دیتا۔ اُن دنوں جاپان کے قصبوں میں خندقیں عام تھیں۔ وقفے وقفے سے آسمان لڑاکا طیاروں کی گونج سے بھر جاتے۔ جنگ جاری تھی اور خطرات بڑھتے جا رہے تھے۔

جب خام مال کی درکار مقدار اکٹھی ہوگئی تو قصبے کے سرکاری عہدے داروں سے خفیہ رابطے کیے گئے۔ سوئشیرو کو خدشہ تھا کہ عمارت کی تعمیر شروع ہوتے ہی وہ بدمعاش قانون کی کتابیں اٹھائے چلے آئیں گے۔

چند کی مٹھی گرم کی گئی، چند کو سمجھا بجھا کر راضی کرلیا گیا۔

بالآخر تعمیراتی کام شروع ہوا۔ محاذ سے بری خبریں آرہی تھیں، جاپان مشکل میں تھا مگر سوئشیرو نے اس جانب توجہ نہیں دی۔ اس نے خود کو رجائیت کی دیوی کو سونپ رکھا تھا۔

کچھ عرصے بعد عمارت کھڑی ہوگئی۔

کمپنی کو "ٹوکیا سیکی" کا نام دیا گیا۔ پروڈکشن کے لیے اُسے افرادی قوت کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لیے ٹیکنیکل کالج کے طلبا کا انتخاب کیا گیا۔ پسٹن کی تیاری شروع ہوگئی۔

پہلے ہی نمونے کو ٹیوٹا کارپوریشن نے قبول کرلیا۔ وہ بہترین تھا۔ سوئشیرو کو ڈیڑھ سو پسٹن کی تیاری کا آرڈر مل گیا۔

سوئشیرو اپنا سب کچھ کمپنی میں جھونک چکا تھا۔ وہ مقروض ہوگیا مگر اُسے غم نہیں تھا۔ راہ ہاتھ آگئی تھی۔ وہ اپنے خواب کے قریب تھا مگر شاید قدرت مزید امتحان لینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

قصبے پر تاریکی چھائی تھی اور آسمان پر پُراسرار روشنی حرکت کررہی تھی۔

اچانک لڑاکا طیارے کی گونج نے ماحول کو گرفت میں لے لیا۔ چند دھماکے سنائی دیے۔ قصبے کے باسی خندقوں میں چھپ گئے۔

گزشتہ کئی دنوں سے اتحادی فوج کے طیارے علاقے پر پرواز کر رہے تھے مگر آج رات معاملہ گمبھیر تھا۔ جاپان کا مقابلہ کرنے کے لیے امریکا پوری طرح میدان میں آگیا اور اس نے جاپان کے علاقوں پر حملہ کرنے کا اعلان کردیا۔ صبح ہی سوئشیرو کے قصبے میں یہ افسوسناک خبر پہنچی کہ گزشتہ رات ٹوکیو کے جنوب میں امریکی طیاروں نے بم باری کی جس میں کئی ہلاکتیں ہوئیں۔

شام کے وقت جب آسمان پر خوفناک گھن گرج سنائی دی تو قصبے والوں نے فوراً روشنیاں بجھا دیں اور خود کو خندقوں کے سپرد کردیا۔

سوئشیرو اپنے خاندان کے ساتھ خندق میں تھا۔ پسینے سے شرابور۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا سانس اپنی فیکٹری میں اٹکا تھا، جو بہ آسانی امریکی B-29 طیاروں کا نشانہ بن سکتی تھی۔

دور دھماکا ہوا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ لمحے صدیوں کے مانند طویل تھے۔ اگلا دھماکا نسبتاً قریب ہوا۔ زمین لرز اٹھی۔

چند ہی منٹوں بعد شمال میں زوردار دھماکا سنائی دیا۔

سوئشیرو کے کان میں پُراسرار سرگوشی ہوئی۔ "تباہی!"

اس کا دل بیٹھ گیا۔ اندرون سلگنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

امریکی طیارے نے اُس کے کل سرمائے کونشانہ بنایا ہے۔

کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ خطرہ ہنوز موجود تھا مگر وہ خندق سے نکل آیا۔ شمال کی جانب سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اُس کی فیکٹری تباہ ہو گئی تھی۔

آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس کی دھڑکن دھیمی پڑ گئی۔ یاسیت گہری ہونے لگی۔

فیوجی کی چوٹی خاموش تھی۔ اس کے سائے میں ایک شکست خوردہ شخص آنسو بہا رہا تھا۔

وہ بہت دیر تک یونہی تنہا کھڑا رہا۔ اچانک سناٹے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی عصا ٹیکتے ہوئے اُس کی سمت آ رہا تھا۔

کیا یہ وہی راہب تھا، جس نے صدیوں قبل برفیلی چوٹی سر کی تھی؟

کچھ دیر تک آواز سنائی دیتی رہی۔ دور جھاڑیوں میں سائے نے حرکت کی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

سویشیرو کا غم کچھ کم ہو گیا۔ دھڑکن لوٹ آئی۔ کچھ دیر مراقباتی خاموشی قائم رہی تھی۔ پھر مشرق کی سمت ایک کرن ظاہر ہوئی۔

نیا دن طلوع ہو رہا تھا۔

☆☆☆

فیکٹری کا بڑا حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ اُس کے گرد کھڑے لوگوں میں یاسیت کا جرثومہ حرکت کر رہا تھا۔ سب کے سر جھکے تھے، مگر ایک شخص... اعتماد کا عصا تھامے کسی چٹان کی طرح موجود تھا۔ وہ سویشیرو تھا۔

"کوئی مسئلہ نہیں۔ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو سویشیرو... مرکزی پلانٹ تباہ ہو چکا ہے۔ سب ختم ہو گیا۔" ایک ہمدرد نے کہا۔

"کچھ بھی ختم نہیں ہوا۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "کیونکہ نیا سورج طلوع ہو چکا ہے۔ ہمارے پاس دوسرا پلانٹ ہے۔ گو چھوٹا ہے، مگر ہم وہاں کام شروع کر سکتے ہیں۔"

پھر وہ اپنے ملازمین کی جانب مڑا۔ "گزشتہ چند دنوں میں کئی امریکی طیاروں نے اس علاقے پر پرواز کی۔ لڑاکا طیارے اکثر اپنے فیول ٹینک گرا دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان ٹینکوں کو تلاش کریں۔"

لوگوں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی بات سمجھنے سے قاصر تھے۔

سویشیرو نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "فیول ٹینک کی تیاری میں بہترین دھات استعمال ہوتی ہے۔ وہ ہمارے کام آ سکتی ہے۔ قدرت نے جو کچھ ہمیں دیا ہے، ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ تو دوستوں کام پر لگ جاؤ۔ وقت کم ہے۔ اور گریہ کرنے کا تو بالکل بھی وقت نہیں۔"

کچھ دیر بعد اس کے ملازمین علاقے میں پھیل گئے۔ وہ امریکی طیاروں کے گرائے ہوئے فیول ٹینک تلاش کر رہے تھے اور سویشیرو انہیں کارآمد بنانے کا نسخہ کھوج رہا تھا۔

اگلے چند ماہ بے حد مصروف رہے۔ سویشیرو فیول ٹینک سے حاصل ہونے والی دھات کو بلیک مارکیٹ میں فروخت کرنے میں کامیاب رہا۔ اتنی رقم ہاتھ آ گئی کہ وہ قرضے اتار سکے۔ دوسرے پلانٹ میں کام کا آغاز کر دیا گیا مگر مرکزی حصے کے غیر فعال ہونے کے باعث بات آگے نہیں بڑھ سکی۔

سویشیرو ناامید نہیں تھا۔ اگرچہ مسائل سے نکلنے کا کوئی حل دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر اُسے یقین تھا کہ سرنگ کے آخری سرے پر روشنی ہے۔ ضرور قدرت نے اُس کے لیے ایک مفید منصوبہ تیار کر رکھا ہوگا، ایسا منصوبہ جو اس کی بکھری زندگی میں ترتیب سمو دے گا۔

اور پھر قدرت نے اپنے منصوبے کا بہت ہی عجیب ڈھنگ سے اظہار کیا۔

وہ جنوری 1945 کی اکتا دینے والی دوپہر تھی۔

اچانک وادی زلزلے سے لرز اٹھی۔ پہاڑوں سے تودے گرے۔ مکانات ڈھے گئے۔ کئی افراد اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس کا علاقہ تو محفوظ رہا، البتہ زلزلے نے فیکٹری کو شدید نقصان پہنچایا تھا۔ ایک دیوار ڈھے گئی تھی، مشینوں کو بھی جزوی طور پر نقصان پہنچا۔

زلزلہ اکلوتا عذاب نہیں تھا۔ جنگِ عظیم دوم کا اختتام ایک اور عفریت جنم دینے کو تھا۔ امریکا نے ایٹمی حملے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

ماہ اگست میں جاپان پر تباہی کے عفریت نے حملہ کر دیا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کو ایٹم بم سے نشانہ بنا گیا۔ کھمبی نما دھوئیں کے آسیب کا ظہور ہوا، جو پورے جاپان پر چھا گیا۔ زندگی جمود کا شکار ہو گئی۔ جاپان میں وقت رک چکا تھا۔

☆☆☆

آسمان پر سنہری کرنوں کا ظہور ہوا۔ ہوا کے لمس نے درختوں میں مسرت بھر دی۔ پرندے چہکنے لگے۔

وہ چھلانگ لگا کر بستر سے باہر آیا۔ بھرپور انگڑائی لی۔

"آج کا دن شان دار ہے۔" اس نے خود سے کہا۔

منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور گھر سے باہر آ گیا۔ کچھ دیر بعد دریا کے کنارے بیٹھا تھا، جس کی روانی موسیقی ترتیب دے رہی تھی۔ قدرت کے جلوے بکھرے پڑے تھے۔

اس حسین خاموشی میں اس نے آنکھیں بند کیں۔ اندرون میں جھانکا۔ وہاں سکون تھا، کامل سکون۔ ایسا سکون جو معجزات رونما کر سکتا تھا۔

"شاید کوئی خوشخبری میری منتظر ہے۔" وہ بڑبڑایا۔

گھاٹ سے لوٹتے ہی خوشخبری سے ملاقات ہو گئی۔ ڈاکیا سامنے کھڑا تھا۔ اس کے نام ٹوکیو سے تار آیا تھا۔ ٹیوٹا کارپوریشن اُس کی کمپنی خریدنا چاہتی تھی۔

"شان دار خبر ہے۔" وہ چہکا۔

گھر والوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تم اپنی کمپنی بیچ دو گے۔" بیوی نے سوال کیا۔ "یہ کمپنی تمہارا خواب تھا۔ اس کے لیے تم نے کتنی محنت کی۔"

"شاید قدرت مجھ سے کوئی اور کام لینا چاہتی ہے۔" وہ مسکرایا۔ "سامان باندھ دو، میں ٹوکیو روانہ ہو رہا ہوں۔"

گھر والوں کو حیران پریشان چھوڑ کر وہ ٹوکیو کوچ کر گیا۔ اسی شام وہ ٹیوٹا کارپوریشن کے ڈائریکٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔

"آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی مسٹر ہنڈا۔" ڈائریکٹر نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ یہ مویان تھا.... وہی شخص، جس نے گزشتہ ملاقات میں سویشیرو کی حوصلہ افزائی کی۔

"مجھے بھی خوشی ہوئی کہ ٹیوٹا کارپوریشن نے آپ جیسے قابل شخص کو اِس عہدے پر فائز کیا۔" سویشیرو نے جواب دیا۔

"چلو دوست کام کی بات کرتے ہیں۔" ڈائریکٹر نے کاغذات سمیٹے۔ "آپ کے تیار کردہ پسٹن ہمارے خوب کام آئے۔ آپ اچھے جا رہے تھے۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ جنگ اور زلزلے کے بعد آپ کی کمپنی کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔"

"مگر مشینیں بالکل سالم ہیں۔" اُس نے فوراً کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ اِسی لیے تو آپ سے رابطہ کیا ہے۔" ڈائریکٹر مسکرایا۔ "ہم وہ مشینیں خریدنا چاہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس خام مال بھی ہے۔ وہ بھی ہمارے لیے کارآمد ہوگا۔"

"میں سن رہا ہوں۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لی۔

"ہم... ساڑھے چار لاکھ ین ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔" ڈائریکٹر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ یہ رقم خاصی کم ہے، مگر حالات کا آپ کو اندازہ ہے۔ جنگ، زلزلہ اور پھر ایٹمی حملہ... یہ رقم بھی میرے کہنے پر بڑھائی گئی ورنہ...."

"میں تیار ہوں۔" اس نے بہ آواز بلند کہا۔ "بتائیں کہاں دستخط کرنے ہیں۔"

کاغذی کارروائی پوری ہونے کے بعد جب وہ رخصت ہونے لگا، تو ڈائریکٹر نے پوچھا۔ "اب کیا ارادہ ہے مسٹر ہنڈا؟"

"جب ایک دروازہ بند ہوتا ہے مسٹر مویان، تو دوسرا کھل جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قدرت کے پاس میرے لیے شان دار منصوبہ ہے۔"

"میری نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔" ڈائریکٹر نے دھیرے سے کہا۔

☆☆☆

اگلے چند ماہ مصائب سے بھرپور تھے۔ ایک تو شکست کی ہزیمت پھر ایٹمی حملے جیسا زخم... سچ تو یہ ہے کہ جاپان دنیا سے کٹ چکا تھا۔

مالیاتی بحران کے باعث اشیائے خورونوش نایاب ہو گئیں۔ کرنسی کی قدر گرنے لگی تھی۔ بینک دیوالیا ہونے کے قریب آ گئے۔ کئی کمپنیاں بند ہو گئیں۔

سب سے زیادہ اثر پیٹرولیم مصنوعات کی قیمتوں پر پڑا۔ ایندھن کی قیمت میں ہوش ربا اضافہ ہو چکا تھا۔ عام افراد کے لیے گاڑی رکھنا مشکل ہو گیا۔ موٹریں گیراج تک محدود ہو گئیں۔ سڑکیں خالی رہنے لگیں۔

خود سویشیرو بھی پیٹرول کے نایاب ہونے کی وجہ سے شدید اذیت سے دوچار تھا۔ وہ گاڑیوں کا عاشق تھا مگر وہ ایندھن کے بغیر بے کار تھیں۔

جائیداد کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اس کے پاس محفوظ تھی، مگر سرمایہ کاری کے لیے کوئی شعبہ ہی نہیں بچا تھا۔ جاپان میں کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔

مشکلات کے باوجود اس نے ہمت نہ ہاری۔ گریہ کرنے کے بجائے خود سے سوال کیا۔ "اپنے خاندان کا پیٹ پالنے کے لیے میں کیا کر سکتا ہوں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

اندرون خاموش رہا۔ سوئشیرو مایوس نہیں ہوا۔ وہ صبر کرنا جانتا تھا۔ ہر صبح بیدار ہونے کے بعد وہ یہ سوال دہراتا اور قدرت کے جواب کا منتظر رہتا۔ اور پھر ایک خوش گوار صبح قدرت نے کان میں جادوئی سرگوشی کی۔

ہوا کچھ یوں کہ اُسے سودا سلف لینے بازار جانا تھا۔ اس نے بیٹے کو لان کی بڑھتی گھاس تراشنے کی ہدایت کی اور چابی گھماتا ہوا گیراج میں داخل ہوا۔ جب گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی تو انکشاف ہوا کہ اس میں ایندھن ختم ہو چکا ہے۔

''دھت تیرے کی۔'' اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ مارا۔

گاڑی سے باہر آ کر چند ساعت یونہی کھڑا رہا۔ پھر نظر لان میں کھڑی سائیکل پر پڑی۔

''تو آج سائیکل پر بازار جانا پڑے گا۔'' اس نے کاندھے اچکائے۔

بیٹا لان میں گھاس کٹائی مشین لیے کھڑا تھا، جس سے ننھی موٹر شور مچا رہی تھی۔

''اپنی مما سے کہنا، مجھے کچھ دیر ہو جائے گی۔ میں سائیکل لے جا رہا ہوں۔''

اس کے الفاظ شور میں دب گئے۔ بیٹے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے پھر بیٹے کو پکارا۔ شور نے آواز نگل لی۔ اور ٹھیک تب... ایک انوکھا خیال اس کے ذہن میں کوندا۔

اس کے ہاتھ میں سائیکل کا ہینڈل اور آنکھوں کے سامنے ایک چھوٹی سی موٹر تھی۔ موٹر... جس کی قوت گیاہ تراش کو حرکت دے رہی تھی۔

''قوت... حرکت... موٹر... اور سائیکل!'' یہ الفاظ ذہن کے پردے پر جگمگائے اور انہوں نے ایک فارمولے کی شکل اختیار کر لی۔

اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔ قدرت مسکرا رہی تھی۔

وہ جست لگا کر سائیکل پر سوار ہوا اور گنگناتا ہوا بازار کی سمت نکل گیا۔

☆☆☆

قصبے میں عجیب سا شور گردش کر رہا تھا۔

لوگ حیرت سے ایک دوسرے سے سوال کرتے۔

''یہ کس چیز کی آواز ہے؟ کیسا شور ہے؟''

کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ تجسس کے زیرِ اثر لوگ اس سمت بڑھنے لگے جہاں سے شور اٹھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے خود کو لوہار کے گھر کے سامنے پایا جہاں ایک تحیر خیز منظر ان کا منتظر تھا۔

میدان میں تین سائیکلیں گردش کر رہی تھیں۔ ایک پر بوڑھا لوہار سوار تھا۔ دوسرے کی گدی اس کے بیٹے سوئشیرو نے سنبھالی ہوئی تھی۔ آخری اور نسبتاً چھوٹی سائیکل سوئشیرو کے بیٹے کے پاس تھی۔

وہ عجیب و غریب سائیکلیں تھیں۔ رفتار حیرت انگیز تھی۔ دلچسپ امر یہ تھا کہ سوار مسلسل پیڈل نہیں مار رہے تھے۔ وہ مزے سے ہینڈل تھامے بیٹھے تھے۔ وقفے وقفے سے پیروں کو حرکت دیتے۔ اور یہ معمولی حرکت سائیکل میں آگ بھر دیتی۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے سائیکلوں کے پہیے کسی پُراسرار قوت کے تحت خود بہ خود گھوم رہے ہوں۔

کچھ دیر لوگ یونہی مبہوت کھڑے رہے۔ پھر ان کا دھیان اس شور کی طرف گیا جو سائیکل کے اگلے حصے میں لگے ڈبوں سے بلند ہو رہا تھا۔ اور تب انہیں احساس ہوا کہ اسی ڈبے میں وہ قوت قید ہے، جو پہیوں کو حرکت دے رہی ہے۔

سوئشیرو لوگوں کی حیرت سے محظوظ ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ سائیکل سے اتر آیا۔ سب نے اسے گھیر لیا۔ ہر چہرے پر سوال تھا اور وہ ان کے سوالات کے جواب دینے کے لیے تیار تھا۔

دراصل سوئشیرو نے تیل سے چلنے والی چھوٹی سی موٹر کو، جو کل تک گیاہ تراش میں استعمال ہوا کرتی تھی، سائیکل میں نصب کر دیا تھا، جس کی قوت سے سائیکل کا پچھلا پہیہ حرکت میں آ گیا۔ واضح رہے کہ اس سے قبل بھی ایسی تیز رفتار موٹر سائیکلوں کا تصور موجود تھا، جن میں موٹریں نصب ہوتیں۔ البتہ جاپان میں یہ زیادہ مقبول نہیں تھیں۔ پھر اُن کی قیمتیں بہت زیادہ تھیں۔ شکست خوردہ جاپانیوں کے لیے انہیں خریدنا لگ بھگ ناممکن تھا۔

جلد ہی قرب و جوار میں اس کارنامے کی شہرت پھیل گئی۔ جب لوگوں کو پتا چلا کہ ایک معمولی موٹر نے سائیکل میں جان ڈال دی ہے، تو وہ اس کی سمت دوڑے چلے آئے۔ کئی افراد خواہش مند تھے کہ لوہار کا بیٹا ان کے لیے ایسی ہی ایک سائیکل تیار کر دے۔

اگلے چند دنوں میں اس نے کئی سائیکلوں میں گیاہ تراش میں استعمال ہونے والی موٹر نصب کی... اور یوں اس موٹر سائیکل کی پہلی شکل سامنے آئی، جو کچھ برس بعد اس کی پہچان بننے والی تھی۔

اس نے منصوبے کی ابتدائی تفصیلات ٹیوٹا کمپنی کے ڈائریکٹر کو لکھ بھیجیں۔ چند روز بعد اسے ڈائریکٹر کا مسرت بھرا

جواب موصول ہوا، جس میں اس نے سوئشیرو کی صلاحیتوں کو شان دار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔

سوئشیرو جانتا تھا کہ یہ منصوبہ ابھی خام شکل میں ہے۔ نصب کردہ موٹریں زیادہ وزن ڈھونے کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔ انہیں مزید طاقتور بنانا ہوگا۔

اسی منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایٹمی حملے کے ٹھیک ایک برس بعد سوئشیرو نے ہنڈا ٹیکنیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد رکھی۔

پرانے دوست پھر لوٹ آئے۔ نئے ولولے کے ساتھ کام شروع کیا گیا۔ گیاہ تراش میں نصب موٹریں یورپ سے برآمد کی جاتی تھیں۔ چونکہ جاپان دنیا سے کٹ چکا تھا، اس لیے موٹریں باہر سے منگوانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ البتہ اس بات نے سوئشیرو کو پریشان نہیں کیا۔ وہ انجینئرنگ کی شدبد رکھتا تھا۔ پھر اچھے ساتھی میسر تھے۔ جلد ہی اس نے دیسی ساختہ موٹر تیار کر لی۔

ابتدائی کامیابیوں کے بعد اچانک ایک رکاوٹ سامنے آن کھڑی ہوئی۔ منصوبے کی توسیع کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی، جب کہ سوئشیرو کی جیب انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے بعد خالی تھی۔ خیر خواہ بھی اس معاملے میں کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ مالیاتی بحران نے ہر شخص کو نچوڑ لیا تھا۔

ایک مرحلے پر ایسا لگنے لگا کہ یہ منصوبہ ٹھپ ہو جائے گا مگر ہمیشہ کی طرح اس بار بھی باہمت سوئشیرو نے ہار ماننے سے انکار کر دیا۔

''میں ہار نہیں مانوں گا۔'' اس نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔ ''یہ منصوبہ مصائب میں گھرے جاپان میں نئی روح پھونک سکتا ہے۔ ہماری سست زندگی کو رفتار عطا کر سکتا ہے۔ میں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر نہیں بیٹھوں گا۔''

اگلے چند روز اس نے اپنے گھر کے پُرسکون گوشے میں گزارے، جہاں وہ میز کے سامنے بیٹھا کاغذ پر قلم چلاتا رہا۔

دراصل وہ خط لکھ رہا تھا۔ سائیکل تیار کرنے والی ہر جاپانی کمپنی کے نام۔ سائیکلیں فروخت کرنے والی ہر چھوٹی بڑی دکان کے نام۔

اس نے گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے سلیس اور دوٹوک انداز میں اپنا مدعا بیان کیا:

''جناب، ایندھن کی قیمت عام آدمی کی قوتِ خرید سے باہر ہے۔ زندگی ٹھپ ہو گئی ہے۔ البتہ میرے پاس ایک ایسا آئیڈیا ہے، جس کے ذریعے جاپان پھر پیروں پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ میں سوئشیرو ہنڈا آپ کی تیار کردہ سائیکلوں کو، جن کی خرید میں جنگ کے بعد شدید کمی آئی ہے، ایک نیا روپ دے سکتا ہوں، ان کی رفتار میں حیران کن اضافہ کر سکتا ہوں۔ میرا آئیڈیا آپ کی سائیکل میں نئی روح پھونک دے گا۔ مجھے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے سرمائے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ میری مدد کرنا پسند کریں گے؟''

قلم حرکت میں تھا اور سامنے کاغذات کا ڈھیر لگا تھا۔ معمولی، بوسیدہ کاغذ، جن پر قلم کی سیاہی پھیل جاتی۔

سوئشیرو نے پندرہ ہزار خطوط لکھے۔ انہیں ڈاک سے روانہ کرنے میں پورا ایک ہفتہ لگا۔ اب اسے طویل انتظار کرنا تھا۔ انتظار کے ان لمحات میں خود کو تفکرات سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ دریا کی سمت چلا جاتا۔ دوپہریں انسٹی ٹیوٹ میں گزارتا۔ شامیں دوستوں کے ساتھ گزرتیں۔

تین ہفتے بعد اسے پہلا جواب موصول ہوا۔ خط لکھنے والی کمپنی نے اس کے منصوبے میں پیسے لگانے سے انکار کر دیا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' اس نے خود سے کہا۔ ''ابھی چودہ ہزار نو سو ننانوے خطوط کا جواب آنا باقی ہے۔''

آنے والے دنوں میں اسے ڈھیروں خطوط موصول ہوئے۔

کسی نے اس کے منصوبے کو ناقابلِ عمل قرار دیتے ہوئے مذاق اڑایا۔ کسی نے اپنے مالی مسائل کا رونا رویا۔ البتہ چند خطوط ایسے بھی تھے، جن میں اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس انوکھے منصوبے میں دلچسپی ظاہر کی گئی۔

بیش تر مثبت جوابات اسے چھوٹی کمپنیوں سے موصول ہوئے تھے۔

خطوط کے بعد چھوٹے بڑے منی آرڈر آنے لگے۔ جلد اتنے پیسے اکٹھے ہو گئے کہ وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکے۔

اگلے دن مصروفیات سے بھرپور تھے۔ وہ تیل سے چلنے والی دیسی ساختہ موٹروں میں مزید توانائی بھرنے میں کامیاب رہا۔ انہیں باقاعدہ انجن کی شکل دے دی۔ ایسے انجن جو وزن ڈھونے کی قابلیت رکھتے تھے۔ ساتھ ہی اس نے عام سائیکلوں کے برعکس بڑی اور مضبوط سائیکلیں تیار کروائیں۔

1948 کے موسم سرما میں سوئشیرو کی کمپنی نے پہلی کھیپ تیار کر لی۔ یہ دو سو کے قریب موٹر سائیکلیں تھیں، جنہیں بڑی امیدوں کے ساتھ مختلف کمپنیوں کو روانہ کیا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیا باہمت سوئیشیرو کا سپنا پورا ہونے والا تھا؟

نہیں... ناکامی کا آسیب ہنوز تعاقب میں تھا۔ بدقسمتی اس سے چمٹی تھی۔

جاپانیوں نے ان موٹر سائیکلوں کو رد کر دیا۔ ان کے نزدیک یہ بہت بھاری اور بھدی تھیں اور بہت شور مچاتی تھیں۔ کمپنیوں نے صارفین سے لاکھ کہا کہ اس موٹر سائیکل کا مقصد ایندھن کی بچت اور مفلوج ہو چکے ذرائع مواصلات میں نئی روح پھونکنا ہے، مگر گاڑیوں کے جدید اور نفیس ماڈل پسند کرنے والے جاپانیوں نے انھیں خریدنے سے انکار کر دیا۔

جب یہ مایوس کن خبر سوئیشیرو کو ملی، اس نے بال نوچنے کے بجائے کاندھے اچکائے اور کہا۔ ''اگر انھیں ہلکی اور دلکش موٹر سائیکلیں چاہئیں، تو ہم ان کی یہ خواہش پوری کریں گے۔''

موٹر سائیکلوں کے پرانے ماڈل کی تیاری روک دی گئی۔ جو تیار ہو چکی تھیں، انھیں گودام میں ڈال دیا گیا۔ مشینوں میں ترمیم کی گئی۔ ہلکی دھات خریدی گئی اور کام شروع کر دیا گیا۔

ڈیڑھ ماہ میں نئی کھیپ تیار ہو گئی۔ یہ موٹر سائیکلیں وزن میں ہلکی اور دیکھنے میں خاصی خوبصورت تھیں۔ انجن میں بھی ترامیم کی گئی تھیں، جس سے شور خاصا کم ہو گیا۔

سوئیشیرو نے ان کمپنیوں سے رابطہ کیا جنھیں ماضی میں نے اس نے اپنی سائیکلیں فروخت کی تھیں۔ کمپنیاں تذبذب کا شکار تھیں۔ گزشتہ ماڈل کی ناکامی نے ان کا اعتماد متزلزل کر دیا تھا۔

ان کا اعتماد بحال کرنے کے لیے سوئیشیرو نے کہا۔ ''اگر اس سودے میں فائدہ ہوا تو حصہ آدھا آدھا۔ نقصان ہوا، تو پورا میں برداشت کروں گا۔''

اس کی پیشکش قبول کر لی گئی۔ چند روز بعد ہنڈا کمپنی کی تیار کردہ موٹر سائیکلیں مارکیٹ میں تھیں۔

فقط ایک ہفتے بعد ملک بھر سے حیران کن خبریں موصول ہونے لگیں۔ یاسیت کے بادل چھٹنے لگے تھے۔

موسم بہار کی ایک خوش گوار صبح شہر کی سڑکوں پر ہلکی، دل کش اور تیز رفتار موٹر سائیکلیں دوڑ رہی تھیں۔ کل تک اکتائے رہنے والے خریداروں کی دلچسپی اوج پر نظر آئی۔ بحران کے زمانے میں یہ کم خرچ سواری انھیں اپنی ضرورت محسوس ہوئی۔ آرڈرز کی لائن لگ گئی تھی۔

ٹوکیو کی چند معروف شخصیات نے بھی یہ سواری خریدی۔ جب اخبارات میں ان موٹر سائیکلوں کے ساتھ ان کی تصاویر شائع ہوئیں، تو پورے جاپان میں سوئیشیرو کے کارنامے کی دھوم مچ گئی۔

اُسے بھاری تعداد میں آرڈرز موصول ہوئے۔ ستائشی خطوط کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔ اس کے ملازمین نے اضافی شفٹوں میں کام شروع کر دیا۔ اُسے بہت کام کرنا تھا۔

زخم خوردہ جاپان میں تبدیلی رونما ہونے والی تھا۔

لوہار کا بیٹا اپنے سپنے کو حقیقت کا روپ دے چکا تھا!

☆☆☆

وہ رکا نہیں، کیونکہ وہ رکنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ کامیاب ٹھہرا، مگر اس نے مزید کامیابیوں کی تلاش جاری رکھی۔

سوئیشیرو ہنڈا... ایک دیہاتی جاپان میں انقلاب برپا کر چکا تھا، مگر وہ مطمئن ہو کر نہیں بیٹھا۔ اس نے اپنے ڈیزائن میں بہتری کا عمل جاری رکھا۔ انجن میں بھی ترامیم کرتا رہا۔ 1948 میں جو ماڈل اس نے پیش کیا تھا، وہ اگلے تین برس تک مارکیٹ پر چھایا رہا۔ اس عرصے میں وہ نئے ڈیزائن کی تشکیل میں جتا رہا۔

جنگِ عظیم دوم میں شکست کے ٹھیک پانچ برس بعد اس نے اسٹیل کے ڈھانچے بنانے کا سلسلہ شروع کیا جس میں ٹو اسٹروک انجن نصب تھا۔ اِس 98 سی سی انجن کی حامل موٹر سائیکلوں کو جدید موٹر سائیکل کی اولین شکل قرار دیا جاتا ہے۔

اس ماڈل نے انقلاب برپا کر دیا۔ ہنڈا کارپوریشن کا شمار جاپان کی صف اول کی کمپنیوں میں ہونے لگا۔ بحران کے دور میں یہ اُن گنی چنی کمپنیوں میں سے ایک تھی جو سو فیصد منافع میں رہیں۔ صارفین کی تعداد کے پیشِ نظر سوئیشیرو کو نئی فیکٹریاں لگانی پڑیں، جہاں سیکڑوں ہنرمند بھرتی کیے گئے۔

60 کی دہائی کے اوائل ہی میں اس دیہاتی نے ایک بزنس ٹائی کون کی شکل اختیار کر لی۔ حکومت جاپان نے اُسے قومی اعزاز سے نوازا۔ صنعت کاروں کے مختلف گروپس نے بھی اُسے ایوارڈز کا حق دار ٹھہراتے ہوئے قابلِ تقلید اور قابلِ فخر قرار دیا۔

جلد ہی اس کی شہرت نے سرحدیں عبور کر لیں۔ دیگر ممالک سے آڈرز موصول ہونے لگے۔ اس کی موٹر سائیکلیں اتنی شان دار اور مضبوط تھیں کہ جلد ہی یورپی مارکیٹ پر جاپان کا سکہ بیٹھ گیا۔ ہنڈا کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔

اور پھر ایک دن... سوئیشیرو کو اُس ملک سے ٹیلی فون

کال موصول ہوئی، جس نے اُس کی روح کو گہرا زخم دیا تھا۔

امریکا کے چند صنعت کار اس کی موٹر سائیکلیں اپنے ہاں لانچ کرنا چاہتے تھے۔

اس ٹیلی فون کال نے جلد ہی خبر کی شکل اختیار کر لی۔ گرما گرم بحث چھڑ گئی۔

ایک اخبار نے سوال اٹھایا۔ ''جس ملک نے ہمارے ہزاروں شہریوں کی جان لی، کیا اس کے ساتھ کاروبار جرم نہیں؟''

ایک اخباری اداریہ میں اُسے امریکیوں کی پیشکش رد کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ چند انتہا پسندوں نے تو اس پیشکش کو ملکی سلامتی کا مسئلہ قرار دے دیا۔ وہ یہ تک کہہ گئے کہ سوئیشیرو امریکا کو انکار کر کے جنگِ عظیم دوم کا بدلہ لے سکتا ہے۔

صورتِ حال اتنی حساس ہو گئی کہ سوئیشیرو دباؤ محسوس کرنے لگا۔ اور یہ پہلا موقع تھا، جب اس نے اپنی زندگی میں دباؤ کا سامنا کیا۔

خوش قسمتی سے اس کے حلقۂ احباب میں کچھ ذہین افراد موجود تھے۔ حکومت بھی معاملے میں دلچسپی لے رہی تھی۔ وزیر صنعت نے سوئیشیرو سے رابطہ کیا۔ اعلیٰ سطح کی کئی میٹنگز کے بعد اس پیشکش سے متعلق حتمی فیصلہ کیا گیا۔

میٹنگ کے بعد ہونے والی پریس کانفرنس میں سوئیشیرو نے کہا۔ ''ہم نے دشمن سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مگر ہم جنگ کے ذریعے بدلہ نہیں لیں گے۔ کیونکہ جنگیں یاسیت لے کر آتی ہیں۔ ہم بدلہ لیں گے معاشی ہتھیار سے۔ جو دورِ جدید کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔''

اس وقت تو چند حلقوں نے سوئیشیرو کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اُسے موقع پرست اور لالچی قرار دیا گیا۔ چند تو غدار تک کہہ گئے، مگر کچھ ہی برسوں میں ثابت ہو گیا کہ اس کا فیصلہ درست تھا۔

1959 میں سوئیشیرو نے امریکا میں اپنی ڈیلر شپ شروع کی۔ آگے جو کچھ ہوا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ ہنڈا موٹر سائیکلیں دنیا پر چھا گئیں۔

دریا کے کنارے پروان چڑھنے والا دیہاتی جاپان کا ہیرو بن گیا تھا۔

☆☆☆

''محنت میں عظمت پنہاں ہے، مگر محنت تب ہی رنگ لاتی ہے، جب اس کا ہاتھ ایک عظیم مقصد نے سنبھال رکھا ہو اور مقصد ایک فیصلے سے جنم لیتا ہے۔ میری کامیابی کے پیچھے کوئی پُراسرار قوت نہیں۔ درحقیقت اس کے پیچھے ایک حتمی فیصلہ تھا۔''

سوئیشیرو نے گہرا سانس لیا۔ اس وقت وہ جاپان کی سب سے بڑی انجینئرنگ یونیورسٹی کے... آڈیٹوریم میں کھڑا تھا۔ آڈیٹوریم کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سامنے سیکڑوں افراد تھے جن میں اساتذہ بھی تھے، ماہرینِ اقتصادیات بھی اور تجسس سے بھرے طلبا بھی۔ ان کی آنکھوں میں سوئیشیرو کے لیے احترام تھا۔

اس نے بات کا سرا پکڑا۔ ''تو میں نے فیصلہ کیا ایک ایسا انجن تیار کرنے کا، جو اس صنعت کو یکسر بدل دے۔ اور اسی فیصلے کے بل بوتے پر میں نے یہ کر دکھایا۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ بھی ایسا کر سکتے ہیں کیونکہ جب آپ ایک فیصلہ کر لیتے ہیں تو راہ میں حائل رکاوٹیں خود بہ خود معدوم ہونے لگتی ہیں۔ دنیا کی کوئی رکاوٹ حتمی فیصلے کی قوت کا سامنا نہیں کر سکتی۔''

ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ تالیاں بہت دیر تک بجتی رہیں۔

ٹھہراؤ آنے پر ایک پروفیسر نے کہا۔ ''میں موٹر انڈسٹری کے ٹائی کون سے اتنی فلسفیانہ گفتگو کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ دانائی سے بھرپور خیالات۔ شستہ زبان۔ یہ سب آپ نے کہاں سے سیکھا؟''

''دریا سے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جس کی فطرت مسلسل بہنے کا، آگے بڑھنے کا تقاضا کرتی ہے۔''

ہاں اُس نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ واقعی وہ دریا کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔

قسمت اسے موٹر سائیکل سازی کی صنعت میں لے آئی مگر اس کا اصل عشق تو گاڑیاں تھیں۔ جب کاروبار جم گیا سرمایہ اکٹھا ہو گیا تو اس نے پرانے سپنے کی جانب رخ کیا اور موسم سرما میں جدید اور تیز رفتار گاڑیوں کی تیاری کا اعلان کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔

اس امتحان میں بھی وہ کامیاب ٹھہرا۔ سوئیشیرو نے جاپان کے ذہین ترین کاروباری افراد کو اپنی کمپنی کے پرچم تلے اکٹھا کر لیا جن کی شب و روز محنت نے ہنڈا موٹر کمپنی کو دنیا کی اہم اور طاقتور ترین کمپنیوں میں لا کھڑا کیا۔ دیگر ادارے اس کی گرد پانے میں بھی ناکام تھے۔

وہ اپنے محسنین کو بھی نہیں بھولا۔ ہر وہ شخص جس نے زندگی کے مشکل دنوں میں اس کا ساتھ دیا آج وہ ہنڈا موٹر کمپنی کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

شیئر ہولڈر تھا۔ سویان بھی ان میں شامل تھا۔ وہ جب کبھی اس سے ملتا، تو سر جھکا لیتا اور دھیمے لہجے میں بات کرتا۔

1973 تک سوئشیرو ہنڈا کمپنی کا صدر رہا۔ جب اسے محسوس ہونے لگا کہ کمپنی پیروں پر کھڑی ہوگئی ہے، اس نے ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیا۔ اس اعلان کو دنیا بھر میں حیرت کے ساتھ سنا گیا۔ ہر کسی کا خیال تھا کہ یقین کی قوت کا حامل یہ شخص اب بھی جوان ہے، ابھی اس میں بہت توانائی ہے۔

جب اس بابت سوال ہوا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں، توانائی تو ہے، مگر دوسروں کو بھی موقع ملنا چاہیے۔“

اگلے چند برس اس نے بہ طور ڈائریکٹر ذمے داریاں نبھائیں۔ پھر کچھ عرصہ بہ حیثیت ایڈوائزر مصروف رہا۔ 1980 میں جب پیپل میگزین نے سال کے پچیس اہم ترین افراد کی فہرست جاری کی تو سوئشیرو اس میں شامل تھا۔ میگزین نے اسے جاپان کا ہنری فورڈ قرار دیا۔ جس پر اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ ”وہ تو بڑے آدمی تھے۔ میں تو بس ایک لوہار کا بیٹا ہوں۔“

☆☆☆

طیارہ ہزاروں فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا تھا۔ وہ بادلوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اس نے قلابازی لگائی۔ تیزی سے نیچے آیا۔ پھر مزید قلابازیاں لگائیں، مگر پریشانی کی بات نہیں تھی۔ طیارہ ایک ماہر پائلٹ نے سنبھال رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ معمول کی پرواز کرتا ہوا رن وے پر اتر آیا۔

کاک پٹ سے پائلٹ برآمد ہوا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ چہرے پر شفیق مسکراہٹ۔ اس نے اپنی بیوی کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا جو رن وے ہی پر کھڑی تھی۔

”اب میری باری ہے۔“ عورت نے کہا۔ ”اور دیکھنا میری لینڈنگ تم سے بہتر ہوگی۔“

بوڑھا مسکرا دیا۔

یہ سوئشیرو تھا۔ گو وہ ریٹائر ہوگیا تھا، مگر ٹک کر بیٹھنا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ کاروبار سے کنارہ کش ہونے کے بعد وہ اپنے پرانے شوق کی جانب لوٹ گیا۔ ہوابازی کا شوق۔ دورِ نوجوانی میں تو غربت کے باعث یہ شوق پورا نہیں کرسکا تھا، مگر اب کوئی دقت نہیں تھی۔ اس نے نہ صرف تربیت حاصل کی، بلکہ لائسنس بھی بنوالیا۔ اس شوق میں اس کی بیوی نے بھرپور ساتھ دیا۔

اس نے برف پوش پہاڑوں کا بھی رخ کیا جہاں زندگی سے بھرپور اس جوڑے نے آگ کی۔ انہوں نے جادو بھرے..... جنگلوں میں بھی کیمپ لگائے۔ خاموشی سے بہتے دریاؤں کے کنارے وقت گزارا۔

سوئشیرو نے فیصلہ کیا تھا کہ جس طرح اس نے اپنی مرضی سے زندگی گزاری ہے، اسی طرح اپنے بیٹے کو بھی سپنوں کے تعاقب کی بھرپور آزادی دے گا۔ اس کا بیٹا ہیروتوشی بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلا۔ اس نے ایک الگ کمپنی کی بنیاد رکھی، جس نے شان دار ریسنگ کار بنائیں۔

سوئشیرو کئی اعزازت کا حق دار ٹھہرا، مگر سب سے پُرمسرت لمحہ وہ تھا، جب 1982 میں انجینئرنگ کی دنیا کے ایک بڑے ادارے نے اُس کے نام سے ایوارڈ شروع کرنے کا اعلان کیا۔ سوئشیرو ہنڈا میڈل ان اداروں اور افراد کو دیا جاتا، جو اپنی تخلیقی اُپج سے ناممکن کو ممکن کر دکھاتے۔ ٹھیک سوئشیرو ہنڈا کی مانند۔

خوشیوں کا سفر جاری تھا کہ اچانک معالجین نے یہ انکشاف کیا کہ اس کا جگر جواب دے گیا ہے۔

”میں مزید کتنے برس زندہ رہوں گا؟“ اس نے سوال کیا۔ چہرے پر پریشانی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

”شاید اگلے دو برس۔“ ڈاکٹر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”واقعی۔“ آواز میں سکون تھا۔ ”مجھے تو لگتا ہے کہ مجھ میں ابھی مزید چھ برس کی زندگی باقی ہے۔ خیر، جتنے بھی دن باقی ہیں ان سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ سوچتا ہوں ایک بار پھر جنگلوں کا رخ کروں۔“

”مجھے خطرہ ہے کہ یہ ممکن نہیں ہوگا مسٹر ہنڈا۔“ ڈاکٹر نے دھیرے سے کہا۔ ”اس عارضے میں سفرِ سم قاتل ثابت ہوگا۔ میں آرام کا مشورہ دوں گا۔“

”آرام....“ وہ مسکرایا۔ پھر ڈاکٹر کی سمت دیکھا۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ ”دنیا آرام کی جگہ نہیں ہے دوست۔ آرام کے لیے تو قبر ہے۔“

وہ شان سے بستر سے اترا۔ چہرے پر مسکراہٹ سجائی اور اسپتال سے باہر چلا گیا۔

اس کے عزم نے ڈاکٹرز کو غلط ثابت کر دیا۔ وہ اگلے سات برس زندہ رہا۔

5 اگست 1991 کو جب اس کا انتقال ہوا، اس کی عمر 84 سال تھی۔

اُسے فیوجی کے زیرِ سایہ دفنایا گیا۔ فیوجی... جس کی چوٹی پر ایک راہب کا بسیرا تھا۔

مروہ کا مجنوں

ذوالفقار ارشد گیلانی

عشق انسان کو کیا سے کیا بنادیتا ہے۔ سلطان کو بے مایہ اور بے مایہ کو دل کا سلطان بنادیتا ہے۔ جنگل جنگل، صحرا صحرا بھٹکاتا ہے۔ ہر منظر میں محبوب کا پرتو بھردیتا ہے۔ ہرشے سے بیگانہ بناکر مجنوں بنادیتا ہے۔ عرب کی تاریخ میں کئی عشاق کا تذکرہ ہے۔ لیلیٰ مجنوں، وامق عذرا، قیس لبنیٰ اور مروہ الفرانسی، یہ داستانیں عشق کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اردو میں مروہ الفرانسی کی داستان عشق کا تذکرہ کم کم ہوا ہے۔ اسی وجہ سے باذوق قارئین کی تشنہ لبی کو مٹانے کی خاطر پیش کیا جارہا ہے۔

ایک عاشق کے عشقِ بے کراں کا تذکرۂ خاص

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ محبت انسان کو بہادر بنادیتی ہے لیکن محبت کرنے والوں کی کہانیوں، داستانوں اور قصوں سے یہ مشاہدہ سامنے آیا ہے کہ محبت انسان کو بہادر تو شاید نہیں بناتی مگر پاگل ضرور بنادیتی ہے اور وہ اپنے پاگل پن میں ہی ایسی حرکتیں کرنے لگتا ہے جسے ہم بہادری کا نام دے کر اس کی حالتِ جنون کی پردہ پوشی کی کوشش کرتے ہیں۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ شیریں کی موت کی خبر سن کر فرہاد کا سر میں تیشہ مار کر مرجانا بہادری تھی یا پاگل پن؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

شیریں نے اس سے بھی بڑے پاگل پن کا مظاہرہ کیا اور اپنے وقت کی سب سے بڑی سلطنت کی ملکہ ہونے کے باوجود ایک تیشہ گر کی موت کا سن کر محل کی چھت سے کود گئی۔

بخارا کا شہزادہ عزت بیگ گجرات آیا تو ایک کمہارن اسے پسند آگئی۔ وہ ایک صراحی خریدنے اس کی دکان پر گیا لیکن وہ سوہنی...... اسے کچھ ایسی سوہنی لگی کہ جیب میں موجود تمام اشرفیاں نکال کر صراحی کی قیمت چکادی۔ پھر روزانہ سوہنی تھی اور اشرفیوں کے ڈھیر تھے۔ جب شہزادے کے پاس اشرفیاں ختم ہوگئیں اور سوہنی کی دکان پر جانے کا کوئی بہانہ نہ رہا تو خود ہی اس کا ملازم بن گیا۔ یہ بہادری سے زیادہ پاگل پن تھا۔ عزت بیگ، مہینوال بن کر سوہنی کو اپنی ران کے گوشت کے کباب کھلاتا رہا تو سوہنی کا پاگل پن بھی جاگ اٹھا اور وہ کچے گھڑے کے سہارے محبوب تک پہنچنے کے لیے بپھرے ہوئے دریائے چناب میں کود گئی۔ رانجھا اچھے خاصے کھاتے پیتے گھر کا لاڈلا بیٹا تھا لیکن محبت کے ہاتھوں پاگل ہوکر ہیر کی بھینسوں کا چرواہا بن گیا۔ مجنوں، لیلیٰ کے کتے کو چومتا رہا اور مرزا، دشمنوں کی موجودگی میں صاحباں کو گھوڑی پر بٹھا کر فرار ہوگیا۔ پنوں بھی ایک شہزادہ ہی تھا لیکن ایک دھوبن نے اسے پاگل بنادیا اور وہ بھی سسی کے کندھے سے کندھا ملا کر شہر بھر کے میلے کچیلے کپڑے دھونے لگا۔ سسی اس سے زیادہ پاگل نکلی اور ننگے پاؤں، صحراؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں اپنے محبوب کو تلاش کرتے ہوئے موت کو گلے لگا بیٹھی۔

الغرض محبتوں کی تاریخ پاگل پن کی ایسی کہانیوں سے بھری پڑی ہے جن پر یقین نہیں آتا لیکن قرائن وشواہد سے ثابت ہے کہ ایسے کردار کسی نہ کسی دور میں حیات ضرور تھے۔

شمس الفرانسی بن الصحاری بھی تاریخِ محبت کا ایک ایسا ہی کردار ہے جسے عرفِ عام میں ''مروہ کا مجنوں'' کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے بھی اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوکر جو کچھ کیا وہ پاگل پن کے سوا کچھ نہ تھا۔

مشرقِ وسطیٰ کی اس سچی کلاسیکل داستانِ محبت کو عربی میں مروۃ والمجنون الفرنسی اور فارسی میں مروۃ المجنون کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو چودھویں صدی عیسوی میں شمس الفرانسی بن الصحاری کی حیثیت سے پیدا ہوا۔ عربی میں اس کی کہانی کو درجنوں مختلف انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔

ایک روایت کے مطابق شمس الفرانسی ابن قطوطہ ابن رومی ایک شاعر، جہاز راں، مہم جو، مترجم، مصنف اور ماہر لسانیات تھا۔ بعض ذرائع کا کہنا ہے کہ وہ 2 مئی 1373ء کو پیدا ہوا لیکن اس کی وفات کا صحیح سن معلوم نہیں۔ متفرق روایات کے مطابق اس کا سالِ وفات 1458ء یا 1467ء ہے۔ شمس الفرانسی اپنی شاعری اور مہم جویانہ فطرت کے باعث مشہور ہوا اور شاید کسی مہم کے دوران ہی مارا گیا تھا۔ اغلب امکان ہے کہ وہ افغانستان میں پیدا ہوا لیکن اس کی پرورش اندلس (اسپین) میں ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق اس نے اندلس یعنی ہسپانیہ کے علاوہ مراکش، مصر اور افریقا کے بعض جید علمائے کرام اور مسلمان فلاسفروں سے بھی استفادہ کیا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ شمس الفرانسی، دنیا کے مشہور سیاح ابن بطوطہ کا بیٹا تھا۔ یہ تو درست طور پر علم نہیں کہ ابن بطوطہ کی کتنی اولادیں تھیں لیکن کہا جاتا ہے کہ شمس ان میں سے ایک تھا۔ 25 فروری 1304ء سے 1368ء یا 1369ء تک حیات ابن بطوطہ کا مکمل نام ابوعبداللہ محمد ابن بطوطہ تھا جبکہ اسے شمس الدین کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا۔

ابن بطوطہ مراکش کا ایک بربر مسلمان سیاح تھا جو اپنے شاندار سفر کے باعث عالمی شہرت کا حامل ہے۔ اس کے یہ سفر ''راحلہ'' یعنی ''دی جرنی'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

ابن بطوطہ نے اپنی زندگی کے کم وبیش تیس سال سفر وسیاحت میں گزارے اور معلوم اسلامی دنیا کے علاوہ شمالی افریقا، افریقا کے نوکیلے ساحل، مغربی افریقا، جنوبی یورپ، مشرقی یورپ، مشرقِ وسطیٰ، جنوبی ایشیا، وسطی ایشیا، جنوب مشرقی ایشیا اور چین کی سیاحت کی۔ اس کے سفر کی طوالت مارکو پولو سے زیادہ ہے۔ ابن بطوطہ کو اب تک کی انسانی تاریخ کا سب سے بڑا سیاح قرار دیا جاتا ہے۔ اسے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس نے سفر کے آرام دہ ذرائع بطور خاص اسٹیم انجن (یعنی اسٹیم ایج کے آغاز) کی دریافت سے پہلے ایک لاکھ اکیس ہزار کلومیٹرز کا سفر طے کیا جس میں کئی بار وہ مرنے سے بھی بال بال بچا لیکن سفر ترک نہیں کیا۔

بظاہر دیکھا جائے تو شمس الفرانسی کا ابن بطوطہ کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہیں بنتا کہ ابن بطوطہ کو شمس الدین بھی کہا جاتا تھا جبکہ الفرانسی کا نام ہی شمس تھا۔ جو لوگ شمس الفرانسی کو ابن بطوطہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں وہ یقیناً ایک تاریخی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ شمس الفرانسی کا سنِ ولادت 1373ء بیان کیا جاتا ہے جبکہ ابن بطوطہ اس کی

پیدائش سے پانچ یا چھ سال پہلے انتقال کرگیا تھا اور یہ ناممکنات میں سے ہے کہ کوئی شخص اپنی موت کے پانچ یا چھ سال بعد باپ بن جائے۔

عرب مورخین نے شمس کا پورا نام شمس الفرانسی ابنِ قطوطہ ابنِ رومی لکھا ہے۔ خیال ہے کہ بعد کے راویوں نے قطوطہ کو بطوطہ قرار دے دیا ہوگا کیونکہ دونوں ہم وزن ہیں لیکن دونوں کے سنِ ولادت اور سنِ وفات میں پانچ سے چھ سال کا وقفہ ہونے کی وجہ سے ناموں کا ہم وزن ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ابن بطوطہ کی طرح الفرانسی بھی کہیں ٹک کر نہیں بیٹھا۔

وہ اپنے سفر کے دوران اٹلی کے شہر وینس پہنچا اور کچھ عرصہ وہاں مقیم رہا۔ یہاں اس کی ملاقات کرسٹائن ڈی پیسان (کرسٹائن ڈی پیزان) سے ہوئی۔ دونوں اجنبی کی حیثیت سے ملے لیکن پھر ان میں ایسی دوستی ہوئی جسے مثالی کہا جاسکتا ہے۔ بعض ذرائع کہتے ہیں کہ دونوں کا تعلق دوستی سے کچھ آگے کا تعلق تھا۔ یہ آشنائی طویل عرصے پر محیط بتائی جاتی ہے۔

کرسٹائن 1363ء میں پیدا ہوئی تھی یعنی شمس الفرانسی سے عمر میں دس سال بڑی تھی۔ وہ ایک مشہور فرانسیسی شاعرہ اور حقوقِ نسواں کی علم بردار تھی۔ اس نے قرونِ وسطیٰ میں عورتوں کی ثانوی حیثیت کو چیلنج کیا اور مردوں کے اثرورسوخ کے خلاف آواز بلند کی۔ ایک مصنفہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا شمار اپنے وقت کے بہترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس نے 1399ء سے 1429ء تک اپنے 30 سالہ کیریئر میں اکتالیس کتابیں تصنیف کیں (اس کا سالِ انتقال 1430ء ہے) لہٰذا اسے یورپ کی پہلی پروفیشنل خاتون مصنفہ کہا جاسکتا ہے۔

1380ء میں محض پندرہ سال کی عمر میں کرسٹائن کی شادی ہوگئی لیکن دس سال بعد ہی وہ بیوہ ہوگئی۔ اس نے اپنی بیشتر تحریریں اپنا اور اپنے تین بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے لکھیں۔ اس نے اپنے بچپن کے علاوہ جوانی کا زیادہ تر حصہ پیرس میں گزارہ۔ پھر وہ پوئیسی میں اپے منتقل ہوگئی لیکن اپنا سب کچھ فرانسیسی زبان میں ہی تصنیف کیا۔

کرسٹائن کی ابتدائی شاعری ارسٹوکریٹک روایات اور فیشن کے حوالے سے اس کی اپنی معلومات پر مبنی تھی۔ اس نے اپنی شاعری میں اس وقت ہونے والی عیاشی اور اس میں عورتوں کے کردار پر خاصی روشنی ڈالی۔ اس کی ابتدائی اور بعد کی شاعری اور تصانیف میں اس کی اپنی زندگی کا عکس بھی نظر آتا ہے جبکہ بعد میں اساطیری داستانوں، روایات اور تاریخ نے بھی اس کی تحریروں میں جگہ پائی۔ یہ سب کچھ اس نے چرچ کے ذمے داروں سے سیکھا اور اپنے ہم عصر اطالوی اور فرانسیسی شعرا کے کلام سے حاصل کیا جنہیں وہ پسند کرتی تھی۔ اہم فرانسیسی اور انگریز شاہی شخصیات کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کے باعث کرسٹائن نے پندرھویں صدی کی انگریزی شاعری پر بھی اپنے اثرات چھوڑے۔ اس کی کامیابیوں پر بہت سے مرد مصنفین ناخوش بھی تھے جن میں جین ڈی میون سرِفہرست تھا کیونکہ وہ خواتین کی آزادی کا حامی نہیں تھا۔

حالیہ دہائیوں میں چیریٹی کینن ولرڈ، ارل جیفر ے رچرڈز اور سائمن ڈی بیوویور جیسے اسکالرز کی کوششوں سے کرسٹائن کے کام کو دوبارہ پذیرائی حاصل ہوئی اور بیشتر لوگ اس امر پر متفق ہیں کہ کرسٹائن نے اپنی تحریروں کے ذریعے حقوقِ نسواں کا بھرپور پرچار کیا اور اس میں حتی المقدور کامیابی حاصل کی۔

الفرانسی سے کرسٹائن کی ملاقات اپنے عالمِ شباب میں ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں بے حد قریب رہے لیکن کرسٹائن، الفرانسی کی منزل نہیں تھی چنانچہ وہ کرسٹائن کی قربتوں کی خوش گوار یادیں لے کر آگے بڑھ گیا اور اٹلی سے اسپین یعنی اندلس آگیا۔

اور یہیں اس کی ملاقات شہزادی مروہ سے ہوئی جو بعد میں نہ صرف اس کے نام کا حصہ بن گئی بلکہ اسی کی مناسبت سے اسے مروہ کا مجنوں یا مروہ کا پاگل کہا جانے لگا۔

عرب ثقافت میں الفرانسی اور مروہ کی محبت کو حبِ عذری یا Virgin Love کہا جاتا ہے۔ حبِ عذری یا ورجن لو میں محب اور محبوب کی شادی ہوتی ہے نہ ان میں کسی قسم کے جسمانی تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ جن داستانوں کو حبِ عذری میں شامل کیا جاتا ہے ان میں مروہ اور المجنون الفرانسی کے علاوہ قیس اور لبنیٰ، کوثیر اور آذا، انتارا ابن شداد اور لیلیٰ مجنوں سرِفہرست ہیں کیونکہ ان سب کا انجام ابدی فراق ہے۔

اسی طرح عربی ادب میں الفرانسی اور مروہ کی داستانِ محبت کو مختلف انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

ایک کہانی کے مطابق الفرانسی یورپ میں زیرِ تعلیم تھا اور ساتھ ہی سیر وسیاحت میں بھی مصروف تھا۔ وہیں اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ملاقات مروہ نامی لڑکی سے ہوئی اور وہ بری طرح اس کی محبت میں مبتلا ہوگیا لیکن یہ علم نہیں کہ مروہ سے اس کی پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور کیسے ان کے درمیان محبت کا رشتہ استوار ہوا۔

ایک اور کہانی میں بتایا گیا ہے کہ شمس الفرانسی ان دنوں قاہرہ میں اہرامِ مصر پر تحقیق میں مصروف تھا۔ ایک روز وہ اپنی تعلیم و تحقیق کے لیے اہرامِ مصر کے علاقے میں موجود تھا کہ مروہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ اہرام دیکھنے وہاں آئی۔ الفرانسی اور مروہ نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر ہمیشہ کے لیے محبت کے رشتے میں بندھ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ محبت کی ابتدا الفرانسی کی جانب سے ہوئی تھی اور مروہ نے بعد میں اس کے جذبوں کو سمجھا اور قبول کیا۔

اسی طرح کی ایک اور داستان میں ہے کہ الفرانسی نے خلافتِ عراق کی سیاحت کے دوران مروہ کی خوبصورتی کے بارے میں سنا اور بغیر دیکھے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ وہ چونکہ شاعر تھا اس لیے اس نے اپنی ان دیکھی محبوبہ کی شان میں نظمیں لکھنی شروع کردیں اور اس کے حسن کے قصیدے تحریر کرنے کا آغاز کردیا۔ وہ اپنی یہ ساری نظمیں اور قصائد اپنی فاختہ ”بطوطہ“ کے ذریعے اپنی محبوبہ کو بھیجتا لیکن وہ ہمیشہ ہی راستہ بھول جاتی اور الفرانسی کی کوئی نظم کبھی مروہ تک نہ پہنچ سکی۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ہر کہانی میں مروہ سے الفرانسی کی مجنونانہ اور بے انتہا محبت کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن مروہ کی محبت کا کہیں کوئی ذکر موجود نہیں۔ الفرانسی کے مختصر حالاتِ زندگی بھی تاریخ میں دستیاب ہیں لیکن سوائے الفرانسی کی داستان کے، مروہ کا تاریخ میں کوئی تذکرہ نہیں۔ وہ کون تھی، کہاں کی رہنے والی تھی، کب پیدا ہوئی، کس کی بیٹی تھی، الفرانسی سے اس کی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور دونوں نے محبت کا یہ کٹھن سفر کیسے طے کیا، کسی داستان نویس، قصہ گو یا مورخ نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بالآخر الفرانسی نے مروہ کو ڈھونڈ نکالا اور اس سے شادی کا خواستگار ہوا لیکن اسے مروہ کے ساتھ شادی سے روک دیا گیا۔ منزل کے انتہائی قریب پہنچ کر جب اسے یہ دھچکا لگا تو وہ اسے برداشت نہ کرسکا اور پاگل ہوگیا یا کم از کم پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگا جس کی وجہ سے اسے ”مجنون مروہ“ یا ”مروہ کا دیوانہ“ جیسے القاب سے نوازا گیا۔

بعض روایات میں ہے کہ مروہ بنت احمد سے شمس الفرانسی کی پہلی ملاقات اندلس میں ہوئی تھی۔ الفرانسی اس وقت قاہرہ میں تعلیم حاصل کررہا تھا اور سیاحت کے لیے اندلس گیا تھا۔ اس کا نام شہزادی مروہ تھا لیکن وہ شہزادی العامرہ مروہ کے نام سے مشہور تھی۔ الفرانسی اور مروہ عرصہ اندلس میں ہی محبت کے اندھے راستوں پر چلتے رہے۔ عہد و پیمان کرتے رہے اور زندگی ایک ساتھ گزارنے کے منصوبے بناتے رہے۔

کہتے ہیں کہ مروہ بہت خوبصورت تھی۔ گو الفرانسی بھی ایک دلکش نوجوان تھا لیکن مروہ اس کی جسمانی دل کشی سے زیادہ اس کی صلاحیتوں سے زیادہ متاثر ہوئی تھی۔ خاص طور پر مختلف فنون کے بارے میں الفرانسی کے علم اور شاعری نے تو مروہ کو اس کا دیوانہ بنادیا تھا۔ وہ اکثر مروہ کو سامنے بٹھالیتا اور اس کی شان میں شعر گوئی شروع کردیتا۔ وہ اس کی سرخ و سپید رنگت، قندھاری سیبوں جیسے رخساروں، چاند سے ماتھے، ستاروں جیسی آنکھوں، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں، لمبے اور گھنے بالوں، سرو جیسے قد اور اپسراؤں جیسے سراپا کے بارے میں طویل نظمیں کہتا جن سے مروہ بے حد مسرور ہوتی۔

مروہ خود ایک شہزادی تھی لیکن الفرانسی کے روپ میں اسے واقعی ایک شہزادہ مل گیا تھا۔ بے شک وہ اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا لیکن وہ اپنے خوابوں کے اسی شہزادے کی بانہوں میں اپنی زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مروہ کے والدین کو بھی اس کے الفرانسی کے میل جول پر کوئی اعتراض نہ تھا چنانچہ دونوں آزادانہ ایک ساتھ گھومتے پھرتے۔ مروہ کے والدین بھی الفرانسی کی صلاحیتوں سے بے حد متاثر تھے اور ان کا خیال تھا کہ دونوں کی جوڑی خوب جچے گی۔

الفرانسی کو پانے کے بعد مروہ کی اپنی حالت یہ تھی کہ وہ پوری دنیا سے کٹ کر رہ گئی تھی۔ شہزادی کی حیثیت سے اس کی محل کی اپنی زندگی تھی لیکن اس نے سب مصروفیات سے کنارہ کشی اختیار کرکے خود کو الفرانسی کے لیے وقف کردیا تھا۔ اس کی ہم عمر اور بچپن کی ساتھی سہیلیاں اکثر اس سے شکوہ کرتیں کہ اس نے ان سے بھی ملنا جلنا ترک کردیا ہے لیکن مروہ کو اب کسی کی پروا نہ تھی۔ وہ نہایت بے پروائی سے یہ کہہ کر سہیلیوں کے جھمگٹے سے اٹھ جاتی کہ اس کے لیے اب سب کچھ اس کا محبوب ہے۔

الفرانسی نے اس کی شان میں جو قصیدے کہے تھے وہ

تحریری شکل میں مروہ کے پاس موجود تھے۔ تنہائی میں وہ اکثر اس بیاض کو لے کر بیٹھ جاتی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اس کا ایک ایک لفظ نہایت توجہ، محبت اور رغبت سے پڑھتی۔ بعض روایات میں ہے کہ مروہ کی آواز بے حد سریلی تھی اور وہ اپنے محبوب کی شاعری گنگنایا بھی کرتی تھی۔

الفرانسی سے گو اس کی روزانہ ملاقات ہوتی تھی لیکن مروہ کو ہر وقت بے چینی سے اس کا انتظار رہتا۔ وہ آتا تو مروہ کسی پھول کی طرح کھل اٹھتی لیکن جب وہ چلا جاتا تو باسی کلی کی طرح مرجھا جاتی۔ وہ الفرانسی سے زیادہ سے زیادہ دیر رکنے پر اصرار کرتی اور کہتے ہیں کہ الفرانسی نے کبھی اپنی محبوبہ کی خواہش رد نہیں کی تھی۔ وہ شرگیں پلکیں جھکائے، سنگِ مرمر کے کسی مجسمے کی طرح اس کے سامنے بیٹھی رہتی اور الفرانسی اس کے حسن کو اپنی آنکھوں کی پتلیوں میں سموتا رہتا۔ اسے دیکھ دیکھ کر شاعری کرتا رہتا اور جب کوئی ذومعنی شعر کہتا تو مروہ سرخ ہوجاتی لیکن اس نے کبھی اپنے محبوب کی کسی بات کا برا نہیں مانا تھا اور نہ ہی کسی بھی انداز میں اپنی تعریف سے روکا تھا۔

لیکن حیرت انگیز امر یہ تھا کہ اس تمام بے تکلفی اور آزادانہ ملاقاتوں کے باوجود دونوں میں سے کسی نے بھی اب تک شادی کی کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ مروہ نے کئی بار اس موضوع پر گفتگو کی کوشش کی لیکن روایتی اور نسوانی شرم و حیا آڑے آگئی۔ اس نے اشارے کنایوں میں الفرانسی کو باور کرایا کہ وہ اس سلسلے میں اس کے والدین سے بات کرے لیکن الفرانسی، مروہ کی محبت میں اس قدر مگن تھا کہ اسے بھی فی الحال شادی کا موضوع تضیعِ اوقات کے علاوہ کچھ محسوس نہ ہوتا تھا۔

محبتوں کی یہ رنگینیاں اچانک ہی اس وقت فرقت اور جدائی کی سنگینیوں میں تبدیل ہوگئیں جب الفرانسی کو اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے واپس قاہرہ جانا پڑا۔

مروہ کے لیے الفرانسی سے جدائی کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔ وہ اس کی قربت میں جتنی خوش تھی، اس کی فرقت سے اسی قدر اداس ہوگئی۔ محل کے جن باغات میں وہ مورنی کی طرح رقص کیا کرتی تھی۔ اب کسی کونج کی طرح بے قرار و بے چین پھرا کرتی جو اپنی ڈار سے بچھڑ گئی ہو۔ بعض روایات میں ہے کہ مروہ نے الفرانسی کی کمی کو اتنا محسوس کیا کہ بیمار پڑگئی۔ اس کے والدین اس کی زندگی سے مایوس ہونے لگے لیکن جب قاہرہ سے الفرانسی کے خطوط آنے

ڈاکٹر فرید بخش

1864-1969ء

ماہر تعلیم۔ بانی غوثیہ کالج چک نمبر 333۔ وہ لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی۔ بچپن ہی میں ترجمے کے ساتھ قرآن پاک پڑھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی ادب کی کتب کا بھی مطالعہ کیا۔ پندرہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہوگئے۔ فوجی ملازمت کے دوران فوجی اسپتال میں خدمات انجام دیں۔ اسپتال کی ملازمت کے دوران ایلو پیتھک طریقِ علاج میں تجربہ حاصل کرلیا۔ 1898ء میں فوجی اسپتال میں خدمات انجام دے رہے تھے کہ اپنے رشتے داروں اور عزیزوں کی مدد سے چک نمبر 333 گ۔ب (ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ) میں رہائش اختیار کرلی۔ فوجی ملازمت ترک کرنے کے بعد زراعت کو بطور پیشہ اپنایا، لوگوں کی سہولت کے لیے اپنے گاؤں میں چھوٹی سی ڈسپنسری بھی بنائی۔ پرائمری کے ساتھ ہی انہوں نے اسلامیہ پرائمری اسکول بھی کھول لیا ان کی ذاتی دلچسپی اور ان تھک کوششوں کے نتیجے میں 1918ء میں محکمہ تعلیم نے غوثیہ اسلامیہ کالج کے قیام کی بھی منظوری دی۔ پاکستان کے قیام کے سلسلے میں انہوں نے قائداعظم کا ساتھ دیا۔ انہوں نے اپنے علاقے میں کئی خدمات انجام دیں۔ جن کا ذکر قائداعظم نے اپنی کئی محفلوں میں کیا۔ 105 سال کی عمر میں انتقال کیا اور چک نمبر 333 پیرمحل کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

مرسلہ: غوثیہ خاتون، حیدرآباد

WWW.PAKSOCIETY.COM

شروع ہوئے تو مروہ کی حالت بھی سنبھلنے لگی۔

دوسری جانب الفرانسی بھی مروہ کے بغیر چین اور سکون سے نہیں تھا۔ اب اس کا پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔ کتاب کھولتا تو مروہ کی تصویر دکھائی دیتی۔ آنکھیں بند کرتا تو مروہ سامنے آکھڑی ہوتی اور کھولتا تو اس کی یاد میں آنسو ٹپکنے لگتے۔ کہاں وہ اسے سامنے بٹھا کر شاعری کیا کرتا اور قصیدے لکھا کرتا تھا اور کہاں اب وہ اس کے دیدار کو ترس گیا تھا۔ مروہ کے لیے شاعری وہ اب بھی کرتا تھا لیکن یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے لفظ بے جان اور قصیدے بے رنگ ہوگئے تھے۔ وہ مروہ کو خط بھی لکھتا تھا لیکن بالمشافہ گفتگو کرنے اور غائبانہ انداز میں اسے مخاطب کرنے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

پہلے وہ مروہ سے دور ہوا لیکن قاہرہ آکر وہ دوستوں اور ان کی محفلوں سے بھی دور ہوگیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے وہ دنیا سے اکتا ہوگیا ہو۔ دوست احباب اس سے اس کی بے رخی اور اکتاہٹ کی وجوہات دریافت کرتے لیکن الفرانسی کے پاس وہ الفاظ ہی نہیں تھے جن کے ذریعے وہ مروہ سے اپنی جدائی کے کرب کا اظہار کرسکتا۔ وہ دوستوں کو ٹال جاتا لیکن ہر کسی کا اندازہ تھا کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی واردات گزری ہے جس نے اسے دنیا اور اس کی رونقوں سے دور کردیا ہے۔

الفرانسی نے کچھ عرصہ تو اس صورتِ حال کو جیسے تیسے برداشت کیا لیکن جب دکھ حد سے سوا ہونے لگا تو اس نے رختِ سفر باندھا اور قاہرہ کو خیرباد کہہ دیا۔

اور ایک دن وہ اچانک ہی بغیر بتائے اندلس میں اپنی محبوبہ کے سامنے بیٹھا تھا۔

الفرانسی کو دیکھ کر مروہ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمکنے لگا تھا۔ اسے زمانے بھر کی خوشیاں واپس مل گئی تھیں۔ اس کی رنگت پھر سے نکھرنے لگی۔ منہ سے پھول جھڑنے لگے، آنکھیں چمکنے لگیں۔ انگ انگ سے خوشیوں کے سوتے پھوٹنے لگے۔ وہ اس حد تک مسرور تھی کہ اس کی چال پر رقص کا گمان ہونے لگا تھا۔ مروہ ایک بار پھر دنیا کو بھول کر الفرانسی میں گم ہوگئی، کچھ یہی معاملہ الفرانسی کے ساتھ بھی تھا۔

وہ بھی مروہ کو پاکر خود کو آسمانوں پر محسوس کررہا تھا۔ اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ قربت کی رنگینی اور فرقت کی سنگینی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اب اس کی ہتھیلیاں تھیں اور مروہ کے سبک پاؤں تھے جن پر چل کر وہ آنکھوں سے ہوتی ہوئی اس کے دل تک پہنچتی تھی۔ اب اس کی آنکھیں تھیں اور مروہ کا حسین سراپا تھا۔ وہ اس دلکش وجود کو اپنی آنکھوں میں بسا کر اور پلکیں بند کرلیتا جیسے چاہتا ہو کہ مروہ کبھی اس کی آنکھوں کی قید سے آزاد نہ ہونے پائے۔

ملاقاتیں اور محفلیں دوبارہ شروع ہوگئیں اور الفرانسی اور مروہ دنیا کو کہیں پیچھے چھوڑ کر پھر ایک دوسرے میں کھو گئے۔

الفرانسی نے اس بار بھی مروہ کے لیے محبت کے بہت سے گیت لکھے جن میں اب جدائی کی چبھن اور ملن کی لگن بھی شامل تھی۔ نشہ دو آتشہ ہوگیا تھا کیونکہ دونوں نے ہی اب قربتوں کے آبِ شیریں کے ساتھ ساتھ فرقتوں کا زہرِ ہلاہل بھی پی لیا تھا۔ وصل کا ذائقہ چکھ لیا تھا۔ دوریوں اور نزدیکیوں کی بدصورتی اور خوب صورتی کو محسوس کرلیا تھا۔ کھونے اور پانے کی منزل کو چھو لیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ محبت پہلو میں ہو تو دنیا کا ہوش نہیں ہوتا لیکن جب پہلو خالی ہوجائے تو پھر دنیا بھی کانٹوں بھری سیج بن جاتی ہے۔

اب الفرانسی کے گیتوں میں ملن کی خواہش اور وصل کی تمنا شامل تھی۔

مروہ کو یہ سب اچھا لگتا تھا کیونکہ اب اس کے منہ زور جذبے بھی اسے کچھ کہنے یا کرنے پر اکسا رہے تھے۔ الفرانسی کے قاہرہ جانے سے پہلے وہ سوچتی ہی رہ گئی تھی لیکن شادی کی بات زبان پر نہ لاسکی تھی تاہم اب اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر الفرانسی کی طرف سے پیش قدمی نہ ہوئی تو وہ خود اس خواہش کا اظہار کردے گی۔

کہتے ہیں کہ اگر محبت سچی ہو تو پھر کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہتی اور اللہ تعالیٰ خود ہی اظہار کے راستے پیدا کردیتا ہے۔

اور مروہ کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

جانے کیسے الفرانسی کو مروہ کی خواہش کا علم ہوگیا۔ اس نے مروہ کے والدین سے اسے یورپ لے جانے کی خواہش کا اظہار کردیا اور حیرت انگیز طور پر انہیں اس کی اجازت بھی مل گئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے اجنبی سرزمینوں کی جانب روانہ ہوگئے جہاں پہنچ کر انہوں نے دو سے ایک ہونا تھا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ الفرانسی نے یورپ جانے کے لیے مروہ کے والدین سے باضابطہ اجازت نہیں لی تھی بلکہ دونوں اندلس سے فرار ہوئے تھے۔ بالفرض اگر ایسا ہوا بھی تھا، تب بھی محبت کرنے والوں کی اپنے آشیانوں کو خیرباد کہنے کی رسم نہایت قدیم ہے۔

یورپ پہنچ کر الفرانسی نے باضابطہ طور پر مروہ سے شادی کا اظہار کردیا۔

مروہ نے اس پیش کش کا نہایت بھرپور انداز میں گرم جوشی سے خیرمقدم کیا لیکن ابھی قدرت کو دونوں کے ملن کے لیے کچھ اور امتحان مقصود تھے۔

عین انہی لمحات میں شمس الفرانسی کو خلیفۂ عراق کی جانب سے افریقا جانے کے احکامات موصول ہوئے۔ خلیفہ نے وعدہ کیا تھا کہ افریقا میں اس اہم مشن کی تکمیل کے بعد شمس الفرانسی اور مروہ کی شادی باقاعدہ سرکاری طور پر انجام دی جائے گی۔ الفرانسی اور مروہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری لیکن خلیفہ کے احکامات پر عمل درآمد کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کیونکہ الفرانسی اور مروہ دونوں ہی خلافت کے وفادار تھے۔

مروہ نے نہایت دل گرفتہ انداز میں اپنے محبوب کو افریقا رخصت کیا لیکن بعض ایسی اشیا بھی اس کے ساتھ کردیں جو ہر وقت اسے اپنی اس محبوبہ کی یاد دلاتی رہتیں جسے وہ یورپ میں تنہا چھوڑ آیا تھا۔

ان دنوں منصور حلاج کا طوطی بولتا تھا۔ گو اس کے انتقال کو چار سو سال ہوچکے تھے لیکن اسلامی دنیا میں اس کے نظریات زندہ تھے۔ ابوالمغیث حسین منصور ال حلاج عرف منصور الحلاج ایک فارسی صوفی، انقلابی مصنف اور بے باک شاعر تھا۔ وہ 858ء بمطابق 244 ہجری میں پیدا ہوا۔ اس نے دنیا کو جس فلسفے سے روشناس کرانے کی کوشش کی وہ لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس نے عالمِ جذب میں ''اناالحق'' یعنی میں خدا ہوں کا نعرہ لگایا جس پر اسے گرفتار کرلیا گیا۔ عباسی خلیفہ المقتدر باللہ کے احکامات پر اسے مرتد قرار دے کر پھانسی کے احکامات دے دیے۔ منصور کو 26 مارچ 922ء (309 ہجری) کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

مروہ، منصور حلاج کی بے حد معتقد تھی چنانچہ اس نے وقتِ روانگی اپنے محبوب کو چاندی کا ایک لاکٹ دیا جس پر منصور حلاج کی ایک نظم کندہ تھی۔ اس کے علاوہ مروہ نے الفرانسی کو لکڑی کا ایک کلائی بند بھی دیا جس پر اس نے اپنے ہاتھوں سے الفرانسی کا نام لکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ الفرانسی نے افریقا کے اپنے سفر کے بعد اپنی موت تک بھی ان دونوں چیزوں کو اپنے جسم سے علیحدہ نہیں کیا۔ الفرانسی، یورپ سے افریقا پہنچا۔ خلیفہ نے اسے جو مشن دیا تھا اس کے بارے میں تفصیلات دستیاب نہیں تاہم یہ ضرور معلوم ہے کہ صحرا میں سفر کے دوران الفرانسی، زغوہ قبیلے کے جنگ جوؤں کا قیدی بن گیا جو روئے زمین کے وحشی ترین افراد تھے۔

تاریخ کے مطابق زغوہ، زغاوہ یا زخاوہ نامی یہ قبیلہ مشرقی چاڈ اور مغربی سوڈان میں آباد ہے۔ ان کے آبائی وطن میں ڈارفر کا علاقہ بھی شامل ہے۔ کیمبرج ہسٹری، دی گرگام، ان زغوہ افراد کو ڈوگاوا کے نام سے یاد کرتی ہے۔ زغوہ خود کو بیری کہتے ہیں۔ زغوہ کا نام بنیادی طور پر قریبی عربوں کی پیداوار ہے اور وہ اس سے اچھی طرح واقف بھی ہیں۔ ان کی اپنی زبان ہے اور اس کا نام بھی زغوہ ہی ہے۔ یہ بھیڑیں چراتے ہیں اور عرب بھیڑوں کے اسی ریوڑ کو زغوہ کہتے ہیں۔ یہ نیم خانہ بدوش قبیلہ ہے اور اپنی زندگی مویشی چرانے، اونٹ پالنے اور بعض اجناس کاشت کرکے گزارتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس وقت بھی دنیا میں 75 ہزار سے ساڑھے تین لاکھ افراد کے لگ بھگ زغوہ افراد موجود ہیں۔

زغوہ قبائل کا تذکرہ پہلی مرتبہ عربی زبان کی نصابی کتابوں کے ذریعے سامنے آیا۔ عرب جغرافیہ دان الیعقوبی نے 890ء میں لکھی جانے والی ایک کتاب میں تحریر کیا کہ اس کی زغوہ قبائل کے بعض افراد سے باقاعدہ گفتگو ہوئی

فاطر

لفظی معنی، موجد یا کسی چیز کی ابتدا کرنے والا، جبکہ اس چیز کا پہلے وجود یا اصل بالکل موجود نہ ہو۔ فاطر اللہ کے اسمائے حسنہ میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ صفاتی نام استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کی ایک مکی سورت کا نام۔ عددِ تلاوت 35۔ عددِ نزول 43۔ اس کا دوسرا نام سورہ الملائکہ ہے، لیکن فاطر زیادہ مشہور ہے۔ یہ صورت قرآن مجید کی ان صورتوں میں سے آخری سورت ہے، جن کا آغاز ''الحمدللہ'' سے ہوتا ہے۔

مرسلہ: احسن عابدی، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

میسور

جنوب مغربی بھارت کی ایک ریاست، بنگلور اس کا دارالحکومت ہے۔ رقبہ 74122 مربع میل۔ اس نام کا ایک علاقہ مدراس پریذیڈنسی اور بمبئی پریذیڈنسی کے درمیان میں واقع ہے۔ مغرب میں کوہستانی علاقہ ہے۔ زیادہ حصہ میدانوں اور وسیع وادیوں پر مشتمل ہے۔ یہاں بڑے پیمانے پر آبپاشی کی جاتی ہے۔ بالخصوص دریائے کاویرہ کے ذریعے۔ یہاں سونے کی کانیں اور میڈرو الیکٹرک ورکس ہے۔ پہلی میسور یونیورسٹی 1916ء میں قائم ہوئی۔ آبادی کی اکثریت کا گزارہ گنا، چاول، باجرہ وغیرہ کی کاشت پر ہے۔ انگریزوں کی بیجانہ حکمتِ عملی سے قبل یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان نے اسے بڑی ترقی دی۔ 1799ء میں یہ ٹیپو سلطان سے انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ 1947ء میں اس کا الحاق بھارت سے ہوگیا۔ یہاں کے قلعے بہت مشہور ہیں۔ انگریزوں نے اسے مسلمانوں سے چھیننے کے لیے متعدد بار حملے اور دوسری حکمت عملیاں استعمال کیں۔ مختصر سے وقفے میں مسلمانوں پر چار جنگیں مسلط کی گئیں۔ ابتدائی دو جنگیں سلطان حیدر علی اور آخری دو جنگیں، دسمبر 1782ء کو باپ کے انتقال کے بعد ٹیپو سلطان شہید نے لڑیں۔

میسور کی پہلی لڑائی

والیٔ میسور سلطان حیدر علی کے خلاف انگریزوں اور مرہٹوں اور نظام نے اتحاد کر کے 1765ء کو میسور پر حملہ کردیا۔ اسی دوران سلطان مرہٹوں کو روپیا دے کر انگریزوں سے الگ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر انگریز اور نظام خون خرابے پر تلے ہوئے تھے۔ اپریل 1767ء میں نظام نے انگریز جرنل جوزف اسمتھ کے ساتھ میسور پر ایک بار پھر حملہ کیا۔ اسمتھ نے درہ چنگلہ اور ترنولی کے مقام پر سلطان کو شکست دی لیکن حیدر علی نے جنگ جاری رکھی۔ بمبئی کی فوج کو شکست دے کر منگلور واپس لے لیا۔ مدراس اس کی بڑھتی ہوئی فوجوں کے قدموں سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر رہ گیا تو 4 اپریل 1769ء میں انگریزوں نے سلطان کے ساتھ معاہدہ کرلیا جس کے تحت طے پایا کہ میسور پر حملے کی صورت میں انگریز سلطان کی مدد کرے گا اور طرفین ایک دوسرے کے علاقے مع جنگی قیدی وغیرہ واپس کردیں گے۔

مرسلہ: سلطانہ فخر، کراچی

ہے۔ اس کے مطابق زغوہ قبائل کینم میں رہتے ہیں اور ان کی عملداری میں ایسے علاقے بھی شامل ہیں جنہیں باقاعدہ بادشاہت قرار دیا جاسکتا ہے۔ زغوہ حکومتوں کی باقاعدہ نشاندہی تو نہیں کی جاسکتی لیکن یہ طے ہے کہ زغوہ قبائل اور ان کی حکومتیں جھیل چاڈ سے کر کچن وادی نیل کی بادشاہتوں نوبیا، ماکوریا اور علوا تک پھیلی ہوئی ہیں۔

الیعقوبی نے یہ بھی لکھا کہ زغوہ غلام شمال کو فروخت کیے جاتے ہیں۔ مورخین نے زغوہ افراد کو وحشی، خانہ بدوش اور جنگ جو قبائل قرار دیا جو قریبی آبادیوں اور قافلوں کو نہایت بے دردی سے نشانہ بنایا کرتے تھے۔ زغوہ قبائل کا ان علاقوں پر اثر و رسوخ اور طاقت و دہشت عرصہ دراز تک قائم رہی۔ 1154ء میں ال ادریسی اور 1220ء میں یاقوت نے بھی ان کی طاقت اور بستیوں اور ریاستوں کی نشاندہی کی اور ان کے دو اہم ترین شہروں کینم اور انجیمی کا تذکرہ کیا۔ ال ادریسی پہلا شخص تھا جس نے باقاعدہ نقشوں کی مدد سے زغوہ قبائل کی حد بندیاں کیں۔

ابن سعد نے 1270ء میں البتہ یہ لکھا کہ کینم کسی حد تک آزاد ہوگیا ہے۔ اس نے نقشوں کی مدد سے اپنے اس دعوے کی تصدیق کی کوشش بھی کی۔ بعد میں جرمن اسکالر ڈیرک لانگ نے گرگام یا دیوان آف کینم کے بارے میں ایک بھرپور ریسرچ کی جس میں اس نے اعتراض کیا کہ حکومتوں اور طاقت میں یہ تبدیلی حکمرانوں کی بیویوں کی قومیت میں تبدیلی کی وجہ سے آئی ہے۔ اب ان کا تعلق شمالی قبائل کے بجائے جنوبی قبائل کے ساتھ استوار ہوگیا ہے۔ جرمن ریسرچ اور ابن سعد کی تحقیق سے یہ ثابت ہوگیا کہ زغوہ کی طاقت کو کینم کے حکمران دونامہ دبالامی (1210ء سے 1248ء) نے نیست و نابود کیا۔

اس میں شک نہیں کہ جھیل چاڈ کے علاقے میں کینم نے زغوہ کی طاقت پاش پاش کر دی تھی لیکن کینم کے مشرقی حصوں میں زغوہ اپنے عروج پر ہی رہے حتیٰ کہ چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں بھی مصری مورخ اور جغرافیہ دان مقریزی نے ان کی طاقت و سلطنت کی نشاندہی کی۔ بعد میں ڈارفر اور کینم کے عروج پر زغوہ قبائل نے صحراؤں پر قبضہ کرلیا اور علاقے کی ایک بڑی قوت بن گئے۔

امکان یہی ہے کہ الفرانسی انہی صحراؤں میں زغوہ قبائل کا قیدی بنا لیکن اس کا تذکرہ بھی کہیں موجود نہیں کہ وہ کتنا عرصہ ان کا قیدی رہا اور اسے ان سے رہائی کیسے ملی۔

بہرحال یہ طے ہے کہ الفرانسی نے ایک طویل قید کاٹی کیونکہ جب وہ زغوہ قبائل کی تحویل سے آزاد ہوا تو حالات اس قدر تبدیل ہوچکے تھے جن کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

یہ تذکرہ بھی کہیں موجود نہیں کہ زغوہ قبائل سے جان چھڑانے کے بعد الفرانسی کی مروہ سے ملاقات ہوئی یا نہیں لیکن اس امر کی نشاندہی بہرحال کی گئی ہے کہ الفرانسی کی طویل غیر موجودگی کے دوران مروہ کی ملاقات ایک اور شخص سے ہوئی جو عرب روایات سے زیادہ قریب تھا۔ اس کی مزید کوئی وضاحت نہیں کی گئی لیکن بادی النظر میں یہی محسوس ہوتا ہے کہ مروہ نے اپنے لیے نیا محبوب تلاش کرلیا تھا جو الفرانسی سے زیادہ بہتر عرب تھا۔

اس عرب سے مروہ کی شادی ہوئی یا نہیں اور اگر ہوئی تو کہاں ہوئی۔ اس کے بعد مروہ کہاں گئی۔ الفرانسی کا اس شادی پر کیا ردعمل تھا اس بارے میں کسی قسم کی کوئی تفصیلات دستیاب نہیں۔ تذکرہ نگار صرف یہی بتاتے ہیں کہ الفرانسی، اپنی محبوبہ کو یاد کرتے کرتے پاگل ہوگیا اور لوگوں نے اسے مروہ کا مجنوں کہنا شروع کردیا۔

الفرانسی کی موت کا سال بعض تضادات کے ساتھ 1458ء یا 1467ء قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ علم نہیں کہ اس کا انتقال کن حالات میں ہوا البتہ یہ نشاندہی ضرور کی گئی کہ اس کی قبر افغانستان میں ہے۔ 1937ء میں الفرانسی کی قبر سے دو ایسی اشیا ملیں جو مروہ سے اس کی محبت کا ثبوت تھیں۔ ان میں سے ایک وہ لاکٹ تھا جس پر منصور حلاج کی نظم لکھی ہوئی تھی جبکہ دوسرا چوبی بازوبند تھا جس پر مروہ نے اپنے ہاتھوں الفرانسی کا نام تراشا تھا۔ ان دونوں اشیا کو کابل میوزیم میں رکھ دیا گیا لیکن 2002ء میں جب امریکا نے افغانستان سے جنگ شروع کی تو ایامِ جنگ کے باعث کابل میں لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا اور کابل میوزیم سے دیگر قیمتی اشیا کے ساتھ یہ چیزیں بھی چرالی گئیں اور یوں محبت کی یہ نشانیاں ایسے ہاتھوں میں پہنچ گئیں جو نادیدہ ہیں اور دنیا ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔

لیکن ان دو چیزوں کے علاوہ بھی بعض شواہد ایسے ہیں جن سے مروہ اور الفرانسی کی محبت آج بھی زندہ ہے۔

الفرانسی فاختاؤں کے ذریعے اپنی محبوبہ کو خطوط روانہ کیا کرتا تھا جو کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچے لیکن الفرانسی نے ان فاختاؤں کے بارے میں بھی شاعری کی۔ اس نے محبت کے گیتوں میں صرف اپنی محبوبہ کو ہی یاد نہیں رکھا بلکہ

قمری مہینے

ایک چاند کے طلوع "رویتِ ہلال" سے دوسرے چاند کے طلوع تک درمیانی وقفہ کبھی 29 دن اور کبھی 30 دن کا ہوتا ہے۔ یہ وقفہ قمری مہینا کہلاتا ہے چونکہ اس کا آغاز آپ کی مکہ معظمہ ہجرت سے ہوا تھا۔ اس لیے اس نسبت سے انہیں ہجری مہینے بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقفے میں چاند زمین کے گرد اپنی ایک گردش پوری کرتا ہے۔ اپنی گردش کے اٹھائیسویں دن چاند پس منظر میں چلا جاتا ہے، کبھی ایک اور کبھی دو دن کے وقفے سے ظاہر ہو کر نئے قمری مہینے کا آغاز کرتا ہے۔ پہلے دن کے چاند کو "ہلال" کہتے ہیں۔ سال میں بارہ قمری مہینے ہوتے ہیں۔ یہ سال "سن ہجری" یا قمری سال کہلاتا ہے۔ ایک ہجری سال عیسوی سال سے گیارہ دن چھوٹا ہوتا ہے۔ بارہ مہینے قمری یوں ہیں۔ "محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذی القعد اور ذوالحج۔ عرب میں قمری مہینے زمانہ قدیم سے چلے آرہے ہیں۔ کسی اہم واقعہ کی بنا پر سال کے نام تجویز کرلیے جاتے تھے۔ عیسوی سال کی نسبت سے پہلا قمری دن 12 جولائی 622ء کو تھا۔ ان میں چار ماہ محرم، رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحج بہت مقدس ہیں۔ قرآن مجید کی سورہ توبہ میں اللہ نے ان ماہ میں لڑائی کی سخت ممانعت فرمائی ہے۔

مرسلہ: سلطان خان، کوئٹہ

فتاویٰ قراخانی

جلال الدین فیروز تغلق کے عہد کا ایک فقہی مخطوطہ جو فقہ حنفی کے مسائل پر مشتمل ہے۔ فارسی زبان میں ہے اور اس کا ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ یہ مولانا امام ہمام صدر الملت والدین یعقوب مظفر کرامی کا تصنیف کردہ ہے۔

مرسلہ: احمد شاہ، کوہاٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان فاختاؤں کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا جو اس کے محبت ناموں کو لے جاتی تھیں۔ اس کے بعد جب وہ صحرا میں زغوہ قبائل کا قیدی بنا تو صحرائی عقاب کی پرواز سے بے حد متاثر ہوا چنانچہ اس نے دشت کے شاہین کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔

انیسویں صدی کے آخر میں فرانسیسی باشندہ پیری لوئیس میلارڈ نے قاہرہ کا دورہ کیا۔ وہ الفرانسی کی شاعری سے بے حد متاثر تھا چنانچہ اس نے صحرائی عقابوں اور فاختاؤں کی پرواز کا کچھ اتنی باریک بینی سے مشاہدہ کیا کہ میلارڈ کو "المجنوں الفرانسی" کا خطاب دیا گیا۔ الفرانسی نے مروہ کی محبت میں بلا مبالغہ درجنوں گیت لکھے۔ محبت کے یہ دل موہ لینے والے گیت اور نظمیں عربی شاعری کا حصہ ہیں جبکہ الفرانسی کو حقوق نسواں کا سب سے پہلا مرد مصنف بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ شاید کرسٹائن کی صحبت کا اثر تھا کہ وہ بھی اپنی اولین محبوبہ کی طرح حقوق نسواں کا علم بردار بن کر ابھرا۔

اس کے علاوہ برطانوی مہم جو، مترجم، مصنف، فوجی، مستشرق، ماہر لسانیات، شاعر، ہپناٹسٹ اور سفارت کار کیپٹن سر رچرڈ فرانسس بورٹن (پیدائش 19 مارچ 1821ء انتقال 20 اکتوبر 1890ء) کا دعویٰ ہے کہ شیخ محمد ابن محمد ال نفزاوی کی "دی پرفیومڈ گارڈن" درحقیقت الفر... بیشتر نظموں کو بنیاد بنا کر تحریر کی گئی ہے جبکہ یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ ال نفزاوی اور شمس الفرانسی ایک دوسرے کے گہرے دوست رہے ہیں۔

سر رچرڈ فرانسس بورٹن انتیس یورپی، ایشیائی اور افریقی زبانوں پر عبور رکھتا تھا۔ وہ تاریخ کا دوسرا غیر مسلم ہے جس نے 1853ء میں حج کیا اور مکہ و مدینہ کی زیارت کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے نہ صرف پٹھان کا بہروپ بھرا بلکہ پکڑے جانے کے خطرات کو کم سے کم کرنے کے لیے ختنہ بھی کرالیا لیکن اس کے باوجود ایک لڑکے نے اسے غیر مسلموں کی طرح کھڑے ہو کر پیشاب کرتے دیکھ لیا اور فرانسس بورٹن نے اپنی جان بچانے کے لیے اسے حل کردیا۔ بورٹن نے افریقا کی کئی جھیلیں بھی دریافت کیں جن میں مشہور زمانہ جھیل وکٹوریہ بھی شامل ہے۔

فرانسس بورٹن کا ایک اور کارنامہ "الف لیلہ" کی کہانیوں کی فہرست مرتب کرنا اور ان کے واقعات تحریر کرنا ہے۔ ان واقعات کی دس جلدیں تشکیل پائیں جو 1865ء اور 1886ء میں منظر عام پر آئیں جبکہ اضافی راتوں کی کہانیاں 1886ء اور پھر 1888ء میں شائع ہوئیں۔

بورٹن نے "دی پرفیومڈ گارڈن" کا ترجمہ "معطر باغ" کے نام سے کیا تھا لیکن یہ کبھی شائع نہ ہوسکا کیونکہ بورٹن کی بیوہ ازابیل نے شوہر کی موت کے بعد اس کا مسودہ نذر آتش کردیا تھا۔ اس کی اس کارروائی پر بے حد وحساب اعتراضات اٹھائے گئے لیکن ازابیل نے دعویٰ کیا کہ "معطر باغ" کا مسودہ جلانے کی ترغیب اسے اس کے شوہر کی روح نے دی تھی۔

دی پرفیومڈ گارڈن (الخاطر نزہتہ فی العاطر الروض)

محمد ابن محمد ال نفزاوی کا سکس مینوئل اور شہوانی ادب کا شہ پارہ ہے۔ کتاب کا پورا نام "دی پرفیومڈ گارڈن آف سینسوئل ڈیلائٹ" ہے۔ ازابیل کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ اس نے کتاب کے مسودے کو نذر آتش کردیا تھا کیونکہ اس وقت بھی "دی پرفیومڈ گارڈن" کا جو انگریزی ترجمہ دستیاب ہے وہ سر رچرڈ بورٹن کا ہی ہے۔

دی پرفیومڈ گارڈن درحقیقت عربی کی "کاما سوترا" ہے۔ اغلب امکان ہے کہ اسے ال نفزاوی نے 1410ء سے 1434ء کے درمیان تحریر کیا جبکہ انگریزی زبان میں یہ 1886ء میں شائع ہوئی۔

ہندوؤں کی کاما سوترا کی طرح دی پرفیومڈ گارڈن بھی جنسی مواد سے بھری پڑی ہے۔ یہ بیس ابواب اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے جس میں عربی معاشرے میں عورت اور مرد کے تعلقات پر بے حد تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیپٹن سر رچرڈ فرانسس بورٹن کے اس دعوے کو اگر درست تسلیم کرلیا جائے کہ اس کتاب کی بنا درحقیقت محبت کے ان گیتوں پر رکھی گئی تھی جو شمس الفرانسی نے اپنی محبوبہ کے لیے لکھے تھے، تب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا الفرانسی، مروہ کے نام فحش نظمیں یا گیت لکھا کرتا تھا۔

اور یہ اسی طرح کا پُراسرار معاملہ ہے جو الفرانسی اور مروہ کی نامکمل محبت یا پھر مروہ کی الفرانسی سے بے وفائی سے مشابہ ہے۔ بہرحال "دی پرفیومڈ گارڈن" اگر مروہ کے جسمانی حسن کی عکاس ہے، تب بھی یہ کتاب عربی ادب کا حصہ ہے جبکہ خود مروہ اور الفرانسی کی محبت...... لیلیٰ مجنوں کی طرح چاہتوں کی بے مثال داستان اور جذبوں کی لافانی کہانی ہے۔

عشق حشرساماں

محمد ایاز راہی

عشق ایک الوہی جذبہ ہے اس کی توضیح وتشریح ناممکن ہے، دیوان کے دیوان پُر کردیئے گئے پھر بھی حق ادا نہ ہوا کیونکہ اس کے بے شمار پہلو ہیں، بہت سی اقسام ہیں۔ کبھی شفقت تو کبھی محبت اور کبھی عقیدت، زیرنظر تحریر بھی ہشت پہلو ہے، مختصر سی ہوکر بھی خود میں جامع ہے۔

عشق کی حشر سامانیوں کا مختصر سا بیان

حضرت عزازیل کا شمار قوم اجنّا میں ہوتا ہے جو ناری مخلوق یعنی آگ سے بنی یا پیدا کی گئی مخلوق کہلاتی ہے۔ یہ ایک غیر مرئی (نظر نہ آنے والی) مخلوق ہے مگر جنات کے وجود پر قرآن وحدیث کی گواہی مستند اور کافی ہے۔ دیگر ادیان و مذاہب کے لوگ بھی کسی نہ کسی صورت ان کا وجود مانتے ہیں۔ ان جنات کا رہن سہن، قوم قبیلہ اور دین ومذہب انسانوں ہی کی طرح ہوتا ہے۔ یہ گروہ ثقلین میں سے ہیں یعنی ابن آدم کی طرح ان کی وجہ سے

بھی زمین پر گناہوں کا بوجھ بڑھتا ہے۔ اپنے اعمال پر اللہ تعالیٰ کے آگے ان کو بھی حساب دینا ہوتا ہے۔ انہیں بھی نیکی یا بدی کی راہ چننے کا اختیار حاصل ہے۔ یہ انسانوں سے کئی گنا زیادہ عمر پاتے ہیں۔ حضرت عزازیل کو جب اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بڑائی کا احساس ہوا تو یہ بات اس کے دل کو لگی کہ اللہ کی عبادت ہی زندگی کا مقصد وحاصل ہے چنانچہ حضرت عزازیل کی طویل اور مسلسل عبادت کا آغاز ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عزازیل نے ہر قدم پر سجدہ کیا اور کثرتِ عبادت کی بلندیوں کو چھولیا۔ کائنات دم بہ خود تو فرشتے حیرت زدہ تھے۔ عبادت سے یہ طوفانی عشق حضرت عزازیل کی پہچان بن گیا۔ عبادت بڑھتی گئی اور اللہ سے دوری کے فاصلے گھٹتے گئے۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑا منصف اور عادل ہے جو کسی کی کوئی سی بھی محنت ضائع نہیں کرتا صلہ ضرور دیتا ہے۔ حضرت عزازیل کا یہ جنون رنگ لایا اور اللہ تعالیٰ نے اسے فرشتوں کا استاد مقرر کر دیا۔ اب حضرت عزازیل معلم الملکوت کے لقب سے سرفراز ہوئے اور فرشتوں کو تعلیم دینے لگے۔ مسلسل عبادت وریاضت نے ایک ناری وجود کو نوری اجسام پر فوقیت دے دی اور حضرت عزازیل کو مسندِ استاد پر بٹھا گئی لیکن دوسری طرف یہ محنت واعزاز (عبادت وریاضت اور معلم الملکوت ہونا) حضرت عزازیل کو فخر وغرور میں مبتلا کرتا گیا۔ عجز وانکسار کے اَن مول بیج فخر وغرور کی چلچلاتی دھوپ میں بے طرح جل کر رہ گئے، یہ نہ جانا کہ عبادت و ریاضت کی توفیق بھی تو اللہ ہی کے کرم سے ہے۔ حضرت عزازیل کا یہ زعم خود سچا مگر درحقیقت جھوٹا عشق اسے ”ہم چو ما دیگرے نیست“ کا خوگر بناتا گیا۔ خدا کے بعد اپنا وجود سب سے بلند اور اہم لگنے لگا بلکہ فخر وغرور کا گھمنڈ اور بڑھا تو مخلوق نے اپنے خالق کی ہم سری کے جھوٹے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ سو غیر معتبر عبادت و ریاضت سے پھولا فخر وغرور کا غبارہ اپنے منطقی انجام سے دوچار ہونے اور قیامت تک عبرت کا نشان بننے کے قریب ہونے لگا۔ جھوٹے عشق نے بالآخر تا ابد عشقِ ناکام کا چولا پہنا تھا اور فسق وفجور کا لبادہ اوڑھنا تھا۔ ایک ناری وجود نے اپنی ہی آگ میں جل کر ہمیشہ کے لیے سلگتا وجود بننا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ آدم کے اعلیٰ وارفع اور عظیم الشان کام کا اعلان کیا تو فرشتوں نے قبل از وقت ہی اعتراض کا اظہار کیا کہ یہ نئی مخلوق (آدمی) فساد کا باعث ہوگی، نافرمان ہوگی وغیرہ۔ اس پر خداوندِ علیم نے فرمایا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جان سکتے۔ میری حکمت عن قریب تم پر واضح ہو جائے گی۔ تخلیقِ آدم دراصل رسالتِ محمدی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بشری اظہار تھا جس کی تکمیل آگے چل کر کئی صدیوں بعد ہونی تھی اور پھر ہوئی۔ حضرت آدمؑ کا بت تیار ہوا تو اللہ تعالیٰ نے تمام فرشتوں کو اس بت کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ یہ وہ وجودِ خاکی (آدمی) تھا بہ قولِ ممتاز شیریں مرحومہ کہ جس میں بنیادی گناہ، فساد اور قتل وخوں وغیرہ کا امکان ہونے کے باوجود جس کے سامنے خدا نے نوری فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا اور بہ قول شاعر اس انسان (ابن آدم) کی تر دامنی بھی ایسی ہے کہ دامن نچوڑے تو فرشتے وضو کریں۔ چنانچہ تمام فرشتوں نے بے اختیار سجدہ کیا کہ ان کے پیشِ نظر صرف اور صرف اللہ کے حکم کی بجا آوری تھی۔ کچھ مفسرین کا کہنا ہے کہ فرشتوں کو حضرت آدمؑ کی پیشانی میں نورِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نظر آ گیا تھا مگر عزازیل کی آنکھیں فخر وغرور کی جھوٹی چمک سے چندھیا گئی تھیں، وہ جو خود کو خدا کے بعد سب سے بلند اور اہم گردانتا تھا۔ مٹی اور مٹ جانے (عجز وانکسار) کی عظمت سے آشنا نہ ہو سکا اور نورِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سعادت سے محروم رہ گیا۔ خود پرستی (جھوٹے عشق) کا شکار عزازیل خدا پرستی (سچے عشق) کو نہ پا سکا۔ عزازیل جھنجلا کر بے اختیار کہہ اٹھا کہ اپنے سامنے بنے مٹی اور گارے کے بت کو کیوں کر سجدہ کر سکتا ہوں، کیسے ممکن ہے کہ میں معلم الملکوت (خدا کے بعد دوسرا) مٹی کو سجدہ کروں۔ میں نے خاک پر تو اَن گنت سجدے کیے ہیں مگر خاک (خاکی بت) کو سجدہ کبھی نہیں کر سکتا۔ دراصل عزازیل اپنے خالق ومالک کے حکم کو نہ جان سکا۔ ایک خاکی غلام (ایاز) اپنے آقا (محمود غزنوی) کے حکم پر تو قیمتی موتی توڑ دیتا ہے مگر ایک ناری غلام (عزازیل) اپنے خالق (ربِ دو جہاں) کے حکم پر اپنی جھوٹی انا کا پتھر نہ توڑ سکا۔ اس لیے کہ یہ ناری غلام عجز وانکسار سے محروم غلام ہے نتیجہ یہ کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راندۂ درگاہ قرار پاتا ہے، مردود ٹھہرتا ہے۔ جھوٹے عشق کی تباہ کاری دیکھیے کہ مایوسی میں مبتلا ابلیس (عزازیل) توبہ کرنے کی بجائے بھنا کر مزید اکڑ بیٹھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو (نعوذ باللہ) مبازرت دے ڈالتا ہے کہ میں ابنِ آدم کو ضرور گم راہ

کروں گا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بھی بڑی بے نیاز ذات ہے نہ صرف عزازیل کو کھلی مہلت دی بلکہ قیامت تک زندگی بھی دے ڈالی کہ اے ملعون، جا جو چاہے کرلے مگر میرے بندوں کو تو کبھی گمراہ نہ کر سکے گا کہ میری رحمت ان کی محافظ ہوگی اور انہیں بچائے رکھے گی۔ ضربِ کلیم میں علامہ اقبال مرحوم کی ایک نظم تقدیر (ابلیس ویزداں) مکالماتی نظم ہے جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ عزازیل اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے خدا مجھے آدم سے کوئی دشمنی نہ تھی نہ ہی میرے لیے ممکن تھا کہ انکارِ سجدہ کرتا یا اپنے آپ کو متکبر ومغرور ثابت کرتا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میرا سجدہ نہ کرنا تیری مرضی اور ارادے کے مطابق تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مخاطب کر کے فرمایا تم نے اس (ابلیس) لعین کا جواب سن لیا۔ یہ اس کی کمینہ فطرت کو ظاہر کر رہا ہے۔ انکارِ سجدہ اس نے اپنی مرضی سے کیا اور اب بہانہ بنا رہا ہے کہ اے خدا، میرا سجدہ نہ کرنا تیری مرضی سے تھا۔ یوں یہ لعین اپنے کردہ گناہ کو خدا کا لکھا بتا کر تقدیر کا غلط مفہوم بتا رہا ہے حالانکہ یہ لعین سجدہ کرنے نہ کرنے میں آزاد تھا۔ کوئی پابندی نہیں تھی اس پر لیکن اب یہ اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دے رہا ہے (اس نظم کا بنیادی خیال علامہ اقبالؒ نے شیخ محی الدین ابن عربی سے لیا ہے) اس تمام واقعہ سے قطع نظر کہ یہ اللہ اور عزازیل کے درمیان ہونے والا معاملہ ہے مسلمان صوفیا اور مفکرین عزازیل کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھتے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومیؒ عزازیل کو خواجہ اہلِ فراق کا لقب دیتے ہیں۔ ہ گفت رومی، خواجہ اہلِ فراق، آں سراپا سوز وساز خونیں آیاق، جب کہ علامہ اقبال مرحوم ایک عالمِ بے عمل کے مقابل عزازیل کو عالمِ باعمل کے روپ میں دیکھتے ہیں گو کہ یہ عالمِ باعمل عزازیل حقی وغلط حرکات کا پرچارک اور عامل ہے لیکن بے عملی کے برعکس کار مسلسل میں مصروف ہے (تو فقط اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ اللہ ہو۔ مکالمہ، جبریل وابلیس۔ کتاب بالِ جبریل) بہرحال عشقِ ناکام کی یہ نمائندہ اور ناکام شخصیت (عزازیل) اب قیامت تک کے لیے عبرت کا نشان بنی رہے گی۔ چاہے اسے عزازیل کہیں یا ابلیس۔ شیطان کا نام دیا جائے یا شرید سرکش کا۔ راون یا اہرمن، دنیا کے تقریباً ہر مذہب اور ادب میں شیطان کا تصور کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے غلطی تو حضرت آدم علیہ السلام سے بھی ہوئی (نادانستہ ہو جانے اور دانستہ قصداً کر ڈالنے کا فرق ملحوظ رہے) مگر عجز وانکسار اور گریہ وزاری نے بندگی کے اس قدر خوش نما پھول کھلائے کہ خداوند رحیم وکریم نے ندامت کے آنسو سچے موتیوں سے بدل دیے لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل نے ایک بار پھر نافرمانی اور سرکشی کی داستان دہرا دی۔

قرآن پاک کے چھٹے پارے میں سورۂ مائدہ کی ستائیسویں آیت سے ہابیل اور قابیل کا قصہ شروع ہوتا ہے۔ ہابیل اور قابیل دونوں حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے۔ ہابیل فطری طور پر نیک نفس تھا جب کہ قابیل سرکش تھا۔ حضرت حوا کے جڑواں بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوتے تھے...... سو پہلے پیدا ہونے والی لڑکی بعد میں جنم لینے والے لڑکے کے لیے اور بعد میں پیدا ہونے والی لڑکی پہلے لڑکے کے لیے ہوتی تھی۔ اس طرح اقلیمہ نامی لڑکی ہابیل کے لیے اور لیوا نامی لڑکی قابیل کے لیے منتخب ہوئی لیکن اقلیمہ چونکہ بہت خوبصورت تھی اس لیے قابیل اسی سے شادی پر بہ ضد تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے قابیل کو سختی سے منع کیا کہ اقلیمہ تجھ پر حرام ہے اس کا خیال چھوڑ دو۔ اس پر قابیل والد سے الجھ پڑا کہ آپ ہابیل کو زیادہ چاہتے ہیں۔ اس لیے خوب صورت لڑکی اسے دینا چاہتے ہیں، آپ یہ غلط کر رہے ہیں۔ قابیل نے جب کسی صورت مان کے نہ دیا تو بالآخر حضرت آدم علیہ السلام نے دونوں بیٹوں سے کہا کہ تم دونوں اللہ کی بارگاہ میں قربانی پیش کرو جس کی قربانی قبول ہو جائے گی اقلیمہ اسی کی ہوگی۔ آغازِ کار میں دونوں بیٹے گڈریے تھے بعد ازاں قابیل نے تہذیب کی دوڑ میں اہم قدم اٹھایا اور کھیتی باڑی کرنے لگا جب کہ ہابیل اپنے ابتدائی پیشے (مویشی چرانا) سے ہی منسلک رہا۔ بہرحال ہابیل نے تو نہایت خوب صورت دنبہ ذبح کیا اور قابیل نے گندم کی ردی بالیاں اکٹھی کیں۔ دونوں چیزیں ایک پہاڑ پر رکھ دی گئیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفید رنگ کی نیبی آگ اتری اور ہابیل کے دنبے کو جلا کر اس کی قربانی قبول کر لی۔ بعض روایات میں ہے کہ دنبے کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ یہ دنبہ جنت میں رہا اور بعد میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ ذبح ہوا۔ ہابیل کی قربانی قبول ہونے پر قابیل جھنجلا کر حسد میں مبتلا ہو گیا۔ ادھر اقلیمہ کے عشق نے اسے پاگل کر رکھا تھا۔ اس نے مایوس ہو کر ہابیل

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو راہ سے ہٹانے کی ٹھان لی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہابیل کے ساتھ کیا سلوک کرے اپنی راہ سے کیوں کر ہٹائے۔ ایسے میں عزازیل (ابلیس) اس کے پاس ایک بزرگ کے بہروپ میں پہنچا۔ تجاہل عارفانہ سے قابیل کا حال پوچھا تو قابیل نے اپنی الجھن کا اظہار کردیا۔ اس پر ابلیس نے اسے سمجھایا اور یہ راہ دکھائی کہ جب ہابیل سو رہا ہو تو بڑے پتھر سے اس کا سر کچل دو۔ بعض روایات میں ہے کہ ابلیس ایک جانور کی شکل میں اس کے پاس آیا جس کے ایک پنجے میں کوئی چھوٹا جانور تھا اس نے دوسرے پنجے میں پتھر اٹھا کر چھوٹے جانور کا سر کچل دیا۔ (بعض روایت میں کو ابیان کیا گیا ہے) ایک دن مویشی چراتے دوپہر کو جب ایک درخت تلے ہابیل سوگیا تو قابیل نے ایک بڑا بھاری پتھر اس کے سر پر دے مارا یوں ہابیل کا قتل کر ڈالا اور پھر اقلیمہ کو اٹھا کر عدن کی طرف بھاگ گیا۔ اقلیمہ کو زبردستی ساتھ رکھا۔ بوڑھا ہوا تو اس کی ناجائز اولاد اسے پتھر مارا کرتی تھی۔ بالآخر قاتل قابیل اپنے ہی ایک بیٹے کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ انگریزی زبان کے شاعر لارڈ بائرن کے ہاں انسانیت کے اس پہلے قاتل کا تصور بہت اونچا ہے۔ بائرن کا قابیل کسی کے آگے جھکنا نہیں چاہتا۔ یزداں کے آگے نہ اہرمن کے آگے۔ اس کے پاس ایک اعلیٰ دماغ ہے وہ علم اور زیادہ سے زیادہ علم کی تلاش میں سرگرداں ہے اس لیے کائنات کی ساری چیزیں سارے اسرار و رموز حیرت ناک ہوتے ہوئے بھی اس کے اپنے تصور سے کم درجہ کی معلوم ہوتی ہیں۔ بائرن نے قابیل کے حرکت قتل کی توجیہ و توضیح دوسرے انداز میں کی ہے کہ قابیل نے کسی وحشی جذبے کے تحت عورت یا جنس کی خاطر قتل نہیں کیا بلکہ اس کے دماغی توازن کھو کر آپے سے باہر ہوجانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاکیزہ پھلوں کی قربانی ہابیل کی خونی قربانی کے سامنے قبول نہیں کی گئی۔ قابیل کا اعلیٰ دماغ یہ یقین نہیں کرسکتا تھا کہ خدا کو خونی قربانیوں کی ضرورت ہے۔ بھیڑ بکریوں کے ننھے ننھے بلکتے بچے اپنی نالہ و فریاد کرتی ماؤں سے چھین کر قربان کردیے جائیں۔ قربان گاہ پر ان کا خون بہایا جائے اور ان کا گوشت جلایا جائے۔ قابیل، ہابیل کو اس طرح کی قربانی کرتے دیکھ کر غصے سے مار بیٹھتا ہے کہ اگر تمہارا خدا خون چاہتا ہے تو پھر اپنا بھی کچھ خون اس قربان گاہ پر بہادو۔ لارڈ بائرن کی یہ توجیہ اپنی جگہ مگر

اصل بات نیک نیتی اور اطاعت الٰہی کی ہی ہے۔ بدطینت بدنہاد قابیل دنیا و آخرت دونوں میں رسوا ہوا۔ اللہ کا باغی، پیغمبر باپ کا نافرمان، بھائی کا قاتل، زانی، حاسد، ایک اقلیمہ کے جھوٹے عشق نے قابیل کو کہیں کا نہ رکھا اور وہ قیامت تک کے لیے عبرت بن گیا۔ اسی طرح ہاروت ماروت کا واقعہ بھی بڑا نصیحت آموز واقعہ ہے۔ قرآن پاک میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت کا ذکر ہے جس کی تفصیل احادیث اور اسلامی روایات میں ملتی ہے۔ قرآن پاک کے پہلے پارے بارہویں رکوع کی آیت ایک سو دو کا ترجمہ ہے۔ ”اور یہودی اس علم کے پیچھے ہولیے جو شہر بابل میں ان دو فرشتوں پر اترا تھا جن کا نام ہاروت و ماروت تھا اور وہ دونوں فرشتے کسی کو سحر (جادو) نہیں سکھاتے تھے جب تک صاف طور سے یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو ذریعۂ آزمائش ہیں پس اے طالب سحر تو کافر نہ بن۔ کفر میں نہ پڑ۔ لیکن اس کے باوجود یہودی ان سے سحر سیکھتے جس سے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیتے۔“ تفسیر عزیزی نے بہ حوالہ ابن جریر، ابن ابی حاتم حاکم اور دیگر تفاسیر نے حضرت علی المرتضیٰؓ حضرت ابن عباس اور عبداللہ ابن مجاہد سے بیان کیا کہ حضرت ادریسؑ کا زمانہ تھا حضرت ادریس حضرت آدم کی پانچویں پشت اور حضرت شیث کی اولاد میں سے تھے تو حضرت ادریس کے عہد میں لوگ بہت بدکار اور گمراہ ہوگئے تھے۔ فرشتوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ مولیٰ آدمی بڑا پاپی ہے۔ یاد ہے کہ فرشتوں نے تخلیق آدم سے پہلے بھی اپنا استحقاق خلافت بیان کیا تھا کہ یہ آدمی خلافت کے لائق نہیں نااہل ہے اور اگر آدمی کو اپنا خلیفہ یا نائب بنانا ہی ہے تو اس کا وزیر و مشیر ہم فرشتوں کو بنایا جائے تاکہ ہم ان کے بگڑے کام سنبھال لیں۔ بہرحال ارشاد باری ہوا کہ اس زمانے (عہد ادریس) کے آدمی کو غصہ اور شہوت دیا گیا ہے جس سے گناہ زیادہ کرتا ہے لہٰذا اے فرشتو، اگر یہ چیزیں تمہیں ملیں تو تم بھی گناہ کرنے لگو گے۔ فرشتے بولے مولیٰ کریم ہم تو گناہ کے قریب بھی نہ جائیں گے خواہ کتنا ہی غصہ اور شہوت کیوں نہ ہو (وہی پارسائی کا بے جا غرور) اس پر حکم ربی ہوا کہ اچھا تم اپنی جماعت میں سے اعلیٰ درجے کے پرہیزگار فرشتے چن لو، ان کو غصہ اور شہوت دے دیتے ہیں پھر امتحان ہوجائے گا چنانچہ ہاروت و ماروت جو بڑے ہی عبادت گزار فرشتے تھے انتخاب میں آگئے (فرشتوں نے

عزازیل اور قابیل کے انجام سے کوئی سبق نہ لیا) حق تعالیٰ نے ہاروت و ماروت کو دونوں چیزیں (غصہ اور شہوت) دے کر شہر بابل میں اتار دیا اور فرمایا کہ تم قاضی بن کر لوگوں کے فیصلے کیا کرو اور ہر شام اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر آجایا کرو۔ سو یہ دونوں فرشتے اسی طرح ایک ماہ تک آتے جاتے رہے اور ان کے عدل و انصاف کا چرچا عام ہوگیا۔ ایک روز زہرہ نامی ایک حسین و جمیل عورت مقدمہ لے کر آئی۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ اس عورت کا نام بیدخت تھا زہرہ لقب تھا ملک فارس کی رہنے والی تھی اور اپنے شوہر کے خلاف مقدمہ لے کر آئی تھی۔ ہوا کچھ یوں کہ اس عورت زہرہ کو دیکھتے ہی دونوں فرشتے بے اختیار ہوگئے اور اس سے محبت کی خواہش کی۔ زہرہ نے کہا کہ میرا دین کچھ اور ہے تمہارا کچھ اور۔ لہٰذا یہ نہیں ہوسکتا نیز میرا شوہر بہت غیرت مند ہے اگر اسے پتا چل گیا تو مجھے قتل کردے گا۔ سو پہلے تو میرے معبود بت کو سجدہ کرو۔ دوم میرے شوہر کو قتل کردو۔ پھر میں تمہاری اور تم میرے۔ فرشتوں نے انکار کردیا اور زہرہ چلی گئی مگر فرشتے زہرہ کے دام میں گرفتار ہوچکے تھے انہیں خود پر اختیار نہیں رہا تھا۔ ذہین زہرہ بھی انہیں تاڑ گئی تھی۔ آخر فرشتوں نے زہرہ کو پیغام بھیجا کہ ہم تیرے گھر آنا چاہتے ہیں۔ زہرہ نے جواب کہلا بھیجا کہ بہ سر و چشم۔ دونوں فرشتے زہرہ کے گھر پہنچے تو سجی سنوری حسین زہرہ نے والہانہ استقبال کیا اور چار شرائط ان کے سامنے رکھیں 1۔ مجھے اسم اعظم بتادیں۔ 2۔ میرے بت کو سجدہ کریں۔ 3۔ میرے شوہر کو قتل کردیں۔ 4۔ یا پھر شراب پی لیں۔ فرشتوں نے باہم سوچ بچار اور مشورہ کیا کہ اسم اعظم تو ہم کسی صورت نہیں بتا سکتے۔ بت کو سجدہ شرک ہے اور قتل گنا کبیرہ ہے۔ سو آخری شرط ہی ہلکی پھلکی ہے چنانچہ فرشتوں نے جی بھر کے شراب پی لی جب بدمست ہوگئے تو زہرہ نے ان سے اپنے بت کو سجدہ کروایا مزید شہ دے کر شوہر کو مروا ڈالا اور بہلا پھسلا کر ناز و ادا سے اسم اعظم بھی اگلوالیا۔ نتیجہ یہ کہ وہ خود تو اسم اعظم پڑھ کے صورت بدل کر آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے قالب و روح کو زہرہ سیارہ سے متصل کیا اور اس کی شکل زہرہ سیارے کی طرح ہوگئی۔ ادھر فرشتے جب ہوش میں آئے تو شرک، قتل اور حرام خوری کے مرتکب ہوچکے تھے۔ ندامت، خوف اور شرمندگی کے بوجھ سے لرزتے کانپتے حضرت ادریسؑ کی

بارگاہ میں پہنچے۔ سارا ماجرا کہہ کے دعائے مغفرت کے طالب ہوئے۔ حضرت ادریسؑ نے دعا کی تو بہت دنوں بعد بارگاہ الٰہی سے جواب آیا کہ یا تو یہ فرشتے دنیوی عذاب قبول کرلیں یا آخرت کا۔ اس پر فرشتوں نے اس فانی دنیا کا عارضی عذاب قبول کرلیا چنانچہ دونوں فرشتے ہاروت و ماروت شہر بابل (عراق) کے ایک کنویں میں زنجیروں سے باندھ کے الٹے لٹکا دیے گئے جہاں قیامت تک صبح و شام دیگر فرشتے باری باری انہیں کوڑے مارتے رہیں گے۔ یہ قصہ سنن [illegible] مسند امام احمد اور دیگر کتب احادیث میں بہ اسناد صحیح درج ہے۔ امام فخرالدین رازی اس واقعے کی صحت سے یکسر انکاری ہیں کہ یہ سب کچھ عقل سے بعید ہے۔ جبکہ اسرائیلی روایت کے مطابق ہاروت، ماروت ایک طوائف زہرہ کے جال میں آکر پارسائی، پاکیزگی کھو بیٹھے حد درجہ گنہگار ہوئے اور اب قیامت تک کے لیے عذاب سے دوچار ہیں۔ نوری، ناری اور خاکی۔ تین مختلف مخلوقات (ہاروت و ماروت، عزازیل اور قابیل) کے یہ ابتدائی اور اولین عشق ناکام کی عبرت آموز داستانیں اب تاریخ کا حصہ ہیں اب تک کی معلوم تاریخ اس طرح کی ناکام داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ بہ قول ممتاز شیریں مرحومہ پرانے دور میں مثلاً قدیم یونانیوں اور مصریوں کے ہاں جنس اتنی زبردست قوت سمجھی جاتی تھی کہ یا تو اسے ”آسمانی الوہی“ درجہ دیا جاتا یا شیطان کا۔ یہ کوئی عالم بالا کی قوت تھی یا اندرونی شیطانی قوت جو مردوں اور عورتوں کو اپنے غلبے سے بے بس کردیتی تھی۔ ممتاز شیریں مرحومہ کے اس قول کی روشنی میں آیئے دیکھتے ہیں کہ دیگر مشاہیر عالم عشق مجازی (جھوٹے بناوٹی عشق) کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ افلاطون کی رائے میں عشق بغیر فکر کے بے کار نفس کی ایک حرکت کا نام ہے۔ معلم اول ارسطو کے مطابق عشق محبوب کے عیبوں کے ادراک سے حس کا اندھا ہونا ہے۔ سقراط کہتا ہے عشق دیوانگی ہے اس کی بھی کئی اقسام ہیں جس طرح سے جنون کی کئی اقسام ہیں۔ فیثا غورث کے نزدیک عشق ایک ایسا لالچ ہے جو تباہ کن غم تک پہنچا کر چھوڑتا ہے۔ عرب کی ایک شاعرہ پکاری، عشق ذلت اور پاگل پن ہے۔ کسی نے کہا عشق تو جادو کا نچوڑ ہے اور اسد اللہ خان غالب فرماتے ہیں۔ ” کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنوری

منظرامام

عیسوی سال کا پہلا مہینہ، اس مہینے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کہ کئی اہم واقعات اس ماہ میں رونما ہوئے۔ وہ واقعات کیا تھے؟

باشعور قارئین کے لیے ایک خصوصی تحریر

ہم نے عیسوی کلینڈر کے لحاظ سے دنیا بھر کے اہم واقعات کو مختلف تاریخوں میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد آپ کو ایک نظر میں یہ معلوم ہوجائے گا کہ پوری دنیا میں اس تاریخ کو کیا کیا ہوا تھا۔

چونکہ ہجری تاریخ اور عیسوی تاریخ میں بہت فرق ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ جو واقعہ عیسوی کلینڈر کے حساب سے کسی تاریخ کو ہوا ہو، وہ ہجری تاریخ کے حساب سے اگلے سال کسی اور تاریخ میں آجائے۔ ہم نے اس مضمون میں صرف عیسوی تاریخ (کلینڈر) سے ملادی ہے۔

پہلی جنوری:

یہ وہ تاریخ ہے جو ہجری لحاظ سے صفر المظفر / ربیع الاول 1435 ہے۔ اور وصال حضرت رسول خدا ہے۔ بہ مطابق 11 ہجری اور شہادت امام حسن ہے۔ 50 ہجری۔

آپ اور حضرت امام حسن کے لیے ہم بس اتنا ہی لکھ سکتے ہیں۔ یہاں صرف اس تاریخ کو یادداشت کے طور پر لکھ دیا گیا ہے۔

پہلی جنوری کو دنیا بھر میں اسٹریٹ چلڈرن ڈے اور نیو ایئر ڈے منایا جاتا ہے۔ اسٹریٹ چلڈرن وہ بچے ہیں جو آپ کو سیکڑوں کی تعداد میں اپنے اردگرد دکھائی دے جائیں گے۔ کچرا چنتے ہوئے، گاڑیاں دھوتے یا اس قسم کے چھوٹے موٹے کام کرتے ہوئے۔ ان بچوں کا خاندانی پس منظر یا گھر وغیرہ نہیں ہوتا۔ یہ فٹ پاتھوں پر زندگی گزارتے ہیں اور وہیں زندگی کی جدوجہد میں بڑے ہوجاتے ہیں۔ اس دن کو منانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہمیں ان پر بھی دھیان دینا چاہیے۔ یہ بھی کسی کی اولاد ہوں گے۔ نیو ایئر ڈے۔ یہ اکتیس دسمبر رات کے بارہ بجے کے بعد جنوری کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور پوری دنیا میں ایک جشن کے طور پر منایا جاتا ہے۔

جدید جارجین کلینڈر کے علاوہ رومن حکومت کے۔ جولین کلینڈر میں بھی اس کا رواج تھا۔ اس کی ابتدا 45BC سے ہوتی ہے۔

رومن اس تاریخ کو اپنے دیوتا JANUS سے منسوب کرتے تھے۔ یہ دیوتا، دروازوں، گیٹ وغیرہ کو کھولنے اور کسی کام کی ابتدا کا دیوتا سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے پہلی جنوری کا مطلب ہوتا ہے کہ نئے سال کا دروازہ کھول دیا گیا۔

اس دن تقریباً دنیا بھر میں تعطیل ہوتی ہے۔ جولیس سیزر کی موت کے بعد اس تاریخ کا اہتمام اور شدید ہوگیا تھا۔

لندن میں بگ بین کے ذریعے اس کی آمد کا اعلان کیا جاتا ہے اور بے مثال آتش بازی ہوا کرتی ہے۔

پہلی جنوری کو روسی انجینئر اور سائنس دان Valdamir Zworykin نے Cathodekay tobe ایجاد کیا۔

1863ء لنکن نے ایک اہم معاہدے پر دستخط کیے۔

دو جنوری:

دو جنوری کو امریکا اور کینیڈا نے آپس میں ایک معاہدہ کیا۔ سال 1988ء، جس کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کی وسیع راہیں استوار ہوگئیں۔

دو جنوری 1861ء کو ہیلن ٹانٹ کی پیدائش ہوئی۔

Isaac asimov کی پیدائش (1920ء) یہ دنیا کے چند بڑے اسٹرونومر میں سے تھا۔

تین جنوری:

اس تاریخ کو یورپ اور مغربی ممالک میں Festival of sleep day منایا جاتا ہے۔ یعنی سو کر گزارنے کا دن۔ اس دن کو منانے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ نئے سال کے ہنگاموں میں سب بری طرح تھک چکے ہوتے ہیں۔ اسی لیے یہ تاریخ چھٹی کی ہوتی ہے تاکہ وہ جی بھر کر سو سکیں، آرام کرسکیں۔ اس کے بعد زندگی کی جدوجہد میں پھر سے حصہ لینے کو ذہنی طور پر تیار ہوجائیں۔

اسی تاریخ کو ایک اور روایت بھی دُہرائی جاتی ہے اور وہ ہے کیک کو پھینک دینے کی روایت۔ نئے سال کی چھٹیوں سے پہلے ہر گھر میں کیک خریدے جاتے ہیں۔ اور تین جنوری تک وہ یا تو خراب ہوچکے ہوتے ہیں یا کھانے کو دل نہیں چاہتا (اسی لیے اٹھا کر پھینک دیے جاتے ہیں)

اس تاریخ کو Humiliation day بھی منایا جاتا ہے۔

یہ روایت شاید 1923ء میں کینیڈا میں چینی باشندوں کی ہجرت سے ہوئی ہے۔ جب بارڈر پر ان کو روک کر توہین آمیز سلوک کیا جاتا تھا۔

چینیوں نے اس دن کو منانا اس لیے شروع کیا کہ احساس دلایا جائے کہ کسی کو بھی کسی کی توہین کا حق نہیں ہے۔

تین جنوری کو ہیری تھامسن نے سولر انرجی (شمسی توانائی) کے ذریعے ایک مکان کو گرم کرنے کا مظاہرہ کیا جس کو بہت پذیرائی ملی۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ امریکا بے شمار ریاستوں سے مل کر بنا ہے۔ ساری ریاستیں ایک ساتھ اس میں شامل نہیں ہوئیں بلکہ آہستہ آہستہ ہوتی رہیں۔

تین جنوری 1959ء کو الاسکا نے یونین میں شرکت کی۔

تین جنوری 1989ء کو امریکا نے لیبیا کے دو طیارے مار گرائے۔ اور دوسری طرف پناما میں جنرل Manual noriga نے تین جنوری 1990ء کو ہتھیار ڈال دیے۔

اس تاریخ کو 1888ء میں مشروب پینے کا اسٹرا متعارف ہوا۔

چار جنوری:

اس تاریخ کو مغرب میں Trivia day منایا جاتا ہے۔ اس دن دوستوں اور قریبی رشتے داروں کے ساتھ ہنسی مذاق کیا جاتا ہے (میرا خیال ہے کہ یہ بھی اپریل فول قسم کی کوئی روایت ہو سکتی ہے)

اسی تاریخ کو امریکا نے لیبیا کے دو اور طیارے گرادیے۔ 1643ء میں مشہور سائنس دان نیوٹن کی پیدائش۔

پانچ جنوری:

اس تاریخ کو پوری دنیا میں پرندوں سے محبت کا دن منایا جاتا ہے (Bird Day) پرندے زندگی میں خوبصورتی اور سکون کی علامت ہوا کرتے ہیں۔ یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہمیں پرندوں سے محبت کرنی چاہیے۔ ان کا خیال رکھنا چاہیے۔

اس دن کو منانے کی ابتدا چارلس اماتر دنے 1894ء میں کی تھی۔ ابتدا میں تو اس کی محبت اپنے علاقے، پھر اپنے شہر تک محدود رہی۔ پھر ساری دنیا میں یہ دن منایا جانے لگا۔ اس دن لوگ ایک دوسرے کو اپنے اپنے پالتو پرندوں کے بارے میں بتاتے ہیں اور ان کی حفاظت کے طریقے شیئر کرتے ہیں۔

پانچ جنوری ہی کو صدر Caluin Cooligla کی وفات ہوئی تھی۔

6 جنوری:

یہ تاریخ بھی اپنی اہمیت کے لحاظ سے کم نہیں ہے۔ مشہور کردار شرلاک ہومز کی تخلیق 1854ء میں ہوئی۔

6 جنوری 1912ء میں نیو میکسیکو نے یونین میں شمولیت اختیار کی۔

6 جنوری 1919ء کو مشہور امریکی صدر روز ویلٹ کا انتقال ہوا۔

اس تاریخ کو دو یوم منائے جاتے ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام Bean Day ہے اور دوسرا Coddle up ڈے ہے۔

ان دونوں ایام کی تاریخ ابتدا کے بارے میں کچھ نہیں معلوم لیکن Beanday پھلیاں کھانے کا دن ہے۔

اس دن دنیا کے کئی ملکوں میں پھلیاں کھانوں میں تیار کی جاتی ہیں۔ ایک دوسرے کو پھلیوں کی دعوت دی جاتی ہے۔ یہ تاریخ مشہور شاعر، مفکر، ادیب خلیل جبران کی بھی پیدائش کی تاریخ ہے (1883ء) Coddleup day آرام کرنے کا دن ہے۔ فراغت اور اطمینان کی تاریخ ہے۔ آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر گپ شپ کرنے کا دن ہے یا آرام دہ بستر پر نیم دراز ہو کر اپنی پسندیدہ کتاب کے مطالعے کا دن ہے۔

یہ دن کیوں منایا جاتا ہے۔ کب سے اس کی ابتدا ہوئی۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن یہ بھی ان بے شمار ایام میں سے ایک ہے جو دنیا کے کئی ممالک میں منائے جاتے ہیں جبکہ پاکستان میں اگرتلہ سازش کیس کی تاریخ ہے۔ (1968ء)

7 جنوری:

بہت ہی اہم تاریخ ہے۔

اس تاریخ کو مشہور ہیئت دان گلیلیو گلیلی نے جیوپیٹر کے پانچ چاند کا مشاہدہ کیا۔ واقعہ 7 جنوری 1610ء کا ہے۔

اسی تاریخ کو 1789ء میں امریکا میں پہلا صدارتی انتخاب ہوا تھا۔

7 جنوری 1913ء کو ولیم برٹن نے گیسولین رجسٹر کروائی۔ اسی تاریخ کو Old rock day (پرانے پتھروں کا دن) منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو استاد اپنے شاگردوں کو ایسی جگہ لے جاتے ہیں جہاں بہت پرانے پتھر موجود ہوں۔ وہ فوسل اور پتھروں کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم اس تاریخ کو پتھروں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا دن کہہ سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس یوم کی تاریخ بہت قدیم ہے۔

8 جنوری:

اس تاریخ کو شوبز کے ایک لیجنڈ ایلوس پریسلے کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ پیدائش مسی سی پی میں 1935ء میں ہوئی تھی۔ ایلوس پریسلے کل بھی لیجنڈ تھا اور آج بھی لیجنڈ ہے۔ اس جیسی مقبولیت شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی تھی۔ اس نے اپنی آواز اور موسیقی سے پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

8 جنوری کو Bubble bath day منایا جاتا ہے۔ نہیں معلوم کہ اس دن کی ابتدا کب اور کہاں سے ہوئی۔ لیکن یہ دن بچوں کے لیے بہت موج مستی کا دن ہوا کرتا ہے۔ جب انہیں بلبلوں سے نہلایا جاتا ہے۔ اسی تاریخ کو Make your dream come true کا یوم بھی منایا جاتا ہے۔ یعنی اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کر لیں۔

9 جنوری:

1913ء میں امریکا کے صدر نکسن پیدا ہوئے۔ اسی تاریخ کو سال 1906ء میں Compbelle صابن کی

رجسٹری ہوئی۔ اسی تاریخ کو 2007ء میں پہلا آئی فون متعارف کیا گیا۔

اسی تاریخ کو 1793ء میں امریکا کے پہلے غبارے کی پرواز ہوئی۔ اسی تاریخ کو... دو یوم منائے جاتے ہیں۔

ایک ہے نیشنل اپری کاٹ ڈے اور دوسرا ہے National static electricity day عیسوی کیلنڈر کی ترتیب کے لحاظ سے 9 جنوری (1914ء) کو حضرت میاں میر کے عرس کی تاریخ ہے۔ جبکہ ہجری کیلنڈر کے حساب سے ان کی وفات سات ربیع الاول کو ہوئی تھی (1630ء میں سات ربیع الاول گیارہ اگست کو تھی) لیکن 2014ء میں 9 جنوری کو ہو رہی ہے۔ اسی لیے ہم 9 جنوری کے حساب سے ان کے بارے میں بتا رہے ہیں) حضرت بابا سائیں میر محمد صاحب (میاں میر) کا زمانہ 1550-1635ء کا ہے۔ آپ کی رہائش لاہور کے علاقے دھرم پورہ میں تھی۔ آپ حضرت عمر فاروق کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ روحانی اعتبار سے قادریہ سلسلہ کے بزرگ تھے۔ شاہ جہاں کا چھوٹا بیٹا دارا شکوہ آپ کا بہت معتقد تھا۔ بلکہ آپ داراشکوہ کے استاد تھے۔ داراشکوہ نے اپنی کتاب میں آپ کا تذکرہ بہت احترام اور عقیدت سے کیا ہے۔ حضرت میاں میر قادریہ سلسلے کی ایک شاخ میاں خلیل کے بانی بھی ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی آپ کا بہت احترام کیا کرتے۔ آپ کی بہن بی بی جمال خاتون بھی ولیہ تھیں۔

گرو ارجن اکثر ان کی ملاقات کو آیا کرتے اور دونوں کے درمیان گھنٹوں عشق الٰہی کی باتیں ہوا کرتیں۔ کہا جاتا ہے کہ امرتسر کے گولڈن ٹیمپل کی بنیاد گرو ارجن نے حضرت میاں میر سے رکھوائی تھی۔ گرو ارجن کے وصال کے بعد ان کے بیٹے گرو ہر گوبند بھی آپ کی خدمت میں حاضری دیا کرتے تھے۔

10 جنوری:

1776ء (دس جنوری) Thamas paines کی مشہور کتاب کامن سنس کی اشاعت ہوئی۔ اس کتاب نے انسانی ذہن کے کئی سربستہ راز کا انکشاف کیا۔ (انسان صدیوں سے علم اور ہنر کی اشاعت اور ترقی میں لگا ہوا ہے۔ مغربی ممالک کے برعکس جب ہم اپنے یہاں ان تاریخوں کو دیکھتے ہیں تو کوئی خاص کارنامہ سامنے نہیں آتا)

دس جنوری 1863ء کو لندن میں دنیا کی پہلی انڈر گراؤنڈ ریلوے لوگوں کے لیے کھول دی گئی تھی (اب 2014ء ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں) دس جنوری 1893ء کو تھامس لین نے دنیا کا سب سے پہلا گیس لائٹر متعارف کروایا تھا اور آج بچہ بچہ اس ایجاد سے واقف ہے۔ دس جنوری کی تاریخ ایک اور لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے اور وہ ہے یونائیٹڈ نیشن جنرل کی پہلی میٹنگ۔ یہ میٹنگ دس جنوری 1946ء میں لندن میں ہوئی تھی۔

یہ تاریخ پاکستان میں اس لیے اہم ہے کہ اسی تاریخ کو 1965ء میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان معاہدہ تاشقند ہوا تھا۔ اور اسی تاریخ کو (1977ء) میں پاکستان میں حکومت مخالف نو سیاسی جماعتوں کا اتحاد ہوا تھا جنہیں نو ستارے کہا جاتا تھا یعنی PNA پاکستان نیشنل الائنز۔

اس تاریخ کو ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔ یعنی لیگ آف نیشن کا قیام۔ یہ سال ہے 1920ء اور اسی تاریخ کو پوری دنیا کے لیے ایک فتنہ برپا ہوا جس کا نام ہے ہولوکاسٹ Holo Caust اس کی ابتدا دس جنوری 1933ء میں ہوئی تھی۔

گیارہ جنوری:

یہ وہ تاریخ ہے جب دنیائے ادب اپنے دو قابل قدر ادیبوں سے محروم ہوگئی۔ اس میں سے ایک تھے اردو کے بانکے چھبیلے شاعر ابن انشاء جن کی وفات گیارہ جنوری 1978ء میں ہوئی تھی اور دوسرے تھے تھامس ہارڈی۔ انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والا شخص اس کے نام اور کام سے واقف ہے۔ تھامس ہارڈی کی وفات گیارہ جنوری 1928ء کو ہوئی۔ ابن انشاء کی پیدائش جالندھر میں ہوئی تھی 1946ء میں پنجاب یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ شاعری کی شہزادی ان کو ایسی پسند آئی کہ پھر ہمیشہ کے لیے اسی کے ہو کر رہ گئے۔ شاعری کی طرح ابن انشاء کی نثر بھی کمال کی تھی۔ ان کو دنیا کی سیر کا بھی موقع ملتا رہا تھا۔ اسی لیے ان کے سفرنامے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ اتنے ہلکے پھلکے اور شگفتہ انداز میں لکھنا بہت کم کو نصیب ہوا ہوگا۔

ان کی شاعری اور نثر کے کئی مجموعے ہیں۔ جیسے اس بستی کے اک کوچے میں۔ چاند نگر۔ دل وحشی۔ سوتا ہوں میں۔ آوارہ گرد کی ڈائری، دنیا گول ہے۔ نگری نگری پھرا مسافر۔ چلتے ہو تو چین کو چلیے۔ اس کے علاوہ مضامین کے مجموعے۔ "آپ سے کیا پردہ، خمار گندم" وغیرہ۔

گیارہ جنوری 1955ء کو اینٹی بائنگ Tetracycline متعارف کروایا گیا۔

اس تاریخ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ گیارہ جنوری

WWW.PAKSOCIETY.COM

1931ء میں بیلا نام کی ایک خاتون نے بغیر کسی کی مدد اور بغیر کسی ساتھی کے تنہا سمندر پر پرواز کرکے اسے عبور کرنے کا کارنامہ انجام دے کر یہ ثابت کردیا کہ عورت کسی سے کم نہیں ہے۔

اس تاریخ کو دنیا بھر میں Milk day یعنی دودھ کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ تاریخ Milk day اس لیے ہے کہ 1878ء میں اس تاریخ کو پہلی بار دودھ کو بوتلوں میں بھر کر سپلائی کیا گیا تھا۔

12 جنوری:

اس تاریخ کو مشہور رومن بادشاہ Maximilian کا انتقال ہوا تھا اور وفات کا سال تھا 1519ء۔ بارہ جنوری کو بھی ایک یوم منایا جاتا ہے جسے Secret pal day کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی آپ کی وہ دوست جس کے بارے میں دوسرے نہ جانتے ہیں۔ اس کے علاوہ کام کرنے کی ترغیب دلانے کے لیے Work hard day بھی منایا جاتا ہے (یعنی جن ممالک میں لوگ کام کرتے ہی رہتے ہیں۔ ان کو مزید ترغیب دی جاتی ہے)

اسی تاریخ کو مصنف جیک آرتھر کی پیدائش ہوئی تھی۔ سن 1876ء میں۔

12 جنوری 1992ء پاکستان کی تاریخ میں بھی اس لیے اہمیت رکھتا ہے کہ اس تاریخ کو لاہور اسلام آباد کے درمیان موٹروے کا آغاز ہوا جس نے سفر کو بہت آسان اور خوش گوار بنادیا۔

علم اور معلومات کی ترقی اور تاریخی ورثے کو محفوظ رکھنے کے لیے بھی اس تاریخ کی بہت اہمیت ہے کیونکہ اسی تاریخ کو 1773ء میں امریکا میں پہلے پبلک میوزیم کا قیام ہوا تھا (آپ اندازہ لگالیں کہ 1773ء میں ہم کہاں ہوں گے ہمارے پاس سوائے کبوتر بازی، شاعری اور بے کار کی مذہبی مباحث کے سوا اور کیا ہوگا)

پاکستان کی طرف آئیں تو 12 جنوری 2014ء کو ایک بہت بڑے بزرگ حضرت سید مکی کا عرس منایا جاتا ہے (ہجری تاریخ کا حساب کچھ اور ہے) آپ کا پورا نام عبدالرزاق مکی ہے۔ آپ غزنی سے لاہور تشریف لائے۔ آپ حضرت موج دریا بخاریؒ کے جانشین تھے۔ آپ کا مزار لاہور میں نیلا گنبد کے مقام پر ہے۔

13 جنوری:

13 جنوری کی تاریخ شوبز اور تفریح کی دنیا میں اپنی خاص شناخت رکھتی ہے۔ 1979ء میں اس تاریخ کو مشہور میوزیکل گروپ بیٹلز کا زبردست البم "یلو سب میرین" ریلیز ہوا جس نے مقبولیت کے کئی ریکارڈ قائم کیے۔ اسی تاریخ کو 1930ء میں مکی ماؤس کارٹون کی پورے امریکا کے اخبارات میں اشاعت شروع ہوئی کہ بچے بوڑھے سب اس کے گرویدہ ہوگئے اور آج بھی ہیں۔ اب تو دنیا کا بچہ بچہ مکی ماؤس کو جانتا اور پہچانتا ہے۔

اسی تاریخ کو ربرڈ کیسر کی تخلیق ہوئی۔ یہ بھی ایک مشہور پروگرام سیسم اسٹریٹ کا مشہور کردار ہے اور جہاں تک یوم کا تعلق ہے تو یہ تاریخ کیسے خالی جاتی۔ اسی لیے اس تاریخ کو Poetry break day منایا جاتا ہے۔

14 جنوری:

اس تاریخ کو بھی ایک دن منایا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس دن کے منانے کا سبب بھی معلوم نہیں ہوسکا ہے۔ اور نہ ہی یہ اندازہ ہوا ہے کہ اس کی ابتدا کب اور کہاں سے ہوئی۔ بہرحال 14 جنوری National dress up your pet day ہے۔ اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں اس تاریخ کی بہت آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ اس تاریخ کو ایک بڑا واقعہ یہ رونما ہوا کہ 1784ء میں انقلابی جنگ کا خاتمہ ہوگیا اور لاکھوں انسانوں نے سکھ کا سانس لیا۔

14 جنوری 1914ء کو ہنری فورڈ نے اسمبلی لائن متعارف کروایا تھا۔ اور اسی تاریخ کو 1890ء میں جارج کوک نے گیس برنر متعارف کروایا۔ اسی تاریخ کو 1952ء میں NBC کا مشہور شو Today شروع ہوا۔

15 جنوری:

15 جنوری 1559ء کو کوئن الزبیتھ کی تاج پوشی ہوئی۔ 1929ء کو مارٹن لوتھر کنگ کی پیدائش ہوئی۔ 15 جنوری 1799ء میں پہلا Top hat پہنا گیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ پوری دنیا میں پھیلتا چلا گیا۔

اس تاریخ کو پاکستان میں بھی دو اہم واقعات رونما ہوئے۔ پندرہ جنوری 1983ء کو پاکستان کے پاس پہلے تین عدد F-16 طیارے پہنچے... اور 15 جنوری 1994ء کو پاکستان ٹیلی وژن نے دنیا کے 38 ممالک میں اپنی نشریات دکھانے کا آغاز کیا۔

16 جنوری:

اب ہم آگئے ہیں 16 جنوری کی تاریخ میں۔ میرا خیال ہے کہ اس مضمون کو پڑھنے والے یقیناً اسے پسند کررہے ہوں گے کیونکہ ایک ہی تاریخ میں دنیا بھر میں رونما ہونے

والے واقعات کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر یہ سلسلہ پسند آتا ہے تو ہم اس سلسلے کو آخری مہینے تک لے جاسکتے ہیں۔ فی الحال ہم جنوری میں ہیں یعنی سولہ جنوری۔

16 جنوری 1944ء کو جنرل آئزن ہاور نے متحدہ فورس کی کمانڈ سنبھالی تھی۔ اس فورس میں کئی یورپی ممالک شریک تھے۔ 1964ء میں اسی تاریخ کو براڈوے کے مشہور تھیٹر Itello dolly کی شروعات ہوئی۔

یہ تاریخ بھی یوم سے خالی نہیں ہے اور وہ ہے National nothing day (یعنی کچھ نہ کرنے کا دن) ویسے اس دن کا آغاز 1920ء سے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اسی تاریخ کو Prohibition کا آغاز ہوا ہے۔

دنیا بہت مختصر ہوتی جارہی ہے۔ یعنی گلوبل ولیج کا تصور، لہٰذا دنیا کے کسی بھی حصے میں کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو دوسرے گوشے تک اس کی گونج سنائی دینے لگتی ہے۔

17 جنوری:

سب سے پہلے تو ہم اسلامی اور اپنے اعتبار سے اس تاریخ کو اس لیے بہت اہم پاتے ہیں کہ 17 جنوری کو مسجد قبا کی بنیاد رکھی گئی۔ یہاں پھر یاد دلادیں کہ ہجری نہیں بلکہ عیسوی تاریخ کی ترتیب ہے جو اپنے حساب سے 17 جنوری 2014ء کو آرہی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے قدیم مسجد ہے۔ اس کی بنیاد آپ ﷺ کے مبارک ہاتھوں نے رکھی اور صحابہ کرامؓ نے مل جل کر اس مسجد کی تکمیل فرمائی۔ اسلامی تاریخ اور عقیدے میں اس مسجد کی بے انتہا اہمیت اور عظمت ہے۔ مسجد قبا میں دو رکعت نفل کا ثواب بے پناہ ہے۔ یہ مسجد مدینہ کے نواح میں واقع ہے۔ اس کے 6 گنبد اور چار مینار ہیں۔ پہلے یہ چھوٹی سی تھی۔ پھر عبدالوحید بن وکیل نے بیسویں صدی میں اس کی توسیع کی۔ اس کے احاطے میں رہائشی عمارات، دفاتر، دکانیں اور لائبریری ہے۔

سترہ جنوری کی تاریخ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس تاریخ کو دو مشہور افراد پیدا ہوئے۔ 1942ء کو محمد علی (کلے) جو مسلمان ہوکر پوری دنیا میں ...... پہچانے جانے لگے۔ اور اسی تاریخ کو دوسری پیدائش بنجامن فرینکلن کی ہے۔ یہ 1839ء میں پیدا ہوا تھا۔ جو ایک مشہور دانش ور گزرا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور پیدائش ہے۔ اصل اہمیت پیدائش کی ہے کردار کی نہیں۔

امریکی صدر تھامس جیفرسن کی بیٹی مارتھا نے وہائٹ ہاؤس میں ایک بچے کو جنم دیا (1806ء) اہمیت یہ ہے کہ یہ پہلا بچہ تھا جس کی پیدائش وہائٹ ہاؤس میں ہوئی۔

17 جنوری 1882ء کو لی روئے فرین نے دنیا میں پہلی بار سوئچ بورڈ متعارف کرایا۔

18 جنوری:

18 جنوری 2014ء میں عرس حضرت شاہ محمد غوث منعقد ہوگا (ہجری لحاظ سے) آپ ایک بلند مرتبہ بزرگ تھے۔ آپ کا مزار مبارک لاہور (دہلی گیٹ) میں ہے۔ گرچہ وہاں کہنے کو ایک لائبریری بنادی گئی ہے۔ لیکن اس کا بھی نشان نہیں ملتا۔

18 جنوری 1882ء کو مصنف A.A.Milve کی پیدائش ہوئی۔ اس تاریخ کو آل ٹائم ہٹ میوزیکل فلم "مائی فیئر لیڈی" کی رجسٹریشن ہوئی۔ اسی تاریخ کو 1862ء میں صدر جان ٹیلر نے وفات پائی۔

19 جنوری:

یہ ایک بہت بڑے رائٹر کی پیدائش کا دن ہے۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑا مصور بھی اسی تاریخ کو پیدا ہوا تھا۔ اس رائٹر کا نام ہے "ایڈگرایلن پو" پیدائش 1804ء۔

شاعری میں Al aaraaf اور Anwabel lee بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ اور اس تاریخ کو پیدا ہونے والے مشہور آرٹسٹ کا نام ہے پال زینے۔ جس کی پیدائش کا سال 1839ء ہے۔

اس تاریخ کو جو دن منایا جاتا ہے اسے پاپ کارن ڈے کہتے ہیں۔ یہ تاریخ بچوں کے استعمال کی ایک چیز کے متعارف ہونے کی وجہ سے بھی یاد رکھی جاتی ہے۔ 19 جنوری کو ڈیل منٹ گم کا تعارف کروایا گیا تھا۔

صدر آئزن ہاور نے 19 جنوری 1955ء کو ایک تاریخی قدم اٹھایا۔ اب تک وہائٹ ہاؤس میں ہونے والی میٹنگز کی خبروں میں تشہیر نہیں ہوتی تھی۔ لیکن 1955ء کی 19 جنوری کو پہلی بار وہائٹ ہاؤس کی نیوز کانفرنس کو ٹی وی پر دکھانے کی اجازت دی گئی۔

20 جنوری:

امریکی جنگی بحریہ میں ایک دیو ہیکل جہاز 20 جنوری 1887ء کو شامل ہوا تھا۔ اور پہلی بار اسی تاریخ کو 1986ء میں مارٹن لوتھر ڈے منانے کی ابتدا ہوئی۔

اس تاریخ کے حوالے سے ایک اور بڑا واقعہ یہ ہے کہ ایران نے 52 امریکی قیدیوں کو رہا کردیا تھا۔ یہ واقعہ 1981ء کا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

1964ء کی اس تاریخ کو بیکو کا ایک مشہور گیت منظر عام پر آیا تھا۔ 20 جنوری 1857ء کو لوہے کی صنعت میں انقلاب کے لیے ولیم کیلس نے بلاسٹ فرنس کا استعمال کیا اور اسی تاریخ کو 1929ء میں پہلی آؤٹ ڈور بولتی فلم in old arizone ریلیز ہوئی۔ اس تاریخ کو جو دن منایا جاتا ہے وہ ہے cheese day چیز یعنی پنیر ہمارے یہاں بہت کم جبکہ مغرب میں بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

اس تاریخ کو پوری دنیا کی بھلائی کے لیے پہلے ٹریفک قوانین کا اجرا ہوا۔ (1900)۔ پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے ملتان میں ایک میٹنگ کی اور پاکستان کے نیوکلیئر پروگرام کی منظوری دی گئی۔

21 جنوری:

امریکی بحری بیڑے میں 1954ء میں پہلی ایٹمی آب دوز کی شمولیت۔

یہ تاریخ National hugging day کے طور پر منائی جاتی ہے۔ ایک دوسرے سے لوگ معانقہ کرتے ہیں جبکہ ہم بغیر کسی تاریخ کی پروا کیے ایک دوسرے کو جپھی ڈالتے رہتے ہیں)

22 جنوری:

ایجاد اور اختراع کے لحاظ سے یہ تاریخ بہت اہم ہے۔

1895ء میں دنیا کا مشہور صابن لائف بوائے اس تاریخ کو مارکیٹ میں آیا تھا۔ اور اس تاریخ کو 1931ء میں ایک ڈچ کمپنی دارانے ٹیلی وژن کا آغاز کیا۔ اسی تاریخ کو امریکی صدر جانسن کا انتقال ہوا اور اسی تاریخ کو امریکا اور ویت نام کے درمیان امن کا معاہدہ ہوا (1973)

23 جنوری:

علم و آگہی کے لیے اس تاریخ کی بہت اہمیت ہے۔ اس تاریخ کو مشہور یونیورسٹی جارج ٹاؤن یونیورسٹی قائم ہوئی تھی۔ اس تاریخ کو تین ڈیز منائے جاتے ہیں۔

1۔ Measure your feetday (یعنی اپنے پیروں پر دھیان دیں)

2۔ National hand writing day یہ بھی ایک دلچسپ ڈے ہے۔ یعنی ٹائپ کرنے کے بجائے ہاتھ سے لکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ National piz day بھی منایا جاتا ہے۔ اسی تاریخ کو ایک چھوٹی سی لیکن اہم مشین بھی سامنے آئی۔ سال 1849ء میں اس مشین کے ذریعے لفافے بنائے جانے لگے جو اس سے پہلے صرف ہاتھوں سے بنائے جاتے تھے۔

24 جنوری:

یہ تاریخ کئی لحاظ سے بہت اہم ہے۔ 41 AD میں روم کے بادشاہ Caligola کی وفات ہوئی۔ یہ ایک شاندار فرماں روا گزرا ہے۔ 2014ء کے حساب سے 24 جنوری وہ تاریخ ہے جب آپؐ مدینہ میں تشریف لائے تھے۔ اس لحاظ سے یہ ایک مبارک تاریخ ہے (یہاں پھر یہ وضاحت کہ یہ ہجری تاریخ نہیں ہے)

اس تاریخ کا ایک اور اہم اسلامی واقعہ غزوہ بنی نضیر ہے۔

بنو نضیر یہودیوں کے ایک قبیلہ کا نام ہے۔ جس سے ایک اسلامی تاریخی واقعہ تعلق رکھتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے بنی نضیر کے حادثے کے بعد دو صحابیوں نے رستے میں آتے ہوئے بنو عامر کے دو آدمیوں کو جو بے خبر سوئے ہوئے تھے قتل کر ڈالا۔

جب رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ بیان کیا تو آپ کو بہت افسوس ہوا۔ کیونکہ وہ مسلمانوں کے مخالف نہیں تھے۔

اس لیے آپ نے ارادہ فرمایا کہ ان دونوں مقتولوں کے وارثوں کو خون بہا ادا کیا جائے جس کے لیے چندہ کرنے کی تجویز ہوئی۔

چونکہ مسلمانوں کا قبیلہ بنو نضیر کے ساتھ پہلے یہ عہد ہو چکا تھا کہ ایسے موقع پر ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اس لیے ان سے بھی چندہ طلب کیا گیا مگر انہوں نے صاف انکار کیا اور معاہدے کی پروا نہ کی۔

آنحضرتؐ خود ان کے محلے میں تشریف لے گئے اور ان ناانصاف اور بدعہد لوگوں کو سمجھانے لگے۔ اس وقت ان لوگوں نے آپس میں صلاح و مشورہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ پاس کی دیوار سے ایک پتھر دھکیل کر آپ پر گرا دیا جائے۔

لیکن اللہ نے عین وقت پر آپ کو مطلع کر دیا۔ اور آپؐ فوراً وہاں سے چلے آئے۔ اس لیے آپ نے صحابہؓ کی جماعت کو ساتھ لے کر ان کے محلے کا محاصرہ کر لیا۔

دونوں فریقوں میں چھ دنوں تک لڑائی ہوتی رہی۔ آخر بنو نضیر نے تنگ آکر صلح کا پیغام بھیجا جو منظور کر لیا گیا۔

لیکن صلح نامے کی شرائط ابھی طے بھی نہیں ہوئی تھیں کہ عبداللہ بن ابی منافق نے ان کو بھڑکایا اور قلعہ بندی کر کے لڑنے کی ترغیب دی۔

آنحضرتؐ نے پھر ان کا محاصرہ فرمایا اور پندرہ دنوں کے بعد جب ان لوگوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے تو یہ درخواست کی کہ ہمیں اپنے مال و اسباب سمیت مدینے سے نکل جانے دیا جائے۔

آخر یہ قرار پایا کہ یہ لوگ ہتھیاروں کے بغیر جس قدر مال اونٹوں پر لاد سکیں ساتھ لے جائیں۔ بنو نضیر نے چھ سو اونٹوں پر اپنا مال و اسباب لاد کر گھروں کو اپنے ہاتھوں سے آگ لگا دی اور مدینے کو چھوڑ کر خیبر میں جا کر آباد ہو گئے۔

اسی تاریخ یعنی 24 جنوری 1922ء کو کرسٹن نیلسن نے اسکیمو پائی متعارف کروائی۔ اور اسی تاریخ کو 1848ء میں جان مارشل نے کیلی فورنیا میں سونا دریافت کیا۔ 1871ء میں 24 جنوری کو چارلس گڈائر نے ایک ایسی مشین ایجاد کی جو جوتے سینے کے کام آتی تھی۔ اس طرح اس صنعت میں ترقی ہوتی چلی گئی 24 جنوری 1908ء میں ایک بہت بڑی تحریک وجود میں آئی جو پوری دنیا کے لیے مشعل راہ تھی اور وہ تھی بوائے اسکاؤٹ تحریک۔

رابرٹ بیڈن پاول نے خدمت خلق کا یہ تصور پوری دنیا کو اسی تاریخ کو دیا۔

25 جنوری:

اس تاریخ کو بھی ایک یوم منایا جاتا ہے۔ Opposite day۔ 25 جنوری 1924ء کو پہلے سرمائی اولمپک کا آغاز ہوا تھا جو اب ہر سال اولمپک کی طرح باقاعدگی سے منایا جاتا ہے۔ اور اس میں بے شمار ممالک مختلف کھیلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ اولمپک سردیوں کا ہے اسی لیے اس میں ایسے کھیل شامل کیے گئے ہیں جن کا تعلق برف سے ہو۔ جیسے آئس ہاکی، اسکیٹنگ وغیرہ۔ 25 جنوری کو ایمی ایوارڈ بھی دیا جاتا ہے۔ موسیقی کی دنیا کا یہ اعزاز بہت مستند سمجھا جاتا ہے۔ پہلا ایمی ایوارڈ 25 جنوری 1944ء کو دیا گیا تھا۔ تب سے یہ ہر سال باقاعدگی سے دیا جاتا ہے۔

25 جنوری 1870ء کو گستاو رڈاؤ نے سوڈا فاؤنٹین کی ایک نئی شکل متعارف کروائی تھی۔ 25 جنوری ورجینیا وولف کی بھی پیدائش کی تاریخ ہے۔

26 جنوری:

26 جنوری 2014ء کو مشہور بزرگ حضرت داؤد بندگیؒ (کرمانی) کا عرس منایا جائے گا (ہجری تاریخ کچھ اور ہے) آپ قادریہ سلسلے کے سولہویں صدی کے مشہور بزرگ ہیں۔

ابوالقاسم حسن فردوسی

940-1020ء

مشہور ایرانی شاعر، علاقہ طوس میں ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں داستان بیژن و منیژہ نظم کی اور اپنے باغ جوئبار اور مکان کا ذکر تفصیل سے کیا۔ اسی اثنا میں بیٹا انتقال کر گیا۔ شاہنامہ کی تالیف کا سبب منجملہ دیگر اسباب کے بیٹی کے جہیز کے لیے معقول رقم حاصل کرنا بھی تھا، چنانچہ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں جانے سے پیشتر شاہنامہ کا بہت سا حصہ نذر کر لیا۔ معقول انعام کی امید میں محمود کے دربار میں آئے، کچھ مدت تک شاہنامہ سنا کر داد و تحسین حاصل کرتے رہے۔ بادشاہ نے شاہنامے کے ہر شعر پر ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا تھا، مگر جب ایفائے عہد کا وقت آیا تو بیس ہزار درہم دے کر ٹال دیا۔ فردوسی اس سلوک سے افسردہ ہوئے۔ حمام میں غسل کے بعد بادشاہ کا انعام حمامی اور عطار میں تقسیم کر کے غزنی سے نکل گئے۔ دربدر پھرنے کے بعد آخر طوس لوٹے اور سلطان محمود کی ہجو لکھی۔ کہتے ہیں کہ محمود نے اپنے وزیر حسن میمندی کے ایما پر بعد میں ساٹھ ہزار دینار فردوسی کو بھجوا دیے، لیکن وہ انعام ان تک نہیں پہنچا کیونکہ جب ایک دروازے سے انعام کا حکم نامہ لے کر ہرکارہ داخل ہوا تو دوسرے دروازے سے فردوسی کا جنازہ شہر سے باہر نکل رہا تھا۔ فردوسی کی بیٹی نے بھی یہ انعام قبول کرنا گوارا نہ کیا۔

فروری (february)

یورپین کیلنڈر کا دوسرا مہینا جو اطلاوی لفظ فیبر رور (Februar) کے نام پر موسوم ہے۔ فروری کے مہینے کے اضافے سے پیشتر روما کا کیلنڈر دس ماہ کا ہوا کرتا تھا۔ اس مہینے کو اس کا موجودہ مقام جولیس سیزر نے عطا کیا ہے۔ لیپ کے سال میں فروری کا مہینہ 29 دن کا ہوتا ہے ورنہ اس کے 28 دن ہوتے ہیں۔

مرسلہ: محمد ایاز راہی مانسہرہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

امریکا کی ریاستوں میں ایک اور ریاست مشی گن کا اضافہ ہوا(1837ء)
چھبیسویں ریاست شمار کی گئی۔

26 جنوری 1875ء کو جارج گرین نے پہلی ڈینٹل ڈرل مشین متعارف کروائی جس سے آج دنیا بھر کے دندان ساز استفادہ کرتے ہیں۔اسی تاریخ کوآسٹریلیا Day منایا جاتا ہے۔اس تقریب کا آغاز 1788ء سے ہوتا ہے۔

27 جنوری:

اہم واقعات کے لحاظ سے شاید سب سے اہم واقعہ اس تاریخ کا یہ ہے کہ تھامس ایڈیسن نے 27 جنوری 1880 میں الیکٹرک لیمپ پیٹنٹ کروایا۔جس نے اس کے نام اور کام کو واقعی روشن کردیا۔

1967ء میں اسی تاریخ کو دو خلاباز حادثے میں ہلاک ہوگئے اور 27 جنوری 1973ء کو امریکا اور ویت نام کی بلا وجہ کی جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔

ایک اور اہم بات اس تاریخ کی یہ ہے کہ 1888ء میں نیشنل جیوگرافک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے ایک دنیا تک معلومات پہنچادیں اور آج ہم اسی کے چینل کو شوق سے دیکھتے اور اس کے میگزین کو شوق سے پڑھتے ہیں۔

28 جنوری:

28 جنوری 1878ء میں پہلے ٹیلی فون ایکسچینج کا قیام عمل میں آیا اور 28 جنوری 1807ء میں لندن کے پالی مال نے پہلی مرتبہ لندن کی سڑکوں پر گیس لیمپ روشن کیے اور وہ شہر جس کی راتیں اندھیری ہوا کرتیں وہ شہر روشن ہوگیا۔

یہ دن بھی ایک یوم سے خالی نہیں ہے اس تاریخ کو National kazooday کے حوالے سے منایا جاتا ہے۔

28 جنوری (2014ء) حضرت ابوطالب کے وصال کی تاریخ ہے (یہاں پھر یاد دلادیں کہ یہ ہجری تاریخ نہیں ہے)

حضرت ابو طالب بن عبد مناف بن عبدالمطلب۔ آنحضرتؐ کے مہربان اور باپ سے زیادہ شفقت دینے والے چچا۔آپؐ کے دادا عبدالمطلب نے اپنی وفات کے وقت آپؐ کی سرپرستی کا کام حضرت ابوطالب کے سپرد کیا جس کا حق امید سے بڑھ کر ادا کیا گیا۔آپؐ کے لیے ایک ڈھال، ایک فصیل کی طرح تھے۔ ہزار طرح کی آفتوں کے باوجود آپ نے اپنے بھتیجے پر آنچ نہ آنے دی۔

29 جنوری:

ایڈگرایلن پو کی مشہور کتاب Tkeraven کی اشاعت ہوئی۔1845ء میں۔

اسی تاریخ کو چارلس اسٹین نے ایک ایسا سسٹم متعارف کروایا کہ AC کرنٹ کی تقسیم ہوجاتی تھی۔ 1924ء میں کارل ٹیلر نے آئس کریم کون بنانے کی مشین بناڈالی۔بیس بال چونکہ امریکا کا مشہور اور مرغوب کھیل ہے اس لیے 1936ء میں بیس بال ہال آف فیم بنایا گیا۔ جس میں موجود بیس بال کے کھلاڑیوں کی تصاویر دیکھنے ہزاروں لوگ جایا کرتے ہیں۔

یہ تاریخ بھی ایک Day سے ' خالی نہیں گئی۔اس لیے اس تاریخ کو نیشنل پزل ڈے کے طور پر منایا جاتا ہے۔

30 جنوری:

اس تاریخ میں بھی کئی واقعات رونما ہوئے۔

اگر پیدائش کو لیتے ہیں تو امریکی صدر روزویلٹ پیدا ہوئے سال تھا 1882ء ایڈولف ہٹلر 30 جنوری 1933ء کو جرمن کا چانسلر بنا۔

اسی تاریخ کو 1948ء میں موہن داس کرم چند گاندھی کا قتل ہوا۔اسی تاریخ کو کیش رجسٹر کی ایجاد ہوئی۔

پاکستان میں بھی یہ تاریخ اس لحاظ سے اہمیت رکھتی ہے کہ 30 جنوری 1971ء کو دو کشمیری باشندوں نے ایک ہندوستانی طیارہ اغوا کرکے لاہور پہنچادیا۔اور اسی سال اسی تاریخ کو پاکستان کے سامنے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ کھڑا ہوا۔

31 جنوری:

مہینے کی آخری تاریخ۔

امریکا میں انسانی آزادی کی طرف ایک بہت بڑا قدم۔1865ء میں غلامی کے خلاف قانون بنایا گیا۔

31 جنوری 1851ء میں گیل برڈن نے خشک دودھ متعارف کرایا.... مشہور زمانہ مشروب کوکا کولا کی رجسٹریشن 1893ء میں اسی تاریخ کو ہوئی۔اسی تاریخ کو Back wards day منایا جاتا ہے۔بیس بال کے عظیم کھلاڑی جیکی رابنسن کی پیدائش 1919ء میں اسی تاریخ کو ہوئی۔

پاکستان میں اس تاریخ کو 1999ء میں ایک دلچسپ واقعہ ہوا کہ پاکستان نے کرکٹ میچ میں ہندوستان کو بارہ رنز سے ہرادیا۔

ترکی نمی دانم

رقم: آن لیفنٹ

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کرہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بڑی کم دلچسپ نہیں' وہی کچھ وہ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفرکہانی میں پائیں گے۔

ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفرکہانی کی نویں کڑی

اس بازار سے باہر نکلے تو سامنے ایک خوبصورت مسجد تھی۔ مرزا صاحب نے بتایا کہ اس کا نام رستم پاشا مسجد ہے۔رستم اور پاشا کا یہ ملاپ پہلی مرتبہ دیکھا اور سنا تھا۔اس مسجد کے مینار بہت اونچے اور خوبصورت ہیں۔ مسجد کے نزدیک پہنچے تو ایک عجیب نظارہ تھا۔ بے شمار مختلف رنگ و نسل کے کبوتر وہاں ٹہل رہے تھے یا پھڑ پھڑاتے پھر رہے تھے۔ بہت سے کبوتر فرش پر اس طرح بیٹھے تھے جیسے کوئی اجلاس منعقد ہورہا ہے۔ہمارا خیال ہے کہ بیٹھے بٹھائے دن

بھر دانہ کھانے کی وجہ سے یہ کبوتر سست اور کاہل ہو گئے تھے یہاں تک کہ اُڑنے کی زحمت بھی گوارا نہیں تھی۔ اگر ان کے درمیان سے گزر جائیں مگر کیا مجال جو کبوتر اپنی جگہ سے حرکت کر جائیں۔ مجبوراً گزرنے والے خود ہی راستہ بنا کر انہیں پھلانگتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ مسجد کا صحن نہیں تھا بلکہ اس کے باہر کی سڑک تھی۔ شاید اس مسجد کے آس پاس ٹریفک پر پابندی تھی۔ ممکن ہے مسجد کے احترام اور کبوتروں کو ڈسٹرب نہ کرنے کی وجہ سے یہ پابندی لگا دی گئی ہو۔ عموماً مزاروں اور مقدس مقامات پر کبوتروں کے غول نظر آتے ہیں۔ بعض جگہوں پہ کھلے میدان میں سیاح انہیں دانہ ڈالتے ہیں جس کی وجہ سے وہ یہیں کے ہو جاتے ہیں اور اتنے بے تکلف ہو جاتے ہیں کہ دانہ ڈالنے والوں کی ہتھیلیوں سے دانہ چگ لیتے ہیں مثلاً لندن کا ٹریفلگر اسکوائر کبوتروں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ یہاں بہت سے دانہ فروخت کرنے والے بھی منتظر کھڑے رہتے ہیں۔ یہ سیاح ان سے دانہ خرید کر کبوتروں کو کھلاتے ہیں اور ان کے ساتھ تصویریں بنواتے ہیں۔ کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے ایک عجیب سا سکون چھایا ہوتا ہے۔ مسلمان اسے ایک پاکیزہ پرندہ خیال کرتے ہیں اور ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ لاہور میں ایک مزار پر دور دور سے لوگ دانہ لے کر آتے ہیں۔ پہلے فاتح پڑھتے ہیں اور پھر کبوتروں کو دانہ ڈالتے ہیں۔ کبوتروں میں سیر چشمی بہت ہوتی ہے، چاہے آس پاس دانے کا ڈھیر لگا ہو مگر جب پیٹ بھر جائے تو کھانے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ مسجد سے کچھ آگے بڑھیں تو ایک اسٹیڈیم نما کھلا میدان ہے۔ جہاں میوزیکل کنسرٹ ہوتے ہیں۔ یہ بالکل فری ہوتے ہیں۔ جو چاہے آ کر اور جب تک جی چاہے سنے اور اٹھ کر چلا جائے۔ آرکسٹرا میں صرف ترکی نغمے پیش کیے جاتے ہیں جنہیں حاضرین بہت خاموشی اور نسبت سے سنتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا ہے ترک موسیقی کے سب دلدادہ ہوتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں تو ہر ٹیکسی میں کیسٹ یا سی ڈی ضرور ہوتا تھا۔ ایسے کنسرٹ میں والدین اور بچے ایک ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اور سب مل کر موسیقی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہی شوق ہم نے مصر میں بھی دیکھا۔ وہاں بھی خاندان کے سب لوگ اکٹھے ہو کر نائٹ کلبوں اور موسیقی کے پروگراموں میں حصہ لیتے ہیں۔

اوغلو صاحب نے مطلع کیا کہ ترکی میں پیزا بھی ہوتا ہے لیکن عام پیزا سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک بار ہم نے بھی ترکی کا پیزا کھایا۔ پیزا کو ترکی میں شاید پیڈے کہا جاتا ہے۔ گویا ترک پرائی چیزوں کا نام بھی بدل کر اپنا لیتے ہیں۔ یہ پیزا لکڑی کے ایک کشتی نما برتن میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تازہ تازہ اوون سے نکل کر لایا گیا تھا اور اس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یہ پیزا شاپ سلمان احمد کے علاقے میں تھا۔ استنبول میں جگہ جگہ پیزا ہٹ کے ریستوران نظر نہیں آتے۔ ممکن ہے ترکوں کو پیزا زیادہ مزیدار نہ لگتا ہو۔ دیکھنے میں یہ پیزا اچھا نہیں لگتا لیکن مزیدار ہوتا ہے۔ دراصل اس کو پیزا کہنا درست نہیں ہے کیونکہ اس کی شکل وصورت سے لے کر مزے تک ہر چیز عام پیزا سے مختلف ہوتی ہے۔ ترکی پیزا کے اوپر بکری کا گوشت، مرغی کے گوشت کے ٹکڑے، چٹنی (یا سانجر) ترکاری کو سجایا جاتا ہے۔

ٹوپ کاپی ایسی جگہ ہے جو ...... سارے شہر میں مشہور ہے، ٹوپ کاپی وہ محل ہے جو قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلطان محمد نے 1462 میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ سلاطین کی رہائش گاہ یا محل تھا۔ پھر سلطان نے اس میں اضافے کیے اور یہ ایک عظیم ترین محل کی صورت اختیار کر گیا۔ 1924ء میں اس کو ایک میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہم نے دنیا کے دوسرے بڑے ملکوں کے میوزیم بھی دیکھے ہیں جن کی وسعت اور حسن قابل دید ہے لیکن ٹوپ کاپی میوزیم کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس جیسا میوزیم ہم نے دنیا میں کہیں نہیں دیکھا۔ استنبول میں اگر کوئی اجنبی کسی جگہ کا پتا دریافت کرے تو اس کو گرینڈ بازار، سلطان احمد کی مسجد، نیلی مسجد اور ٹوپ کاپی کے حوالے سے ہی پتا بتایا جاتا ہے۔ سارے استنبول میں ٹوپ کاپی نام کی کوئی عمارت نہیں ہے۔ سوائے ایک دوسرے درجے کے ہوٹل کے جس کا نام ٹوپ کاپی ہوٹل ہے۔

بٹ صاحب کی خواہش بلکہ ضد تھی کہ ہم لوگ وہ ہوٹل بھی جا کر دیکھیں۔ ایک درمیانہ درجے کے بازار میں ایک مختصر سی عمارت پر ٹوپ کاپی ہوٹل لکھا ہوا تھا۔ اس زمانے میں اس ہوٹل کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس ہوٹل کی سب سے بڑی خوبی ہم نے یہ دیکھی کہ سارے ہوٹل میں انگریزی جاننے والا صرف ایک ہی شخص تھا جو استقبالیہ پر متعین تھا۔ اگر مہمان کو کوئی بات کرنی ہو یا کسی چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنی ہیں تو ان صاحب کے سوا کوئی اور آپ کو نہیں بتا سکتا۔

ہم لوگ ان کے انتظار میں ریستوران میں بیٹھ گئے۔ ہر طرف سے کھٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں کیونکہ راج مزدور اپنے کام میں مصروف تھے۔

کچھ دیر میں منیجر، مالک اور استقبالیہ کے انچارج واپس آ گئے۔ وہ ایسی انگریزی بولتے تھے جسے شیکسپیر بھی نہیں سمجھ سکتا تھا مگر مہمان جوڑ توڑ کر کے اس کا مفہوم سمجھ لیتا تھا۔

بٹ صاحب کا اصرار تھا کہ ہمیں اس تاریخی نام کے ہوٹل میں ایک رات ضرور قیام کرنا چاہیے مگر جب ہوٹل کے کمروں کے بارے میں دریافت کیا تو وہ فائیو اسٹار ہوٹل کے کرائے سے بھی زیادہ تھا۔

خان صاحب نے کہا۔ ”آپ کے ہوٹل کا معیار تو تیسرے درجے کا ہے لیکن کرایہ آپ اتنا زیادہ وصول کر رہے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”جناب کرایہ ہم ہوٹل کا نہیں اس کے نام کا لیتے ہیں۔ آپ اپنے وطن جا کر فخریہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ استنبول کے ٹوپ کاپی میں رہے تھے۔ چند لمحے اس تاریخی محل میں رہ چکے ہیں رات گزار چکے ہیں تو کتنا رعب پڑے گا۔“

رات کو ہم اپنے ہوٹل واپس آ گئے تو استقبالیہ پر وہی بڑی بی بیٹھی ہوئی تھیں مگر انہوں نے اپنے اسکارف سے منہ چھپا رکھا تھا۔ انہوں نے خاموشی سے چابیاں ہمارے حوالے کر دیں اور خاموشی سے اٹھ کر چلی گئیں۔ ہم نے ساتھ والی خاتون سے پوچھا کہ انہیں کیا ہوا، یہ خاموش کیوں ہیں اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”دراصل ان کی بھتیجی ٹورنامنٹ میں گر گئی ہے اس لیے یہ کچھ نہیں بول رہیں۔ یہ آٹھ دن کی چھٹی پہ جا رہی ہیں۔“ واقعی، دنیا میں لوگوں کو کیسے کیسے مسائل سے واسطہ پڑتا ہے۔

استنبول کے بارے میں سب بتاتے ہیں کہ یہ واحد ملک ہے جو براعظم ایشیا اور یورپ کو ملاتا ہے۔ لیکن خاص بات یہ ہے کہ جن مختلف تہذیبوں اور قوموں نے استنبول پر حکمرانی کی انہوں نے دانستہ طور پر یہ کوشش کی کہ ان سے پہلے حکومت کرنے والی اقوام کی یادگاروں کو تباہ و برباد کرنے کی بجائے یادگار کے طور پر بحال رکھا جائے۔ یہ استنبول کی بدقسمتی ہے کہ یہاں ایسی قوموں نے حکومت کی جنہوں نے اسپین اور غرناطہ کے سات سو سالہ مسلم دور

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
جنوری 2014ء
گلابوں اور جاڑوں کا موسم
سالِ نو کے پہلے شمارے کی نکہتیں
پہلی سوغات ● خواب دیکھنا...... خوابوں کو سوچنا اور خوابوں سے کنارہ کشی موت ہے ایک پراسرار کہانی کی انہونیاں کاشف زبیر کی جادو دانیاں
گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ
جواری ● احمد اقبال کے شربار قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نت نئے انداز
مغرب کے نرالے انداز ● مغرب کی تہذیب اور ماحول کی عکاسی اور محبت کی ناقابل فراموش کہانیاں
سرورق کی کہانیاں
پہلی کہانی ● زر و زمین کے پرانے شاخسانے کی نذر ہو جانے والی زن گزیدہ داستان
دوسری کہانی ● صبح دم کے اجالوں میں کھو جانے والے قانون شکن اور خواب شکن جانبازوں کا احوال
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

حکومت کی یادگاروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ شاندار عمارتیں مسمار کر دیں، قیمتی اور نادر کتابوں سے بھری ہوئی لائبریریاں جلا کر راکھ کر دیں۔ جو کچھ بچا تھا یورپ والوں نے ان ہی سے سبق حاصل کر کے نئی نئی ایجادات کیں جن سے آج ہم اور آپ فائدے اٹھا رہے ہیں۔

اس کے برعکس استنبول کو کسی حکمراں نے تباہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اسے سجا سنوار کر ان کی حفاظت کے خصوصی اہتمام کیے۔ یہی وجہ ہے کہ استنبول مختلف تہذیبوں کا ایک گلدستہ بن چکا ہے، ہر دورِ حکومت کی یادگار عمارتیں بہت اچھی حالت میں آج بھی نظر آتی ہیں اور سیکڑوں سال بعد بھی انہیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے یہ آج ہی بنائی گئی ہیں۔

یورپ کے ایک معروف ماہرِ تعمیرات سی بالڈ نے جب پہلی بار استنبول کو دیکھا تو اپنی ڈائری میں لکھا۔ ”کوئی شخص ایسے شہر کا تصور نہیں کر سکتا جہاں اتنی زیادہ مختلف طرزِ تعمیر کی عمارتیں پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ ہر عمارت کا انداز جدا اور حسن انوکھا ہے۔“

استنبول کے پرانے علاقے بھی جوں کے توں رکھے گئے ہیں۔ یہ ہمارے اندرونی شہر کے محلوں کی طرح ہیں جہاں چھوٹی چھوٹی دکانیں اور درختوں سے گھرے ہوئے چوک ہیں جہاں بیٹھ کر مقامی لوگ اور سیاح گپ شپ کرتے ہیں اور پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ یہاں پیچ دار گلیاں اور پرانے طرز کے مکانات ہیں جن کی دیواروں پر پڑوسنیں آپس کے مسائل پر بات کرنے کے علاوہ چغلیاں بھی کرتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے پرانے لاہور کے برعکس یہاں گندگی اور کوڑے کرکٹ کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا۔ البتہ یہ علاقے ایک ری پلے کا کام کرتے ہیں۔ خواتین پرانے انداز کے ملبوسات میں اور مرد پرانی طرز کے لبادے پہنے ہوئے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ نئی طرزِ زندگی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کا ہر فقرہ ”ہمارے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا“ سے شروع ہوتا ہے۔

خواتین آس پاس کے مکانوں کی دیواروں سے ایک دوسرے سے گپ شپ اور باتیں کرتی نظر آتی ہیں جیسا کہ ہمارے پرانے لاہور میں ہوتا ہے۔ گلیاں صاف ستھری ہیں۔ کیا مجال جو کہیں گندگی اور کوڑا کرکٹ نظر آ جائے۔ گلیاں عموماً پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ شاید پرانے زمانے میں جب سیمنٹ اور تارکول نہیں تھا تو پتھروں کی سڑکیں ہی بنائی جاتی تھیں۔ پتھروں کے ٹکڑے بہت خوبصورتی سے یکساں سائز میں کاٹ کر لگائے گئے ہیں۔ اس قسم کی سڑکیں صرف گلیوں میں ہی نہیں ہوتیں، پیرس، روم میں بھی ہم نے بڑی بڑی شاہراہیں پتھروں کی بنی ہوئی دیکھی ہیں۔

یہ سڑکیں اور گلیاں نہ جانے کب بنائی گئی ہوں گی لیکن انہیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے حال ہی میں بنائی گئی ہیں۔ ٹریفک کی آمد و رفت کی وجہ سے یہ سڑکیں بالکل چکنی اور شفاف ہو گئی ہیں۔

ان گلیوں میں گھومتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے ہم ایک سو سال پہلے کے استنبول میں گھوم رہے ہیں۔ ترک ایک مہذب قوم ہیں۔ صفائی پسند ہیں۔ انہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کوڑا سڑک پر نہ پھینکیے۔ یہ اپنے شہری حقوق سے پوری طرح آگاہ ہیں۔

یہ گلیاں بہت زیادہ تنگ نہیں ہیں۔ یہاں موٹر کاریں بھی آ جاتی ہیں مگر بہت کم۔ عام طور پر لوگ پیدل گھومتے ہوئے ہی نظر آتے ہیں۔ مختلف چوراہوں پر سایہ دار درختوں کے جھنڈ میں جن کے سائے میں کرسیاں اور میزیں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ دراصل قہوہ خانے ہیں۔ ترکی میں چائے کا رواج بہت کم ہے۔ قہوہ خانے قدم قدم پر مل جاتے ہیں۔ ہر علاقے میں اس کے معیار کے مطابق قہوہ خانے ہوتے ہیں۔

بٹ صاحب نے درختوں کا جھنڈ دیکھتے ہی قہوہ پینے کی فرمائش کر دی۔ یوں تو انہیں ترکی قہوہ پسند نہیں ہے کیونکہ بہت کڑوا اور گاڑھا ہوتا ہے۔ بقول ان کے ”منہ کا مزہ بدلنے کے لیے کبھی کبھی ترکی قہوہ پینا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔“ ان کا کہنا ہے کہ ”بھائی ترکی ہمارا برادر اور دوست ملک ہے۔ دنیا میں ہم جہاں گئے سب سے زیادہ ہم سے محبت ترکوں نے ہی کی ہے۔ دنیا بھر میں ہم پاکستانی اپنے کارناموں ... کی وجہ سے بدنام ہیں لیکن ترک بھائیوں نے ہماری تمام خرابیوں کے باوجود ہمیں قبول کر لیا ہے۔ کتنی زیادہ محبت کرتے ہیں۔ جب معلوم ہو کہ ہم پاکستانی ہیں تو پاکستان پاکستان کہہ کر ہم سے گلے ملتے ہیں۔“

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب آپ کی یہ تقریر ہم کئی بار سن چکے ہیں۔ آپ مختصراً یہ کہہ دیتے کہ یہاں بیٹھ کر قہوہ پینا ہے۔ بات ختم ہو جاتی۔“

کار سے نکل کر ہم لوگ اس اوپن ائر قہوہ خانے میں بیٹھ گئے۔ یہاں لکڑی کی میزیں اور کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میزوں پر رنگین میز پوش بچے ہوئے تھے۔ درختوں کے نیچے ٹھنڈی ہوا نے مزید لطف پیدا کر دیا تھا۔ ایک نوجوان لڑکا کہیں سے نمودار ہوا۔ ”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام!“

”کیا پسند کریں گے؟“ اس نے ترکی میں پوچھا۔

”قہوہ لے آیئے۔“ مرزا مشرف نے ترکی میں جواب دیا۔

”مگر زیادہ گاڑھا نہ ہو۔“ بٹ صاحب فوراً اردو میں بول پڑے۔

اس نے حیران ہو کر بٹ صاحب کو دیکھا تو مرزا مشرف نے ترکی زبان میں اس کو سمجھایا کہ بٹ صاحب چاہتے ہیں کہ قہوہ زیادہ گاڑھا اور کڑوا نہ ہو۔

”تو پھر قہوے کے مزہ ہی کیا رہے گا۔“ اس نے فقرہ کسا، پھر بولا ”برادر، آپ پردیسی معلوم ہوتے ہیں۔“

”ہاں، ہم پاکستانی ہیں۔“

خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”پاکستان، پاکستان“ کہہ کر اس نے سب سے ہاتھ ملایا اور یہ خوش خبری سنانے کے لیے قہوہ خانے کی طرف چلا گیا۔

”دیکھا آپ نے، ہم سے کتنی محبت کرتے ہیں؟“

”دراصل وہ ابھی آپ کے کرتوتوں سے واقف نہیں ہیں۔“

وہاں، ہمیں ایک منزلہ مکان نظر آئے جیسے ہمارے پرانے شہروں میں ہوتے ہیں۔ ویسے ہی دیواروں پر چڑھی خواتین ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف۔ ایک جگہ تو قریب قریب کے گھروں کی تین خواتین تبادلہ خیالات میں مصروف تھیں۔

خان صاحب بولے۔ ”یہ ضرور کسی چوتھی عورت کی برائی کر رہی ہوں گی۔“

”آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”بھائی! یہ ان کی فطرت ہے۔ چغلیوں اور ایک دوسرے کی برائیوں کے سوا ان کی گفتگو کا کوئی اور موضوع نہیں ہوتا۔“

”کتنی اچھی جگہ ہے۔“ بٹ صاحب نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

خان صاحب فوراً اس کا سبب جاننے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ بالآخر یہ انکشاف کیا کہ ان تین خواتین میں ایک خوبصورت چہرہ بھی شامل ہے۔ یہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ بٹ صاحب کو یہ جگہ اتنی پسند کیوں آئی تھی۔

یہ دراصل ایک ایسی جگہ تھی جہاں تین اطراف سے گلیاں آ کر ملتی تھیں۔ ان کے مقامِ اتصال پر یہ سایہ دار درختوں کا قہوہ خانہ تھا۔ پرانے طرز کے لباسوں میں لوگ اسی طرح گھوم رہے تھے جیسے ہمارے پرانے لاہور میں گھومتے نظر آتے ہیں مگر ایک دوسرے کو السلام علیکم اور مرحبا ضرور کہتے تھے۔ چند چھوٹی دکانیں بھی تھیں جیسے ہمارے ہاں پرچون کی دکانیں ہوتی ہیں۔ چھوٹے بچے اور بچیاں یہاں سے سودا خریدتی نظر آئیں۔ ایک گھر کا دروازہ کھول کر ایک خاتون نے پکار کر اپنے بچے کو کوئی اور چیز لانے کی ہدایت بھی کر دی۔

یہ پرانا استنبول تھا۔ وہی ماحول جو ساٹھ ستر سال پہلے ہوتا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ سو سوا سو سال پہلے بھی ان گلیوں میں ایسا ہی ماحول ہوتا ہو۔

استنبول کی تہذیب پانچ ہزار سال پرانی ہے۔ اس میں کئی تہذیبیں شامل ہیں۔ بازنطینی، عیسائی، سلجوقی اور پھر ترکی تہذیبوں کا یہاں میل ملاپ نظر آتا ہے۔ استنبول شہر اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ جو بھی نیا فاتح آیا اس نے پرانے طرزِ تعمیر اور ماحول کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کی بہت زیادہ دیکھ بھال کی۔ یہی اس شہر کا حسن ہے۔

مرزا مشرف مختلف عمارتوں کے بارے میں معلومات فراہم کر رہے تھے کہ یہ عمارت فلاں عہد میں تعمیر ہوئی تھی اور اتنے سو سال پرانی ہے۔ استنبول کو مساجد کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس شہر میں پانچ سو سے زائد مسجدیں ہیں جن کے گنبد اور مینارے شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ ان عمارتوں کو اس طرح حفاظت سے رکھا گیا ہے کہ ایسا لگتا ہے جیسے حال ہی میں تعمیر کی گئی ہوں۔ جس قوم نے استنبول پر حکمرانی کی اس نے شہر میں اپنے طرزِ تعمیر کا اضافہ کیا۔

سلیمانیہ مسجد سولہ سو عیسوی میں تعمیر ہوئی تھی۔ یہ سلطان سلیمان نے تعمیر کرائی تھی اس مسجد کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ اتنی پرانی ہے۔ 1923 میں اتاترک نے ملک کا اقتدار سنبھالا تو شہر میں نئی عمارتیں بھی تعمیر کی گئیں۔ یہ جدید طرزِ تعمیر تھی لیکن پرانے طرزِ تعمیر کے درمیان میں یہ اپنا علیحدہ حسن اور پہچان رکھتی ہیں۔ آج کے استنبول میں کئی سو سال پرانی عمارتیں بھی نظر آتی ہیں اور جدید طرزِ تعمیر کی

عمارتیں بھی ان کے پہلو بہ پہلو موجود ہیں جو آج کے بین الاقوامی طرزِ تعمیر کی نمائندگی کرتی ہیں۔

مشہور برطانوی میگزین ”وال پیپر“ نے استنبول کو دنیا کا بہترین شہر قرار دیا ہے۔ استنبول میں نئی عمارتوں کی تعمیر کے سلسلے میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ یہ شہر کی خوبصورتی کو خراب نہ کردیں۔ مثال کے طور پر ہمیں بتایا گیا کہ 1990 میں یہ تجویز بھی کہ تقسیم چوک میں ایک مسجد تعمیر کی جائے لیکن ماہرینِ تعمیرات نے مشورہ دیا کہ اس طرح شہر کا حسن خراب ہوجائے گا۔

استنبول کی آبادی دس لاکھ کے قریب ہے لیکن اس کے باوجود شہر میں ہجوم یا بے ترتیبی نظر نہیں آتی۔ سڑکوں پر ٹریفک سگنل کے حساب سے چلتا ہے۔ پیدل چلنے والے فٹ پاتھوں پر چلتے ہیں۔ استنبول کی اکثر سڑکیں زیادہ چوڑی نہیں ہیں۔ یہ دوطرفہ ٹریفک کے لیے بنائی گئی ہیں۔ یعنی ایک لین آنے کے لیے اور دوسری جانے کے لیے۔ ظاہر ہے کہ ان پر بہت زیادہ رش ہوتا ہے۔ لیکن کار چلانے والے اطمینان اور صبر سے سگنل کھلنے کا انتظار کرتے ہیں۔ نہ کوئی ہارن بجاتا ہے اور نہ ہی قطار میں گھس کر ٹریفک کو خراب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ صفائی کے لحاظ سے بھی یہ دنیا کے صاف ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی بھی سڑک پر کاغذ کا ٹکڑا یا بجھی ہوئی سگریٹ نہیں پھینکتا۔ تھوکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جیسا کہ ہمارے شہروں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی صاف شفاف سڑک پر کار کی رفتار کم کی اور شیشہ اتار کر تھوک دیا۔ خدا جانے ہم لوگوں کو تمیز کب آئے گی۔ استنبول میں جدید ترین اور اونچی عمارتیں بھی ہیں۔ ٹرکش ائر لائنز سے سفر کرنے والے اگر ٹرکش ائرویز کا میگزین پڑھیں تو انہیں دو صفحات پر مشتمل ایک خوبصورت بہت اونچی عمارت کی تصویر نظر آئے گی۔ اس پر صرف ایک فقرہ درج ہے۔ ”ایک بالکل نئی زندگی آپ کی منتظر ہے۔“

ترکی میں آج کل جسٹس پارٹی کی حکومت ہے جو اسلامی جماعت کہلاتی ہے۔ اسی حکومت کے دور میں خواتین کو حجاب پہننے کی اجازت دی گئی۔ ورنہ اس سے پہلے ترکی میں خواتین کے حجاب پہننے پر پابندی تھی لیکن اب تو صدر اور وزیراعظم کی بیگمات بھی حجاب پہنتی ہیں۔ سڑکوں پر عبایا پہنے ہوئے خواتین بھی نظر آتی ہیں۔ لیکن موجودہ اسلامی حکومت نے کسی چیز پر پابندی بھی نہیں لگائی۔ خواتین ہر قسم کے لباس میں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ اسکرٹ اور بلاؤز کا فیشن کم ہوگیا ہے۔ اب جینز اور قمیص ہی خواتین کا پسندیدہ لباس ہے۔ ترشے ہوئے بال، جسم پر جینز اور قمیص یا بلاؤز، اونچی ایڑھی پہنے یہ کھٹ کھٹ چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ موجودہ حکومت نے بہت دانائی اور جذبات سے مغلوب ہوئے بغیر استنبول کو ایک کاسموپولیٹن شہر میں تبدیل کردیا ہے۔ باریش نوجوان سروں پر کپڑے کی ٹوپیاں پہنے بھی نظر آتے ہیں اور جدید تراش خراش کے بالوں والے نوجوان بھی جینز اور قمیص میں ملبوس گھومتے پھرتے ہیں۔ استنبول میں نائٹ کلب بھی ہیں اور شراب کے بار بھی۔ حکومت کا یہ خیال ہے کہ جس شخص نے شراب پینی ہے اگر پابندی لگادی جائے پھر وہ ناجائز طریقے سے حاصل کرکے شراب پیے گا۔ یہ لاقانونیت اور معاشرے میں خرابی پیدا کرنے سے بہتر ہے کہ جو شخص بھی چاہے قانون اور اخلاق کے دائرے میں رہ کر اپنا شوق پورا کرے۔

یہی وجہ ہے کہ عام طور پر ترکی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک سیکولر ملک ہے لیکن شخصی آزادی ہر شخص کو حاصل ہے۔ وہ مسجد میں جاکر نماز پڑھے یا بار میں جاکر شراب سے شوق فرمائے۔ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ملک میں عجیب دوغلا پن نظر آتا ہے۔ کرسچن لوگوں کو شراب کے پرمٹ دیئے جاتے ہیں جو وہ مسلمانوں کے ہاتھوں فروخت کردیتے ہیں اور خود دیسی شراب پی کر اپنی صحت خراب کرلیتے ہیں۔ ہوٹلوں میں بار موجود نہیں ہے لیکن جو بھی چاہے وہ ویٹر سے چائے دانی میں شراب منگالیتا ہے۔ ترک حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ اپنے مذہب کو نہ چھوڑو اور دوسرے کے مذہب کو نہ چھیڑو۔

ہمارے شہروں میں حکمرانوں کا غالباً یہ خیال ہے کہ ہم ایسے لوگ ہیں جنہیں ٹائلٹ جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے حالانکہ یہ ایک فطری چیز ہے..... اب لاہور کراچی جیسے شہروں کے شاندار بازاروں میں گھومنے فیملی اگر ٹائلٹ کی ضرورت پڑجائے تو وہ کہیں نظر نہ آئے گا۔

اس کے برعکس استنبول (اور ترکی کے دوسرے شہروں میں) آپ کو جابجا صاف ستھرے ٹائلٹ نظر آجائیں گے۔ یہ باغوں میں، بازاروں میں یا کسی بھی جگہ نظر آتے ہیں اور عام لوگ انہیں سلیقے سے استعمال کرتے ہیں۔ ان کی صفائی کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ عام لوگ بھی مہذب ہیں، وہ کسی طرح کی گندگی نہیں پھیلاتے۔

استنبول کے علاقے کاؤے کوئی میں ہم گھوم رہے

تھے۔ یہ ایک پُررونق علاقہ ہے، درمیان میں ایک وسیع و عریض خوبصورت پارک ہے۔ یہاں ہم نے دیکھا کہ قطار اندر قطار ایک جیسی ایک منزلہ خوبصورت عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ مرزا مشرف نے بتایا کہ یہ پبلک کے لیے ٹائلٹس بنائے گئے ہیں۔ شہر کے ہر علاقے میں اسی صورت شکل کے ٹائلٹس نظر آتے ہیں جو عام طور پر ایک ہی طرز کے ہوتے ہیں۔

بٹ صاحب تو یہ دیکھ کر بے تاب ہوگئے اور انہیں ٹائلٹ جانے کی ضرورت پیش آگئی۔ ایسی پُرفضا جگہ پر اتنے خوبصورت ٹائلٹس، انہیں استعمال کرنا ضروری ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب ٹائلٹس ساری دنیا میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔“

کہنے لگے۔ ”اگر یہ باہر سے اتنے خوبصورت ہیں تو اندر سے کیسے ہوں گے، دیکھنا چاہیے۔ آخر ہم ٹورسٹ ہیں ہر ملک کی ہر چیز کو دیکھنے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر آپ میں سے کوئی میرے ساتھ چلنا چاہے تو بے شک چلے۔ مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

سب نے کہا ”ہمیں کوئی شوق نہیں ہے۔ آپ آکر اپنی رپورٹ پیش کردیں۔“

بٹ صاحب فوراً ریسٹ روم سے غائب ہوگئے ہم سب ان کے انتظار میں باغ میں لگی ہوئی بینچوں پر بیٹھ گئے۔

کافی دیر بعد بٹ صاحب باہر نکلے تو بہت ہشاش بشاش نظر آرہے تھے۔

”بٹ صاحب، اتنی دیر لگادی آپ نے؟“

بولے۔ ”بھائی اتنی صاف ستھری اور خوبصورت جگہ ہے کہ باہر آنے کو جی ہی نہیں کرتا۔ بالکل صاف شفاف۔ ہمارے ملک میں تو اندر جانے کو جی نہیں چاہتا اور یہاں سے باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔“

خان صاحب بولے۔ ”بس تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ ہوٹل چھوڑ کر یہیں شفٹ ہوجائیں۔ پیسے بھی بچیں گے اور دل بھی خوش رہے گا۔ ہم بستر وغیرہ کا بندوبست کردیں گے۔“

بٹ صاحب کہنے لگے۔ ”پہلے میں نے بھی یہی سوچا تھا مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں سونے کے لیے بیڈ وغیرہ کا بندوبست نہیں ہے۔ مگر یہ ایسی جگہ ہے کہ جب تک ہم استنبول میں ہیں دن میں ایک بار یہاں ضرور آنا پڑے گا۔“

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب، ریسٹ روم میں جانے کے لیے ٹکٹ لینا پڑے گا۔“

بولے۔ ”تو پھر کیا ہوا۔ ایک بار ٹکٹ لے کر اندر گئے تو پھر اگلے دن ہی باہر آئیں گے۔“

خان صاحب جل کر بولے۔ ”بٹ صاحب، آپ استنبول دیکھنے آئے ہیں یا یہاں کے ریسٹ روم دیکھنے۔ یہاں کے ساحل دیکھ لیجیے۔ یہاں کے بازار دیکھیے۔ باسفورس کا حسن دیکھیے۔ شہر کی خوبصورتی اور صفائی دیکھیے۔ آخر ہم ترکی دیکھنے آئے ہیں تو اس کی خوبیاں ضرور دیکھنی چاہئیں۔ اسی لیے میں نے ریسٹ روم کا بھی معائنہ کیا۔ اس سے پہلے کسی سفرنامہ نویس نے استنبول کے ریسٹ ہاؤس کا تذکرہ نہیں کیا۔ دیکھیے کسی بھی ملک کی ترقی اور تہذیب کا اندازہ لگانے کے لیے وہاں کے ریسٹ روم ضرور دیکھنا چاہئیں۔ اس سے آپ کو ملک کی ترقی اور عوامی سہولتیں فراہم کرنے کا اندازہ ہوجائے گا۔ مثلاً سب سے پہلے تو آپ لاہور اور کراچی کا ٹریفک دیکھیے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہاں ٹریفک پولیس کا وجود ہی نہیں ہے۔ ہماری سڑکوں پر ٹریفک نہیں ایک ہڑبونگ مچی ہوئی ہے۔ پھر یہاں کے لوگوں کا مہذب اور شائستہ طرزِ زندگی دیکھیے۔ شہر میں صفائی کا بندوبست دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ گھروں، سڑکوں اور دوسری جگہوں پر صفائی کا ایک سب شہریوں کا احساس ذمے داری بھی ہے اگر شہری تعلیم یافتہ ہوں تو احساس ذمے داری خود بخود بڑھ جاتا ہے۔ ہم نے دنیا کے بہت ملک دیکھے ہیں اور سبھی ہمارے ملک سے صفائی اور تہذیب اور شائستگی میں بڑھ کر ہیں۔ وجہ صرف اچھے حکمراں ہیں جو اپنی تجوریاں بھرنے سے زیادہ کسی اور چیز کو فوقیت نہیں دیتے۔ انہیں مقصد صرف عیش وعشرت اور لوٹ مار سے ہے۔ انہیں عوام کا صرف نام پتا ہے اور یہ نام بھی انہیں صرف انتخابات کے زمانے میں یاد آتا ہے۔ اس کے بعد انہیں عوام یاد رہتے ہیں نہ ان کے مسائل۔ دراصل ہم نے جتنی دنیا دیکھی ہے... بدقسمتی سے تمیز وتہذیب، اخلاق اور گندگی کے معاملے میں پاکستان کو سب سے کمتر پایا ہے۔ کہنے کو مسلمان ہیں اور اسلام نے صفائی، پاکیزگی اور خوش اخلاقی پر بہت زور دیا ہے لیکن ہم عموماً وہ کام نہیں کرتے جن پر اسلام نے عمل کرنے کا حکم دیا ہے۔ خدا جانے پستی اور گندگی کا سفر کہاں جاکر رکے گا اور ہم کب مہذب اور خوش اخلاق ہوں گے۔

استنبول کے علاوہ بھی کسی شہر کو دیکھا جائے اس خیال پر گرما گرم بحثیں ہوئیں اور قرعہ فال قیصری کا نکلا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے کہ کیسری جانے کے لیے ہوائی جہاز کا سفر زیادہ بہتر ہے۔ یوں تو ترکی میں بسیں بھی بہت اچھی اور ائر کنڈیشنڈ ہوتی ہیں لیکن طویل راستے ہونے کی وجہ سے لوگ ٹرکش ائرویز سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں۔

پہلے اس شہر کا نام اپاسں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر تین سو سال قبل مسیح میں سکندر اعظم کے ایک جنرل نے آباد کیا تھا۔ یہ علاقے ازمیر کے صوبے میں ہیں۔ اس لیے فیصلہ کیا گیا کہ اگلے دن ازمیر کا سفر کیا جائے۔ یہاں مقامی یعنی اندرونی پروازیں اتنی کثرت سے چلتی ہیں کہ سیٹ بکنگ کرانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہوائی جہاز بہت اچھی حالت میں ہیں۔ مختصر سفر کے اڑان میں مسافروں کو لنچ بکس دیے جاتے ہیں۔ ائر ہوسٹس بہت اسمارٹ اور خوبصورت و مستعد نظر آتی ہیں۔ اگر ائر ہوسٹس کو بلانے کے لیے بٹن دبایا جائے تو ائر ہوسٹس فوراً الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوجاتی ہیں۔ خدا جانے ان ائر ہوسٹوں کے چہرے پر مسکراتے ہوئے نقاب لگادیے گئے ہیں یا پھر پلاسٹک سرجری کے ذریعے ان کے چہرے ایسے بنادیے گئے ہیں کہ یہ ہر وقت مسکراتی نظر آتی ہیں مسکراہٹ ان کے چہروں کا لازمی حصہ بن چکی ہے۔ شاید اکیلے میں بھی یہ مسکراتی رہتی ہیں۔

خان صاحب نے کہا۔ ”یہ لڑکیاں ہر وقت مسکراتی کیوں رہتی ہیں، ؟“

بٹ صاحب نے پاس سے گزرنے والی ایک ائر ہوسٹس کو روکا اور پوچھا۔ ”میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں؟“

”جی“ پوچھیے۔“ وہ مسکرائی۔

”سسٹر آپ ہر وقت مسکراتی رہتی ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ہر وقت مسکراتا رہے۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”ہمیں مسکرا کر بات کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ اگر آپ مسکرا کر کسی سے بات کریں گے تو جواب میں وہ بھی مسکرائے گا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مسکراہٹ سے ماحول.... خوشگوار ہوجاتا ہے۔ ہر شخص خوش نظر آتا ہے۔“

”سچ فرمایا آپ نے۔“

جاتے جاتے اس نے بٹ صاحب سے پوچھا۔ ”میں بھی آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہوں گی۔“

”ضرور پوچھیے۔“

”آپ نے مجھے سسٹر کہہ کر کیوں مخاطب کیا۔ سسٹر تو اسپتال کی نرسوں کو کہا جاتا ہے۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”دیکھیے آپ ائر ہوسٹس ہیں۔ اب میں آپ کو ائر ہوسٹس کہہ کر تو مخاطب نہیں کرسکتا۔ اسپتال میں نرس کو محض نرس کہہ کر بلایا جائے تو وہ عجیب سا محسوس کرے گی۔ نرس، مجھے یہ تکلیف ہے تو عجیب سا لگے گا۔ اس کے علاوہ جب مریض نرس کو سسٹر کہتا ہے تو دونوں میں ایک اپنائیت اور رشتہ قائم ہوجاتا ہے اور نرسیں مریض کو اپنا بھائی یا بہن سمجھ کر ان پر زیادہ توجہ دیتی ہے۔“

ائر ہوسٹس یہ دلیل سن کر مسکرائی۔ ”آپ درست کہتے ہیں۔“

وہ جانے لگی تو بٹ صاحب نے جاتے جاتے پوچھ لیا۔ ”سسٹر کیا آپ ہمارے ملک کی نرسوں کو بھی مسکرانا سکھا سکتی ہیں۔ وہ تو سیدھے منہ نرمی سے بات کرنا بھی توہین سمجھتی ہیں۔“

ائر ہوسٹس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

خان صاحب نے کہا۔ ”ہماری نرسوں کو مسکرانے کے لیے یا تو ماسک پہنائے جائیں یا پھر ان کا مسکرانے والا میک اپ کیا جائے۔“

مرزا اشرف خاموش نہ رہ سکے۔ ”معاف کیجیے آپ نرسوں سے خواہ مخواہ ناراض ہیں۔ ذرا سوچیے کہ ان کی ڈیوٹی کتنی لمبی ہوتی ہے۔ گھنٹی کی آواز سن کر انہیں مریض کے پاس جانا پڑتا ہے۔ اسپتال میں ہر طرح کے مریض ہوتے ہیں جن کے دکھ نرسیں برداشت کرتی ہیں۔ اگر الٹی ہوجائے اور لباس خراب ہوجائے تو مریض کو صاف لباس فراہم کرنا اور اس کا منہ ہاتھ دھلانا بھی نرس کا کام ہے۔ مریض کی ہر قسم کی ضرورت نرس ہی پورا کرتی ہے۔ آخر وہ بھی انسان ہے۔ اس کے گھریلو مسائل اور پریشانیاں بھی ہوسکتی ہیں۔ مگر ہم نرسوں کی خدمات کا تو اعتراف بھی نہیں کرتے۔“

بٹ صاحب کہاں خاموش رہ سکتے تھے، بولے۔ ”مرزا صاحب، آپ صحیح فرماتے ہیں۔ لیکن ہمارے اسپتالوں میں کچھ نرسیں انتہائی بدمزاج بھی ہوتی ہیں۔ شاید جس طرح وہ روتی ہوئی پیدا ہوتی ہیں مرتے دم تک روتی ہی رہتی ہیں۔ ان کو پکارو تو وہ تیوری پر بل ڈال کر اس طرح مریض کے پاس جاتی ہیں جیسے جاتے ہی اس کی ناک پر ایک مکا لگادیں گی۔“

اتنی دیر میں جہاز کے لینڈ کرنے کا اعلان ہوا اور وہی ائر ہوسٹس تیزی میں سب سے کہتی ہوئی گزر گئی کہ اپنی

بیلٹس باندھ لیجیے۔“ ہم سب نے اپنی بیلٹس باندھ لیں سوائے بٹ صاحب کے۔ بٹ صاحب کے بیلٹ نہ باندھنے کا واقعہ الگ ہے لیکن اگر لگے ہاتھوں سنا ہی دیں تو کیا حرج ہے۔

بٹ صاحب نے شاید قسم کھا رکھی ہے کہ ہوائی جہاز میں بیٹھنے کے بعد وہ بیلٹ نہیں باندھیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ بس یہ ایک فیشن بنادیا گیا ہے ورنہ بیلٹ باندھنے یا نہ باندھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ایک بار ہم لاہور سے کراچی جارہے تھے۔ بار بار اعلان کرنے بلکہ تاکید کرنے کے باوجود بٹ صاحب نے بیلٹ نہیں باندھی۔ اچانک رحیم یار خان کے نزدیک ہوائی جہاز ائر پاکٹ میں آگیا۔ ائر ہوسٹس نے پھر آکر سب کی بیلٹ چیک کیں اور بیلٹ باندھنے کا مشورہ دیا۔ پائلٹ نے بھی ہدایت کی کہ ہم ائر پاکٹ میں پھنس گئے ہیں پریشان نہ ہوں اور اپنی بیلٹس ضرور باندھ لیں۔

ائر ہوسٹس کو دھوکا دینے کے لیے بٹ صاحب نے بیلٹ کے دونوں سرے اپنے پیٹ پر رکھ کر اس پر اپنا ہاتھ رکھ لیا تاکہ نظر نہ آئے کہ یہ واقعی باندھی گئی ہے یا دھوکا دیا جارہا ہے۔

ہوائی جہاز ایک تنکے کی طرح کبھی ایک دم کئی سوفٹ نیچے اور کبھی اچانک کئی سوفٹ اونچا ہوجاتا تھا۔ پائلٹ سنبھالنے کی بہت کوشش کررہا تھا لیکن ہوائی جہاز کی... قلابازیاں جاری تھیں۔ ایک بڑا جھٹکا لگا سیٹوں کے اوپر رکھے ہوئے سامان کے پٹ کھل گئے اور اوپر رکھا ہوا سامان نکل کر نیچے گر گیا۔ کچھ مسافروں کے اوپر غرضیکہ ایک افراتفری مچ گئی۔ جہاز نے پھر ایک جھٹکا کھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے بٹ صاحب اپنی سیٹ پر سے لڑھک کر فرش پر گر گئے۔ جہاز کا توازن بگڑ چکا تھا اور مسافروں کا سامان ایک طرف سے دوسری طرف دھکے کھاتا پھر رہا تھا۔ اس سامان کے ساتھ ہی بٹ صاحب بھی بڑی تیزی سے ایک جانب سے دوسری جانب لڑھکتے پھر رہے تھے۔ کسی میں حوصلہ نہیں تھا کہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر بٹ صاحب کی مدد کرے۔ زبانی مشورے البتہ جاری تھے۔

”قریبی کرسی پکڑ لیجیے۔“

”فرش سے چمٹ جائیے۔“

”کسی قریبی مسافر کے پیر پکڑ کر لپٹ جائیں۔“

ایک آواز آئی۔ ”بیلٹ باندھ لیجیے۔ جلدی کیجیے۔“

مگر بٹ صاحب کو ہوش ہی کہاں تھا۔ وہ تھالی کے بینگن کی طرح پورے ہوائی جہاز میں اِدھر سے اُدھر لڑھکتے پھر رہے تھے۔

کچھ دیر میں رفتہ رفتہ ہوائی جہاز ...... قابو میں آیا تو وہ لوگ جو دعائیں کرنے میں مصروف تھے اور گڑگڑا کر اللہ سے توبہ کررہے تھے ان کی سانس میں سانس آئی اور انہوں نے اپنے سامان کو اکٹھا کرنا شروع کردیا۔ ہمیں سب سے زیادہ فکر بٹ صاحب کی تھی جو اِدھر سے اُدھر لڑھکنے اور قلابازیاں کھانے میں مصروف تھے۔ شکر ہے کہ ہوائی جہاز کے دروازے بند تھے ورنہ اگر دروازہ کھل جاتا تو بٹ صاحب چھاتے کے بغیر ہی آسمان سے زمین پر پہنچ جاتے۔ بٹ صاحب کافی تندرست اور مضبوط تھے۔ اگر ہمارے جیسے دبلے پتلے ہوتے تو شاید جسم کی کوئی ایک ہڈی بھی سلامت نہ رہتی۔

خان صاحب نے کہا۔ ”آفاقی صاحب شکر ادا کیجیے۔ اگر بٹ صاحب کی جگہ آپ ہوتے تو آپ کی چانپیں بن جاتیں۔

قابلِ ذکر اور قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ بٹ صاحب نے اس خطرناک واقعے کے بعد بھی بیلٹ باندھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ صاحب اب تو آپ بیلٹ باندھ لیا کیجیے تو بٹ صاحب مسکرا کر جواب دیتے۔ ”آپ شاید بھول گئے ہیں کہ میں بٹ ہوں ہم بٹ کبھی اپنی عادت نہیں چھوڑتے۔“

ازمیر جانے کے لیے ہم اتاترک انٹرنیشنل ائر پورٹ کی جگہ ایک مختصر ہوائی پورٹ پر پہنچ گئے۔ جیسا کہ پہلے بتاچکا ہوں کہ ترکی میں ہر ائر پورٹ ایک ہی جیسا ہوتا ہے صرف سائز میں اور چند سہولتوں میں فرق ہوتا ہے۔ ترکی والوں کی یہ بات ہمیں بہت پسند آئی کہ انٹرنیشنل ائر پورٹ علیحدہ ہوتا ہے۔ اندرونِ ملک آمدورفت کے لیے ہوائی اڈا الگ ہوتا ہے اور کارگو لانے لے جانے والا ائر پورٹ الگ ہوتا ہے۔ اس طرح ایک تو ائر پورٹس پر زیادہ ہجوم نہیں ہوتا اور لوگ بہت اطمینان اور سکون سے سفر کرتے ہیں۔ مختصر سفر کے لیے مسافروں کو لنچ باکس دیے جاتے ہیں۔ چائے کافی یا جوس بھی طلب کرنے پر وہ مل جاتا ہے۔

ازمیر کا ائر پورٹ بھی مختصر ہے۔ اطمینان اور سکون کا ماحول میسر آیا تھا۔ سفر بہت دلچسپ تھا۔ ہمارے برابر والی سیٹ پر ایک ترک بزرگ بیٹھے تھے۔ بزرگ تو کسی طور بھی نہیں لگتے تھے۔ صحت اچھی تھی۔ گردن اور کمر میں کوئی خم نہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ وہ قمیص اور پتلون میں ملبوس تھے۔ تھوڑی سے خنکی تھی لیکن وہ اس سے بے نیاز۔ درمیانہ قد، متناسب جسم، بارعب شکل وصورت، صرف ان کے سر اور مونچھوں کے بال سفید برف کی طرح تھے۔

جب استنبول ہوائی اڈے سے جہاز نے پرواز کا آغاز کیا تو ہمارے ہم سفر نے بھی ایک دم گفتگو کا آغاز کردیا۔ اس سے پہلے وہ آس پاس کی ہر چیز سے اس طرح بے نیاز تھے جیسے ان کا وجود ہی نہ ہو۔

جیسے ہی ہوائی جہاز نے زمین کو چھوڑا ان بزرگ نے ہمیں مخاطب کرکے کہا۔ ''میرا نام سلیم کاظمی ہے اور آپ کی تعریف؟''

ہم نے چونک کر انہیں دیکھا کہ اچھا، یہ تو بولتے بھی ہیں۔ ہم نے کہا۔ ''السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام! خوش آمدید۔'' وہ اچھی خاصی انگریزی بول رہے تھے، کہنے لگے۔ ''آپ کا نام کیا ہے؟''

ہم نے اپنا نام بتایا۔ بولے۔ ''اچھا نام ہے لیکن ذرا لمبا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''نام تو ہمارا اس سے بھی لمبا ہے۔ آسانی کے لیے مختصر نام بتاتے ہیں۔ آپ کہیں تو اور زیادہ مختصر کردیں۔''

انہوں نے ہمارے سراپے کا جائزہ لیا۔ ''آپ کے لیے چھوٹا نام ہی مناسب ہے۔ اتنی دیر میں ائر ہوسٹس سوئٹس لے کر آگئی تھی۔ ہم نے تو ایک ٹافی اٹھائی مگر انہوں نے چاکلیٹس سے مٹھی بھرلی۔ پھر مسکرا کر ہم سے بولے۔

''مجھے میٹھا بہت پسند ہے۔ ڈاکٹر میٹھا کھانے کو منع کرتے ہیں۔ اس لیے جب موقع ملتا ہے میں میٹھا کھا لیتا ہوں۔''

''تو آپ ان کی بات کیوں نہیں مانتے!''

بولے ''میٹھا تو میں دن میں کم ہی کھاتا ہوں اور ہر روز چھ کلو میٹر جاگنگ کرتا ہوں۔ خانم میرے لیے ہمیشہ پرہیزی کھانا پکاتی ہیں۔''

''خانم؟''

''جی ہاں۔ میں اپنی بیگم کو خانم ہی کہتا ہوں جس کی وجہ سے وہ میری بہت سی غلطیاں معاف کردیتی ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''ہم نے صرف خالدہ ادیب خانم کا نام سنا تھا۔ بچپن میں ہم ترکی کے بارے میں صرف دو نام جانتے تھے اتاترک مصطفیٰ کمال اور خالدہ ادیب خانم۔''

''آپ نے بہت بڑے اور بہادر لوگوں کے ذریعے ترکی کو پہچانا۔ آپ ٹورسٹ ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''آپ کس ملک سے آئے ہیں۔''

''جی پاکستان سے۔''

''پاکستان، پاکستان۔'' انہوں نے ہمارا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔ ''مجھے ہمیشہ پاکستان جانے کی خواہش رہی ہے سونے اب میں ریٹائر ہوگیا ہوں۔ ساری دنیا کی سیر کروں گا۔ سب سے پہلے پاکستان جاؤں گا۔''

ہم نے بظاہر تو بہت خوشی کا اظہار کیا لیکن دل ہی دل میں دعا کی کہ خدا کرے یہ پاکستان نہ جائیں۔ خواب کی دنیا میں ہی رہیں۔

پاکستان، ویری بریو پیپلز۔ ہم ترک لوگ بہادروں کی بہت قدر کرتے ہیں ان کی عزت کرتے ہیں۔ آپ اپنے ملک سے چار گنا زیادہ بڑے ملک سے بھی نہیں ڈرتے۔ بلکہ بڑا ملک آپ سے ڈرتا ہے۔''

ان کی زبان سے پاکستان اور پاکستانیوں کی تعریف سن کر ہم بہت خوش ہوئے یہ 1965 کی جنگ کے بعد کا واقعہ ہے جب ساری دنیا میں پاکستانیوں کی بہادری کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ بھارت نے زور شور سے پراپیگنڈا کیا تھا کہ وہ یہ جنگ جیت گیا ہے لیکن رفتہ رفتہ دنیا والوں کو علم ہوچکا تھا کہ بھارت اپنے مقاصد پورے نہیں کرسکا اسی لیے معاہدہ تاشقند پر رضامند ہوگیا ورنہ کسی فتح مند کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ جنگ بند کرانے کے لیے کسی تیسرے ملک کو بیچ میں ڈالے۔

ہم نے پوچھا۔ ''کیا آپ نے کبھی کسی جنگ میں حصہ لیا ہے؟''

وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور بولے۔ ''ہم ترک ہر وقت جنگ کے لیے تیار رہتے ہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ میں بھی فوج میں تھا لیکن کبھی محاذ جنگ پر جاکر لڑنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ اس کے بعد جب یہ نان سینس برطانیہ اور جرمنی نے استنبول میں بیٹھ کر ملک کے حصے بخرے کرائے۔ خلیفہ نے ترک فوجیوں کو جنگ نہ کرنے کا موقع دیا تو ان ملکوں کی دلی مراد بر آئی اور انہوں نے ترکی کے جس علاقے پر چاہا قبضہ کرلیا۔

کمال پاشا نے محبِ وطن فوجیوں کی جو خفیہ تنظیم بنائی تھی اس نے مدافعت کا فیصلہ کرلیا اور ترکی کے مفتوحہ علاقوں کو چھوڑ کر اصل ترکی کی سرحدوں سے دشمنوں کو مار بھگایا۔ کمال پاشا کا کہنا تھا کہ خلافت کا زمانہ چلا گیا ہے بلکہ اب خلیفہ بے بس ہوکر رہ گیا ہے تو پھر ایسے خلیفہ کی ضرورت کیا ہے۔ ان جنگوں میں دوسرے فوجیوں کی طرح میں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور کئی بار زخمی بھی ہوا لیکن جیسے ہی زخم بھرے پھر محاذ پر پہنچ گیا۔ دراصل ہمارے اندر حب الوطنی اور اپنے ملک کو آزاد کرنے کا جذبہ تھا جس کے لیے ہم سب کچھ لٹانے کے لیے تیار تھے۔''

اسی وقت اعلان ہوا کہ طیارہ کچھ دیر میں ازمیر کے ہوائی اڈے پر اترنے والا ہے۔

ہم نے بزرگ سے کہا۔ ''ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسے بزرگ ترک سے ملاقات اور بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ کیا آپ ازمیر میں رہتے ہیں یا استنبول سے آئے ہیں؟''

وہ فخریہ انداز میں سینہ تان کر بولے۔ ''میں ازمیر میں رہتا ہوں اس شہر کو دشمنوں سے چھین لینے کے لیے میں نے جنگ کی ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''کلفی صاحب اگر آپ برا نہ مانیں تو کچھ عرض کریں؟''

وہ سنجیدگی سے بولے۔ ''برا تو میں ضرور مانوں گا اس لیے کہ آپ نے میرا نام بگاڑ دیا ہے، فرزند میرا نام کلفی نہیں کاظمی ہے۔''

''سوری سر، دراصل میں ترک ناموں سے واقف نہیں ہوں۔ کیا آپ بتائیں گے کہ کاظمی کا کیا مطلب ہے؟''

بولے۔ ''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ دراصل یہ ہمارا سر نیم ہے آپ کیا کہنا چاہ رہے تھے۔''

ہم نے کہا۔ ''دیکھیے ہمارے ساتھ چند ساتھی اور ہیں وہ بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے اور آپ سے معلومات بھی حاصل کریں گے کیا آپ اتنا وقت نکال سکیں گے؟''

انہوں نے کہا ''ائرپورٹ سے باہر جاکر پہلے تو میں سگار پیوں گا۔ اس کے بعد آپ چاہیں تو میرے ساتھ گھر چلیں۔ اطمینان سے بات کریں گے۔''

ہم نے کہا۔ ''آپ کو تکلیف نہیں دینا چاہتے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم کسی قریبی ریستوران میں جاکر گفتگو کرلیں۔''

وہ ہنسے۔ ''مناسب ہے مگر ایک شرط بھی ہے۔''

''وہ کیا۔''

''وہ یہ کہ بل میں ادا کروں گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ پاکستان سے آئے ہیں، ازمیر میں ہمارے مہمان ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میں عمر میں آپ سب سے بڑا ہوں۔''

ہم جانتے تھے کہ ترک بھی پاکستانیوں کی طرح میزبانی کرتے ہیں اس لیے ان کی شرط فوراً منظور کرلی۔

ائرپورٹ کے لاؤنج میں ہم نے کاظمی صاحب سے اپنے دوستوں کی ملاقات کرائی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور ہر ایک سے پاکستان پاکستان کہہ کر نہ صرف مصافحہ کیا بلکہ گلے بھی لگایا۔

ہم نے مختصراً ان کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو بتایا۔

بٹ صاحب کہنے لگے ''آفاقی صاحب اگر انہوں نے اپنے گھر لے جانے کی دعوت دی تھی تو منظور کرلیتے۔ ہمارا ہوٹل کا خرچہ بچ جاتا۔''

''شرم کرو بٹ صاحب، مجھے تو تمہیں بٹ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

''یار میں تو مذاق کررہا تھا۔ ترکی آکر تو تمہارا احساسِ مزاح بھی ختم ہوگیا ہے۔''

کاظمی صاحب کے ہاتھ میں سامان کے نام پر صرف ایک چھوٹا سا بیگ تھا جو انہوں نے اپنے ہاتھ میں اٹھالیا۔ ہم لوگ حیران تھے کہ کہاں جاکر ریستوران ملے گا مگر کاظمی صاحب سامنے والی سڑک عبور کرکے ایک چھوٹے سے ریستوران میں داخل ہوگئے۔ کرسی پر بیٹھتے ہی انہوں نے سگار پھینک کر ایک اور سگار سلگا لیا۔ ان دنوں ہم بھی کبھی کبھی سگار اور پائپ پی لیا کرتے تھے مگر اتنے زیادہ نہیں کہ چین اسموکر کہلائیں۔

ہم لوگوں کی طرف دیکھ کر انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب سے تین اور اعلیٰ درجے کے سگار نکال کر ہم سب کو پیش کیے۔ سگار کی خوشبو کی وجہ سے ہمارا دل تو بے تاب ہوگیا مگر ہم نے تکلف کرنا ہی بہتر سمجھا۔

انہوں نے ایک لمبا کش لے کر سگار کا خوشبودار دھواں چاروں طرف پھیلایا اور پھر بولے۔ ''دراصل مجھے گھر کے اندر سگار پینے کی اجازت نہیں ہے۔ اس لیے ساری بدپرہیزیاں میں گھر کے باہر ہی کرتا ہوں۔''

''تو کیا آپ کی خانم کو خبر نہیں ہوتی۔ سگار کی خوشبو تو کپڑوں میں بھی بس جاتی ہے۔''

''اس کا علاج بھی میرے پاس ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے سینٹ کی دو شیشیاں جیب سے نکال کر میز پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

رکھ دیں۔ ”ان میں سے ایک میرے لیے ہے اور دوسری خانم کے لیے۔ خوشبو کا خرچہ تو ہوتا ہے لیکن شوق تو پورا ہوجاتا ہے۔“

خان صاحب نے انہیں سرتاپا دیکھا اور بولے۔ ”ڈاکٹر آپ کو پرہیز کرنے کے لیے کیوں کہتے ہیں۔ آپ کی صحت تو ماشا اللہ بہت اچھی ہے۔“

وہ ہنس پڑے۔ ”اگر مجھ جیسے بیوقوف لوگ ڈاکٹروں کے پاس نہ جائیں تو ان کی آمدنی کیسے ہوگی۔“

ہم نے اردو میں کہا۔ ”ان سے جو معلومات حاصل کرنی ہیں کرلو۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ دو سگار ختم ہوتے ہی یہ رخصت ہوجائیں گے۔“

ہم نے ترجمان کے طور پر سوال کا آغاز کاغی صاحب سے کیا۔ ”محترم آپ کے ملک کو ترکی کیوں کہتے ہیں۔“

بولے۔ ”اس لیے کہ یہاں ترک رہتے ہیں۔ آپ کے ملک کو پاکستان کیوں کہتے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں پاکستانی رہتے ہیں۔

خان صاحب نے پوچھا۔ ”مگر رومن تو اسے ایشیائے کوچک کہتے تھے۔“

وہ بولے۔ ”اس ملک کو کسی زمانے میں اناطولیہ بھی کہا جاتا تھا۔ یہ علاقہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک طرف بحرِ اسود ہے۔ دوسری طرف ایجیئن کی ہے۔ اس ملک کی سرحدیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ عراق، شام، بلغاریہ، یونان، ایران ان سب ملکوں سے ہماری سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ ایک زمانے میں سلطنتِ عثمانیہ نے یورپ تک ملکوں کو فتح کرلیا تھا۔ اس کے بعد جب زوال آیا تو جس کا بس چلا اس نے ایک حصہ ہتھیالیا۔ 1923 سے پہلے یہاں خلافت تھی مگر صرف نام کی۔ 1923 میں اس ملک کے حصے بخرے کئی ملکوں نے آپس میں بانٹ لیے تھے مگر پھر مصطفیٰ کمال پاشا نے طاقت کے ذریعے سارے فاتحوں کو ترکی کی اصل سرحدوں سے نکال باہر کیا۔ کمال پاشا نے اسے ترکیہ کا نام دیا جس کے بعد یہ ترکی بن گیا۔ ترکیہ کا مطلب ہے کہ وہ ملک جہاں ترک رہتے ہیں۔ اب یہ ترک سرزمین ہے۔

یہ سرزمین بہت اچھی ہے اس لیے ہر ملک اور قوم نے اس پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ رومیوں نے اس سرزمین کو فتح کرلیا اور ایک ہزار سال تک یہاں حکومت کی۔ اس کے دارالحکومت کو قسطنطنیہ کہا جاتا تھا۔ روم اس زمانے میں بہت بڑی طاقت تھی۔ رومیوں نے ایک ہزار سال سے زیادہ یہاں حکومت کی۔ لیکن روم کے بعد بازنطینیہ نے اس پر قبضہ کرلیا۔ یہ عیسائی حکومت تھی۔ قسطنطنیہ اس کا دارالحکومت تھا۔ حالانکہ ملک کا مرکز اس وقت اناطولیہ ہی تھا۔ حکومت کا مذہب عیسائیت تھی۔ اسی علاقے میں عیسائی مذہب نے استحکام حاصل کیا۔ ساتویں صدی عیسوی میں عربوں نے اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔ یہ ساتویں صدی عیسوی کا قصہ ہے۔ عربوں نے کافی عرصے یہاں پر حکومت کی جس کے بعد سلجوقیوں کا عروج ہوا تو انہوں نے کئی سال تک قسطنطنیہ پر حکومت کی۔ اس کے بعد سلطنتِ عثمانیہ کا عروج ہوا۔ عثمانیہ سلطنت نے تقریباً سات سو سال کے قریب بڑے جاہ و جلال کے ساتھ حکمرانی کی۔ یہ عثمانیوں کے عروج کا دور تھا۔ دنیا بھر میں سلطنتِ عثمانیہ کی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ تمام عیسائی حکومتوں نے اس کے خلاف متحدہ محاذ بنالیا لیکن عثمانیوں پر فتح نہ پاسکیں۔ اس کے برعکس عثمانوی سلطنت کی فوجیں جس طرف رخ کرتی تھیں ان کی آمد کی خبر سن کر ہی قلعے دار یا تو اس کی بالادستی قبول کرلیتے یا قلعہ خالی کرکے چلے جاتے تھے۔ عثمانیہ سلطنت کی سرحدیں ایران سے لے کر بحرِ روم تک اور بحرِ ہند سے لے کر یورپ میں بلغاریہ اور ویانا تک پہنچادی تھیں۔“

”مگر سلیم کاغی صاحب اتنی طاقتور سلطنت ختم کیوں ہوگئی۔“

وہ تلخی سے مسکرائے۔ ”عیش و عشرت۔ امورِ سلطنت سے بے خبری۔ آپس کی سازشیں اور نااہل حکمراں۔ آپ خود دیکھ لیجیے کہ........ مغلوں نے پانچ سو سال سے زیادہ ہندوستان پر حکومت کی مگر پھر یہ عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی اور انگریزی حکومت قائم ہوگئی۔ اس کی وجہ آپ کو معلوم ہوگی۔ بس یہی سب کچھ سلطنتِ عثمانیہ کے ساتھ بھی ہوا۔ یہ وسیع و عریض سلطنت اس طرح ختم ہوگئی جیسے کہ کبھی تھی ہی نہیں۔ اس طرح آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ترکوں کی تاریخ کیا ہے اور موجودہ ترک حکومت کیسے وجود میں آئی۔ اس سے آپ کو یہ بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اس ملک پر کتنی مختلف تہذیبوں کا اثر ہوا۔ قسطنطنیہ شہر کو دیکھ کر یورپ اور امریکا کے لوگ بھی حیران رہ جاتے ہیں کہ یہاں کیسی کیسی تہذیبوں کے آثار ہیں اور کئی قسم کے طرزِ تعمیر کی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ قسطنطنیہ دراصل مختلف تہذیبوں کا گلدستہ ہے۔ ایرانی یہاں، رومن یہاں، بازنطینیوں نے یہاں طویل عرصے تک حکومت کی۔ عربوں نے بھی اس ملک پر حکمرانی کی۔ سکندر اعظم نے جب یہاں کا رخ کیا تو اس نے ایرانی اثر و رسوخ کو ختم کرکے یونانی تہذیب کی بنیاد رکھی۔ آج آپ جس ترکی میں رہتے ہیں اس کی تاریخ بھی عجیب و غریب ہے۔ آپ تو شاید جانتے ہوں گے کہ یونان کا مشہور شاعر ہومر اسی ملک میں پیدا ہوا تھا۔“

ہم نے دیکھا کہ ان کا دوسرا سگار ختم ہونے والا تھا۔ انہوں نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ تیسرا سگار ختم کرنے کے بعد وہ گھر کی راہ لیں گے۔

عیسائیوں اور بازنطینیوں میں یہ فرق تھا کہ بازنطینی بت پرستی کرتے تھے لیکن عیسائیوں کا مذہب ان سے مختلف تھا۔ ان دونوں مذہبوں سے واسطہ رکھنے والے بھی خوب لوگ تھے۔ مذہب ان کے نزدیک خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ کبھی وہ بازنطینی بن جاتے اور کبھی عیسائی۔ بازنطینی بہت عیش و عشرت میں رہا کرتے تھے اور رعایا کا بھی خیال رکھتے تھے۔ انہوں نے ملک میں اور قسطنطنیہ میں بہت شاندار عمارتیں تعمیر کرائیں جو آج بھی قسطنطنیہ کی زینت میں اضافہ کرتی ہیں لیکن ایرانی دورِ حکومت اس سے مختلف تھا۔

ایرانی دور میں کافی تباہی اور بربادی ہوئی۔ ایران کے دورِ حکومت میں صرف اناطولیہ میں ترقی کے کام ہوئے۔ انہوں نے اس علاقے میں تعلیمی ادارے قائم کیے۔ تعلیمی درسگاہیں تعمیر کیں۔ تھیٹرز اور تفریح گاہیں بنوائیں۔ لیکن سب کچھ ایرانیوں کے ایک روشن خیال اور ترقی یافتہ لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا لیکن مجموعی طور پر ایرانی تباہی اور بربادی کو ترجیح دیتے تھے۔

اناطولیہ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ان ہی پہاڑیوں پر آکر ٹھہری تھی۔ ترک کا لفظ کب استعمال ہوا یہ 1300 قبل از مسیح کا زمانہ تھا۔ دراصل منگولیوں کو سب سے زیادہ خطرہ چین سے تھا۔ چین اس زمانے میں ایک طاقتور ملک تھا۔ اور جب بھی اناطولیہ میں کوئی ترقی یا خوشحالی ہوتی تھی تو چین حملہ کرکے مال و اسباب لوٹ کر لے جاتا تھا۔ ادھر جب منگولیا طاقتور ہوتا تھا تو وہ چین کے سرحدی علاقے میں توڑ پھوڑ کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ چین اور منگولیا کی سرحدیں بہت طویل ہیں اور دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان سرحدوں کی حفاظت کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ ان حملوں سے محفوظ رہنے کے لیے چین کے گرد دیوارِ چین بنائی گئی تھی جس کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ بھی کہا جاتا ہے۔“

ہم نے پوچھا، ”مگر یہ سب الگ الگ قبیلے تھے۔ انہیں ترک کا نام کب دیا گیا؟“

انہوں نے تیسرا سگار سلگالیا اور بولے۔ ”چین کی تاریخ میں ترک کا لفظ تیرہ سو سال قبل مسیح میں ملتا ہے۔ جب مختلف قبیلوں کو متحد کرکے ایک بہت بڑی طاقت بنایا گیا جس نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کو تباہ و برباد کردیا۔ چنگیز خان کا نام ہی ایک زمانے میں خوف اور دہشت کی علامت تھا۔

ہم نے پوچھا۔ ”آپ نے تو ایک تاریخ بتادی ہے۔ ہم صرف اتنا جاننا چاہتے ہیں، ترک قوم کب اور کیسے وجود میں آئی۔“

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کو شاید یہ سن کر حیرت ہوگی کہ چنگیز خان کے خون میں ترک اور منگول خون شامل تھا۔ ترکوں کا رواج یہ تھا کہ ترک اپنے قبیلے سے باہر دوسرے قبیلوں میں شادیاں کرتے تھے۔ اس طرح ان کی دوسرے قبیلوں سے بھی رشتہ داری قائم ہوجاتی تھی اور ترک قوم میں اضافہ ہوتا رہتا تھا۔“

منگولوں کی طرح ترک بھی بہت بہادر، بے خوف اور بہترین شہسوار تھے۔ چنگیز خان کے عہد کے بعد بھی بادشاہ اور خلفا ترکوں کو اپنی فوج میں شامل کرنا فخر سمجھتے ہر خلیفہ اور بادشاہ کی یہی خواہش ہوتی تھی۔ بغداد کے عباسی خلفا کی فوج میں بھی ترکوں کو رکھنا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ ترکوں میں نسلی طور پر بہادری کے جراثیم شامل رہے ہیں۔ اکثر بادشاہوں کی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر ترکوں کو فائز کیا جاتا تھا کیونکہ بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت وفادار بھی ہوتے تھے جس کی بنا پر خلیفہ یا بادشاہِ وقت ان پر پورا بھروسا کرتے تھے۔

سلجوق ایک ترکمانی قوم تھی۔ انہوں نے اتنی تیزی سے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا کہ بڑے بڑے بادشاہ خوفزدہ ہوگئے۔ ان کا دارالحکومت اصفہان تھا۔ ان میں بہت جلد اسلام بھی پھیل گیا۔

بازنطینی سلطنت نے سلجوقیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کی وجہ سے ان کے خلاف جنگ کا اعلان کردیا لیکن شکست کھائی۔ سلجوقی جس تیزی سے ابھرے تھے اتنی ہی تیزی سے زوال پذیر ہوئے۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرلیں۔ وہ موقع پاکر کمزور عیسائی ریاستوں پر اپنی بالادستی قائم کرلیتے تھے۔ لیکن آج کے ترک بھی اپنے آپ کو چنگیز خان کے قبیلے سے ہی وابستہ کرتے ہیں۔ منگولوں کا جو

WWW.PAKSOCIETY.COM

حال ہوا وہ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ بیبرس کی مسلمان فوج سے منگولوں نے پہلی مرتبہ شکست کھائی۔ اس کے بعد ان میں کافی تعداد مسلمان ہوگئی۔

خان صاحب نے کہا۔ ”کاغی صاحب آپ کا سگار زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ کیا آپ سلطنتِ عثمانیہ کے قیام اور عروج کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہیں؟“

وہ مسکرائے۔ ”فکر نہ کیجیے۔ سگار ختم ہونے کے بعد میں آپ کے پاس رہوں گا۔ آخر آپ ہمارے پاکستانی مہمان ہیں۔ منگولوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد سلجوقیوں اور منگولوں میں مقابلہ ہوا تو اس جنگ میں ترکوں نے سلجوقی سپہ سالار کی جان ایک شخص سے بچائی تھی۔ سلجوقی فوج تو فرار ہوگئی تھی۔ علاؤالدین نے دریافت کیا کہ وہ بہادر کون تھا جس نے میدانِ جنگ میں میری جان بچائی تھی۔ علاؤالدین نے جب شکریہ ادا کرنے کے لیے اس کو طلب کیا تو معلوم ہوا کہ ان کا نام ارطغرل ہے۔ علاؤالدین نے اس کی بہت آؤ بھگت کی اور اعلیٰ عہدہ دیا۔ ارطغرل کے بیٹے عثمان نے اپنی بہادری اور وفاداری سے علاؤالدین کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کا دربار میں اضافہ ہوگیا اور اس نے کئی معرکوں میں فتح حاصل کی۔ عثمان کا اثر ورسوخ اتنا بڑھ گیا تھا کہ ارطغرل کی وفات کے بعد عثمان کو تخت پر بٹھایا گیا۔ عثمان کا تعلق ایک اسلامی گھرانے سے تھا۔ وہ ایک بہت مہربان اور بہادر شخص تھا۔ اس کے دور میں ترکی میں مسلمانوں کو عروج حاصل ہوا۔ سلطان عثمان نے عیسائی ریاستوں کو فتح کیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ یونانیوں نے سلطان عثمان کو چیلنج کرنے کی کوشش کی، مگر دونوں مقابلوں میں شکست کھائی۔ سلطان عثمان نے بازنطینی دور کا اثر ختم کردیا اور بازنطینیہ کے تمام شہروں کو فتح کرلیا۔ بُرسا کے قلعے کو فتح کرنے کے لیے سلطان عثمان نے سات آٹھ مہینے تک بُرسا کا محاصرہ جاری رکھا یہاں تک کہ بُرسا فتح ہوگیا۔ اس دوران میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا کیونکہ اسلام کی خوبیوں کو دیکھ کر دوسرے مذاہب کے لوگ بھی مسلمان ہونے لگے۔

عثمانی دورِ حکومت میں بہت تعمیری اور اصلاحی کام ہوئے۔ اس سلطنت کی خوبی یہ تھی کہ غیر مسلموں کو بھی مکمل آزادی حاصل تھی۔ مسجدوں کے ساتھ ساتھ گرجوں اور دوسرے مذاہب کی درسگاہوں کا سلسلہ بھی جاری رہا جس کی وجہ سے سلطنت کو غیر مسلموں کی حمایت بھی حاصل ہوگئی۔ سلطان عثمان نے اپنی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کرلیا تھا۔ سلطان عثمان کے بعد ان کے جانشین نے بھی ان ہی کے نقشِ قدم پر چل کر سلطنت کو مزید وسعت اور ترقی دی۔ اس طرح ایک عظیم سلطنت وجود میں آئی۔ عثمانیوں نے بڑی فتوحات حاصل کیں اور غیر ریاستوں کو سلطنت میں شامل کرکے ایک ایسی سلطنت قائم کی جس کے سامنے دنیا کی بڑی سلطنتیں اور طاقتور حکومتیں بھی لرزتے تھے۔ سلطنتِ عثمانیہ کی سرحدیں مشرق و مغرب میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔

سلطنتِ عثمانیہ کی افواج کو پہلی بار امیر تیمور نے شکست دی۔ امیر تیمور اور بایزید یلدرم دونوں مسلمان تھے لیکن ایک دوسرے سے برسرِپیکار ہوگئے۔ اگر ان دونوں طاقتوں میں اتحاد ہوتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی تبدیل ہوجاتا اور ساری دنیا پر مسلمانوں کا راج ہوتا۔

اس عبرت ناک وجہ کے بعد عثمانیہ سلطنت کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ اب اس کا دور ختم ہوگیا لیکن سلطان محمد اول نے سلطنت کو سہارا دیا۔ سلطان محمد نے سلطنتِ عثمانیہ کو نیا جنم دیا۔ سلطان محمد اول وہ بادشاہ ہے جس نے دنیائے اسلام کو سہارا دیا۔ ان کے بعد ان کا بیٹا سلطان محمد دوم تخت نشین ہوا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے آنحضرتؐ کی خواہش کو پورا کیا اور قسطنطنیہ جو ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا اس کو حیرت انگیز بلکہ ناقابلِ یقین انداز میں فتح کرلیا۔ اس کے بعد سے خدا کے فضل سے قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہے اور ترکی ایک خوشحال اور ترقی یافتہ ملک ہے۔ ترکی نے یورپین یونین میں شامل ہونے کی بہت کوشش کی لیکن یونین اس پر شرائط لگاتی رہی۔ یہاں تک کہ اب (2013) میں ترکی جس کو یورپ کا بیمار کہا جاتا تھا اس وقت معاشی طور پر یورپین ملکوں سے زیادہ خوشحال ہے اور یونین کے کئی ممالک معاشی مشکلات سے دوچار ہیں۔“

سلیم کاغی صاحب کا تیسرا سگار ختم ہوچکا تھا۔ انہوں نے ایش ٹرے میں سگار کو مسلا اور پھر بولے۔ ”دیکھیے۔ میری آفر اب بھی موجود ہے کہ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں تاکہ میں آپ کی خدمت کرسکوں۔“

ہم نے وقت کی کمی کا عذر کیا لیکن ان کا فون نمبر لے لیا اور کہا کہ کسی دن آپ کے دولت خانے پر ضرور آئیں گے۔

انہوں نے رخصت ہوتے ہوئے ہم سب کو گلے لگایا

اور دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔

بٹ صاحب بولے۔ ”اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ ترک کون لوگ ہیں۔“

”جی یہ تو معلوم ہوگیا لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ اب ایئرپورٹ سے ہم کہاں جائیں۔“

بٹ صاحب بولے۔ ”آفاقی صاحب، ازمیر میں بہت سے ہوٹل بھی ہیں۔“

مرزا اشرف نے کہا۔ ”میں آپ کو ایک ایسے ہوٹل میں لے جاتا ہوں جو شہر کے درمیان میں ہے۔ مہنگا بھی نہیں ہے۔“

”تو پھر انتظار کس بات کا ہے۔ وہ سامنے ٹیکسی کھڑی ہے اس کو بلائیے اور ہوٹل چلیں۔“

ٹیکسی والا درمیانی عمر کا تھا اور اپنے لباس کی وجہ سے ہمارے کسی بیوروکریٹ کی طرح نظر آرہا تھا۔ یہاں ٹیکسیاں میٹر کے حساب سے چلتی ہیں اس لیے ٹیکسی والے کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

بٹ صاحب نے کہا۔ ”بڑے صاحب آپ تو افسر لگ رہے ہیں۔“

بڑے صاحب اردو سے بالکل ناواقف تھے۔ انہوں نے پھر بھی اقرار میں سر ہلا دیا اور پوچھا۔ ”کہاں جائیں گے؟“

مرزا اشرف نے انہیں ترکی زبان میں بتایا کہ وہ الکریم ہوٹل جانا چاہتے ہیں۔ ”اوکے“ کہہ کر انہوں نے کار کا میٹر گرایا اور ”بسم اللہ“ کہہ کر ٹیکسی چلادی۔ وہ انگریزی کے صرف چند الفاظ جانتے تھے۔

”اوکے۔ یس سر۔ نو سر۔ سوری سر۔“

ہم نے راستے میں شہر دیکھا۔ اچھا خوبصورت شہر ہے۔ یہاں آس پاس خشک پہاڑ ہیں۔ سمندر تو جیسے ترکی کا ایک ضروری حصہ ہے، آپ جس طرف بھی جائیں سمندر سے آپ کا واسطہ ضرور پڑتا ہے۔

بٹ صاحب نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”کاش کہ میں ترکی میں پیدا ہوا ہوتا۔“

”اس سے ازمیر کو کیا فائدہ ہوتا۔“

”تیرنا آجاتا۔“

”آپ کو تیرنا آتا ہے؟“

”جی بالکل نہیں، بچپن میں تو میں سمندر کے پاس جانے سے بھی ڈرتا تھا۔“

خان صاحب نے کہا۔ ”پھر تو آپ بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہوجاتے۔ پھر ہم آپ سے کیسے اور کہاں ملتے؟“

بٹ صاحب بولے۔ ”جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ میں منہ دھونے اور نہانے کے علاوہ کبھی پانی کے پاس نہیں جاتا۔“

ازمیر کے فٹ پاتھوں پر خوب رونق تھی۔ قہوہ خانے بھی تھے اور ایک آدھ نائٹ کلب بھی نظر آیا۔

الکریم ہوٹل ایک شاندار ہوٹل تھا حالانکہ ماڈرن نہیں تھا۔ مشرف صاحب نے بتایا ”یہ ہوٹل دو سو سال پرانا ہے۔“

بٹ صاحب چڑ کر بولے۔ ”یار یہاں کوئی نئی عمارت کیوں نہیں ہوتی۔ جس چیز کو دیکھو پانچ ہزار قبل مسیح کی ہے بیسویں صدی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی پرانی چیزوں کو بہت سنبھال کر رکھتے ہیں۔“

راستے میں کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ ٹریفک بہت اچھی طرح چل رہی تھی۔ نہ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے مقابلے اور نہ کاروں کے کان پھاڑ دینے والے ہارن۔

الکریم ہوٹل خاصا معقول ہوٹل تھا۔ پرانا ہونے کے باوجود پرانا نہیں لگتا تھا۔ اس کا فرنیچر بھی پرانا تھا لیکن بہت اچھی حالت میں تھا۔

استقبالیہ پر ایک خوش شکل خاتون بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ یہ لوگ پیشگی مسکرا کر دوسروں کو شرمندہ کردیتے ہیں۔

بٹ صاحب نے ہم سب سے کہا۔ ”مسکراؤ۔“

خان صاحب ناراض ہوگئے۔ ”بھئی کوئی مسکرانے والی بات ہوگی تو مسکرائیں گے بلاوجہ گفتگو کیے بغیر مسکرانے کی کیا ضرورت ہے۔“

یہ خاتون مسکرانے کے علاوہ انگریزی بھی جانتی تھیں۔ وہ پہلے ہی کھڑی ہوئی تھیں مگر ہم لوگوں کو دیکھ کر شاید پنجوں کے بل کھڑی ہوگئیں تاکہ لمبی نظر آئیں۔

خان صاحب کا خیال تھا کہ ان کے لیے کم از کم ایک چبوترہ بنا دینا چاہیے۔ ہم لوگوں نے جاتے ہی السلام علیکم کہا۔ انہوں نے مزید خوش ہوکر جواب دیا۔ جب ہم لوگوں نے اپنے پاکستانی پاسپورٹ ان کے سامنے رکھے تو ان کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔

”اوہ...... پاکستان۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

انہوں نے ضروری کاغذات پُر کروائے اور ہماری چابیاں ہم سب کو دے دیں۔

سامان ایسے ہی رکھا تھا۔

”کیا سامان ہم خود لے جائیں گے۔“

”تو کیا ہوا۔ پہیے لگے ہوئے سوٹ کیس کو لفٹ تک لے جائیے۔“

مگر اتنی دیر میں ایک اسمارٹ ویٹر آ گیا وہ ہمارے سامان کو دیکھ کر بولا۔ ”آپ چلیے سامان کمرے میں پہنچ جائے گا۔“

ویٹر کو انگریزی کے چار پانچ الفاظ ہی آتے تھے مگر وہ اشاروں سے اپنا مقصد پورا کر دیتا تھا۔

کمروں کے بارے میں خاص اختلاف تھا کہ کون سا کمرا کون لے۔ ہم نے کہا کہ ہمیں تو جو بھی کمرا چاہے دے دیجیے۔ سب ایک ہی طرح کے ہیں۔“

کمرے میں جا کر ہم نے کوٹ اتارا ہی تھا کہ بٹ صاحب گھبرائے ہوئے آئے۔ ”میرے کمرے کا اے سی خراب ہے۔“

”تو پھر استقبالیہ سے بات کیجیے۔“

وہ خوش ہو گئے۔ وہیں سے فون کیا تو وہ خاتون خود ہی چلی آئیں۔

انہوں نے اے سی چلانے کی بہت کوشش کی تھی مگر ناکام رہیں۔ پھر انہوں نے مسکرا کر ہمیں تسلی دی کہ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔

ان کی بات ختم ہونے سے پہلے مشرف صاحب اور خان صاحب بھی آ گئے۔ ان کے اے سی بھی خراب تھے۔ ہوٹل میں مزید کمرے خالی نہ تھے اس لیے وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

”اے سی کمرے کب مل سکیں گے؟“

بولیں ”شام تک۔“

اسی وقت ویٹر نے آ کر خاتون سے کچھ کہا وہ مزید پریشان ہو گئیں اور سوری کہہ کر رخصت ہو گئیں۔ مرزا مشرف نے بتایا کہ ہوٹل کے دو اور کمروں کے اے سی بھی خراب ہیں۔

”چلو بھئی، کسی اور ہوٹل میں چلتے ہیں۔“ خان صاحب نے مشورہ دیا۔

”بالکل نہیں، ہم اسی ہوٹل میں رہیں گے۔“ یہ بٹ صاحب تھے۔

”بٹ صاحب آپ یہاں رہیے۔ ہم اپنی نیند خراب نہیں کر سکتے۔“

اتنی دیر میں وہ خاتون پھر آ گئیں۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تو تھی مگر کچھ کھسیانی سی۔

”میں کچھ بندوبست کر رہی ہوں۔“

”کیا آپ ہوٹل میں نئے کمرے بنوا دیں گی؟“

”جی نہیں۔ مگر اور بھی طریقے ہیں۔“

وہیں کھڑے کھڑے انہوں نے حکم دیا کہ ہوٹل کے ملازم رات بھر کے لیے اپنے اے سی کمرے خالی کر دیں۔ مسئلہ حل ہو گیا۔

”کیا آپ بھی یہیں رہتی ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”تو پھر آپ کا کمرا مجھے ملنا چاہیے؟“ بٹ صاحب نے کہا۔

”مگر کیا فرق ہو گا۔“

”آپ کے کمرے میں خوشبو تو ہو گی۔“

وہ پہلی بار شرمانے لگیں۔ ”آپ چاہتے ہیں تو ایسا ہی سہی۔“

”تیسکر انڈرم“ بٹ صاحب نے ترکی میں ان کا شکریہ ادا کیا۔

”گولے گولے“ یعنی گڈ بائی کہہ کر وہ رخصت ہو گئیں۔

یکا یک بٹ صاحب کو خیال آیا ”ہم نے ان کا نام تو پوچھا ہی نہیں۔“

”نام سے کیا اے سی ٹھیک ہو جائے گا؟“

”ارے نہیں اس طرح ذرا بے تکلفی ہو جاتی ہے۔“

اسی وقت ویٹر نے آ کر مرزا مشرف سے کچھ کہا۔ وہ سر پکڑ کر رہ گئے۔

”مرزا صاحب خیریت تو ہے۔“

”جی ہاں خیریت ہے۔ دو کمروں میں پانی نہیں آ رہا۔“

خان صاحب ناراض ہو گئے۔ ”مرزا صاحب آپ ہمیں ہوٹل میں لائے ہیں یا کباڑ خانے میں۔“

”ارے بھئی جس کے کمرے میں پانی نہ آئے وہ میرے کمرے میں آ کر منہ ہاتھ دھولے اور نہا لے۔“

”لیجیے، ہو گیا مسئلہ حل۔“ بٹ صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

(جاری ہے)

تذکرۂ چین

انجم فاروق ساحلی

انتہائی پرانی تہذیب جو آج بھی زندہ ہے۔ جہاں بڑے بڑے ماہرینِ فن پروان چڑھے، جہاں عجائباتِ عالم تخلیق ہوئے، جس نے اقوامِ عالم کو ایجادات سے نوازا اور آج بھی وہ خود میں منفرد ملک ہے۔

ملکِ چین کے ماضی کا ذکر، مختصر مگر جامع

ماضی کبھی نہیں مرتا۔ وہ مٹتے مٹتے بھی فکر و فن اور علم و ہنر کا خزانہ حال کے حوالے کر جاتا ہے اور حال مستقبل کا پہلا قدم ہے۔ وہ اجداد کے اس اثاثے کی چھان پھٹک کرتا ہے، جو اشیا مفید و کارآمد ثابت ہوتی ہیں، ان کو کام میں لاتا ہے، جو اقدار اور روایتیں صحت مند ہوتی ہیں انہیں قبول کر لیتا ہے البتہ فرسودہ روایات و اقدار کو رد کر دیتا ہے اور جب زندگی کا کارواں اگلی منزل کی طرف کوچ کرتا ہے تو اس کے سامانوں میں نئے تجربات اور تخلیقات کے علاوہ

بہت سی پرانی چیزیں بھی ہوتی ہیں۔ قافلۂ حیات کا یہ سفر ہزاروں سالوں سے جاری ہے... یہی کچھ چین کی تہذیب کے ساتھ بھی ہوا ہے۔

تاریخِ عالم میں چین کی تہذیب کو بہت اہمیت حاصل ہے کیونکہ چین ایشیا کا ایک عظیم ملک ہے۔ آج کا چین اٹھارہ صوبوں پر مشتمل ہے۔ اس کا رقبہ پندرہ لاکھ مربع میل ہے۔ چین کبیر میں اندرون منگولیا، تبت، مانچوریا اور فارموسا شامل ہیں اور چالیس لاکھ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ اسے مندرجہ ذیل قدرتی خطوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

☆شمالی چین...... اس کی سطح مرتفع پر زرد رنگ کی زرخیز مٹی کی تہ بچھی ہوئی ہے۔ اس میں شمالی چین اور شان تنگ کا سلسلۂ کوہ واقع ہے اور ہورنگ ہو (زرد دریا) اس کا سب سے بڑا دریا ہے۔

☆مرکزی چین...... شمالی ینگ سی، سطح مرتفع اور ینگ کے نشیبی میدان پر مشتمل ہے۔ اسے دریائے ینگ سی کیا نگ سیراب کرتا ہے۔

☆جنوبی چین...... اس میں جنوبی ینگ سی سطح مرتفع اور دریائے سی کیا نگ کا طاس واقع ہے۔

☆چین کا بیشتر حصہ سطح مرتفع ہے۔ اگرچہ اس میں بڑے بڑے دریاؤں کے میدان بھی ہیں۔ پہاڑ مغرب سے مشرق کو پھیلے ہوئے ہیں۔ مرکز میں 'کون لون' کا سلسلۂ کوہ ہے۔ سب سے بڑا کوہستان سن لنگ کا ہے جو ساحلِ سمندر تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ یہ پہاڑ جو بعض مقامات پر دس ہزار فٹ تک بلند ہیں' چین کو دو واضح حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ جو آب و ہوا، سطح زمین، زرعی پیداوار اور باشندوں کے طرزِ بود و باش کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ شمالی چین کے مغربی حصے میں زرد مٹی کی تہ سطح مرتفع اور میدانوں پر یکساں پھیلتی چلی گئی ہے۔ زرد مٹی کو ہوائیں اُڑا کر لاتی ہیں۔ انتہائے مشرق میں شان تنگ کا علاقہ ہے۔ جس میں تائی شان کا مقدس پہاڑ واقع ہے۔ جنوبی چین کا بیشتر حصہ پہاڑیوں اور وادیوں پر مشتمل ہے۔ جنوب مغرب کی سطح مرتفع تبت کی رفعتوں تک بلند ہوتی چلی گئی ہے۔

چین میں کئی بڑے بڑے دریا بہتے ہیں جن پر معاش کا دارومدار ہے۔ ان میں سے تین بڑے دریا مغرب کے پہاڑوں سے نکلتے ہیں اور مشرق کی طرف بہتے ہوئے سمندر میں جا گرتے ہیں۔ شمالی چین میں ہوانگ ہو بہتا ہے، اس کا علاقہ بڑا زرخیز ہے۔ ینگ سی جو ملک کے درمیانی حصے میں بہتا ہے' یہ ایشیا کا سب سے بڑا دریا ہے اور سرخ میدان کو سیراب کرتا ہے۔ یہ علاقہ چین کا سب سے زیادہ گنجان آباد ہے۔ جنوبی حصے میں بہنے والا دریا سی کیا نگ ہے جس کا علاقہ نہایت زرخیز اور وسیع ہے۔ انہی دریاؤں کے کنارے پر اور میدانوں میں چین کی اکثریتی آبادی ہے۔

اہلِ چین کہتے ہیں کہ ان کی قوم میں پانچ مختلف نسلوں کا اختلاط ہوا ہے چنانچہ 1911ء کے انقلاب کے بعد چینی پھریرے میں پانچ دھاریاں تھیں۔ سرخ چینیوں کے لیے، زرد مانچوؤں کے لیے، نیلی مغلوں کے لیے، سفید ترکوں کے لیے اور سیاہ تبتیوں کے لیے۔ چین کے اکثر باشندے منگولوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ زرد رنگت، رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں، سیدھے سیاہ بال اور ترچھی آنکھیں چین کے تمدن میں سات ہزار برسوں کا تسلسل ہے اور اس کا شمار دنیا کے قدیم ترین تمدنوں میں ہوتا ہے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کے خیال میں یہ تمدن 3500 (ق،م) سے بھی پہلے کا ہے پیکن کی نیم انسانی کھوپڑی سے معلوم ہوتا ہے کہ چین میں تاریخی زمانے سے صدیوں پہلے انسان آباد تھا۔

اہلِ چین کو قدیم زمانے سے تاریخ نگاری سے گہرا شغف رہا ہے اور ان کے سرکاری مورخین احتیاط اور صحت سے اپنے حکمرانوں کے اصول قلم بند کرتے رہے ہیں۔ اس بات کے دستاویزی ثبوت ملتے ہیں کہ چین میں کم و بیش دو ہزار برس قبل مسیح میں ایک ترقی پذیر تمدن پنپ رہا تھا جس کی تشکیل وارتقا میں کئی صدیاں لگی ہوں گی۔ بہرحال جب چین صفحہ تاریخ پر نمودار ہوا تو اسے ہم کانسی کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ اس زمانے میں ملک پر یسیا اور شانگ خانوادوں کی حکومت تھی۔ یہ زمانہ 2205ء تا 1123ء (ق،م) کا ہے۔ تحریر کی ایجاد ہو چکی تھی۔ گندم اور چاول کی کاشت ہوتی تھی۔ سن اور ریشم سے کپڑے بنانے اور سینے کے ہنر موجود تھے۔ کتا، مرغی، سور، بھیڑ اور گھوڑا پالے جاتے تھے۔ دیوتاؤں پر انسانوں اور جانوروں کی سوختنی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ جنگی قیدیوں کو مندروں کی قربان گاہوں میں ذبح کرتے تھے۔ جنگی ہتھیار کلہاڑا، تلوار، برچھا اور خود کانسی کے بنتے تھے۔ میدان جنگ میں جنگی رتھوں کا استعمال ہوتا تھا۔ سنگ یشب اور کوڑی کو مقدس مانتے تھے۔

"چو خاندان" کے عہد (1122 تا 255ء ق،م) کو لوہے کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ پانچویں صدی قبل از مسیح میں

وہ لوہے کی تلواریں بنانے لگے تھے جنہیں ابتدا میں جادو کے ہتھیار کہا جاتا تھا۔ تاریخ عالم میں سب سے پہلے اہلِ چین نے معدنی کوئلے کو دہکا کر لوہے کو ڈھالنے کا ہنر ایجاد کیا۔ اس دور کا نظامِ سلطنت جاگیردارانہ تھا۔ ملک مختلف بڑی بڑی جاگیروں میں منقسم تھا جس پر سردار حکومت کرتے تھے اور بوقت ضرورت اپنی اپنی فوج لے کر شہنشاہ کے جھنڈے تلے جمع ہو جاتے تھے۔ جنگی غلاموں کو قتل کرنے کے بجائے ان سے گھروں اور کھیتوں میں کام لینے کا رواج تھا۔ تسین خاندان نے 255ء (ق،م) میں چو خانوادے کا خاتمہ کردیا اور شاہ شی ہوانگ تی نے سارے چین کو متحد کیا اس لیے بجا طور پر اسے چین کا سب سے پہلا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ شی ہوانگ تی حوصلہ مند اور بیدار مغز تھا۔ اس نے عظیم چین کے تصور کی بنیاد رکھی اور تاتاریوں اور مغلوں کے حملوں سے بچاؤ کے لیے شہرۂ آفاق دیوار چین تعمیر کروائی۔ اس کی موت کے بعد تسین خاندان پر زوال آگیا اور ہین خاندان نے تخت و تاج پر قبضہ کرلیا۔ ہین سلاطین زبردست منتظم اور فاتح تھے۔ انہوں نے ملک کی سرحدوں کو وسیع کیا اور نظم و نسق کو از سرِنو محکم کیا جس سے ملک میں ہر طرف خوشحالی کا دور دورہ ہو گیا اور چین کی سرحدیں ترکستان سے مل گئیں۔ چھٹی صدی (ق،م) میں شہنشاہیت نقطہ عروج پر پہنچ گئی۔ تانگ بادشاہوں نے مزید فتوحات کیں اور چین کی سرحدیں آج کل کے چین کبیر کی سرحدیں بن گئیں۔ تانگ کے بعد پانچ مختلف خاندان حکومت کرتے رہے۔

1276ء میں چنگیزی مغلوں نے تاخت و تاراج کا آغاز کیا اور شاہ چین کو شکست دے کر ملک پر قبضہ کرلیا۔ چنگیز خان کا پوتا قبلائی خان پہلا مغل شہنشاہ تھا۔ 1367ء منگ خاندان کے ایک شہزادے نے مغلوں کے تسلط کا خاتمہ کردیا اور ملک کی باگ ڈور دوبارہ چینیوں نے سنبھال لی۔ 1643ء میں چنگ یا مانچو کے بیرونی خاندان کا تسلط ہو گیا جو 1911ء کے جمہوری انقلاب تک حکمران رہا۔ 1949ء میں چیئرمین ماؤزے تنگ کی سرکردگی میں اشتراکی انقلاب برپا ہوا اور ملک بھر میں اشتراکی معاشرہ قائم کردیا گیا۔ نظریاتی لحاظ سے شہنشاہ کو آسمانی حقوقِ حاصل تھے وہ زمین پر آسمان کا نمائندہ تھا اور اپنے آپ کو (سی ان سی) فرزند آسمان کہتا تھا۔ رعایا اس کے سامنے سربسجود ہونا مذہبی فریضہ سمجھتی تھی۔ اس سجدے کو 'کوتو' کہتے تھے۔ بادشاہ فراعین مصر کی طرح ملک کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا بھی تھا۔ اس کے احکامات قطعی اور ناقابلِ تسخیر تھے لیکن اس کی مطلق العنانی کو صدیوں کی رسوم و روایات نے بڑی حد تک محدود کردیا تھا چنانچہ بعض حالات میں بادشاہ کو معزول بھی کردیا جاتا تھا۔ ایک چینی مورخ لکھتا ہے۔

"سلطنت بادشاہ کے پاس آسمان کی طرف سے بطور امانت ہے۔ بادشاہ صحیح طریقے سے حکومت نہ کرے تو عوام کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کے خلاف بغاوت کردیں۔"

انیسویں صدی میں انگریز چین میں افیم لائے اور چینیوں کو بزور شمشیر اسے کھانے پر مجبور کیا۔ 1838ء میں افیم کی درآمد پر پابندی لگائی گئی تو انگریزوں نے چین کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ اسے افیون کی پہلی جنگ کہتے ہیں۔ اس کشمکش میں چین میں جمہوریت کو تقویت پہنچی۔ جب جمہوری تحریک زور پکڑ گئی تو شہنشاہ چین نے تخت و تاج سے دست برداری کا اعلان کردیا۔

آرتھر کہتا ہے کہ "تانگ خاندان کے دورِ حکومت میں چین بلاشبہ دنیا کا عظیم ترین اور متمدن ملک تھا۔ اہلِ مغرب نے اٹھارہویں صدی میں چین کی تاریخ و تمدن میں دلچسپی لینا شروع کی جب فرانس میں تحریک خرد افروزی برپا ہوئی۔ فرانس کا مشہور مفکر ویدرو لکھتا ہے۔

"چین کے باشندے عقلیت اور درس و حکمت میں تمام ایشیائیوں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ بعض اہلِ قلم کے خیال میں ان پہلوؤں سے وہ یورپ کی مہذب اقوام پر بھی برتری رکھتے ہیں۔ والٹیئر نے بھی شہنشاہیت چین کے نظم و نسق کو تمام اقدارِ عالم میں بہترین قرار دیا ہے۔ شاہی رنگ زرد تھا اور اژدھا شہنشاہیت کی علامت تھا۔ شہنشاہ اژدھے کی شکل کے تخت پر بیٹھتا تھا اور زرد رنگ کا ریشمی لباس پہنتا تھا۔ سلطنت کا انتظام وزراء اور اہل کاروں کے ہاتھوں میں تھا جنہیں مقابلے کے امتحانوں سے منتخب کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ عہدوں پر وہی لوگ فائز ہوتے تھے جن کی دیانت داری اور قابلیت مسلم ہوتی تھی۔ رشوت خوری اور بددیانتی کی سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ بددیانتی ثابت ہو جانے پر مجرم کو بال بچوں سمیت موت کی سزا دی جاتی تھی اور املاک ضبط کرلی جاتی تھیں۔ فرض شناسی کا یہ عالم تھا کہ پرچہ نویس شہنشاہ کی ذاتی خامیوں اور لغزشوں کا ذکر بھی بلا کم و کاست کردیا کرتے تھے جس کے لیے بعض اوقات انہیں مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑتا تھا۔ محتسب بے باک تھے اور اہل

WWW.PAKSOCIETY.COM

کاروں کے بارے میں براہِ راست شہنشاہ کو پرچے بھیجتے تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ عوام کی کیا مشکلات ہیں اور پوچھتے تھے کہ انہیں دور کرنے کا کوئی سامان کیا گیا ہے یا نہیں۔

چین کا قدیم ابتدائی مذہب آباپرستی پر مبنی تھا۔ 1900ء (ق م) تک کے آبا کی قبریں اور شجرے دستیاب ہوئے ہیں جنہیں لوگ سینت سینت کر رکھتے تھے۔ بعد میں تین بڑے بڑے مذاہب صورت پذیر ہوئے۔

(1) تاؤمت...... تاؤ کا صحیح تلفظ داؤ ہے جس کا بانی لاؤتسے تھا۔

(2) کنفیوشس...... کنفیوشس کا مسلک جسے مذہب کے بجائے دستورِ عمل کا نام دینا زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ وہ خاندان، احباب اور حکومت کی طرف صحیح طرزِ عمل کی تلقین کرتا تھا۔

(3) بدھ مت...... جو ہندوستان سے آیا۔ یہ مہاتما بدھ کا فرقہ تھا جس میں ہندومت کے عقائد و توہمات، تناسخِ ارواح وغیرہ نفوذ کر گئے تھے بعد میں چین کے کئی علاقوں میں اسلام کی بھی اشاعت ہوئی۔ چین کے مذہب کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے کہ چینی حشر و نشر یا حیات بعدالموت کے کسی زمانے میں بھی قائل نہیں رہے، نہ ان کے مذہب کا کوئی نظامِ عبادت تھا۔ وہ دنیوی زندگی سے حظ اندوز ہونے ہی کو اپنا مقصدِ حیات سمجھتے تھے۔ ان کے لیے یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ انسان موت کے بعد کی زندگی کی خاطر اس زندگی کی مسرتوں سے دست کش ہو جائے۔ مروجہ مذاہب میں حیات بعدالموت کا تصور مذہب کا اہم جز سمجھا جاتا ہے۔ ہندومت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں روح کی بقا اور حیات بعدالموت کا عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن چین میں اسے کبھی درخورِ توجہ نہیں سمجھا گیا۔ اس لیے تاؤمت اور کنفیوشس کے مسلک کو مذہب کے بجائے دستورِ حیات یا دستورِ عمل کہنا زیادہ قرینِ صحت ہوگا۔ مروجہ مذاہب کے برعکس اہلِ چین اخلاق کو جزوِ مذہب نہیں سمجھتے وہ اس بات پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں کہ کسی خدا یا دیوتا کے حکم کے بغیر کیوں انسان ایک دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک روا نہیں رکھ سکتا۔ ان کے خیال میں انسان کو دوسروں کی بھلائی اس لیے کرنی چاہیے کہ دوسرے بھی انہی جیسے انسان ہیں نہ کہ اس لیے کہ اس کا معاوضہ اگلی دنیا میں بہشت کی صورت میں ملے گا۔ اس طرح وہ اخلاق کو مذہب سے الگ مستقل بالذات طریقۂ عمل سمجھتے ہیں۔ یہ باتیں لاؤتسے اور کنفیوشس کے بارے میں کہی جاسکتی ہیں۔ بدھ مت کی اشاعت کے بعد ان مذاہب میں بھی اصلاحی مذہب کا رنگ پیدا ہو گیا۔

بدھ مت کی اشاعت کے بعد بتوں کی پوجا بھی ہونے لگی لیکن چینی ان کے ساتھ اندھی عقیدت نہیں رکھتے تھے مثلاً قحط پڑنے پر وہ بتوں کے گلوں میں رسیاں ڈال کر انہیں کوچہ و بازار میں گھسیٹتے پھرتے تھے کہ فلاں وقت پر بارش کیوں نہیں برسائی، انہیں گالیاں دیتے اور کوڑے پر پھینک دیتے۔

تاؤمت کی اشاعت سے پہلے دوسری اقوام کی طرح اہلِ چین کی بھی دیومالا تھی۔ تکوین و تخلیق کی چینی کہانی یہ تھی کہ ابتدا میں ہر کہیں انتشار اور فساد تھا۔ جس سے دو قوتیں نمودار ہوئیں۔ یانگ اور ین جو مل کر محیطِ کل بناتی ہیں۔ یانگ آسمان، روشنی، گرمی، حرکت اور تذکیر کا اصول ہے جبکہ ین ارض، تاریکی، سکون، خنکی کا اور تانیث کا اصول ہے۔ ان کے ربط کو ایک دائرے کی صورت میں دکھاتے تھے۔ جس میں سفیدی اور سیاہی باہم پیوستہ ہیں اور جس کی شکل تھی O۔ اس علامتی دائرے کو چین قدیم میں وہی مقام حاصل تھا جو بودھوں کے چکر، آریاؤں کے سواستک اور عیسائیوں کی صلیب کو حاصل تھا بعد میں یہ علامت فنِ تزئین و آرائش کا نشان بن گئی۔ بہرحال عرصہ دراز کے بعد یانگ اور ین سے ایک انسان نے جنم لیا جس کا نام پان کو تھا۔ وہ کرۂ ارض بنا اس نے سورج، چاند، ستاروں کو بنایا۔ وہ بڑھتا گیا اور بدلتا گیا حتیٰ کہ اس کا سر پہاڑوں کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کا سانس بادل بنا، اس کی آواز رعد بنی، اس کی نسیں دریا بن گئیں، اس کی جلد اور بال جنگل بنے، اس کے دانت اور ہڈیاں وہ معدنیات بنیں جو زیرِ زمین دفن ہیں۔ اس کا پسینا بارش بنا اور جو کیڑے اس کے جسم پر رینگتے تھے وہ انسان بن گئے۔ تخلیق کے اس کام میں ایک اژدھا، ایک عنقا اور ایک کچھوے نے مدد کی۔

چنانچہ اژدھا شہنشاہیت کی علامت بن گیا۔ 1911ء کے انقلاب سے پہلے چینی پھریرے پر زرد زمین اور سیاہ اژدھے کی شبیہ ہوتی تھی۔ چینیوں کا خداوند خدا شانگ تی تھا جو آسمان کا خدا تھا اور چینی الٰہیات کا شخصی خدا تھا۔ تاؤ کو وہ سریانی (جاری و ساری) قوت کی صورت میں مانتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ تاؤ ہر شے میں سمایا ہوا ہے اور اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ تاؤ تنہا ہے، غیر متغیر ہے، نہ اسے

دیکھا جاسکتا ہے نہ اس کی آواز کو سنا جاسکتا ہے۔ تاؤ نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے لیکن وہ خود کوئی چیز نہیں ہے۔ تاؤ غیر محدود ہے، نظامِ سماوی اور نوعِ انسانی کا اخلاقی عمل ایک ہی نوع کے افعال ہیں۔ تاؤ کا لغوی معنی شاہراہ یا آسمانی راستہ ہے۔

لاؤتسے (پیدائش 570ء ق م) نے اس تصور پر اپنے مسلک کی بنیاد رکھی۔ اس نے کہا کہ تفکر و تدبّر بے سود ہے اور فائدے سے زیادہ نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ تاؤ اس وقت ملتا ہے جب غور و فکر کو خیرباد کہہ کر بوریا نشینی کی زندگی گزاری جائے۔ علم سے خرد و دانش نہیں آتی، دانش امن و سکون اور عافیت سے زندگی گزارنے کا نام ہے۔ اس پہلو سے تاؤ عرفان و تصوف کا مسلک ہے۔

کنفیوشس کو چین کا سب سے بڑا مفکر مانا جاتا تھا۔ اس نے مغرب کے فلاسفر کی طرح کوئی ایسا نظامِ فلسفہ مرتب نہیں کیا جس میں الٰہیات، منطق، سیاسیات، اخلاقیات اور جمالیات کو ایک مرکزی خیال کے تحت مربوط کیا ہو۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں اپنے شاگردوں کی ایسی تربیت کی کہ وہ معقول اور مربوط طریقے سے معاشرے کے مسائل پر سوچ سکیں اور اظہارِ خیال کرسکیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ذہنی پراگندگی کو دور کرکے لوگوں میں زندگی کے مسائل کا صحیح شعور پیدا کیا جائے۔

چینی رسمِ تحریر کی ایجاد کم و بیش 1500ء (ق م) عمل میں آئی یہ وہ واحد رسمِ تحریر ہے جو حروفِ تہجی پر مشتمل نہیں۔ چینی زبان کے الفاظ اپنے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے کئی طرح کی علامت، خیال یا فنی و علمی تصور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس میں کسی ایک خیال یا ایک تصور کو ایک ہی لفظ میں پیش نہیں کیا جاسکتا اس لیے چینی زبان سیکھنے کے لیے عموماً تین ہزار علامتیں جاننے کی ضرورت ہے۔

چین میں ٹائپ، چھاپے اور کاغذ کی ایجادات نے علوم و معارف کی اشاعت کو بڑا فروغ دیا۔ مشرقی چین میں بلاک کی چھپائی کا آغاز دسویں صدی اوائل میں ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے بلاک سے کاغذ کے نوٹ چھاپے گئے۔ چھاپے کی ایجاد تحریروں پر مہریں ثبت کرنے سے ہوئی چنانچہ چینی زبان میں چھاپے اور مہر کے لیے ایک ہی لفظ ہے۔ بلاک کی چھپائی سے سونگ عہد کی احیاالعلوم کی تحریک کو بڑی تقویت بہم پہنچی اور ہر موضوع پر بے شمار کتابیں چھپنے لگیں۔

اس طرح اطالیہ سے دو سو برس بیشتر چین میں نشاۃ

فرد فقیر

1704-1790ء

ممتاز صوفی بزرگ اور شاعر۔ گجرات میں پیدا ہوئے۔ عربی، فارسی، فقہ، حدیث اور تصوف کی تعلیم حاصل کی اور ان موضوعات پر مہارت تامہ حاصل کیا۔ روحانی مدارج طے کرنے کے ساتھ ساتھ شاعری میں دلچسپی لیتے رہے، ان کی شاعری میں صوفیانہ خیالات کا اظہار چھوٹی ذاتوں کے افراد اور ان کے کسب ناموں کے حوالے سے کیا ہے گویا انہوں نے اپنی شاعری میں اس دور کے مختلف معاشرتی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ سیف الملوک میں میاں محمد بخش نے انتہائی شاندار الفاظ میں انہیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ خواجہ فرد فقیر کے نزدیک بھی لوگ اللہ کی مخلوق ہیں۔ بحیثیت انسان اللہ تعالیٰ نے ایک سا پیدا کیا ہے۔ آخرت میں مال و زر پر نہیں اعمال پر فیصلہ ہوگا۔ ان کی تصانیف میں شامل کتب: روشن دل، کسب نامہ بافندگان، کسب نامہ حجاماں، باراں ماہ اور سی حرفی، کلام میں عربی اور فارسی بہت زیادہ ملتے ہیں۔

فرڈیننڈ کیتھولک

(Ferdinand the Catholic)

ہسپانیہ کا ایک فرمانروا، جس کے عہد میں (1492) کولمبس نے امریکا دریافت کیا۔ فرڈینٹڈ نے 1469ء میں اشبیلیہ کی حکمران ملکہ ایزابیلا سے شادی کی جس کے باعث اشبیلیہ، اراگون، سسلی اور نیپلز کے علاقے اس کے زیرِ تسلط آگئے۔ ان دونوں حکمرانوں کا مشترکہ دورِ حکومت ہسپانیہ کی تاریخ کا سنہری دور ہے۔ 1492ء میں کولمبس نے ہسپانوی اخراجات پر دریافت امریکا کے لیے بحری سفر انجام دیا۔ اسی سال فرڈی ننڈ نے یہودیوں کو ہسپانیہ سے نکال دیا اور مسلمانوں کی عظمت کے چراغ کو گل کر دیا۔ 1500ء تا 1501ء میں فرڈی ننڈ نے تسخیرِ نیپلز میں فرانس کا ساتھ دیا۔ اس کے تین سال بعد وہ نیپلز پر اپنا واحد تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ 1512ء میں اس نے نوارے (Navarre) کو فتح کرکے تمام ہسپانیہ پر غلبہ پالیا۔ اس میں ایک نقص بھی تھا کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر اخلاقی قدروں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔

مرسلہ: ہمایوں اشرف، لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

الثانیہ کی تحریک جنم لے چکی تھی۔ مذہبی، علمی اور ادبی کتب کے ساتھ ساتھ لغات اور قاموس کی ضخیم کتابوں کی اشاعت بھی وسیع پیمانے پر ہونے لگی۔ چھاپا چینیوں کی ایسی عظیم ایجاد ہے جسے افادیت کے لحاظ سے تحریر کی ایجاد سے دوسرے درجے پر رکھا جاسکتا ہے۔ دنیا کی قدیم ترین مطبوعہ کتاب ہیرا سوتر ہے جو ایک بودھ سوامی وانگ جی نے 11 مئی 868ء کو چھاپی تھی۔ چین کے متعلق بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ اہلِ علم کا ملک ہے۔

کاغذ کی ایجاد بھی تاریخ میں بڑی اہم ہے۔ چین کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ یہاں قدیم زمانے سے کاغذ کا رواج ہوگیا تھا۔ ابتدا میں توت کی چھال سے کاغذ بنایا جاتا تھا۔ جب ہندوستان سے بودھ... سوامی کپاس لائے تو روئی سے کاغذ بنانے لگے۔ لفظ کاغذ، چین کے لفظ کوکوذ کی بدلی ہوئی صورت ہے۔ روئی سے کاغذ بنانے کا طریقہ ترکستان والوں نے چینی قیدیوں سے سیکھا تھا اور تب سمرقند میں کاغذ بنانے کے کارخانے قائم ہوئے۔ 704ء میں سمرقند کی تسخیر کے ساتھ مسلمانوں کو روئی سے کاغذ بنانے کا راز ہاتھ آیا اور انہوں نے دمشق، حلب اور بغداد میں کاغذ سازی کے کارخانے قائم کیے۔ اطالیہ والوں نے ہر فن صقلیہ کے مسلمانوں سے سیکھا اور شدہ شدہ تمام یورپ میں اس کا رواج ہوگیا۔ یہاں یہ بات بھی بتادی جائے کہ پاپرس کے باشندوں نے لکھنے کے لیے جو "پیپر" بنایا تھا جو چینی کاغذوں کے مقابلے میں بہت بھدا اور موٹا تھا جسے گتّے کی ایک شکل کہی جاسکتی ہے۔

اہلِ چین فنونِ لطیفہ اور لطیف جذبات و احساسات سے عاری نہیں تھے چنانچہ اہلِ چین قدیم زمانے سے شاعری کے دلدادہ تھے۔ بعض شاعر صبح سویرے بیس بیس نظمیں کہہ لیتے اور انہیں رنگ برنگے کاغذوں پر لکھ کر ایک بانس پر لٹکا دیتے پھر بازار میں بیچتے پھرتے تھے۔ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح چینی شاعری بھی فطرت پرستی کی لطیف مثالیں پیش کرتی ہے۔

☆☆☆

چینی ادبیات میں چو یوآن (343 تا 290ء ق، م) کا شمار عظیم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔ اس کی شاعری ہجر و فراق اور مسرت و حرماں کے پُرسوز جذبات کی نہایت موثر اور اعلیٰ ترجمانی کرتی ہے۔ لی پو کو سب سے بڑا رومانی شاعر کہا جاتا تھا۔ ایک چینی نقاد نے اس کے بارے میں لکھا تھا۔

"وہ کوہ تائی کی بلند چوٹی ہے جس کے سامنے سب پہاڑ اور پہاڑیاں حقیر ہیں۔ وہ سورج ہے جس کے سامنے لاکھوں تارے ماند پڑجاتے ہیں۔ لی پو کا انجام بھی رومانی تھا۔ ایک رات وہ کشتی میں بیٹھا دریا کی سیر کر رہا تھا۔ خوب پی رکھی تھی۔ سطحِ آب پر چاندنی کی چادر جھلملا رہی تھی اور اس کا عکس نیلگوں پانی میں لرز رہا تھا۔ لی پو نے جھک کر چاند کے عکس کو چھونا چاہا۔ اس کا پاؤں رپٹا اور وہ چاند کی تلاش میں اندھیروں میں گم ہوگیا۔

چینیوں کو تعمیر سازی میں بھی بڑی مہارت اور دلچسپی تھی۔ چینی اپنی عمارتوں کو اونچے چبوتروں پر تعمیر کرتے تھے۔ عمارت کہگل کی بنائی جاتی تھی۔ (کہگل پلستر کرنے کی بھوس ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں) اگرچہ سامنے کے حصے میں تراشے ہوئے پتھروں سے چنائی کرنے کا رواج تھا۔ مکانوں میں لکڑی کی خوب صورت منقش جالیاں دیواروں کا کام دیتی تھیں۔ دالان ستونوں پر تعمیر کرتے تھے جنہیں شنگرفی سرخ رنگ کیا جاتا تھا یا ان پر شوخ رنگوں سے نقش، نگار بناتے تھے۔ چھتوں کو بھی رنگ دیا جاتا تھا۔ شاہی محلوں کی چھتوں اور دیواروں پر زرد رنگ کرتے تھے جو چین کا شاہی اور فوجی رنگ تھا۔

چینی فنِ تعمیر کا عظیم ترین کارنامہ دیوارِ چین ہے۔ جس کی تعمیر تیسری صدی قبل مسیح میں شہنشاہ شی ہوانگ ٹی نے شروع کی تھی۔ یہ دیوار کم و بیش ڈیڑھ ہزار میلوں تک میدانوں، پہاڑوں، جھیلوں اور وادیوں سے گزرتی چلی گئی ہے۔ جابجا برجوں میں فوجی چوکیاں قائم کردی گئی ہیں۔ اس سے شہنشاہ کا مقصد ملک کو شمال کے وحشی منگولوں کے حملوں سے بچانا تھا۔ والٹیئر نے دیوارِ چین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس عظیم الشان تعمیر کے سامنے فراعین مصر کے اہرام محض ملبے کا ڈھیر معلوم ہوتے ہیں۔ چینی لکڑی اور سنگ مرمر سے مجسمے تراشتے تھے۔ بدھ مت کی اشاعت کے ساتھ بت تراشی کا رواج عام ہوگیا تھا اور چینی سنگ تراش کانسی کے مجسمے بھی ڈھالنے لگے تھے۔ وہ شبیہ نگاری کی طرف کچھ زیادہ متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ دسویں صدی عیسوی کے بنائے ہوئے مجسمے فطرت نگاری کے خوب صورت نمونے ہیں۔ سونگ خاندان (9 0ء تا 1279ء ب م) کے خاتمے کے ساتھ مذہبی مجسمہ تراشی کو بھی زوال آگیا۔

چینی جس موقلم سے لکھتے اسی سے تصویریں بھی کھینچ

تھے۔ روشنائی کا لک، گوند اور تیل کی آمیزش سے بناتے تھے جو تحریر اور مصوری دونوں میں کام آتی تھی۔ بعد میں دوسرے رنگوں کا بھی رواج ہوگیا۔ چینی مصوروں نے کبھی محاکات نگاری (نقالی) سے اعتنا نہیں کیا وہ حقیقت کے بجائے حسن کے ترجمان تھے۔ انہیں شبیہ نگاری سے واجبی سی دلچسپی تھی وہ اکثر و بیشتر پھولوں، پرندوں اور کہساروں کی تصویریں بناتے تھے۔ ابن بطوطہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شبیہ نگاری میں یدِ طولیٰ تھے۔

قدیم زمانے سے چینیوں کے پیشِ نظر دو مقاصد رہے ہیں۔ دانش کا حصول اور حسن و جمال کی ترجمانی۔ جس طرح دانش کے حصول کے لیے وہ مابعد الطبیعات کو بے ثمر سمجھتے تھے اسی طرح وہ حسن و جمال کے نظریاتی پہلو پر توجہ کرتے تھے اور اس کے عملی اور افادی پہلو کو اہمیت دیتے رہے۔ ان کے ہاں شروع سے کاریگر اور فن کار میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اور وہ روزمرہ کی مصنوعات کو بھی حسین بنانے کے تمنائی تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے اردگرد کی ساری چیزیں خوبصورت ہوں۔ ان کے اس ذوقِ جمال کا ثبوت ان کے برتنوں، پردوں اور جالیوں میں ملتا ہے جن پر بے مثال گل کاری کی گئی ہے۔ سونگ خاندان کے عہد حکومت میں اہلِ چین اپنے گھروں اور معبدوں کو خوبصورت چیزوں سے آراستہ کرتے تھے۔ دھات کے کام، یشب تراشی، کانسی، لکڑی اور ہاتھی دانت کے کام میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ یشب تراشی چین کا خاص فن ہے۔ وہ یشب ایسے پتھر کو کہتے ہیں جو شبنم کی طرح نرم ہوتا ہے۔

ریشم سازی اور ریشم بافی خالصتاً چینی صنعت تھی۔ چین ریشم کو "سی" کہتے ہیں۔ ریشم کے کیڑوں کو شہتوت کے درختوں پر پال کر ان سے ریشم حاصل کیا جاتا تھا۔ 552ء میں چند راہبوں نے ریشم بافی کا طریقہ سیکھ لیا اور اسے مغرب میں رائج کیا۔ انگلستان میں اس کا رواج پندرہویں صدی عیسوی میں ہوا تھا۔ چین کے منقش پارچات دور دراز کے ملکوں کو برآمد کیے جاتے تھے۔ ایک تجارتی راستہ منگولیا، ترکستان، ایران اور ایشیائے کوچک سے گزرتا تھا جسے شاہراہ ریشم کہتے تھے اور جس پر قبضہ کرنے کے لیے صدیوں تک رومیوں اور ایرانیوں میں لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دوسرا راستہ بقول رشید الدین فضل اللہ کابل، پنجاب، دلی اور تبت سے گزرتا تھا۔ پروفیسر پرتھ کہتے ہیں کہ شام کے بازاروں میں چین کا ریشم سونے کے ساتھ تل کر بکتا تھا۔ روم میں چینی ریشم

ڈاکٹر فقیر محمد فقیر

1900-1974ء

نامور پنجابی شاعر، نقاد اور محقق۔ وہ گوجرانوالہ میں میاں لال دین کے ہاں پیدا ہوئے۔ دادا میاں امام دین حکیم تھے جو پوچھل وتی (سری نگر کشمیر) سے ہجرت کرکے گوجرانوالہ میں آباد ہوئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد والد میاں لال دین بھی حکمت کرتے رہے۔ اس اعتبار سے انہیں حکمت ورثے میں ملی۔ 1915ء میں میڈیکل کالج لاہور کی لیبارٹری میں کام سیکھا۔ ابتدا میں وہیں ملازمت اختیار کرلی پھر گوجرانوالہ جاکر اپنا شفاخانہ کھولا۔ 1914ء میں ہی وہ منشی محمد ابراہیم عاول کے شاگرد ہوگئے تھے اور مشاعروں میں نظمیں اور رباعیاں پڑھنے لگے تھے۔ شاعری کے علاوہ ٹھیکیداری اور ایڈیٹری بھی کی۔ پنجابی ادبی اکیڈمی کی بے شمار کتب پر نظرثانی کی۔ 1951ء میں مولانا عبدالمجید سالک کی شراکت سے لاہور سے پنجابی کا ایک ادبی رسالہ بھی جاری کیا۔ متعدد کتب لکھیں جن میں مہکدے پھل، ٹھدائے فقیر، ہیر، سنگی، چنگیاڑے، مواتے اور رباعیاتِ فقیر مشہور ہیں۔ کلام میں صوفیانہ رنگ ملتا ہے۔

مرسلہ: انتظار حسین، گوجرانوالہ

نہایت گراں قیمت تھا اور صرف سلاطین اور امراء ہی کو میسر آسکتا تھا۔ چین کے ریشم باف پارچوں میں نہایت حسین فطری مناظر، رنگ برنگ کے پھول اور پودے، پرندے اور پہاڑ کاڑھتے تھے۔ انہوں نے پارچہ بافی کو مصوری کا ہم پلہ بنادیا تھا۔ چینی "کم خا" جو ایران میں آکر کمخواب بن گیا، مخمل زربفت بیش قیمت سمجھے جاتے تھے۔ چین کی حسین ترین مناعت جسے ارباب نظر تمدنِ نوعِ انسانی کا گراں قدر سرمایہ قرار دیتے ہیں اور اپنی نفاست، نزاکت کے باعث چینی مصوری بھی اپنی مثال آپ بنی ہے۔ اس کی ایک شاخ سفال سازی ہے۔ جس میں چین کا کوئی حریف نہیں۔ چین میں چاک کا استعمال آج سے چار ہزار برس پہلے شروع ہوچکا تھا۔ روغنی برتن ہین خاندان کے عہد میں (206ء...... 220ء ق م) میں بننے لگے تھے۔ اس کے ساتھ ہی پورسلین کی ایجاد عمل میں آئی۔ پورسلین کا نام اہلِ مغرب کا دیا ہوا ہے۔ جو پورسے لانا (کوڑی) سے مشتق

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ چین کی اصل پورسلین کی پہچان یہ ہے کہ اسے چاقو سے کاٹا جاسکتا ہے اور وہ چور چور نہیں ہوتی۔ سفال سازی کا بیان ابن فقیہہ کی کتاب میں ملتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عربوں کو نویں صدی عیسوی میں اس صنعت کا علم ہو چکا تھا۔ مزید تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ عرب تاجر چین کے برتن خلفائے بنو عباس کے لیے بغداد لایا کرتے تھے۔ چینی سفالین کے ٹکڑے جو عہد تانگ کے بنے ہوئے ہیں حال میں ہی کھدائی میں نکلے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں عربوں سے سفال سازی کا فن وینس والوں نے 1470ء میں سیکھا۔

چینی سفال سازی کو محض ایک فنِ ظروف سازی ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے فنِ لطیف بھی خیال کرتے تھے۔ سفال سازی میں انہوں نے جمالیات اور افادیت کا حسین امتزاج پیش کیا ہے۔ چائے نوشی ان کے لیے روحانی تسکین کا ذریعہ بن گئی تھی جس کے لیے انہوں نے چینی مٹی کے نازک اور نفیس برتن تخلیق کیے۔ منگ خاندان کے سفال ساز تین صدیوں تک محنت کرتے رہے کہ اس فن کو سونگ عہد میں جن بلندیوں پر پہنچادیا گیا تھا انہیں برقرار رکھا جاسکے۔ مسلسل تجربات سے زرد رنگ، ہلکے نیلے رنگ اور سفید براق رنگ تکمیل کو پہنچ گئے۔ سفید اور نیلے رنگوں کا ایک پیالہ جس کا نام شہنشاہ وان لی کے نام پر رکھا گیا تھا سفال سازی کا ایک عظیم شاہ کار ہے۔ سونگ سفالین کے ہاتھی دانت کی طرح سفید برتنوں کو "فنگ پاؤ" کہتے تھے۔ چینی کے برتنوں میں رنگ برنگے پھولوں، بیل بوٹوں، پہاڑی مناظر، اژدہے، عقاب، چنڈول وغیرہ کے نہایت دلفریب نقوش بنائے جاتے تھے۔ سفال سازی کے ساتھ انہوں نے سنگِ یشب کی تراش (نرم پتھر) کو بھی فنِ لطیف بنادیا۔ کسی قوم نے یشب کو اتنی حسین صورتوں میں نہیں تراشا ہوگا۔

چین نے عملی سائنس میں عظیم ایجادات کیں جن میں سے بعض انقلاب آور ثابت ہوئیں۔ جن میں ٹائپ، بلاک کی چھپائی اور کاغذ کے علاوہ بارود اور قطب نما بھی شامل ہے۔ اہلِ مغرب ان ایجادات سے عربوں کے ذریعے روشناس ہوئے تھے۔ ابتدا میں چینی بارود کو آتش بازی کے لیے استعمال کرتے تھے۔ لیکن بعد میں جنگ میں بھی استعمال کرنے لگے۔ بارود تانگ عہد کی ایجاد ہے۔ سونگ خاندان کے دورِ حکومت میں اسے جنگی ہتھیار بنادیا گیا۔ چینی میدانِ جنگ میں جلتی ہوئی ہوائیاں دشمن کی صفوں میں پھینکتے تھے۔ چنگیز خان نے چین فتح کیا تو اپنے ساتھ ایسے قیدی بھی لے گیا جو اس فن کے ماہر تھے۔ ان کی مدد سے اس نے "توپ خانہ" بنایا جس کے افسر کو تاتاری پاؤپو کہتے تھے۔ یہ لوگ منجنیقوں سے اُڑتی ہوئی آگ پھینکتے تھے۔ عربوں نے بارود سازی کا ہنر چینیوں سے ہی سیکھا۔ مغرب میں اس کا رواج روجر بیکن کے زمانے میں ہوا جس نے عربی کتابوں سے بارود سازی کی ترکیب سیکھی تھی۔ صلیبی جنگوں میں عربوں نے آتش بازی سے کچھ اس طرح سے کام لیا کہ وہ پہلے دشمن کے قلعے پر منجنیق سے روغن نفت پھینکتے اور پھر آتشی ہوائیوں سے اس میں آگ لگا دیتے تھے۔ ہندوستان میں ظہیر الدین بابر توپ خانہ لایا۔

قطب نما چینیوں کی دوسری انقلاب آور ایجاد ہے مگر انہوں نے اس سے بحری سفروں میں کام نہیں لیا۔ عرب جہازرانوں نے یہ کام لیا۔ عربوں کے توسط سے اہلِ مغرب اس ایجاد سے روشناس ہوئے۔

اقتصادی نقطۂ نظر سے چینیوں کی ایک اہم ایجاد کاغذ کے کرنسی نوٹ تھے جنہیں ابن بطوطہ نے درہم الکاغذ کا نام دیا تھا وہ کہتا ہے کہ ملکِ چین میں سکوں کے بجائے انہی درہم کا رواج تھا۔ جب کبھی کوئی درہم پھٹ جاتا تو اسے سرکاری خزانے سے بدلوا لیتے تھے۔ اہلِ مغرب نے کاغذ کے کرنسی نوٹ اہلِ چین سے اخذ کیے۔

تفریح کے میدانوں میں چینیوں کی دو ایجادات معروف ہوئیں۔ فٹ بال اور تاش، تاش کے پتوں پر آج بھی چینی نقوش دکھائی دیتے ہیں۔ اہلِ مغرب نے یہ کھیل چینیوں سے ہی لیے تھے۔

چینی معاشرہ مساوات کے اصول پر مبنی تھا۔ کسی شخص کو اس کے پیشے کے باعث حقارت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ حکومت کے عہدوں کے انتخاب کے لیے مقابلے کے امتحان لیے جاتے تھے جن میں ہر شخص شریک ہوسکتا تھا۔ ذات پات کی تمیز کا کوئی وجود نہ تھا۔ اس کے باوجود طبقاتی تفریق موجود تھی۔ اہلِ علم کا درجہ بہت بلند تھا۔ چین کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اہلِ علم کا ملک ہے جہاں صدیوں سے اہلِ علم حکومت کرتے رہے ہیں۔ عالموں کے بعد کسانوں کا درجہ تھا۔ ان کے بعد کاریگروں کا طبقہ تھا۔ سب سے ادنیٰ مقام تاجروں کا تھا۔ کیونکہ چینیوں کے خیال میں یہ لوگ دوسروں کی محنت سے بنائی ہوئی اشیا سے محض تبادلہ کرکے دولت کماتے ہیں۔ دوسری قدیم اقوام کی طرح ان کا نظام

معاشرہ بھی جاگیردارانہ تھا۔ شہنشاہ مالیہ اور دوسرے محصولات جنس کی صورت میں وصول کرتا تھا۔ غلامی اور بردہ فروشی کا رواج عام تھا۔ منتخب حسین کنیزیں بادشاہ اور امراء کے شبستانوں میں داخل کی جاتی تھیں، ان کی نگرانی پر خواجہ سرا مامور تھے۔ شہنشاہ کے کارندے نوعمر پری چہرہ لڑکیوں کو اطراف کے ملکوں سے خرید لاتے تھے۔ محل میں عمر رسیدہ، تجربہ کار عورتیں مزید انتخاب کرتی تھیں۔ وہ انہیں دن رات زیرِ مشاہدہ رکھتیں... کہ کوئی لڑکی سوتے میں خراٹے تو نہیں لیتی یا اس کے بدن پر کوئی داغ تو نہیں۔ پھر ان کے بدن کو عطر میں بسا کر باری باری شہنشاہ کے شبستانِ شوق میں بھیجا جاتا تھا۔ شہنشاہ کی موت پر اس کی محبوب کنیزیں بھی اس کے ساتھ مقبرے میں زندہ دفن کردی جاتی تھیں۔

بالائی طبقے میں کثرتِ ازدواج کا رواج تھا۔ بیویوں اور کنیزوں کی تعداد پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ ایک فلسفی ینگ منگ نے ایک دفعہ کثرت ازدواج کی حمایت میں کہا تھا۔ تم نے چائے دانی دیکھی ہوگی جس کے گرد کئی پیالیاں ہوتی ہیں۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے ایک پیالی کے گرد چار چائے دانیاں رکھی ہوئی ہوں۔ دوسری قدیم اقوام کی طرح چین میں بھی آغازِ تمدن سے کسبیاں موجود تھیں جو ناچ گانے سے عیش و عشرت کی محفلوں کو گرم کرتی تھیں۔ چین کی سیاسیات، ادبیات، موسیقی، تمثیل اور قصوں میں ان کسبیوں کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

چینی تمدن میں فنِ تعمیر کو بھی بڑا اہم سمجھا جاتا ہے۔ چینی دیہات میں کہگل کے مکان تعمیر کرتے تھے جن کی دیواریں بانس کی بنائی جاتی تھیں۔ کھڑکیوں میں شیشے کے بجائے رنگین منقش کاغذ لگاتے تھے۔ درمیان میں کھلا صحن ہوتا تھا جس کے گرد کمرے تعمیر کیے جاتے تھے۔ ایک ہی مکان میں سارے کا سارا کنبہ دادا دادی، بیٹے پوتے مل کر رہتے تھے۔ نہر کے گھاٹ کو عورتوں کے مل بیٹھنے اور خوش گپیاں کرنے کا مقام سمجھا جاتا تھا۔ مرد بہنگیوں سے بالٹیاں لٹکا کر کھیتوں کو پانی دیتے تھے۔ برتن مٹی کے استعمال ہوتے تھے۔ چاول کھپچیوں سے کھاتے تھے۔ گوشت کمیاب تھا۔ سبزیاں تیل میں ابالی جاتی تھیں اور مٹھاس خاص خاص تقریبات پر ہی استعمال کی جاتی تھی۔ قصبات میں متوسط طبقے کے مکان میں دیوان خانہ ہوتا تھا جہاں مہمان آکر بیٹھتے تھے۔ دیواروں پر لکڑی کی تختیاں آویزاں کی جاتی تھیں جن پر گھر کے آباؤ اجداد کے نام لکھے جاتے تھے۔ دیہاتی

فرہنگِ آصفیہ

اردو کی مشہور لغت۔ اسے منشی سید احمد دہلوی نے 1908ء میں مرتب کیا۔ یہ چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ عربی و فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی زبان کے ساٹھ ہزار سے زائد الفاظ مع محاورات، ضرب الامثال، تلمیحات اور علمی و فنی اصطلاحات کے ساتھ ساتھ معروف شاعروں اور نثر نگاروں کے نمونوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ بھارت کے علاوہ پاکستان میں اسے متعدد اشاعتی اداروں نے خوبصورت کتابت اور جلد کے ساتھ شائع کیا ہے۔

فرہنگِ آنندراج

فارسی لغت۔ اسے محمد پادشاہ شاد نے 1888ء میں مرتب کرکے والیٔ وجیانگر مہاراجا آنند راج سے منسوب کیا۔ مرتب نے متعدد لغات کے استفادے کے بعد اسے مرتب کیا۔ 1956ء میں محمد دبیر ساقی نے تصحیح کے ساتھ تہران (ایران) سے شائع کیا۔

فرہنگِ جہانگیری

اسے مشہور ہندوستانی ادیب میر جمال الدین حسین بن فخر الدین حسن انجوی شیرازی ملقب بہ عضد الدولہ نے بہ عہد مغل شہنشاہ اکبر اعظم و نور الدین جہانگیر 1596ء تا 1608ء مکمل کیا۔ اس کا شمار جامع ترین فرہنگوں میں سے ہوتا ہے۔ مرتب نے دیباچے میں لکھا ہے کہ ترتیب کے وقت 44 لغت نامے اس کے مدنظر رہے۔ حروف تہجی کی ترتیب سے 24 ابواب ہیں۔ خاتمہ کتاب میں ایک فصل اصطلاحات و کنایات اور لغات مرکبہ کی دی گئی ہے اور بعض جگہ بعینہٖ اسی کے کلمات و عبارات کو نقل کردیا ہے۔

فرہنگِ حیئیم

فارسی انگریزی لغت اسے سلیمان حیئیم نے 1933ء میں مرتب کیا اور یہ تہران (ایران) سے طبع ہوئی۔ یہ پچاس ہزار سے زائد الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس میں فارسی میں مستعمل مغربی الفاظ و نیز فارسی اور ان کے انگریزی مترادفات کی شمولیت کے علاوہ ہر کلمے کا قواعدِ زبان کے لحاظ سے تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔

مرسلہ: نوروز خان، شیخوپورہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

عورتیں کھیتی باڑی میں مردوں کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ اس سے فارغ ہو کے سینے پرونے اور پکانے کا کام کرتی تھیں۔ مرد کھلے ازار پہنتے تھے جن پر لمبے بھورے یا نیلے رنگ کے چغے پہنے جاتے تھے۔ خاص خاص مواقع پر ان چغوں پر چھوٹی سی صدری بھی پہن لیتے تھے۔ جاڑے میں کپڑوں میں روئی بھر کر سی لیتے تھے۔ عورتیں چغے کے بجائے چھوٹی صدری پہنتی تھیں جن کا رنگ نیلا یا سیاہ ہوتا تھا۔ سر پر رومال لپیٹ لیتی تھیں۔ شہری عورتیں اپنے لباس پر کشیدہ کاری سے خوبصورت بیل بوٹے بناتی تھیں۔ گرمی میں مرد دھوپ سے بچنے کے لیے تنکوں کی ٹوپیاں استعمال کرتے تھے۔ عوام کھردرے کپڑے یا تنکوں کے بنائے ہوئے جوتے پہنتے تھے۔ چمڑے کے جوتے صرف امراء پہنتے تھے۔ بچے کی پیدائش کے دن ہی اس کی عمر ایک برس فرض کرلی جاتی تھی۔ نوروز بعد اس کی عمر میں ایک سال کا اضافہ کرلیتے تھے۔ مثلاً جولڑکا نوروز سے دس دن پہلے پیدا ہوا وہ نوروز آنے پر دو برس کا ہوجاتا تھا۔ بچہ ایک ماہ کا ہوتا تو اس کا جشن مناتے تھے اور اسے دودھ کا نام دیا جاتا تھا۔ مدرسے میں داخلے پر کتابی نام رکھتے تھے' بیٹوں کے بڑے چوچلے کرتے تھے۔ لڑکیاں اپنے بھائیوں کی خدمت پر کمربستہ رہتی تھیں۔ بچوں کو بچپن ہی سے بڑوں کا ادب کرنا سکھایا جاتا تھا۔ شہروں میں والدین لڑکوں کو کاریگروں کی شاگردی میں دے دیتے تھے۔ دیہات میں لوہار، ترکھان، موچی وغیرہ سال بھر کی خدمت کا معاوضہ اناج کی صورت میں وصول کرتے تھے۔ جیسے ہمارے دیہات میں سیپ کا رواج ہے۔

چینیوں کا سب سے اہم تہوار نوروز تھا۔ اپنی تقریب پر شکر سے بنے کھلونے تقسیم کرتے تھے، رنگین قندیلیں روشن کی جاتی تھیں۔ تہوار کی آمد سے کئی روز قبل ہی اس کی تیاریاں شروع ہوجاتی تھیں۔ سب جوش وخروش سے حصہ لیتے تھے۔ نوروز کی دعوتوں میں خاندان بھر کا اجتماع ہوتا تھا۔ مکانوں کو رنگ برنگ کی کاغذی جھنڈیوں اور پھریروں سے سجایا جاتا تھا۔ ان ایام میں محتاجوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

بچوں کا خاص تہوار پتنگ بازی تھا۔ نویں چاند کے نویں دن بچے اور جوان پہاڑوں پر جاکر پتنگ اڑاتے تھے۔ یہ پتنگ رنگین کاغذوں کے بنائے جاتے تھے۔ ان میں سیٹیاں لگاتے تھے جو ہوا میں جاکر بڑی سریلی آوازیں بکھیرتی تھیں۔ عام طور سے پتنگ اژدہے یا تتلی کی شکل کے بنائے جاتے تھے۔ شادی بیاہ پر آتش بازی کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ مالی اور کسان آن کی آن میں باغ لگادیتے جن میں پھولوں اور درختوں کو بڑی خوبصورتی سے دکھایا جاتا تھا۔ چینی تقویم قمری تھے۔ سال کے بارہ مہینوں کے نام جانوروں کے ناموں پر رکھتے تھے۔ مثلاً سال موش، سال گرگ وغیرہ۔

چاول شروع سے چینیوں کا من بھاتا کھاجا رہا ہے۔ وہ مچھلی اور گھونگا بھی شوق سے کھاتے ہیں۔ دریاؤں کے کناروں پر رہنے والے بے شمار لوگ مچھلیاں پکڑ کر گزر اوقات کرتے ہیں۔ ماہی گیری بڑا منفعت بخش پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ چین کی کوئی دعوت چاول اور مچھلی کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ چائے پر تو وہ جان چھڑکتے تھے۔ انہوں نے چائے نوشی کو ایک مقدس فریضہ بنالیا تھا۔ چائے چین کے تحائف میں سے ہے۔ جو اس نے دوسری اقوام کو دیئے ہیں۔ چینی زبان میں چائے اس پانی کو کہتے ہیں جو کھولا کر زعفرانی رنگ نکالتا ہے۔ چائے پتیوں کو کہتے ہیں عربوں میں یہ لفظ شائی کا عرق بنا۔ ترک، فارسی اور پرتگالی میں چائے کا لفظ موجود ہے۔ یہ لفظ انگریزی میں (Tea) اور فرانسیسی میں تے بن گیا۔ سلیمان سیرافی پہلا عرب تھا جس نے ''ساخ'' کا پتا چلایا' اپنی تاریخ میں اس نے ساخ لکھا جو بعد میں شائی بن گیا' اہلِ مغرب چائے کے رواج سے پہلے ناشتے میں بیئر پیتے تھے۔ پہلا یورپین جس نے چائے بنانا سیکھا ایک ایرانی تاجر حاجی محمد کا شاگرد جس نے اسے چائے کشید کرنے کا طریقہ بتلایا۔ یہ 1545ء کی بات ہے۔ اس کے بعد مغرب میں چائے نوشی کا رواج عام ہوگیا۔

اس میں شک نہیں کہ قدیم چینیوں نے تمدنِ عالم میں بیش بہا اضافے کیے۔ ٹائپ، بلاک کی چھپائی، بارود، قطب نما، روئی کا کاغذ، کرنسی نوٹ، مقابلے کے امتحان، بٹ بس، کباب، چائے، تاش، یشب تراشی، سفال سازی، چاک سے برتن واشیا تیار کرنا' مصوری کے شاہکار اس عظیم اور درخشاں تمدن کے یادگار ہیں۔ برٹرنڈرسل نے کہا ہے۔ ''آرٹ میں چینیوں کا نصب العین حسن وجمال ہے اور زندگی میں معقولیت پسندی۔'' چینی تمدن کا ذکر کرتے ہوئے ہرڈیال نے لکھا ہے۔ ''یہ عظیم خیال چینی تہذیب کی بیش قیمت میراث ہے کہ عقل وخرد کے ساتھ ساتھ اعلیٰ کردار کی تشکیل کی جائے اور دونوں کو ریاست کی خدمت کے لیے وقف کردیا جائے۔''

ہاتھی والے

عائشہ جونیجو

قصص القرآن میں کئی ایسے دلچسپ قصے ہیں جنہیں پڑھ کر ایک عجیب سی سرشاری طاری ہوجاتی ہے۔ خداوند قدوس کے جبروت سے آگہی ملتی ہے۔ یہ قصہ بھی ایک ایسا قصہ ہے جو ایمان میں تازگی بھردیتا ہے۔

وہ جب کعبہ کو ڈھانے آئے تو خدا نے کیسا انتظام کر دکھایا

عرب مورخین کہتے ہیں کہ یمن کے فاتح کا نام ارباط تھا اور ابرہہ اس کے ہم رکاب تھا۔ چند سال کے بعد ابرہہ نے اس سے بغاوت کردی اور اس کو مار ڈالا اور بلاشرکت غیرے یمن پر قابض ہوگیا۔

اسی ابرہہ کو ابرہۃ الاشرم بھی کہتے تھے کیونکہ یہ نکٹا تھا۔ عربی میں اشرم نکٹے کو کہتے ہیں۔ اس کی حکومت کا آغاز بعض کے نزدیک ۵۲۵ء اور بعض کے نزدیک ۵۴۳ء سے ہوتا ہے۔ ابرہہ عیسائیت میں نہایت متعصب تھا۔ اس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تخت نشیں ہوتے ہی تعمیرات کے ماہرین کو دارالحکومت صنعا میں طلب کیا۔ انہیں اپنے محل میں لے گیا اور انہیں سونے اور جواہرات کے بڑے ڈھیر کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔

''میں نے ایک عدیم النظیر گرجا کی تعمیر کا خواب دیکھا ہے۔ ایسی عمارت جس کی نظیر دنیا میں نہ ملتی ہو کیونکہ میری تمنا ہے کہ عرب جو مکہ میں کعبہ کا حج کرنے کے لیے جمع ہوتے ہیں ان سب کا رخ کلیسا کی جانب موڑ دوں۔ کعبہ کا بازار سرد ہو جائے اور سب اس کلیسا کا رخ کریں۔ کل عرب کے لیے یہی مقام حج بن جائے۔ اگر تم نے میرے لیے ایسی عمارت بنا دی تو میں دولت کے اس ڈھیر سے تمہیں مالا مال کر دوں گا۔'' کاریگروں نے بے پناہ دولت اور ابرہہ کا بے اندازہ شوق دیکھا تو سب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ابرہہ کے شوق تعمیر کی شہرت ہوئی تو مزدور، نقشہ گر، نقاش سب صنعا میں آ آ کر جمع ہونے لگے۔

ابرہہ نے یمن کی بے اندازہ دولت، بیش بہا زر و جواہر بے دریغ خرچ کیے اور نہایت خوب صورت عمارت بن کر تیار ہو گئی۔ یہ بیش قیمت پتھروں کی بہت خوب صورت اور بہت طویل و عریض عمارت تھی اور نادر زرکار نقوش سے منقش اور جواہر ریزوں سے مزین تھی، ہاتھی دانت اور آبنوس کے نہایت حسین و جمیل منقش تیروں اور سونے چاندی کی صلیب سے اس کو سجایا گیا تھا۔

ابرہہ مذہباً عیسائی تھا۔ اس لیے وہ بیت اللہ کعبہ کی عظمت کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے دل میں یہ حقیقت کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی تھی کہ تمام اہل عرب اور ان کے تمام قبائل بیت اللہ کی عظمت کے قائل ہیں اور اپنے عقیدے کے مطابق اس کا حج کرنا مقدس خیال کرتے ہیں۔ حج کے دنوں میں اپنے تمام اختلافات بھلا کر بیت اللہ کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ کعبہ کے اندر عرب کے مختلف قبائل کے بت تین سو ساٹھ کی تعداد میں نصب ہیں اور آپس میں دشمنیوں کے باوجود کوئی کسی کے بتوں کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ ایک مرکز ہے جس کے گرد اہل عرب جمع ہیں۔ اس نے سوچا کہ کعبہ کے مقابلے میں کلیسا جواہرات سے مزین ہو تو اہل عرب یا ان میں سے بعض قبائل یمن کا رخ کریں گے اور اس طرح عربوں کی مرکزیت کے نشان کی عظمت ختم ہو کر رہ جائے گی۔

اس کے یہ عزائم جب عام ہونے لگے تو یمن میں مقیم حجازیوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ حضرت ابراہیمؑ کی نشانی کو خاک میں ملانے کی کوشش کی جائے یہ وہ برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ غم و غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

صنعا میں مقیم ایک حجازی غیرت مذہبی سے بے قرار ہو رہا تھا۔ وہ جب بھی اس گرجا کے سامنے سے گزرتا تو دانت پیس کر رہ جاتا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح اس عمارت کو زمیں بوس کر دے۔ پتھروں کو نوچ دے، اس میں لگے قیمتی جواہرات فقیروں میں تقسیم کر دے۔ وہ گھنٹوں اس عمارت کو کھڑا دیکھتا رہتا اور پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ جاتا۔ ایک دن وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ عمارت کے صدر دروازے کے قریب کھڑے ہو کر اس نے عظمت کعبہ کے حق میں تقریر شروع کر دی۔ اس دوران اس نے عیسائیت کے خلاف کئی سخت سست جملے بھی کہہ دیے۔ انجام یہ ہوا کہ یمن کے عیسائیوں نے اسے پکڑ لیا اور خوب زدوکوب کیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ معاملہ یہیں رفع دفع ہو گیا اور اسے بادشاہ کے پاس نہیں لے جایا گیا۔

اب اس نے جان بوجھ کر اس راستے سے گزرنا چھوڑ دیا تھا۔ جہاں وہ عمارت واقع تھی لیکن اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ سوچا کرتا تھا کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے سے خطرہ ٹل نہیں جاتا۔ یہ عمارت جب تک کھڑی ہے یہ خطرہ موجود ہے کہ عرب کعبۃ اللہ کی سادہ عمارت کو چھوڑ کر اس کا طواف شروع نہ کر دیں۔ اس کے خیالات کیسے بھی سہی لیکن وہ اتنی طاقت نہیں... رکھتا تھا کہ اس عمارت کو گرا دے۔ اس نے اپنا غصہ اس طرح اتارا کہ ایک شب وہ کسی نہ کسی طرح گرجا کے اندر پہنچ گیا اور موقع پا کر اس کلیسا کو نجس کر دیا۔ اس کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے اپنی دانست میں یہ ثابت کر دیا کہ کعبۃ اللہ کے سامنے اس کی یہ حیثیت ہے کہ اسے نجس کیا جائے۔

دن نکلا تو صنعا شہر میں ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر شخص کی زبان پر یہی اطلاع تھی کہ کوئی شخص رات کے وقت آیا اور کلیسا کو نجس کر گیا۔ اطلاع ابرہہ تک بھی پہنچی۔ اس نے چھان بین کی تو شہر کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ کچھ دن پہلے ایک حجازی نے کلیسا کے سامنے کھڑے ہو کر ہنگامہ کھڑا کیا تھا۔ اسے لوگوں نے زدوکوب کیا تھا۔ یہ حرکت اسی حجازی کی ہوگی۔ لوگوں سے مزید چھان بین کی تو ایک شخص ایسا بھی نکل آیا جو اس حجازی کو جانتا تھا۔ ابرہہ کے آدمی اسے ڈھونڈتے ہوئے اس کے گھر تک پہنچ گئے لیکن جان کے خوف سے وہ کہیں چھپ گیا تھا یا صنعا چھوڑ کر کہیں چلا گیا

تھا۔ ابرہہ کے آدمیوں نے اس کے گھر کو آگ لگا دی۔

اس کا گھر جل گیا لیکن ابرہہ کا غصہ نہیں جلا۔ اس کا بھی پچھتاوا کیا کم تھا کہ اس نے ایسی بیش قیمت عمارت بنوا دی اور مکہ سے ایک آدمی بھی کعبہ چھوڑ یہاں نہیں آیا۔ اہل عرب ابھی تک کعبۃ اللہ کی معمولی سی عمارت کو خدا کا مسکن سمجھ رہے ہیں اوپر سے یہ واقعہ سامنے آ گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ اب کعبہ ابراہیمی کو برباد کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔

یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کعبہ کی حرمت اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ حملہ کرنے کا ارادہ پہلے ہی کر چکا تھا اب اسے ایک حیلہ ہاتھ آ گیا۔ اس نے ساٹھ ہزار کا لشکر جرار فراہم کیا جس میں بے شمار ہاتھی بھی تھے اور کعبۃ اللہ ڈھانے کے لیے مکہ کی جانب روانہ ہوا۔

یہ خبر تمام قبائل عرب میں ہوا پر سوار ہو کر پہنچ گئی اور خطہ عرب میں اس سے ہیجان پیدا ہو گیا۔ ابرہہ کی طاقت اتنی تھی کہ کسی میں بھی اس سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی لیکن غیرت مذہبی سب کو مقابلے پر ابھار رہی تھی۔ یمن کے ایک امیر ذونفر نے یمن سے نکل کر عرب کے مختلف قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ میں ابرہہ کا مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ میرا ساتھ دیں۔ کئی قبائل اس کی مدد کو آ گئے لیکن ابرہہ اور ان قبائل کا کیا مقابلہ تھا۔ اس نے جنگ ضرور کی لیکن شکست کھائی اور ذونفر گرفتار کر لیا گیا۔ ابرہہ اور آگے بڑھا' ایک اور قبیلے نے اس کا راستہ روکا لیکن وہ بھی ناکام ہوا۔

ابرہہ کا لشکر جرار کسی طوفان کی طرح آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ راستے میں آنے والے ہر قبیلے کو بہاتا ہوا راستے سے ہٹاتا ہوا جب ابرہہ طائف پہنچا تو بنی ثقیف کے سردار نے آگے بڑھ کر ابرہہ کو یقین دلایا کہ مجھے اور میرے قبیلے کو آپ سے کوئی پرخاش نہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ ''بیت اللہ'' کے انہدام کے لیے نہیں جا رہے ہیں۔ وہاں ہمارا معبود ''لات'' نصب ہے۔ ابرہہ نے غلط بیانی سے کام لیا۔ اس قبیلے کو اطمینان دلایا کہ وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اس پر سردار بنی ثقیف نے ایک شخص ابو غال کو رہنما بنا کر اس کے ساتھ کر دیا کہ یہ شخص آپ کے لشکر کو راستہ بتائے گا اور بہ آسانی مکہ تک پہنچا دے گا مگر یہ شخص راستے ہی میں مر گیا۔ کہتے ہیں عرب زمانۂ جاہلیت میں اس کی قبر کو سنگسار کیا کرتے تھے کہ یہ ابرہہ کا رہنما بنا تھا۔

ابرہہ ایک وادی ''وادی محسر'' میں تھا کہ اس نے ایک حبشی فوجی افسر کو روانہ کیا کہ وہ مکہ جا کر چھاپا مارے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ مکہ کے لوگوں کو خوفزدہ کرنا چاہتا تھا یا پھر اپنے لشکر کے لیے غذا کا طالب ہوگا۔ یہ حبشی افسر مکہ کے قریب پہنچا تھا کہ اسے جانوروں کے ریوڑ نظر آئے۔ ان میں اونٹ تھے اور بھیڑ بکریاں بھی۔

یہ جانور قریش اور دیگر قبائل کے تھے جنہیں چرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس حبشی فوجی نے اپنے فوجی دستے کو حکم دیا کہ یہ تمام جانور ہانکتے ہوئے لشکر کی طرف لے چلو۔ ان جانوروں میں دو سو اونٹ حضور علیہ السلام (آپ کی ابھی پیدائش نہیں ہوئی تھی) کے دادا عبدالمطلب بن ہاشم کے بھی تھے۔

جب جانوروں کے ریوڑ کوئی ہنکا کر لے گیا تو یہ جاننے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ چور کون ہے۔ ابرہہ کے لشکر کی خبریں پہنچتی رہی تھیں۔ اب یہ معلوم ہوا کہ وہ مکہ کے قریب پہنچ چکا ہے اور اس نے جانوروں کے ریوڑ پر چھاپا مار کر اعلان جنگ کر بھی دیا ہے۔

تمام قبائل سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اب کیا ہو۔ دلاوروں نے بڑے بڑے دعوے شروع کر دیے۔ ان معرکوں کو یاد دلانے لگے جن میں وہ فتح یاب ہوئے تھے۔ نسب نامے دہرائے جانے لگے پھر رفتہ رفتہ بات یہاں پہنچی کہ ابرہہ بہت بڑے لشکر کے ساتھ آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہاتھی بھی ہیں جن کو ہمارے ہتھیاروں سے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتی۔ اگر ہم ابرہہ سے ٹکرائے تو بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ابرہہ کی جانب سے ایک شخص حناطہ الحمیری اجازت لے کر مجلس میں آیا اور دریافت کیا تم میں مکہ کا سردار کون ہے۔ لوگوں نے حضرت عبدالمطلب کی جانب اشارہ کر دیا۔

''میں ابرہہ کی جانب سے آیا ہوں۔ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ ہم آپ سے جنگ کرنے نہیں آئے ہیں۔ ہماری دشمنی تو صرف بیت اللہ سے ہے۔ اگر آپ اس کی مدافعت کے لیے ہمارے مقابلے پر آئیں گے تو پھر آپ سے جنگ ضروری ہوگی۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔''

''ہم بھی یہ نہیں چاہتے کہ ابرہہ سے جنگ کریں۔ یہ معاملات اگر بات چیت سے طے ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔''

''بات چیت کے لیے آپ کو ہمارے لشکر میں آنا ہوگا۔ ہمارا بادشاہ آپ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

عبدالمطلب دوسرے دن اس کے لشکر میں پہنچ گئے۔ ابرہہ اپنے سامنے ایک نہایت وجیہہ وشکیل انسان کو دیکھ رہا تھا۔ نہایت متاثر ہوا اور عزت سے پیش آیا۔ میزبانی اور مہمانی کے تقاضے ختم ہوئے تو گفتگو کا آغاز ہوا۔ اب ابرہہ ان کی خطابت اور طاقت لسانی کے مظاہرے دیکھ رہا تھا۔

"میں جس ارادے سے مکہ آیا ہوں چاہتا ہوں آپ اس میں مدافعت نہ کریں۔" ابرہہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"مدافعت کی مجھ میں طاقت بھی نہیں۔ یہ اللہ کا گھر ہے اور اس کے برگزیدہ نبی حضرت ابراہیمؑ کی یادگار۔ اگر اللہ اس کی حفاظت کرنا چاہے گا تو خود کرلے گا۔ ہماری مدافعت کرنے نہ کرنے سے کیا ہوگا۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میرے سپاہیوں کی تلواریں نیام سے باہر نہ آئیں تو اچھا ہے۔"

"آپ کے ایک سردار نے میرے اونٹ آپ کے لشکر میں لانے کی جسارت کی ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ وہ اونٹ میرے حوالے کردیں۔ مجھے اور کسی چیز سے سروکار نہیں۔" ابرہہ اس موقع پر اس تقاضے سے سخت متعجب ہوا۔

"میں کعبہ کو ڈھانے کے لیے آیا ہوں۔ تم نے اس کے متعلق تو مجھ سے درخواست تک نہیں کی۔ شاید میں اس ارادے سے باز آجاتا اور ایسی حقیر بات کا ذکر کررہے ہو۔ تم تو مکہ کے سردار ہو اور فکر تمہیں اپنے نقصان کی ہے۔ میں تو تمہارے بارے میں بہت اچھے گمان رکھتا تھا لیکن تم خودغرضی ظاہر کررہے ہو۔"

"میں نے بھی آپ کی بہت شہرت سنی تھی لیکن آپ اتنی سی بات نہیں سمجھتے۔ یہ اونٹ چونکہ میری ملکیت ہیں اس لیے میں نے ان کے متعلق آپ سے درخواست کی۔ کعبہ میرا گھر نہیں جس کا گھر ہے وہ خود حفاظت کرے گا۔ جس کا گھر آپ ڈھانے آئے ہیں وہ جانے اور آپ جانیں۔"

"آپ کے اونٹ آپ کو مل جائیں گے۔ میں کعبہ کے انہدام کے لیے اپنی فوجوں کو مکہ میں داخل کرنے والا ہوں۔" عبدالمطلب واپس آئے۔ قریش اور دوسرے قبائل کو جمع کیا اور ان کے سامنے وہ گفتگو رکھ دی جو ان کے اور ابرہہ کے درمیان ہوئی تھی۔

"اب دو ہی راستے ہیں یا تو ہم صف آرا ہوکر ابرہہ کے مقابلے پر آجائیں یا مکہ چھوڑ کر کسی پہاڑی پر پناہ گزیں ہوجائیں۔ مجھے یقین ہے اللہ اپنے گھر کی حفاظت ضرور کرے گا۔" تمام قبائل مکہ چھوڑنے سے قبل کعبۃ اللہ میں حاضر ہوئے اور درگاہِ عالی پر دعاگو ہوئے۔

"خدایا ہم اس بارے میں مطمئن ہیں کہ جب ہم اپنی متاع کی حفاظت کرسکتے ہیں تو تجھے اپنی متاع (کعبہ) کی بھی ضرور حفاظت کرنی ہے اور تیری تدبیر پر نہ صلیب کی طاقت غالب آسکتی ہے اور نہ اہلِ صلیب کی کوئی تدبیر۔ ہاں اگر تو ہی یہ چاہتا ہے کہ ان کو اپنے مقدس گھر کو خراب کرنے دے تو پھر ہم کون؟ جو تیرا جی چاہے سو کر۔"

یہ تمام قافلہ دلوں سے دعائیں مانگتا ہوا آنکھوں سے آنسو بہاتا ہوا مکہ سے نکلا اور قریبی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہوکر ابرہہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

☆☆☆

ابھی ولادت باسعادت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر مبارک سے دنیا کے کان ناآشنا ہیں۔ کائنات کا گوشہ گوشہ خداپرستی اور توحیدِ الٰہی کے نغموں سے محروم ہوچکا ہے۔ ہر جگہ شرک وکفر کا دور دورہ ہے۔ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے ہیں۔ کہیں اصنام پرستی ہے تو کہیں کواکب پرستی کا شور ہے۔

فیصلہ ہوچکا ہے کہ نورِ ہدایت آفتاب رسالت جلوہ گر ہو (اس واقعے کے چالیس یا پچاس روز بعد حضور پاکؐ دنیا میں تشریف لائے)

اس ہستی کے لیے ہی ضروری تھا کہ اسرائیل کے خاندان سے دعوتِ حق کی امانت واپس لے کر اسمٰعیلؑ کے خاندان کو نوازا جائے۔

ابرہہ نے اپنا لشکر مکہ کی جانب بڑھایا۔ اگلی قطاروں میں ہاتھی تھے اور ان کے پیچھے لشکرِ جرار۔ سیاہ آندھی تھی کہ مکہ کی جانب بڑھتی چلی آرہی تھی۔ مجلسِ حق میں فیصلہ ہوچکا تھا کہ بیت اللہ کی حفاظت کی جائے گی۔

ابرہہ کے ہاتھی نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔ فیل بان آنکس پر آنکس لگا رہا تھا مگر وہ آگے بڑھنے کو تیار نہیں تھا۔ جب اسے یمن کی جانب چلاتے تھے تو وہ تیزی سے چلنے لگتا تھا لیکن مکہ کی جانب چلنے کو تیار نہیں تھا۔

ابرہہ کی فوج میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ ابرہہ کے کچھ سردار بھاگتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ ان کے ہاتھیوں نے بھی آگے چلنے سے انکار کردیا تھا۔

"اے بادشاہ! کوئی طاقت ہے جو ہمیں آگے بڑھنے سے روک رہی ہے۔ ہمیں اس وقت یمن واپس چلنا چاہیے۔ حملہ تو کسی اور وقت بھی کیا جاسکتا ہے۔"

"بزدلوں جیسی باتیں مت کرو۔ اگر ہاتھیوں نے چلنے سے انکار کردیا ہے تو ہم پیدل ہی مکہ میں داخل ہوجائیں گے۔ اگر اس وقت واپس چلے گئے تو دنیا ہم پر ہنسے گی۔ مکہ والے سمجھیں گے کہ ہم ان سے ڈر کر بھاگ گئے ہیں۔"

"سوال تو یہی ہے کہ ہاتھیوں نے چلنے سے کیوں انکار کردیا ہے۔ کہیں خدا ہمارا مخالف تو نہیں۔"

"خدا ہمارا مخالف کیسے ہوسکتا ہے۔ ہم تثلیث کے پرستار ہیں۔ صلیب کے عاشق ہیں۔ عیسیٰ مسیح ہمارا نگہبان ہے۔ یہ تو کوئی جادو ہے جو ہمیں روک رہا ہے۔ میرے فیل بان کوشش کررہے ہیں۔ بہت جلد یہ ہاتھی مکہ میں داخل ہوجائیں گے۔" اب مقابلہ انسانوں کا انسانوں سے نہیں تھا۔ انسانی طاقت خدا کی طاقت سے ٹکرانا چاہتی تھی۔ نتیجہ ظاہر تھا خدا کی معجزانہ قدرت حرکت میں آگئی۔

ابھی ابرہہ اور اس کے سردار آپس میں مشورے کررہے تھے۔ ابرہہ کی نخوت بھری آواز ان میں سب سے بلند تھی۔ وہ اپنے سرداروں کو لعن طعن کررہا تھا کہ اچانک تیز ہوا چلنے لگی۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ صحرا کی ریت نے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا پھر اس ہوا نے اچانک نیچے کا رخ کیا تو ابرہہ کا لشکر آنکھیں ملنے لگا۔ ریت ان کی آنکھوں میں بھرنے لگی تھی۔ ابرہہ کے ہاتھی اپنے کانوں کو اپنی آنکھوں پر رکھے خاموش کھڑے تھے۔ ابرہہ یہی سمجھا کہ کوئی طوفان ہے جس میں اس کا لشکر گھر گیا ہے۔ اس کے لشکری چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ وہ اس طوفان سے نکلنے کی کوشش کرے۔ ابرہہ کا گھمنڈ اب بھی اسے اس کی اجازت نہیں دے رہا تھا کہ وہ یمن واپس چلا جائے۔

"یہ صحرائی طوفان ہے کچھ دیر میں خود ہی ٹل جائے گا۔ اپنی جگہ پر جمے رہو۔" شاید قدرت اسے موقع دے رہی تھی جس کا اس نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

اچانک یہ ہوا کہ سمندر کی جانب سے پرندوں کے غول اُڑتے ہوئے آئے اور لشکر پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک چھاگئے۔ یہ غول اتنا منظم تھا جیسے دشمن پر حملہ کرنے کے لیے فوجیں اپنی صفیں بناتی ہیں۔ ہر پرندے کے پاس تین کنکریاں تھیں۔ ایک منہ میں اور دو پنجوں میں۔

ان دنوں نہ ایٹم بم تھے نہ میزائل۔ بندوق کی گولیاں تک نہیں تھیں۔ قدرت نے یہ سب وسائل مہیا کردیے۔ ان پرندوں نے اپنے پنجوں اور منہ میں دبے ہوئے سنگریزے چھوڑ دیے۔ ان سنگریزوں میں ایسی غیبی طاقت تھی کہ جس شخص پر یہ معمولی کنکریاں گریں بدن پھوڑ کر باہر نکل آئیں۔ ہاتھیوں پر گریں تو ہاتھی وہیں ڈھیر ہوگئے۔ ان پرندوں کا نشانہ ایسا تھا کہ کوئی سنگریزہ بھی ادھر اُدھر نہیں گرا پھر۔ یہی نہیں بلکہ سنگریزے کچھ اس طرح زہر میں بجھے ہوئے تھے کہ لگتے ہی بدن گلنے سڑنے لگتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی پورا لشکر چھلنی ہوگیا۔

قرآن نے اس پُراسرار واقعے کی گواہی دی۔

"(اے محمدؐ) کیا آپ نے نہیں دیکھا (آپ کو معلوم نہیں) کہ آپ کے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ کیا ان کے فریب کو ناکارہ نہیں بنادیا اور بھیج دیے ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ۔ وہ پھینک رہے تھے ان پر سنگ ریزے۔ پس کردیا ان کو کھائے ہوئے بھوسے کی طرح۔" (سورہ الفیل)

جب تمام لشکر برباد ہوگیا تو اس میں سے بعض آدمی جو بدحالی کے ساتھ فرار ہوکر یمن پہنچے تھے ان میں ابرہہ بھی تھا۔ اس کے تمام اعضا گل سڑ کر گرچکے تھے اور وہ صرف ایک متعفن گوشت نظر آتا تھا۔

"اصحابِ فیل" کا یہ عجیب وغریب واقعہ ماہِ محرم میں ولادت باسعادت محمدؐ سے چالیس یا پچاس روز قبل پیش آیا۔ اہلِ عرب میں یہ واقعہ اس درجہ شہرت واہمیت رکھتا تھا کہ انہوں نے اس سال کا نام ہی "عام الفیل" یعنی ہاتھیوں والا سال رکھ دیا اور اس کے بعد تاریخی واقعات کو اسی سنہ کے حساب سے شمار کرنے لگے۔

روایاتِ عرب میں یہ واقعہ مشہور رہا۔ شعرا نے اسے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ سب سے پہلے تو عبدالمطلب کے وہی اشعار ہیں جو انہوں نے مکہ خالی کرتے ہوئے کہے تھے۔

"ہم اگرچہ عاجز ہونے کی وجہ سے شہر سے جارہے ہیں لیکن یہ کوئی غم کی بات نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے گھر کی حفاظت کرتا ہے۔ خدایا تو بھی اپنے گھر کی حفاظت کر۔ اگر تیرا یہی منشا ہے کہ وہ ہمارے کعبہ کے متعلق اپنا منشا پورا کرلیں تو پھر جو جی چاہے وہ حکم فرما۔"

ایک اور شاعر عبداللہ بن سہمی کے یہ اشعار ملتے ہیں۔

"حبشہ کے سردار سے معلوم کرو کہ اس نے کیا کچھ دیکھا۔ عنقریب ناواقفوں کو اس واقعے سے خبردار لوگ واقف کردیں گے۔ ساٹھ ہزار لشکریوں میں سے کسی کو وطن لوٹنا نصیب نہیں ہوا اور اگر کوئی اِکّادُکّا زخم خوردہ بھاگ نکلا تو وہ بھی خدا کی مار کے زخموں سے نہ بچ سکا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

عبداللہ بن قیس کے یہ اشعار کتب میں درج ہیں۔
''ابرہتہ الاشرم نے یہ تدبیر چلی کہ کعبہ کے گرانے کو ہاتھیوں کو لے آیا۔ پس وہ بھاگا اور اس کا لشکر بھی شکست خوردہ ہوگیا جبکہ پرندوں کے لشکر ان پر کنکریوں کی بارش کرتے ہوئے پرے کے پرے آپہنچے اور سارا لشکر سنگسار ہوکر رہ گیا۔''

ابوالقیس بن اسلت انصاری ابرہہ کے لشکر کی تباہی کے لیے خدائی مدد کا اس طرح ذکر کرتے ہیں۔

''پھر جب عرش والے کے پاس سے تمہارے لیے مدد آپہنچی تو ابرہہ اور اس کے لشکر کا خدائی لشکر (پرندوں) نے منہ پھیر دیا جبکہ وہ ٹھیکریاں اور کنکریاں برسا رہا تھا۔ پس سارا لشکر جلد ہی شکست کھا کر بھاگا اور ان میں سے چند معمولی ٹولیوں کے سوا کوئی بھی حبشہ تک نہ پہنچ سکا اور سب یہیں ہلاک وتباہ ہوکر رہ گئے۔''

تمام معاصر شعرا نے جب بھی اصحاب فیل کا تذکرہ کیا ہے پرندوں کے غول کا ذکر ضرور آیا ہے۔ اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمام معاصرین کی شہادت اس طرف ہے۔ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہ پُراسرار واقعہ دیکھا تھا انہوں نے اسے اسی طرح بیان کیا ہے۔

اس کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ جب نبی کریمؐ پر سورۃ الفیل کا نزول ہوا تو مشرکین، یہود و نصاریٰ تک میں سے کسی کی جانب سے اس کی تردید نہیں آئی۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ واقعہ غلط ہے یا اس کی اصل حقیقت یہ نہیں بلکہ دوسری ہے۔

اس واقعے کی پُراسراریت نے بہت سے ذہنوں کو شکوک وشبہات کے حوالے کردیا اور عقلی گھوڑے دوڑا کر اسے طرح طرح کے معنی پہنانے شروع کردیے۔ اس میں اپنے بھی شریک ہیں پرائے بھی جبکہ انہیں معاصر کی آرا دیکھنی چاہیے تھیں اور قرآن کے بیان کو سامنے رکھنا چاہیے تھا لیکن انہوں نے الفاظ کو نت نئے معنی پہنا کر معنی کچھ سے کچھ کردیے چنانچہ سرسید احمد خان اس مہم کی طرف اپنے اشہب قلم کو دوڑا رہے تھے کہ قرآن کے ہر واقعے کو عقل کے دائرے میں لایا جائے۔ ''طیر'' کے معنی ہی بدل دیے اور فرمایا ''طیر'' کے معنی پرند نہیں بلکہ بدفالی مراد ہے اور کنایتہً یہ لفظ مصیبت و بلا کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ پس مفہوم ہی بدل گیا اور یہ خیال کرلیا گیا کہ ان پر کوئی مصیبت اور بلا (کوئی بیماری وغیرہ) نازل ہوئی۔

یہی حال ایک اور صاحب کا بھی ہے انہوں نے تفسیر بالرائے کرتے ہوئے یہ لکھ دیا کہ اہل مکہ نے عاجز آکر پہاڑوں میں پناہ لی اور اوپر سے سنگباری کرکے ابرہہ کے لشکر کو تباہ کردیا۔

عرب کی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ انہوں نے کبھی سنگ باری کی جنگ کی ہو۔ وہ تو تلوار کے دھنی تھے۔ پتھروں سے جنگ کرنا ان کی عادت نہیں تھی۔ اگر فرض کرلیا جائے کہ خاص اس جنگ میں یہ طریقہ استعمال ہوا تو کوئی تاریخی ثبوت دینا ہوگا جو کہیں نہیں ملتا بلکہ یہ تواتر سے ملتا ہے کہ یہ جنگ سرے سے ہوئی ہی نہیں۔ مقابل کوئی تھا ہی نہیں اور اگر تھا تو جنگ کی نوبت آئی ہی نہیں۔

یہ دراصل الحاد وزندقہ سے مرعوب حضرات کی کارستانیاں ہیں یا پھر منفرد بننے کا شوق۔

حضور کی بعثت اور نزول قرآن کے وقت ایسے کئی لوگ زندہ تھے جنہوں نے اس واقعے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ان میں سے کوئی تو اختلاف کرتا یا کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ اور کہتا۔

صدیوں بعد آج یورپین مورخین یہ کہتے ہیں، واقعہ صرف اتنا ہے کہ ابرہہ رومیوں کی مدد کو فوج لے کر نکلا۔ راہ میں اس کی فوج چیچک کی وبا سے برباد ہوگئی۔

یہ مان بھی لیا جائے تو یہ کیسے ثابت ہوسکتا ہے کہ ابرہہ رومیوں کی مدد کو نکلا تھا کعبہ ڈھانے نہیں چلا تھا۔ تاریخ میں تو ایسا کوئی بیان نہیں ملتا۔ ظاہر ہے یہ اسے ایسی شکست سے بچانے کا ڈھنگ ہے جو اسے کسی انسان کے ہاتھوں نہیں ملی بلکہ اللہ کا عذاب تھا جو اس پر نازل ہوا۔

اگر یورپین پرندوں اور سنگریزوں کی حقیقت کو تسلیم کرلیتے ہیں تو اس سے کعبہ کی عظمت ظاہر ہوتی ہے یہ انہیں کیسے برداشت ہوسکتا ہے۔

اگر اس واقعے کا انکار کیا جائے تو حضرت ابراہیمؑ کا آگ سے زندہ نکل آنا کیا کہلائے گا اور حضرت موسیٰ کو دریائے نیل کے پانی کا راستہ دے دینا کس کھاتے میں لکھا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا چاہے تو آگ کو گلزار کردے۔ پرندوں کے غول سے ہاتھی والوں کو شکست سے دوچار کردے۔ اسرار کو پُراسرار کردے۔

ماخوذ: از قصص القرآن۔ ارض القرآن

فلمی الف لیلیٰ

قسط: 223

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پروازمیں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر وبلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اورمیل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں درداستاں سرگزشت

ریاض شاہد خداداد تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنی قلمی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے افسانے اور کہانیاں بھی لکھنی شروع کردیں۔ انہیں لاہور کی پرانی تہذیب اور ثقافت سے بہت لگاؤ تھا۔ پرانا شہر اور اس کا ماحول انہیں بہت پسند تھا۔ وہ اس ماحول میں پلے بڑھے تھے اور وہ اس دنیا میں سانس لے کر اپنی ذہنی صلاحیتوں میں اضافہ بھی کرتے رہے۔ ریاض شاہد نے پرانے لاہور اور اس کے رہنے

والوں سے بہت کچھ سیکھا اور حاصل کیا۔ وہ اس ماحول سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے ''ہزار داستان'' کے نام سے ایک ناول تصنیف کیا جو اندرونِ شہر میں رہنے والے کرداروں اور ماحول کا عکاس تھا۔ اپنے ناول کے لیے انہوں نے مخصوص کرداروں کا انتخاب کیا۔ اندرونِ شہر لوگ کس طرح رہتے ہیں اور ان کے کیا مسائل ہیں۔ انہیں حل کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ یہ ان کے ذاتی اور گہرے تجربات کا نچوڑ ہے۔

صحافت کو خیر باد کہہ کر ریاض شاہد نے فلمی دنیا کا رخ کیا۔ فلم ساز، ہدایت کار جعفر شاہ نے ''بھروسا'' کے نام سے ایک کہانی کا آغاز کیا۔ اس کا ابتدائی اسکرپٹ یونس راہی نے لکھا تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر یونس راہی ''بھروسا'' سے دستبردار ہوگئے۔ جعفر شاہ کی نظر ریاض شاہد پر پڑی اور ''بھروسا'' کا اسکرپٹ لکھنے کا فرض انہیں سونپ دیا گیا۔ ریاض شاہد نے اس اسکرپٹ میں تبدیلیاں کیں اور مکالمے لکھے۔ ان کے مکالموں کا تیکھا انداز اور فقرے فلم دیکھنے والوں کے دلوں میں اتر گئے۔ اگرچہ ان مکالموں میں سیدھے سادھے فقروں کی بجائے ڈرامائی اور تھیٹریکل انداز اپنایا گیا تھا جو کہ ان کا مخصوص انداز تھا۔ اس سے پہلے انور کمال پاشا کی فلموں میں یہ ڈرامائی انداز اپنایا گیا تھا۔ ریاض شاہد نے بھی وہی انداز اپنایا لیکن وہ اس سے مختلف بھی تھا۔ ریاض شاہد کے مکالمے اتنے پسند کیے گئے کہ ان کے بعد آنے والے مکالمہ نویسوں نے بھی وہی انداز اپنا لیا۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں ہر مصنف ریاض شاہد کے انداز میں مکالمے لکھنے لگا لیکن ان میں وہ اثر اور گہرائی نہ تھی جو ریاض شاہد کے قلم میں تھی۔

حقیقت ہے کہ ریاض شاہد نے پاکستانی فلموں میں مکالمہ نویسی کے انداز کو بدل کر رکھ دیا۔ ''بھروسا'' کی کامیابی نے انہیں ایک مقبول مصنف بنا دیا تھا جس کے بعد دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں نے بھی ان کی خدمات حاصل کرنی شروع کر دیں۔ اس طرح ریاض شاہد کی فلمی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ انہوں نے منفرد اور انوکھے کرداروں کو اپنی کہانیوں کا مرکز بنایا۔ وہ معاشرے کی خرابیوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ فلم ''نیند'' اور ''خاموش رہو'' اس کی دو مثالیں ہیں۔ ان کہانیوں میں معاشرے کے منفی پہلو بھرپور اور جاندار کرداروں کے ذریعے پیش کیے گئے۔ ان کے چبھتے ہوئے مکالمے نشتر کی طرح فلم دیکھنے والوں کے دلوں میں اتر جاتے تھے۔ وہ اپنی فلموں کی کہانیوں کے لیے انوکھے اور زندگی سے قریب کرداروں کا انتخاب کرتے تھے یا کسی مخصوص پس منظر کو پیشِ نظر رکھ کر کہانی لکھتے تھے۔ شہید، فرنگی، آگ کا دریا، زرقا یہ امن اس کی مثالیں ہیں۔

1962ء میں جبکہ وہ ایک معروف مصنف بن چکے تھے ریاض شاہد کو فلم بنانے کا خیال آیا۔ کہانی کے موضوع کے لیے انہوں نے اپنے ناول ہزار داستان، کا انتخاب کیا اور فلمی ضروریات کے مطابق اس میں ردوبدل کرکے فلم ''سسرال'' بنائی جس کے ہدایت کار بھی وہ خود ہی تھے۔

سسرال، اندرونِ شہر رہنے والوں کی زندگی کی عکاسی اور بطور فلم ایک یادگار فلم ہے۔ اس فلم میں انہوں نے ایک آبادی کا نقشہ پیش کیا ہے جس میں مختلف کرداروں کو حقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔

ریاض شاہد عوامی پسند اور ناپسند کے مطابق نہیں بلکہ ان مسائل کے بارے میں لکھتے اور فلمیں بناتے رہے جو سیاسی اور معاشرتی موضوعات تھے، مثال کے طور پر خاموش رہو۔ نیند، فرنگی، شہید، زرقا یہ امن، ایسے موضوعات ہیں جن کے بارے میں فلمیں بنانے کا کسی کو خیال نہیں آیا۔ ریاض شاہد اور ہدایت کار خلیل قیصر دونوں ہم خیال تھے اور اسی انڈراسٹینڈنگ کی وجہ سے ان دونوں کا امتزاج پاکستان کی ابھرتی ہوئی فلمی صنعت کے لیے نعمت ثابت ہوا۔ ان دونوں نے مل کر جو فلمیں بنائیں ان سے متاثر ہوکر دوسرے نوجوانوں نے بھی یہی راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح پاکستانی فلموں میں نئے رجحانات پیدا ہوئے۔ ریاض شاہد اور خلیل قیصر کے علاوہ ریاض شاہد اور ہدایت کار حسن طارق میں بھی ہم آہنگی تھی۔ ان دونوں نے بھی دوسروں سے مختلف اور معاشرتی مسائل کے بارے میں یادگار فلمیں بنائی ہیں۔ حسن طارق ایک ذہین ہدایت کار تھے جو تجربہ کار ہدایت کاروں کے ساتھ کام کرنے کے علاوہ فلم اسکرپٹ بھی لکھتے رہے تھے۔ انہیں اسکرین پلے اور مکالموں کے فن کا ذاتی تجربہ تھا جس کا انہوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

حسن طارق کے ساتھ ہماری بہت گہری اور انوکھی دوستی رہی ہے۔ ہم نے ایک ساتھ مل کر فلمیں بھی بنائیں۔ حسن طارق کے ہمارے ساتھ جس نوعیت کے تعلقات تھے انہیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ لیکن ایک ہدایت کار کی حیثیت سے حسن طارق کا درجہ میری نظر میں بہت بلند ہے۔ اس کی وجہ ان کی ہنرمندی نہیں بلکہ دردمندی کا احساس تھا۔ انہوں نے جو فلمیں بنائیں ان کے موضوعات سے ہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حسن طارق کو معاشرے میں کچلے ہوئے لوگوں کا شدید احساس تھا۔ اس اعتبار سے ان کا اور ریاض شاہد کا سوچنے کا انداز ایک ہی جیسا تھا۔

ریاض شاہد کی پہلی ذاتی فلم ''سسرال'' تھی۔ یہ پرانے لاہور کے اندر رہنے والوں کی عکاس تھی۔ ریاض شاہد نے اس فلم میں اندرون شہر کا حقیقی ماحول پیش کیا تھا۔ فلم کی کہانی کو حقیقت بنانے کے لیے انہوں نے اس ماحول سے ایسے کردار منتخب کیے تھے جو ان کے نزدیک فراموش کردیے گئے تھے کیونکہ زمانہ آگے بڑھ گیا تھا مگر وہ بدستور اپنی ہی دنیا میں مگن تھے۔

1962ء کا سال بعض وجوہات کی بنا پر ایک یادگار سال تھا۔ اس سے پہلے 1950ء کے بعد پاکستانی فلموں کے معیار اور تعداد میں کافی اضافہ ہوچکا تھا اور بڑے بڑے ناموں والے اداکاروں کی بھارتی فلمیں کھلم کھلا پاکستان میں درآمد اور نمائش کے لیے پیش کی جارہی تھیں اس کے باوجود پاکستان کی فلمی صنعت نے بتدریج ترقی کی۔ فلم بینوں کا مزاج بھی رفتہ رفتہ تبدیل ہو رہا تھا۔ انہیں ہندوستانی فلموں کی چمک دمک کے مقابلے میں پاکستانی فلموں کے ماحول کی سادگی مختلف نظر آنے لگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی فلموں کی نمائش کے باوجود پاکستانی فلمیں مقبولیت حاصل کررہی تھیں۔ اس کی ایک وجہ حقیقی ماحول بھی تھا۔ کئی فلمیں ایسی بنائی گئی تھیں جن کے موضوعات کے بارے میں پہلے کسی نے سوچا تک نہیں تھا۔

مناسب ہوگا اگر یاد دہانی کی خاطر فلم سسرال کی کہانی کا خاکہ پیش کردیا جائے۔

''سسرال'' اندرونی لاہور کے ایک علاقے کی کہانی ہے۔ یہ پرانے لاہور کا علاقہ ہے اس لیے ریاض شاہد نے کردار بھی ایسے منتخب کیے ہیں جو ہر ایک کے جانے پہچانے ہیں کیونکہ وہ ہر روز انہیں دیکھتے ہیں اور ان کرداروں سے ان کا واسطہ بھی پڑتا ہے۔ اس علاقے میں شادی بیاہ کا کھانا پکانے والے بھی رہتے ہیں۔ بینڈ بجانے والے بھی۔ پرانے دور کے حمام، موچ ٹھیک کرنے والے پہلوان، کبوتر بازی کے شوقین نوجوان، پرانے گھروں میں رہنے والوں کی چھپی ہوئی محبت اور پرانے مکانوں کی چھتوں پر موقع پاکر مختصر ملاقاتیں۔ یہ کسی ایک کردار کی نہیں بلکہ پوری بستی اور وہاں کے رہنے والوں کی کہانی ہے۔ لیکن ان کرداروں میں باہمی ربط بھی ہے اور یہ سب ایک دوسرے کو بخوبی جانتے بھی ہیں۔

دلیپ کمار اور سائرہ بانو

یوسف خان اس فلم کے ہیرو تھے۔ یوسف خان اس سے پہلے بھی چند فلموں میں کام کرچکے تھے لیکن ابھی وہ پنجابی فلموں کے معروف ہیرو نہیں بنے تھے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ یوسف خان حقیقی زندگی میں بھی کبوتر بازی کے شوقین تھے اور انہیں کبوتروں کی پہچان بھی تھی۔ اس فلم کے ایک اور ہیرو علاؤ الدین تھے۔ علاؤ الدین تو جوانی کی عمر سے گزر چکے ہیں لیکن حالات کے باعث شادی نہیں کرسکے۔ اس زمانے میں کوئی شادی بینڈ باجے کے بغیر مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی اس لیے ہر شادی میں بینڈ باجہ ہونا لازمی تھا۔ فلم کے ایک اور اہم کردار دلجیت مرزا تھے۔ دلجیت مرزا کا محلے میں گرم حمام بھی ہے۔ (ایک زمانے میں عموماً بال تراشنے والوں کی دکان کے ساتھ ایک حمام بھی ہوتا تھا جہاں گرمی میں ٹھنڈا اور سردی میں گرم پانی فراہم کیا جاتا تھا) علاؤ الدین (شیدا) دوسروں کی شادیوں میں بینڈ تو بجاتے ہیں لیکن خود ان کی شادی کی نوبت نہیں آتی۔ اس فلم میں اداکارہ لیلیٰ نے رومانی کردار ادا کیا ہے۔ ان دونوں کے گھر نزدیک ہی ہیں۔ دوپہر یا کسی اور وقت جب چھتوں پر کوئی موجود نہیں ہوتا یہ دونوں مکانوں کی چھتوں اور سیڑھیوں پر بیٹھ کر پیار بھری باتیں کرنے کا وقت نکال لیتے ہیں۔ علاؤ الدین (شیدا) اپنی غربت اور محرومیوں سے تنگ آکر برے کاموں میں پڑ جاتا ہے۔ وہ جوا کھیلتا ہے اور شراب بھی پیتا ہے، دوستوں کے سمجھانے پر اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے غم غلط کرنے کے لیے مدہوش رہنا چاہتا ہے۔ محلے میں ایک نوجوان دھوبن بھی رہتی ہے جو شوخ اور چلبلی طبیعت کی مالک ہے اور ہر ایک سے فقرے بازی کرتی رہتی ہے۔ لہری اور آغا طالش نے بھی اس فلم میں اہم کردار ادا کیے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

دھوبن چاندنی، احمد (یوسف خان) سے محبت کرتی ہے مگر وہ اس کو اہمیت نہیں دیتا۔

دوستوں کے مشورے پر شیدا (علاؤ الدین) اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار شائع کراتا ہے۔ شادی دفتر... چلانے والے لہری ہیں جو ہر ایک کو یقین دلاتے رہتے ہیں کہ ان کے بیٹے یا بیٹی کے لیے ان کے پاس بہترین رشتہ موجود ہے۔ لہری علاؤ الدین کے لیے ایک لڑکی (زرینہ) کا انتخاب کرتا ہے۔ شیدا بہت خوش ہے کہ اب اس کا گھر بھی آباد ہو جائے گا لیکن شادی کے بعد شیدے کو معلوم ہوتا ہے کہ جس لڑکی (زرینہ) سے اس کی شادی ہوئی ہے وہ ٹانگوں سے معذور ہے۔ لڑکی کا باپ یہ عذر پیش کرتا ہے کہ میں غریب آدمی ہوں.... جوان بیٹی کو کب تک گھر میں بٹھا رکھتا؟ اس کی معذوری کی وجہ سے حقیقت کو جاننے کے بعد کوئی (زرینہ سے) شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ میں نے جھوٹ بولا، دھوکا دیا لیکن ایک بے بس باپ اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہے اور میرے مرنے کے بعد اس معذور لڑکی کا کیا انجام ہوگا۔

احمد (یوسف خان) حالات سے آگاہ ہونے کے بعد زرینہ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ زرینہ کے باپ سے مل کر اپنی خواہش کا اظہار کرتا ہے زرینہ اور اس کی معذور بہن (نگہت سلطانہ) کا باپ یہ شرط رکھتا ہے کہ اگر شیدا معذور بیٹی نگہت سلطانہ سے شادی کرنے پر رضا مند ہو جائے تو میں اپنی بیٹی کی شادی تم سے کر دوں گا۔ زرینہ اپنے باپ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے مگر وہ اپنی شرط سے دستبردار نہیں ہوتا۔ اس پر احمد زرینہ سے کہتا ہے کہ ہم دونوں گھر سے بھاگ کر خود ہی شادی کر لیتے ہیں لیکن زرینہ یہ کہہ کر انکار کر دیتی ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کو بدنام کرنا نہیں چاہتی۔ اگر قسمت میں ہوگا تو ہمارا ملاپ ہو جائے گا ورنہ جیسی اللہ کی مرضی۔

زرینہ کا باپ اپنی بیٹی کی باتیں سن کر متاثر ہوتا ہے اور احمد کے ساتھ اس کی شادی کر دیتا ہے۔ یہ فلم 1962ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اگر کچھ غلطیاں ہوں تو انہیں نظر انداز کر دیجئے ویسے بھی یہ دراصل کرداروں کی کہانی تھی جنہیں ایک خوبصورت منظر نامے کے ساتھ ریاض شاہد نے گوندھ کر ایک بہت موثر اور حقیقت پسند فلم بنائی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک زمانے میں اٹلی کے ہدایت کاروں نے زندگی کے روز مرہ واقعات اور عام انسانوں کے بارے میں فلمیں بنا کر ساری دنیا کو چونکا دیا تھا جس سے ساری دنیا کی فلمیں متاثر ہوئی تھیں۔ یہ حقیقت سے نزدیک Neo realistic تحریک ایک زمانے میں اتنی مقبول ہوئی تھی کہ دنیا بھر کے فلم ساز مصنف اور ہدایت کاران سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ''سسرال'' بھی اسی انداز کی فلم تھی اور بہت ہنر مندی اور گہرے تاثر کے ساتھ بنائی گئی تھی۔ بدقسمتی سے ہماری فلمی صنعت اور حکومت نے اس کو دنیا بھر میں عام کرنے کے لیے کچھ بھی نہ کیا۔ اگر اس فلم کو عالمی فلمی میلوں میں پیش کیا جاتا تو یقیناً کئی ایوارڈز حاصل کرتی اور دنیا بھر میں پاکستانی حقیقت پسند فلموں کا بھی چرچا ہو جاتا۔ ریاض شاہد کا ذہن کاروباری نہیں تھا۔ وہ تو ایک مخلص تخلیق کار تھے۔ ہمیں یاد ہے کہ اسی زمانے میں ہندوستان کے معروف اداکار بلراج سہانی پاکستان آئے تھے اور انہوں نے فلم ''سسرال'' کو عالمی معیار کی فلم قرار دیا تھا۔ بدقسمتی سے کاروباری طور پر یہ فلم زیادہ کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ یہ عام فلم بینوں کے ذوق کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں بنائی گئی تھی۔ حکومت اور فلمی حلقوں میں بھی اسے زیادہ پذیرائی نہ مل سکی لیکن ریاض شاہد کی لگن اور اندازِ فکر نہ بدلا اور وہ چونکا دینے والے موضوعات پر فلمیں بناتے رہے۔

ہدایت کار خلیل قیصر کے ساتھ ان کی گہری وابستگی اور ہم خیالی تھی۔ ریاض شاہد کا ایک ہم خیال اور بہت اچھا ہدایت کار جوانی میں اچانک قتل کر دیا گیا اس کے لیے یہ ایک صدمہ تھا۔ خلیل قیصر کو آج کی نسل بھول چکی ہے اس لیے کہ ہمارے سینما گھروں کے مالکوں کو یہ توفیق نہیں ہے کہ اتوار یا چھٹی کے روز پرانی پاکستانی فلمیں رعایتی نرخوں پر دکھائی جائیں جیسا کہ انڈیا میں ہوتا ہے۔

سسرال میں بھی اداکاروں نے بہت اچھی اداکاری کی تھی، اداکاری کے اعتبار سے یہ ایک ناقابلِ فراموش فلم تھی۔ ریاض شاہد نے ان سے اداکاری نہیں کرائی بلکہ روز مرہ کی زندگی میں جس طرح کرداروں کا رویہ ہوتا ہے اسی کے مطابق ان اداکاروں سے کام کرایا جس کی وجہ سے ہر کردار حقیقی اور جیتا جاگتا نظر آتا ہے۔ ریاض شاہد نے ان کرداروں کو حقیقت کا روپ دیا ہے۔ خصوصاً یوسف خان، علاؤ الدین، دل جیت مرزا، لہری، نگہت سلطانہ کی اداکاری قابلِ ذکر ہے۔ طالش نے بھی اپنے کردار کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ خدا جانے اب اس فلم کا کوئی پرنٹ محفوظ ہے بھی یا نہیں۔ ہمارے ملک میں یادگار اور ناقابلِ فراموش

گلوکار محمد رفیع اور موسیقار اعظم نوشاد

فلمیں محفوظ رکھنے کا کوئی ادارہ بھی موجود نہیں ہے اور نہ ہی فلم سازوں کی انجمن یا نیفڈیک جیسے سرکاری اداروں نے فلموں کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ اگر ایسا کوئی ادارہ ہوتا تو پاکستان کی یادگار معیاری فلموں کو ''آرکائیوز'' میں محفوظ کیا جا سکتا تھا لیکن ایسے کسی ادارے کا ملک میں وجود تک نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت نے کبھی فلمی صنعت کو قرار واقعی اہمیت نہیں دی۔ اس کے برعکس انڈیا میں ایسی فلموں کو احتیاط سے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ فلم انسٹی ٹیوٹ جیسے ادارے تعلیم کے دوران میں فلم کے طلباء کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا ان ملکوں میں ہوتا ہے جہاں فلم کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بھارت کی حکومت نے اپنی فلمی صنعت کی ترقی اور خوشحالی میں نمایاں کردار کیا ہے یہاں تک کہ آج بھارتی فلم انڈسٹری، بولی وڈ، ہالی وڈ سے بھی آگے بڑھ چکی ہے۔ بھارتی فلمیں جو تعداد میں بھی ہالی وڈ کی فلموں سے زیادہ بنائی جاتی ہیں، ساری دنیا میں دیکھی جاتی ہیں اور ہر فلم کروڑوں کا زرمبادلہ کماتی ہے۔ بھارتی فلم اسٹارز کے ناموں اور چہروں سے دنیا کے ہر ملک کے لوگ واقف ہیں۔ بھارت فلموں کے ذریعے پروپیگنڈا بھی کرتا ہے جس کی وجہ سے بھارتی کلچر، مذہب اور خوبصورت مناظر سے متاثر ہو کر لاکھوں غیر ملکی سیاح ہر سال بھارت آ کر اربوں ڈالر دے کر جاتے ہیں۔ بھارت نے اپنی فلمی صنعت کے ذریعے دنیا بھر میں بھارت کو ایک خوشحال، ترقی یافتہ اور بھارتی ثقافت کا ایسا تاثر قائم کیا ہے کہ ساری دنیا بھارت کے گن گاتی ہے مگر ہماری حکومتوں کی غلط اور بھونڈی حکمتِ عملی کی وجہ سے فلم سازوں کی محنت سے پاکستانی فلموں نے جو ترقی کی تھی ہماری حکومتوں کے طرزِ عمل کے باعث ترقی کی جانب بڑھنے کی بجائے پاکستان کی فلمی صنعت کا خاتمہ ہو گیا۔

''سسرال'' کی ایک نمایاں خوبی اس کی موسیقی بھی تھی۔ مہدی حسن اور نور جہاں کے گائے ہوئے نغمات آج بھی روزِ اول کی طرح تر و تازہ ہیں۔ ہمارے ریڈیو اور ٹی وی چینلز ان کی نمائش کرنا بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ فلم میں منیر نیازی کے لکھے ہوئے گانے بھی بہت خوبصورت اور دل پذیر ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ منیر نیازی نے اسی فلم کے نغمات کے ذریعے فلمی دنیا میں اپنا مقام بنایا تھا۔ بعد میں انہوں نے کئی دوسری فلموں کے یادگار نغمات بھی لکھے۔

فلم ''سسرال'' 19 اکتوبر 1962ء کو نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی۔ اگرچہ باکس آفس پر کامیاب نہ ہو سکی لیکن جن لوگوں نے یہ فلم دیکھی ہے اسے کبھی بھلا نہیں سکتے۔

برصغیر پاک و ہند میں بڑے نامور اور ہنر مند موسیقار گزرے ہیں جن کے کارنامے فلمی دنیا میں ناقابلِ فراموش ہیں۔ استاد جھنڈے خان، انیل بسواس، پنکج ملک، کھیم چندر پرشاد، خواجہ خورشید انور، ماسٹر غلام حیدر، رفیق غزنوی، آر ڈی برمن، سجاد، شنکر جے کشن، رشید عطرے، غرضیکہ موسیقاروں کی ایک کہکشاں ہے جس نے فلمی دنیا کو جگمگا دیا تھا۔ لیکن ان میں صرف ایک موسیقار ایسا تھا جسے موسیقارِ اعظم کہا جاتا تھا اور یہ تھے نوشاد علی۔

نوشاد کا تعلق لکھنؤ کے ایک مذہبی گھرانے سے تھا جہاں گانے بجانے کو بہت برا سمجھا جاتا تھا۔ نوشاد کے والد واحد علی منشی تھے۔ بچپن میں نوشاد علی اپنے والد کے ساتھ بارہ بنکی میں دیوا شریف کے عرس پر جایا کرتے تھے جہاں ملک بھر کے قوال آتے تھے اور اپنی آوازوں کا جادو جگاتے تھے۔ اس زمانے میں استاد غربت علی، استاد یوسف علی، استاد ببن صاحب کے ناموں کا ڈنکا بجا کرتا تھا اور یہ مانے ہوئے قوال تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نوشاد کو موسیقی کا بہت شوق تھا۔ وہ گھر والوں سے چھپ کر موسیقی سیکھا کرتے تھے، نوشاد علی کو سازوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ہارمونیم اور ستار دو ایسے ساز تھے جو نوشاد علی کو بہت پسند تھے۔ استادوں کی صحبت میں انہوں نے ساز بجانا بلکہ ان کی مرمت کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔

25 دسمبر ان کا یوم پیدائش ہے۔ وہ 25 دسمبر 1919ء کو لکھنو میں پیدا ہوئے تھے۔ نوشاد کے بارے میں اور بھی بہت سے حقائق ہیں جو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ انہوں نے لکھنو کے ایک تھیٹریکل کلب میں ملازمت کر لی تھی اور بہت جلد ترقی کر کے موسیقار بن گئے۔ رائل تھیٹرز لکھنو میں جو ڈرامے بنا کرتے تھے نوشاد نے ان کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ خاموش فلموں کے زمانے میں نوشاد خاموش فلمیں بھی دیکھا کرتے تھے۔ اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ خاموش فلموں میں موسیقی کے لیے تھیٹرز کے مالک سازندوں کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔ ان میں طبلہ ساز، وائلن بجانے والے، ہارمونیم بجانے والے، ستار بجانے والے شامل ہوتے تھے۔ یہ سازندے پہلے تو خاموش فلموں کو دیکھتے تھے۔ پھر نوٹ لیا کرتے تھے کہ کس سین میں کس جگہ کون سا ساز بجایا جائے گا۔ تھیٹرز شروع ہونے سے پہلے یہ سازندے اسٹیج کے سامنے جا کر بیٹھ جاتے تھے اور پھر یہ سازندے اپنی باری پر اپنا ساز بجایا کرتے تھے۔ نوشاد علی کے لیے یہ کام دلچسپ بھی تھا اور فائدہ مند بھی کیونکہ بعد میں جب وہ فلموں کے موسیقار بنے تو پس منظر موسیقی بنانے میں ان کا یہ تجربہ کام آیا۔

اسی زمانے میں نوشاد نے لکھنو میں ونڈسر میوزک انٹرٹیمنٹ کے نام سے ایک ادارہ بنایا۔ اس کے کام سے متاثر ہو کر ایک اور تھیٹریکل کمپنی نے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہاں موسیقار لڈن خان نے ان کو تربیت دی یہاں تک کہ نوشاد کسی کی مدد کے بغیر موسیقی بنا سکتے تھے چنانچہ انہیں ایک میوزک کمپوزر کا عہدہ دے دیا گیا۔ اس زمانے میں انہوں نے لوک موسیقی پر توجہ دی اور مختلف علاقوں کے لوک گیت انہیں یاد ہو گئے۔ انہوں نے یوپی کے لوک گیتوں کے علاوہ مہاراشٹر، راجستھان، گجرات اور ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے لوک گیت سنے جو انہیں یاد ہو گئے۔ ان کا یہی تجربہ آئندہ زندگی میں فلموں کی موسیقی بناتے وقت ان کے کام آیا۔

نوشاد کو فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ خاموش فلموں کا زمانہ تھا مگر نوشاد تو تقریباً ہر فلم دیکھنے کی کوشش کرتے تھے اور سوچتے رہتے تھے کہ کس جگہ کون سا ساز بجایا جائے گا تو منظر کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جائے گا۔

جب بولتی فلموں کا زمانہ آیا تو یہ فلمیں نوشاد علی کو اور زیادہ اچھی لگیں۔ اب ان کے گھر والوں کو بھی پتا چل گیا تھا کہ نوشاد کو گانے بجانے کا شوق ہے۔ اب نوشاد کی موسیقی کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ ان کے والد کی برداشت کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔ انہوں نے ایک دن بیٹے کو بلایا اور الٹی میٹم دیا کہ یہ گانا بجانا اس گھر میں نہیں چلے گا۔ اگر اس گھر میں رہنا ہے تو یہ گانا بجانا چھوڑو۔ تمہیں اپنے گھر اور گانے میں سے کسی ایک چیز کا انتخاب کرنا ہوگا۔

آخر ایک دن نوشاد نے فیصلہ کر لیا کہ وہ موسیقی سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔ اس زمانے میں بمبئی ہی موسیقی اور فلموں کا مرکز تھا۔ شوقین لڑکے اور لڑکیاں گھر سے بھاگ کر سیدھے بمبئی جاتے تھے اور اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ بمبئی کا نام اب ممبئی رکھ دیا گیا لیکن یہ آج بھی فلموں اور موسیقی کے دلدادہ لڑکیوں اور لڑکوں کا آخری ٹھکانا ہے۔ آج بھی سیکڑوں بلکہ ہزاروں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گھروں سے بھاگ کر عملی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ممبئی کا رخ کرتے ہیں مگر ان میں مشکل سے ایک یا دو فیصد ایسے ہوں گے جو اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوتے ہیں کیونکہ گھروں کو واپسی کے دروازے بند ہو چکے ہوتے ہیں اس لیے ... در در کی ٹھوکریں کھانا ہی ان کا مقدر بن جاتا ہے۔

جب نوشاد علی لکھنو چھوڑ کر بمبئی پہنچے اس وقت ان کی عمر تیرہ برس تھی۔

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک تیرہ سالہ نوعمر لڑکا، جس کی جیب میں پیسا نہ ہو۔ جس کا بمبئی جیسے شہر میں کوئی جاننے والا نہ ہو وہ تن تنہا اتنے بڑے شہر میں پہنچ گیا جو ہر لحاظ سے اس کے لیے اجنبی تھا۔

لکھنو کے ایک صاحب کا پتا اس کو معلوم تھا۔ وہ دریافت کرتا ہوا ان کے گھر پہنچا۔ وہ خود بھی مشکل سے گزارہ کرتے تھے۔ انہوں نے وقتی طور پر نوشاد کو اپنے گھر میں رہنے کو جگہ دے دی۔ وہ قلابہ میں رہتے تھے۔ چند دن بعد نوشاد کو احساس ہوا کہ وہ خوامخواہ زبردستی یہاں پر مہمان بن رہا ہے۔

چند روز بعد اس نے ان کا کرایہ ادا کر کے رخصت طلب کی۔ اس کے بعد کہاں جائے۔ کیا کرے؟ یہ سب اس نے اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔

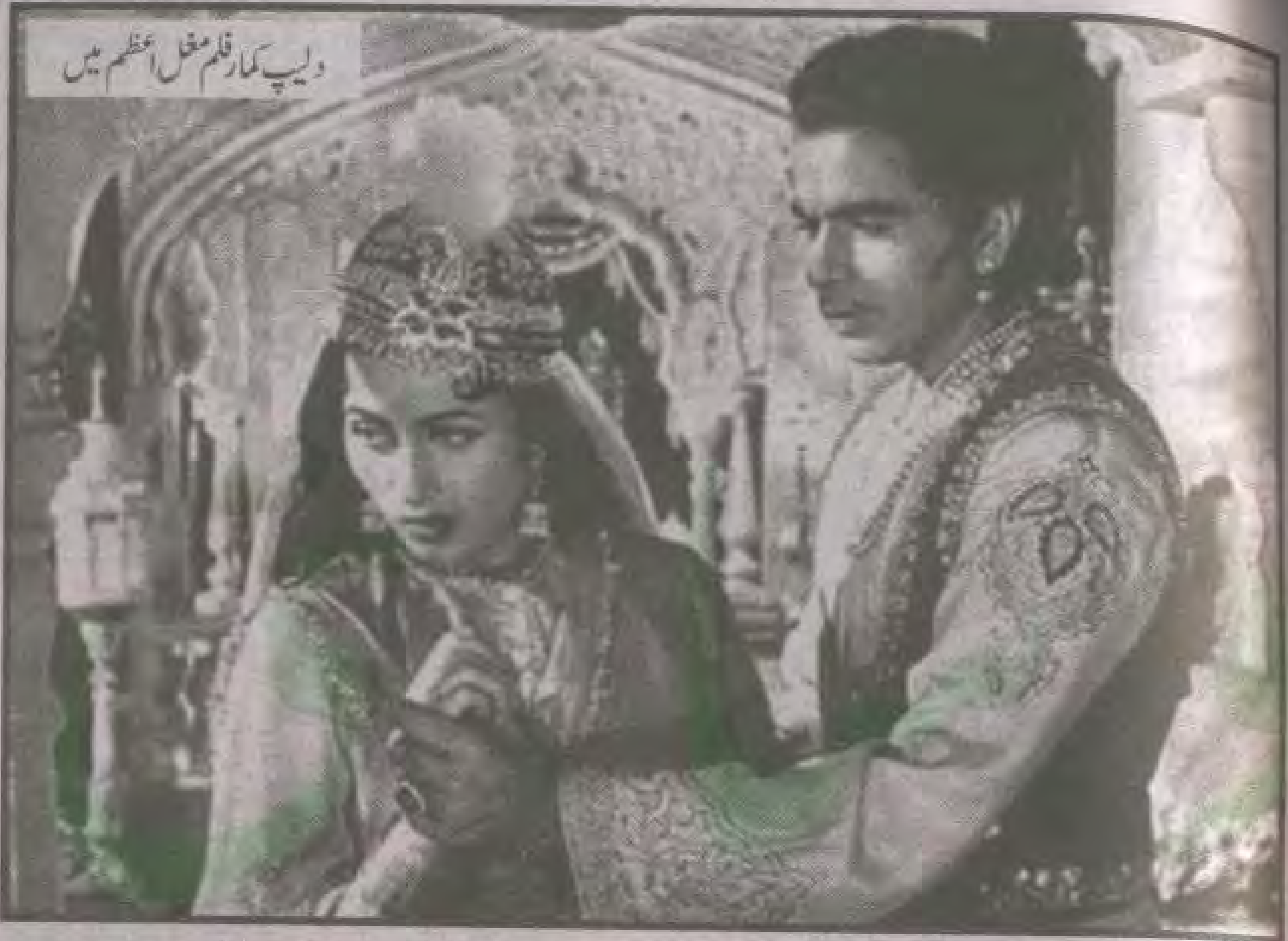

دلیپ کمار فلم مغل اعظم میں

بمبئی میں براڈوے تھیٹر کافی مشہور اور پُر رونق جگہ تھی۔ کوئی اور ٹھکانا تو تھا نہیں۔ دن بھر وہ مختلف کمپنیوں کے چکر لگاتا اور رات کو براڈوے تھیٹر کے سامنے فٹ پاتھ پر سو جاتا۔ بمبئی میں فٹ پاتھ پر سونے والا وہ اکیلا نہ تھا۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد اور خاندان فٹ پاتھوں پر ہی رہتے ہیں۔ آج بھی بمبئی کے فٹ پاتھوں پر بے شمار افراد اور خاندان بسیرا کرتے ہیں۔ ان میں ایسے غریب اور بے آسرا لوگ بھی شامل ہیں جو ساری زندگی فٹ پاتھوں پر گزار دیتے ہیں۔ شادی کرنے کے بعد ان کی بیوی بھی رات کو فٹ پاتھ پر مخصوص جگہ پر سوتی ہے۔ یہیں ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ بڑے ہوتے ہیں۔ اگر قسمت ساتھ دے دے تو بہتر جگہ منتقل ہو جاتے ہیں ورنہ اسی فٹ پاتھ پر پیدا ہوتے ہیں اور اسی پر مر جاتے ہیں۔

بمبئی ہندوستان کا بہت بڑا شاندار دولت مند اور غریب پرور شہر ہے۔ یہاں فٹ پاتھ کی زندگی ایک علیحدہ دنیا ہے۔ بمبئی کے فٹ پاتھ پر رہنے والوں کے بارے میں کبھی کسی نے تحقیق نہیں کی۔ یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ فٹ پاتھ پر جو نئی دنیا آباد ہے وہاں لوگ کیسے رہتے ہیں۔ ان کے مسائل کیا ہیں۔ ان کو کیڑے مکوڑے ہی سمجھا جاتا ہے۔ نہ تو حکومت نے اور نہ کبھی کسی این جی اوز نے ان کے بارے میں جاننے اور ان کی زندگی بہتر بنانے کے لیے کوئی کوشش کی۔

ضیاء سرحدی مرحوم نے پاکستان آنے سے پہلے محبوب خان کے لیے فٹ پاتھ، کے نام سے ایک فلم بنائی تھی۔ یہ فلم کبھی پاکستان میں نہیں دکھائی گئی۔ دلیپ کمار اس فلم کے ہیرو تھے۔ نقادوں نے فٹ پاتھ، کو ایک یادگار فلم قرار دیا ہے۔ اس فلم میں دلیپ کمار کی اداکاری بھی قابلِ دید ہے لیکن کاروباری طور پر یہ فلم کامیاب نہ ہو سکی۔ ممکن ہے اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ ضیاء سرحدی اس فلم کو نامکمل چھوڑ کر پاکستان چلے آئے تھے۔ فلم کا اسکرپٹ لکھا ہوا نہیں تھا چونکہ ضیاء صاحب مکمل اسکرپٹ لکھنے کے عادی نہیں تھے۔ اسکرپٹ ان کے ذہن میں محفوظ رہتا تھا جسے وہ خود ہی الٹ پلٹ کرتے رہتے تھے۔ محبوب صاحب اس کے فلم ساز تھے۔ فلم کو انہوں نے ہی مکمل کیا تھا۔ یہ فلم بمبئی کے فلم آرکائیوز میں محفوظ رکھی گئی ہے لیکن اس کو دیکھنے والے بہت کم لوگ ہیں۔

دیکھیے، نوشاد کے فٹ پاتھ پر سونے سے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نوشاد کام کی تلاش میں بھی سرگرداں تھے۔ آخر ان کی خوش قسمتی کام آئی اور انہیں اس زمانے کے نامور موسیقار استاد جھنڈے خان کے شاگرد کی ملازمت مل گئی۔ ان کی تنخواہ چالیس روپے ماہوار مقرر کی گئی جو اس وقت ان کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھی۔ اور پھر استاد جھنڈے خان کی شاگردی بھی ایک بہت بڑی بات تھی۔ ان کے نام کے جھنڈے گڑے ہوئے تھے اور ان کا شمار صفِ اول کے موسیقاروں میں ہوتا تھا۔

استاد جھنڈے خان جس فلم کے لیے موسیقی بنا رہے تھے اس کا فلم ساز ایک روسی تھا۔ بعض وجوہات کی وجہ سے یہ فلم مکمل نہ ہوسکی اور نوشاد ایک بار پھر بے کار ہوگئے۔

نوشاد کا فلمی حلقوں میں آنا جانا ہوگیا تھا اس لیے بہت سے لوگوں سے واقفیت بھی ہوگئی تھی۔ اسی زمانے میں نوشاد کی ملاقات میوزک کمپوزر استاد مشتاق حسین سے ہوئی۔ انہیں اپنے آرکسٹرا کے لیے ایک پیانو بجانے والے کی ضرورت تھی۔ نوشاد بہت اچھا پیانو بھی بجاتے تھے۔ اس طرح انہیں استاد مشتاق حسین کے آرکسٹرا میں پیانو بجانے کی ملازمت مل گئی۔ اسی زمانے میں نوشاد کو قدرت نے ایک اور موقع فراہم کردیا۔ استاد مشتاق حسین اس زمانے میں ایک اور فلم کو مکمل کرنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے زیرِ تکمیل فلم کو مکمل کرنے کی ذمہ داری نوشاد کے سپرد کردی کیونکہ انہیں نوشاد پر پورا بھروسا تھا کہ وہ یہ کام بخوبی کرسکیں گے۔ جب یہ فلم مکمل ہوکر نمائش کے لیے پیش کی گئی تو اس کے کریڈٹ میں نوشاد علی کا نام استاد مشتاق حسین کے شاگرد کی حیثیت سے دیا گیا تھا۔

یہ فلم تو مکمل ہوکر ریلیز ہوگئی لیکن بدقسمتی سے یہ کمپنی بھی ناکام ہوگئی اور نوشاد صاحب ایک بار پھر بے کار ہوگئے۔ لیکن اس کمپنی کا فلاپ ہوجانا نوشاد صاحب کے لیے خوش قسمتی کا سبب بن گیا۔ موسیقار کھیم چند پرکاش اس زمانے میں رنجیت اسٹوڈیو کے لیے ایک فلم بنا رہے تھے۔ انہوں نے نوشاد صاحب کو ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ پر اپنا اسسٹنٹ مقرر کرلیا۔ کھیم چند ایک ممتاز موسیقار تھے۔ ان کے معاون کی حیثیت سے کام کرنا بھی باعثِ عزت بات تھی۔ اس طرح نوشاد کا ہر طرف چرچا ہوگیا۔ کھیم چند کی اس مہربانی کے باعث نوشاد ہمیشہ ان کے احسان مند رہے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے کھیم چند کو اپنا "گرو" کہا تھا۔

اسی زمانے میں نوشاد علی کی ملاقات نغمہ نگار ڈی این مدھوکر سے ہوگئی۔ ڈی این مدھوکر اس زمانے میں معروف نغمہ نگار تھے۔ ڈی این مدھوکر کو نوشاد کی صلاحیتوں پر پورا بھروسا تھا۔ انہوں نے نوشاد کو کئی فلم سازوں اور ہدایت کاروں سے ملوایا۔ رنجیت اسٹوڈیوز کے مالک چندو لال شاہ نے نوشاد کو اپنی آنے والی فلم کے لیے سائن کرلیا۔ نوشاد نے ان کی فلم کے لیے ایک ٹھمری میں گانا بنایا جس کے بول تھے۔

بتادے کون گلی گئے شیام

لیکن بدقسمتی پھر آڑے آئی اور اس فلم کے شروع ہونے کی نوبت ہی نہ آئی۔

1939ء میں ایک پنجابی فلم "مرزا صاحب" کے لیے نوشاد کو معاون لے لیا گیا۔

فلمی دنیا پھولوں کی سیج نہیں ہوتی۔ عام لوگ کامیاب اداکاروں، موسیقاروں، اور گلوکاروں پر رشک کرتے ہیں مگر انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ کوئی مقام حاصل کرنے کے لیے فلمی دنیا میں کتنے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ لوگ کامیاب لوگوں کو دیکھتے تو ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے انہیں کتنی مشکلیں جھیلنی پڑتی ہیں۔

اتنے عرصے تک ٹھوکریں کھانے اور ناکامیوں سے دوچار ہونے کے بعد وہ مشکلات سے دوچار ہونے کے قابل ہوچکا تھا اور اپنی صلاحیتوں کے باعث بھی پہچانا جاتا تھا۔

آخر نوشاد کی قسمت مسکرائی اور اس کو ایک فلم میں کام کرنے کا موقع مل گیا۔ اس فلم کا نام "پریم نگر" تھا جو 1940ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ یہ فلم کچھ کے پس منظر میں بن رہی تھی اس لیے وہاں کے لوک گیتوں کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے نوشاد وہاں جاکر رہے اور وہاں کی موسیقی کے علاوہ ماحول کے بارے میں بھی جاننے کی کوشش کی۔ نوشاد کی یہ عادت ہمیشہ رہی کہ وہ کسی فلم کی موسیقی بنانے سے پہلے ماحول اور اس علاقے کے لوک گیتوں کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرتے تھے۔ 1942ء میں اے آر کاردار نے انہیں اپنی فلم نئی دنیا کے لیے موسیقار منتخب کیا۔ اس فلم کے کریڈٹ میں پہلی بار ان کا نام میوزک ڈائریکٹر کی حیثیت سے دیا گیا۔ اس فلم کے بعد انہوں نے کاردار کی فلموں کی موسیقی بنانے کا سلسلہ شروع کردیا۔ وہ کاردار پروڈکشنز میں ملازم تھے دوسری فلموں کی موسیقی بھی بنانے کی اجازت تھی۔

موسیقارِ اعظم نوشاد

کاردار کی فلم "شاردا" بہت کامیاب فلم تھی۔ اس کی موسیقی خاص طور پر بہت پسند کی گئی۔ اس فلم کا گیت

پنچھی جا
پیچھے رہا ہے بچپن مرا
اس کو جا کر لا

سپرہٹ ثابت ہوا اور آج تک لوگوں کو یاد ہے۔

یہ گانا فلم کی ہیروئن مہتاب پر فلمایا گیا تھا اور ثریا کا پہلا فلمی گانا تھا۔ اس فلم نے نوشاد کو معروف موسیقاروں کی صف میں شامل کردیا۔ لیکن جس فلم نے نوشاد کو صحیح معنوں میں شہرت اور مقبولیت دی وہ "رتن" تھی۔ رتن، کی کہانی بھی عجیب دلچسپ ہے۔ یہ فلم مکمل ہوئی تو کوئی ڈسٹری بیوٹر اس کو ریلیز کرنے کو تیار نہیں تھا مگر جب یہ فلم ریلیز ہوئی تو اس نے کامیابی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کردیا۔ فلم کی سب سے بڑی دلکشی اس کی موسیقی تھی۔ اس فلم کے تمام گانے ہٹ تھے۔ آج بھی ان میں ایسی ہی کشش ہے جیسی کہ نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ پہلے تھی۔ "رتن" نے سارے ملک میں دھوم مچادی۔ ہر ایک کی زبان پر رتن کے گانے تھے۔ اس فلم کی نمائش کے بعد نوشاد نے ایک فلم میں موسیقی بنانے کا معاوضہ 25 ہزار روپے کردیا جو کوئی اور موسیقار وصول نہیں کرتا تھا۔

اب نوشاد موسیقار کی حیثیت سے ایک بہت بڑا نام تھا۔ فلم رتن، 75 ہزار روپے میں مکمل ہوئی تھی لیکن صرف گراموفون کمپنی سے اس کی رائلٹی تین لاکھ روپے ملی تھی جو کہ ایک نیا ریکارڈ تھا۔ لیکن نوشاد کے گھر والے بدستور گانے بجانے کے مخالف تھے۔ وہ لوگ کیونکہ فلمیں نہیں دیکھتے تھے اس لیے انہیں معلوم نہیں تھا کہ نوشاد فلمی دنیا میں کیا حیثیت اختیار کرچکا ہے۔ خود نوشاد نے بھی گھر والوں کو یہ نہیں بتایا تھا۔

نوشاد کی شادی طے کی گئی۔ شادی لکھنو میں ہونی تھی۔ شادی کے موقع پر بینڈ باجے نے فلم رتن کے گانے بجائے تو نوشاد کے والد اور سسر گانے بجانے اور موسیقی کی مذمت میں مصروف تھے کہ کتنی بے ہودہ رسم ہے کہ شادیوں پر فضول گانے بجائے جاتے ہیں۔

نوشاد صاحب کان دبائے چپ چاپ بیٹھے رہے اور شکر ادا کیا کہ ان بزرگوں کو یہ علم نہیں ہے کہ یہ گیت بنانے والا ان کے سامنے دولھا بنا بیٹھا ہے۔

رتن کے گانوں نے سارے ملک میں دھوم مچادی تھی۔ اس فلم کے بعد نوشاد پر قدرت اتنی مہربان ہوئی کہ اوپر تلے ان کی تقریباً ہر فلم کامیاب ہوئی۔ فلم ہٹ نہ ہوئی تو فلم کے گانے ضرور مقبول ہوئے۔

نوشاد راگ راگنیوں پر اپنے گانوں کی بنیاد رکھتے اور اس میں لوک گیتوں کو بھی شامل کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ نوشاد کی بنائی ہوئی موسیقی سادہ اور عام فہم ہوتی تھی جو ہر شخص نہ صرف سمجھتا تھا بلکہ آسانی سے گا بھی سکتا تھا اور گنگنا بھی سکتا تھا۔ ان کے گانے سن کر ہر طبقے اور ہر عمر کا سننے والا یوں محسوس کرتا تھا جیسے یہ گانا اسی کے لیے بنایا گیا ہے۔

نوشاد کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ ہر فلم ان کی مقبولیت میں اضافہ کرتی رہی یہاں تک کہ ان کو جادوگر اور عظیم ترین موسیقار بھی کہا گیا۔ نوشاد سادہ طبیعت اور نماز روزے کے پابند تھے۔ انہیں دولت کا لالچ نہیں تھا۔ وہ ایک وقت میں صرف ایک فلم کی موسیقی بناتے تھے حالانکہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بے شمار فلم ساز انہیں منہ مانگا معاوضہ دینے کو تیار تھے۔ نوشاد نے زیادہ تر ہدایت کار محبوب اور اے آر کاردار کی فلموں کی موسیقی بنائی اس لیے کہ دوسروں کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے گھر پر ایک بہت جدید اور خوبصورت میوزک روم بنایا تھا جہاں بیٹھ کر وہ فلموں کی دھنیں بناتے تھے۔

نوشاد کو اپنے کام پر عبور حاصل تھا اور وہ یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی بھی کسی اور کے کام میں مداخلت کرے۔ اس سلسلے میں یہ واقعہ مشہور ہے کہ نوشاد نے جب ابتدائی دنوں میں محبوب خان کے ساتھ کام کرنا شروع کیا تو محبوب صاحب کی شخصیت وشہرت آسمان کو چھورہی تھی۔ فلمی صنعت میں ان کا بہت زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر یادگار فلمیں بنا کر ناقابلِ فراموش شہرت اور مقبولیت حاصل کی تھی اس لیے کوئی ان کے سامنے بولتا نہیں تھا اور ان کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا۔

نوشاد نے ان کے ساتھ کام کا آغاز کیا تو ایک گانے کی دھن بنائی۔ محبوب صاحب گانے کی ریہرسل سننے کے لیے آئے تو انہوں نے گیت کے بولوں اور دھنوں کے بارے میں کچھ اعتراضات کیے جو نوشاد صاحب کے خیال میں درست نہ تھے۔

نوشاد صاحب نے ان کی باتیں سن لیں۔ اگلے روز محبوب صاحب فلم کے سیٹ پر شوٹنگ کر رہے تھے کہ نوشاد صاحب بھی وہاں پہنچ گئے اور مشورے دینے لگے کہ اس منظر میں کیمرا کس جگہ رکھا جائے اور کس طریقے سے شاٹ لیا جائے۔

محبوب صاحب کی نظر پڑی تو پاس آ گئے جہاں نوشاد صاحب کیمرا مین کو تجاویز دے رہے تھے۔

محبوب صاحب نے نوشاد صاحب سے کہا ”تم موسیقار ہو۔ فلم کی ہدایت کاری کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ بلاوجہ مداخلت کیوں کر رہے ہو۔“

نوشاد صاحب بولے۔ ”میں تو اپنی رائے دے رہا تھا۔“

محبوب صاحب نے کہا۔ ”جو کام تم جانتے ہی نہیں ہو اس کے بارے میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ ہر ایک کو وہی کام کرنا چاہیے جو وہ جانتا ہے۔“

نوشاد صاحب یہ سن کر زیرِ لب مسکرائے لیکن زبان سے کچھ نہ کہا مگر محبوب صاحب بہت ذہین اور سمجھ دار ہدایت کار تھے۔ وہ ان کا مقصد سمجھ گئے۔ اس کے بعد محبوب صاحب نے کبھی نوشاد صاحب کے کام میں دخل نہیں دیا۔ کبھی گانے کی ریہرسل سننے کے لیے نہیں آئے۔ انہیں نوشاد صاحب پر اعتماد تھا کہ وہ اپنا کام جانتے ہیں اس لیے ان کا کام ان ہی پر چھوڑ دیا۔ وہ نوشاد صاحب کو فلم کی چویشن بتاتے اور یہ بتاتے کہ اس گانے کو وہ کس جگہ اور کس طرح استعمال کریں گے۔ اس کے بعد وہ موسیقی کی طرف سے مطمئن اور غیر جانبدار ہو جاتے۔

موسیقار کی حیثیت سے نوشاد کے عروج کا دور 1942ء میں شروع ہوا تھا جو 1960 کے بعد تک جاری رہا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے فلموں کے لیے موسیقی بنانا بند کر دیا بلکہ خود نئے زمانے کے ہدایت کاروں کا اندازِ فکر بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ ماحول اور موضوعات کی تبدیلی کے باعث پرانے عہد... کے بڑے بڑے ہنرمند فلم ساز اور ہدایت کاروں نے رفتہ رفتہ فلمی صنعت سے خود کو علیحدہ کر لیا۔ ان ہی میں نوشاد صاحب بھی شامل تھے۔ موسیقار کی حیثیت سے نوشاد کی کامیابیوں کا کوئی دوسرا موسیقار مقابلہ نہیں کر سکتا۔

نوشاد زیادہ کام کرنے کے قائل نہیں تھے۔ تمام زندگی میں انہوں نے ایک سو سے بھی کم فلموں کی موسیقی بنائی تھی جن میں سے 26 فلموں نے سلور جوبلی منائی۔ آٹھ فلموں نے گولڈن جوبلی منائی اور چار فلموں نے ڈائمنڈ جوبلی منائی۔ سلور جوبلی وہ فلم کہلاتی ہے جو ایک ہی سنیما میں 25 ہفتے یا اس سے زائد ہفتے چلتی ہے۔ پچاس یا زیادہ ہفتے کامیابی سے چلنے والی فلم کو فلمی اصطلاح میں گولڈن جوبلی منانے والی فلم کہا جاتا ہے۔ ڈائمنڈ جوبلی ایک سو ہفتے یا ساٹھ ہفتوں سے زیادہ چلنے والی فلم کو کہتے ہیں۔ مندرجہ بالا فہرست سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی موسیقی کس قدر پسند کی جاتی تھی۔

نوشاد نے زیادہ تر شکیل بدایونی کے نغمات کی دھنیں بنائیں۔ ڈی این مدھوکر، ضیا سرحدی نے بھی ان کی کچھ فلموں کے نغمات لکھے لیکن ان کے 95 فیصد کے لگ بھگ گانے شکیل بدایونی کے لکھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کا ساتھ فلمی موسیقی کے لیے جادو اثر رکھتا تھا۔ اور یہ صحیح ہے کہ ان دونوں نے انڈیا کی فلمی صنعت کو ناقابلِ فراموش موسیقی فراہم کی ہے جو آج بھی روزِ اول کی طرح تر و تازہ اور دلکش ہے۔ ان کے بنائے ہوئے نغمات سن کر قدم خود بخود رک جاتے ہیں۔ نوشاد کے لیے مجروح سلطان پوری نے بھی

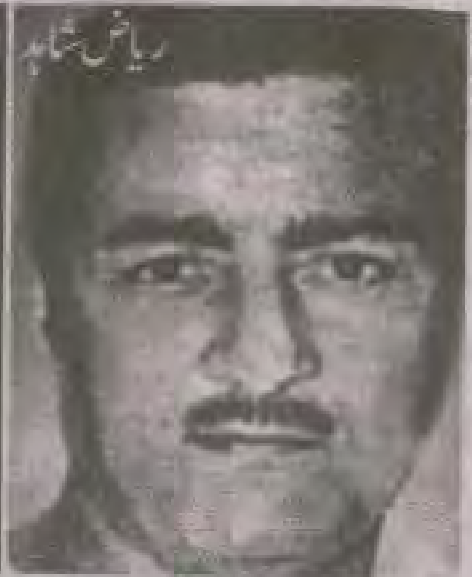

ریاض شاہد اور نیلو

گیت لکھے مگر بہت کم۔ دراصل آغاز ہی سے ان کی اور شکیل بدایونی کی جوڑی بہت کامیاب رہی۔ شکیل بدایونی فلمی گیت نویس یا تک بند نہیں تھے بہت اچھے شاعر بھی تھے اس لیے ان کے لکھے ہوئے گیتوں میں ادبی اور شاعرانہ چاشنی بھی شامل ہے۔

موسیقار اے رحمٰن کو آسکر ایوارڈ مل چکا ہے۔ وہ اس وقت انڈیا کے مقبول ترین موسیقار ہیں لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ 1957ء میں محبوب خان اور نوشاد کی فلم ”مدر انڈیا“ کو پانچ فلموں میں نامزد کیا گیا تھا لیکن بدقسمتی سے بہت محدود ووٹوں کی کمی کی وجہ سے ”مدر انڈیا“ آسکر ایوارڈ نہ حاصل کر سکی۔ نوشاد کو نہ صرف عوام اور فلم بینوں نے سراہا بلکہ ان کی خداداد صلاحیتوں اور مقبولیت کی وجہ سے 1981ء میں انہیں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ یہ ان کی زندگی بھر کی خدمات کا اعتراف تھا۔

نوشاد صاحب نے فلموں میں موسیقی مرتب کرنا ترک کر دیا تھا بلکہ 2005ء میں انہوں نے فلم ”تاج محل“ ایک لافانی لو اسٹوری کے لیے موسیقی مرتب کی۔ اس وقت ان کی عمر 86 سال تھی۔ نوشاد صاحب کے کچھ شاگردوں نے بھی موسیقی میں نام پیدا کیا جس میں محمد شفیع، جیری امل دے اور غلام محمد نمایاں ہیں۔ نوشاد صاحب نے موسیقی خصوصاً پس منظر موسیقی میں بھی بہت کامیاب تجربات کیے۔ فلم کوہ نور، کے لیے انہوں نے فلم اسٹوڈیو کی بجائے آدھی رات کے بعد گانے ریکارڈ کرنے کا تجربہ کیا کیونکہ رات کے اس پہر خاموشی اور سناٹا ہوتا ہے۔ وہ ہندوستان کے پہلے میوزک ڈائریکٹر تھے جنہوں نے موسیقی اور آواز کو میکس کرنے کا رواج ڈالا۔ انہوں نے پہلی بار کلارینٹ، ستار، منڈولین اور بانسری کا ایک ہی گانے میں بیک وقت کامیاب استعمال کیا تھا۔ انڈیا کی فلمی دنیا میں انہوں نے ماحول اور کرداروں کے مزاج کے مطابق پس منظر موسیقی ترتیب دینے کا کامیاب تجربہ کیا۔ انہوں نے کلاسیکی گانوں کو جدید موسیقی کے امتزاج سے اس طرح استعمال کیا کہ وہ ناقابلِ فراموش بن گئے۔ انہوں نے فلم بیجو باورا میں امیر خان جیسے استاد کی آواز استعمال کی۔ فلم مغلِ اعظم کے لیے انہوں نے اور ہدایت کار کے آصف نے استاد بڑے غلام علی خان جیسے بے مثال گائیک کی آواز استعمال کی۔ اس فلم میں جو 1960ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی بڑے غلام علی خان کو فی گانا 25 ہزار روپے ادا کیے تھے جو کہ اس زمانے میں ایک ناقابلِ یقین معاوضہ تھا۔ فلم بیجو باورا میں انہوں نے جدید اور کلاسیکی موسیقی کے امتزاج سے لاجواب موسیقی بنائی تھی جس پر انہیں فلم فیئر ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ محبوب خان کی رنگین فلم آن، کے آرکسٹرا میں انہوں نے ایک سو سے زائد سازندے استعمال کیے تھے۔ فلم آن کی موسیقی کی نوٹیشن لندن میں ایک کتاب کی صورت میں شائع کی گئی ہے۔

نوشاد ان موسیقاروں میں تھے جو ماحول اور کرداروں کے مطابق موسیقی بناتے تھے۔ فلم ”گنگا جمنا“ کو بھوج پوری زبان میں بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ نوشاد نے بھوج پوری لوک موسیقی کے بارے میں تحقیقات کیں۔ تبھی تو گیتوں میں بھوج پوری زبان کے ساتھ ساتھ بھوج پوری موسیقی کا رنگ بھی نمایاں محسوس ہوتا ہے۔ نوشاد ان موسیقاروں میں تھے جو گیت اور چویشن کے مطابق آرکسٹرا یعنی سازندے استعمال کرتے تھے۔ مثلاً آن کے ایک گانے میں انہوں نے ایک سو سے زائد سازندے اکٹھے کیے تھے۔ زیادہ سازندوں کا صحیح استعمال بھی کوئی ماہر ہی کر سکتا ہے۔ ورنہ سننے والے اور موسیقی جاننے والے سوال کر سکتے ہیں کہ فلاں ساز کی تو آواز ہی سنائی نہیں دے رہی تھی' اس کو آرکسٹرا میں کیوں رکھا گیا ہے۔ بعض موسیقاروں کے گیتوں میں ... بعض سازوں کا استعمال فالتو محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے فلم میرے محبوب کے ٹائٹل کی موسیقی میں صرف چھ سازندے استعمال کیے۔

نوشاد نئے نئے تجربات بھی کرتے رہتے تھے تاکہ مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکیں۔

فلم مغلِ اعظم کے مشہور نغمے، جب پیار کیا تو ڈرنا کیا، میں انہیں گیت کے ایک حصے میں گونج دار آواز درکار تھی۔ انہوں نے لتا منگیشکر سے گیت کی ایک استھائی کو چکنے ٹائل والے غسل خانے میں ریکارڈ کرایا جس کی وجہ سے اس استھائی میں صدائے بازگشت اور گونج سنائی دیتی ہے۔

جب راک اینڈ رول اور مغربی موسیقی کو بھونڈے انداز میں فلموں میں استعمال کرنے کا رجحان شروع ہوا تو بدلتے ہوئے زمانے اور موسیقی کے انداز سے بیزار ہو کر نوشاد نے موسیقی بنانا ترک کر دی۔ جدید دور کے ہدایت کاروں نے بھی مغربی موسیقی کو اپنا لیا تھا اس لیے نوشاد جیسا عظیم موسیقار فلمی موسیقی سے کنارہ کش ہو گیا۔ فلم جگنو، میں میڈم نور جہاں اور محمد رفیع کا گایا ہوا دوگانا

یوں ہی دنیا بدلتی ہے
اسی کا نام دنیا ہے
حسب حال ہے۔

نوشاد کو کبھی ایوارڈز اور انعامات کی پروا نہیں تھی۔ عوام کی پسند ہی ان کے لیے سب سے بڑا ایوارڈ تھی۔ وہ ہمہ وقت موسیقی میں گم رہتے تھے اس لیے سوشل تقریبات میں نظر نہیں آتے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ کالج میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر ان کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ وہ بذات خود شاعر بھی تھے لیکن نغمہ نگاروں کے گانوں میں وہ کبھی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ ان کی شاعری کا ایک مجموعہ بھی ہے۔ انہوں نے فلم پالکی، اور تیری پائل میرے گیت کی کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ نوشاد نے فلم سازی بھی کی تھی مگر بہت جلد اس سے قطع تعلق کر کے محض موسیقار رہنے پر اکتفا کیا۔

نوشاد نے کبھی کسی فلمی عہدے کی خواہش نہیں کی لیکن اس کے باوجود فلم میوزک ڈائریکٹرز ایسوسی ایشن کے صدر، انڈین پرفارمنگ سوسائٹی کے صدر کے علاوہ انہیں بمبئی کا اسپیشل ایگزیکٹو مجسٹریٹ بھی مقرر کیا گیا تھا۔

انہوں نے جو ایوارڈز حاصل کیے ان کی فہرست بھی طویل ہے۔

1۔ فلم فیئر۔ بہترین میوزک ایڈیٹر کے لیے فلم فیئر ایوارڈ۔

2۔ بنگال فلم جرنلسٹس ایسوسی ایشن کی طرف سے فلم گنگا جمنا کے لیے بہترین موسیقار کا ایوارڈ۔

3۔ بمبئی ٹیلی ویژن سینٹر نے ان کے بارے میں ایک مختصر دستاویزی فلم بنائی تھی۔

4۔ دادا صاحب پھالکے ایوارڈ۔

5۔ لتا منگیشکر ایوارڈ جو مدھیہ پردیش حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے۔

6۔ امیر خسرو ایوارڈ۔

7۔ سنگیت ناٹک اکیڈمی ایوارڈ۔

8۔ پدم بھوشن۔

9۔ فلم ٹیپو سلطان کی تلوار کے لیے بہترین موسیقار ایوارڈ۔

نوشاد راگ راگنیوں پر اپنے گیتوں کی بنیاد رکھتے تھے۔ ذیل میں مختلف کلاسیکی راگوں کے استعمال کی تفصیل ملاحظہ کیجیے۔

آج ہے پیار کا فیصلہ اے صنم۔ گلوکارہ لتا منگیشکر راگ اہیر بھیروی۔

دل میں چھپا کے پیار کا ارمان لے چلے، فلم آن گلوکار محمد رفیع، راگ بھاگیشوری۔

چاہ برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا۔ گلوکار سہگل فلم شاہ جہاں

مل کے بچھڑ گئیں انکھیاں ہائے رام مل کے بچھڑ گئیں انکھیاں۔ گلوکارہ امیر بائی فلم رتن۔ راگ بھیروی

کیا مل گیا بھگوان تجھے دل کو دکھا کے

یہ زندگی کے میلے دنیا میں کم نہ ہوں گے افسوس ہم نہ ہوں گے۔ فلم میلہ، گلوکار محمد رفیع، (راگ بھیم پلاسی)

آج میرے من میں، فلم آن گلوکارہ لتا۔

ترے صدقے بالم، فلم امر، گلوکارہ لتا۔

افسانہ لکھ رہی ہوں۔ فلم درد، گلوکارہ اما دیوی۔

آج پرانی راہوں سے فلم آدمی، گلوکار محمد رفیع۔

"راگ سہاگ"

میری لاڈلی رے مری لاڈلی فلم انداز گلوکارہ لتا۔

تیرے پیار میں دلدار، فلم میرے محبوب، گلوکارہ لتا۔

تیری پائل میرے گیت۔ فلم تیری پائل میرے گیت (تا مل گلوکارہ)

"راگ بلاول"

میری لاڈلی ہے۔ فلم انداز گلوکارہ لتا۔

بچپن کی محبت کو دل سے نہ جدا کرنا۔ فلم بیجو باورا، گلوکارہ لتا۔

میرے محبوب تجھے میری محبت کی قسم، فلم میرے محبوب، گلوکار لتا محمد رفیع۔

"راگ برنداوانی سارنگ"

ساون کے بادلو،
ان سے یہ جا کہو فلم رتن، گلوکارہ زہرہ بائی، کرن دیوان۔

جب تم ہی چلے پردیس، فلم رتن، گلوکار کرن دیوان۔

آجا میری محبت کے سہارے، فلم "انمول گھڑی"

گلوکارہ نور جہاں۔

تو میرا چاند میں تیری چاندنی فلم دل لگی گلوکار ثریا شیام

ساون آئے یا نہ آئے۔ فلم دل دیا درد لیا۔ گلوکار محمد رفیع

"راگ درباری"

دیّا رے دیّا لاج موہے لاگے۔ فلم لیڈر گلوکار آشا بھوسلے، محمد رفیع۔

گزرے ہیں آج عشق میں، فلم دل دیا درد لیا گلوکار محمد رفیع۔

کبھی دل دل سے ٹکراتا ہوگا
کہیں میرا خیال آتا ہوگا۔ فلم انوکھی ادا۔ گلوکار مکیش

محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے۔ بڑی چوٹ کھائی جوانی پہ روئے۔ فلم مغل اعظم، گلوکار لتا۔

او دنیا کے رکھوالے، سن درد بھرے میرے نالے۔ فلم بیجو باورا، گلوکار محمد رفیع۔

دنیا بدل گئی، فلم بابل، گلوکار طلعت محمود شمشاد بیگم

ہوئے ہم جن کے لیے برباد، فلم دیدار، گلوکار محمد رفیع

"راگ دیسی"

آج گاوت من میرو، فلم بیجو باورا گلوکار استاد امیر خان

راگ دھانی

اجنبی ٹھہرو ذرا فلم تاج محل

میرے محبوب میں کیا نہیں۔ فلم میرے محبوب گلوکار آشا بھوسلے لتا۔

راگ دھنسری

میرے محبوب تجھے میری محبت کی قسم فلم میرے محبوب، گلوکار لتا رفیع۔

راگ کھارا

موہے پنگھٹ پہ نند لعل چھیڑ گیو ری فلم مغل اعظم، گلوکارہ لتا۔

جب رات ہو ایسی متوالی، فلم مغل اعظم گلوکارہ لتا

راگ سارنگ

آئے نہ بالم وعدہ کر کے۔ فلم شباب گلوکار محمد رفیع

راگ گورکھ کلیان

دل کی کشتی، فلم پالکی، گلوکارہ لتا

او بالم تیرے پیار کے فلم رام اور شیام، گلوکار محمد رفیع آشا بھوسلے۔

راگ گھروا سارنگ

میرا سلام لے جا۔ فلم اڑن کھٹولا، گلوکارہ لتا

راگ ہمیر

مدھوبن میں رادھیکا ناچے رے۔ فلم کوہ نور، گلوکار محمد رفیع۔

راگ جے جے ونتی

زندگی آج مرے نام سے شرماتی ہے۔ فلم سن آف انڈیا، گلوکار محمد رفیع۔

محبت کی راہوں میں۔ فلم اڑن کھٹولا، گلوکار محمد رفیع۔

راگ جیین پوری

دل کو لاگے فلم انوکھی ادا، گلوکارہ اما دیوی۔

گزرے ہیں آج ہم اس مقام سے، فلم دل دیا درد لیا گلوکار محمد رفیع۔

راگ جوگیہ

او مرے لعل آجا فلم مدر انڈیا، گلوکارہ لتا۔

راگ کافی

جھوم جھوم کے ناچو آج، فلم انداز گلوکار مکیش

میری پیاری پتنگ فلم دل لگی، گلوکارہ اما دیوی، شمشاد بیگم۔

دنیا بدل گئی۔ فلم بابل، گلوکارہ شمشاد بیگم طلعت محمود۔

راگ بھیروی

موہے بھول گئے سانوریا، فلم بیجو باورا، گلوکارہ لتا۔

راگ کھماج

ڈھل چکی شام غم، فلم کوہ نور گلوکار محمد رفیع لتا۔

کون گلی جیو شیام، فلم پاکیزہ، گلوکارہ پروین۔

نین لڑ گئے ہیں، فلم گنگا جمنا گلوکار محمد رفیع۔

راگ للت

اک شہنشاہ نے بنوا کے حسین تاج محل، فلم لیڈر، گلوکار لتا

حقیقت یہ ہے کہ مجھے ذاتی طور پر راگ راگنیوں کا اتنا علم نہیں ہے اور..... موسیقی کے بارے میں مہارت کیا الف ب کا بھی علم نہیں ہے لیکن قدرتی طور پر موسیقی اور راگوں سے دلچسپی ہے اور قدرت نے یہ صلاحیت دی ہے کہ سریلی اور بے سری آواز کو پہچان سکتا ہوں۔ موسیقار اعظم نوشاد اور ان کے نغمات کے بارے میں بہت سی معلومات میں نے پروفیسر اشتیاق احمد کے مضامین سے اخذ کی ہیں۔ پروفیسر اشتیاق حسین بھی ایک انوکھی شخصیت ہیں۔ وہ اسٹاک ہوم یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس پڑھاتے رہے ہیں اور انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کے اعزازی فیلو ہونے کے علاوہ نیشنل یونیورسٹی آف سنگاپور کے فیلو بھی ہیں مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ برصغیر کی فلموں اور فلمی شخصیات کے بارے میں جاننے کا انہیں بہت شوق ہے۔ یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اشتیاق انہیں ہندوستان اور پاکستان کے فلمی مراکز میں لیے پھرا اور انہوں نے باقاعدہ انڈین فلموں اور فلمی شخصیات کے بارے میں تحقیق کی۔ ان کے مضامین سے میں معلومات اخذ کرتا ہوں۔ نوشاد صاحب کے بارے میں اس مضمون میں بھی ان کی تحقیق سے فائدہ اٹھایا ہے۔

نوشاد صاحب لوک موسیقی اور کلاسیکی موسیقی کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ انہوں نے تقریباً سبھی راگوں اور راگنیوں کو اپنے فلمی گیتوں کا مرکز بنایا ہے۔ یہ فہرست بہت زیادہ طویل ہے اور ہمارے عام قاری بھی راگ راگنیوں سے اتنی دلچسپی نہیں رکھتے۔ انہیں تو صرف اچھی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش ہے۔ اس لیے اب نوشاد صاحب کے سپرہٹ گانے درج کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح کردوں گا کہ یہ نغمات کن راگوں اور راگنیوں پر بنائے گئے ہیں۔

دکھ بھرے دن، فلم مدر انڈیا، گلوکار مناڈے، محمد رفیع آشا بھوسلے، لتا۔

من رنگ لو جی، فلم کوہ نور گلوکار محمد رفیع، لتا۔

اے شہر لکھنو فلم پالکی گلوکار محمد رفیع۔

اپنی زلفیں فلم تاج محل گلوکار ہری ہرن۔

دیا کرے گردھاری، فلم شباب، گلوکار استاد امیر خان۔

چلا گیا دے کے غم، فلم سن آف انڈیا، گلوکارہ لتا۔

محلوں میں رہنے والے، فلم شباب، گلوکار محمد رفیع۔

جبکہ حسبِ ذیل گیت پہاڑی راگ میں ہیں۔

آج کی رات میرے دل کی سلامی لے لے، فلم رام اور شیام، گلوکار محمد رفیع۔

آواز دے کہاں ہے، دنیا مری جواں ہے۔ فلم انمول گھڑی گلوکار سریندر، نور جہاں۔

دیکھو دیکھو ہنسے نہ زمانہ۔ فلم انمول گھڑی، گلوکارہ نور جہاں۔

تیرے نینوں نے چوری کیا، فلم انمول گھڑی، گلوکار ثریا۔

جواں ہے محبت، حسیں ہے زمانہ، فلم انمول گھڑی، گلوکار نور جہاں۔

رم جھم برسے، فلم رتن، گلوکارہ زہرہ بائی، امیر بائی۔

بتادے سکھی کون گیو شام، فلم پاکیزہ گلوکارہ پروین سلطانہ۔

دل توڑنے والے، فلم سن آف انڈیا، گلوکار محمد رفیع۔

دو ستاروں کا زمیں پہ ہے ملن آج کی رات، فلم کوہ نور گلوکار لتا محمد رفیع۔

کوئی پیار کی دیکھے جادوگری گلفام کو مل گئی لال پری، فلم کوہ نور، گلوکار رفیع، لتا۔

او دور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے ہم رہ گئے اکیلے، فلم اڑن کھٹولا، گلوکار محمد رفیع۔

سہانی رات ڈھل چکی نہ جانے تم کب آؤ گے۔ فلم دلاری گلوکار محمد رفیع۔

توڑ دیا دل مرا تو نے او بے وفا، فلم انداز، گلوکارہ لتا۔

تورا من بڑا پاپی سانوریا رے۔ فلم گنگا جمنا، گلوکارہ آشا بھوسلے۔

دنیا میں ہم آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا، فلم مدر انڈیا گلوکارہ لتا۔

تصویر بناتا ہوں تصویر نہیں بنتی، فلم دیوانہ، گلوکار محمد رفیع۔

نہ میں بھگوان...... فلم مدر انڈیا، گلوکار محمد رفیع۔

کس نے مجھے پکارا۔ فلم ساز اور آواز، گلوکار محمد رفیع، سمن۔

چھوڑ بابل کا گھر، فلم بابل، گلوکارہ شمشاد بیگم۔

نوشاد صاحب نے حسبِ ذیل نغمات راگ پیلو میں بنائے ہیں جو تقریباً سبھی ہٹ ہوئے تھے۔

چندن کا پالنا، ریشم کی ڈوری، فلم شباب، ہیمنت کمار لتا۔

ڈھونڈو ڈھونڈو رے ساجنا، فلم گنگا جمنا، گلوکارہ لتا۔

ہے ہے رسیا تو برا ہے بے دردی، فلم دل دیا درد لیا۔ آشا بھوسلے۔

جھولے میں پون کی آئی بہار، فلم بیجو باورا، محمد رفیع لتا۔

پیار بھی تو ہے، فلم ساتھی، گلوکار سمن مکیش۔

میرے سیاں جی اتریں گے پار، فلم اڑن کھٹولا، گلوکارہ لتا۔

نہ مانوں نہ مانوں، گنگا جمنا لتا۔

پی کے گھر آج پیاری دلہنیا، مدر انڈیا شمشاد بیگم۔

گھونگٹ نہیں کھولوں گی سیاں تورے آگے، فلم مدر انڈیا، گلوکارہ لتا۔

چہرے سے اپنے آج، پالکی، محمد رفیع۔

انکھیاں ملا کے جیا برما کے چلے نہیں جانا، فلم رتن، زہرہ بائی۔

ناصر خان

میں بھنورا تو پھول۔ فلم میلہ مکیش، شمشاد بیگم۔

لے جا میری دعائیں لے جا پردیس جانے والے دیدار، لتا۔

ساز ہو تم آواز ہوں میں۔ ساز اور آواز، محمد رفیع۔

پیار کیا تو ڈرنا کیا مغل اعظم، یہ نغمہ نوشاد نے راگ پوریا میں بنایا تھا۔

شبھ دنیا آیو راج دلارا، مغل اعظم میں یہ گانا بڑے غلام علی خان نے گایا تھا۔ یہ راگ راجیشوری میں بنایا گیا۔

محلوں میں رہنے والے۔ فلم شباب، گلوکار، محمد رفیع۔

غم دیئے مستقل کتنا نازک ہے دل یہ نہ جانا ہائے ہائے اے ظالم زمانہ، شاہجہاں، سہگل۔

دھرتی کو آکاش پکارے، میلہ، مکیش، شمشاد بیگم۔

دور کوئی گائے دھن یہ سنائے، بیجو باورا، لتا، شمشاد بیگم، محمد رفیع۔

گائے جا گیت ملن کے میلہ، مکیش، راگ دھارنگ۔

راگ تلنگ میں نوشاد صاحب نے یہ نغمہ فلم لیڈر کے لیے بنایا تھا۔ میری کہانی بھولنے والے دنیا تیری آباد رہے،

یمن کلیان راگ میں بنائے ہوئے نغمے بھی ملاحظہ کیجیے۔

دلربا میں نے تیرے پیار میں کیا کیا نہ کیا دل دیا درد لیا۔ گلوکار محمد رفیع۔

دلِ بے تاب کو، پالکی رفیع، سمن۔

جانے والے سے ملاقات نہ ہونے پائی، امر لتا۔

اے عشق ذرا جاگ تجھے حسن جگائے، فلم میرے محبوب، گلوکار محمد رفیع۔

خدا نگہبان ہو تمہارا، فلم مغل اعظم، لتا۔

میرے جیون ساتھی مجھے بھول نہ جانا، فلم بابل، گلوکار طلعت محمود۔

کون گلی گیو، فلم، پاکیزہ، پروین۔

دو ستاروں کا ملن، کوہ نور محمد رفیع، لتا۔

دل توڑنے والے، فلم، سن آف انڈیا محمد رفیع، لتا۔

(اس مضمون کے لیے 12 کتابوں سے مدد لی گئی ہے)

بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ دلیپ کمار کے بھائی ناصر خان نے ان سے پہلے اداکاری کے میدان میں قدم رکھا تھا اور پاکستان کی پہلی دو فلموں میں انہیں ہیرو بننے کا موقع ملا۔ یہ بالکل ابتدائی زمانے کا تذکرہ ہے جب پاکستان میں فلم سازی کے لیے نہ آلات تھے نہ اسٹوڈیو اور نہ ہی ہنرمند۔ اس کے باوجود باحوصلہ لوگوں نے فلم سازی کا آغاز کیا، ان میں ہدایت کار لقمان کی فلم شاہدہ، شامل ہے۔ فلم تیری یاد، شاہدہ سے پہلے ریلیز ہوگئی تھی لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ فلم تیری یاد کی فلم بندی متحدہ ہندوستان میں یعنی قیام پاکستان سے پہلے شروع ہوئی تھی اس لیے اس کو پہلی پاکستانی فلم نہیں کہا جاسکتا۔

پشاور سے شوکت رحمٰن خٹک صاحب بیماری کے باوجود فلمی الف لیلہ کے لیے دلچسپ تحریریں لکھتے رہے ہیں۔ ان کا تازہ ترین خط ملاحظہ کیجیے۔ انہوں نے ایک تو اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ ہم نے اداکار سریش کا اصلی نام فہیم احمد لکھا ہے۔ شوکت رحمٰن نے ان کا اصلی نام محمد سلیم لکھا ہے۔ سریش کا اصلی نام بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ وہ سریش ہی کے نام سے مشہور ہوئے اور آخر وقت تک اس نام سے اداکاری کرتے رہے۔ شوکت رحمٰن لکھتے ہیں کہ پشاور میں ان کا گھر میرے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ ان کے والد سرور خان پھلوں اور خشک میوے کا کاروبار کرتے تھے۔ ہم ان کے بھائی کو محبت سے گل جی کہا کرتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ اس تحریر میں بیشتر معلومات ان ہی سے حاصل کی گئی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔ ”آپ نے ماہنامہ سرگزشت ماہ فروری 13 میں پشاور کے فنکاروں پر ایک معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ فلمی الف لیلہ کے قارئین نے شہر خیال میں اس مضمون کی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اپنے پشاور کے فنکاروں پر اس مضمون کے پڑھنے سے دلی خوشی ہوئی کہ ایسے باکمال فنکاروں نے پشاور کا نام زندہ رکھا۔ آپ نے کچھ فنکاروں کے نام لکھے ہیں مگر ان پر معلومات فراہم نہیں کیں۔ میں آپ کی اجازت سے فلمی الف لیلہ کے پڑھنے والوں کے لیے معلومات دے رہا ہوں۔

جب ہندوستان فلم انڈسٹری کی تاریخ مرتب ہوئی تو اس میں اداکار ناصر خان کا نام سنہری لفظوں سے لکھا جائے گا۔ وہ دلیپ کمار سے عمر میں تقریباً دو سال چھوٹے تھے۔ مگر فلمی صنعت میں دلیپ کمار سے پہلے داخل ہوئے۔ ایک وقت تھا کہ ہندوستان کے تین بڑے اداکار دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند کا نام سرفہرست تھا مگر 1951ء میں ناصر خان نے اپنی بے ساختہ اداکاری سے ان تینوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ گلوکار سی ایچ آتما کی آواز دیگر گلوکاروں سے مختلف تھی۔ ناصر خان نے فلم آسمان میں سی ایچ آتما کے گائے ہوئے گانے اک ستارہ ہے آسماں پر کے فلمانے پر جو تاثرات دیے انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے یہ خود ناصر خان کی آواز ہے۔ ناصر خان نے جب فلم انڈسٹری میں قدم رکھا تو ایک فلم ساز نے ان کا معاوضہ ہضم کرنے کی کوشش کی۔ ناصر خان نے غنڈوں کا ایک گروپ بنا کر اس فلم ساز کے دفتر کا نقشہ بدل دیا اور وہ فلمساز عرصہ تک سر پر پٹیاں باندھے پھرتا رہا۔ بعد میں ناصر خان نے اسے معاف کر دیا تھا۔

جب تک ناصر خان فلم انڈسٹری میں رہے ان کا رعب قائم رہا اور وہ دادا کے نام سے مشہور تھے۔ کسی فلم کے کمزور کارکن سے کوئی فلم ساز زیادتی کرتا تو وہ ناصر خان کے پاس فریاد لے کر آتا اور وہ منٹوں میں اس کی شکایت دور کر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے جب بے باک اداکارہ بیگم پارہ سے محبت کی تو اس کو دل میں بسا لیا۔ اس سے شادی کی خاطر انہوں نے خاندان بھر سے مخالفت مول لی۔

ناصر خان کی اداکاری کا اپنا انداز تھا، بڑا بھولا پن تھا۔ دھیمی آواز، چہرے کے ساتھ آنکھوں کے تاثرات نمایاں تھے۔ فلم فیئر ایوارڈ کے علاوہ ان کا ایک اور اعزاز یہ ہے کہ وہ پاکستانی فلم انڈسٹری کی پہلی ریلیز ہونے والی فلم تیری یاد، کے ہیرو تھے۔ فلم گنگا جمنا میں دلیپ کمار اور ناصر خان نے فلم میں بھائیوں کا کردار ادا کیا تھا۔ دلیپ کمار نے ڈاکو اور ناصر خان نے پولیس آفیسر کا کردار ادا کیا تھا۔ آخری منظر میں جب وہ دلیپ کمار پر گولی چلاتا ہے، اس منظر میں ان دونوں نے اتنی غضب کی اداکاری کی کہ فلم بین یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ بہتر اداکاری کس نے کی۔ اداکار ناصر خان کی زندگی نے زیادہ وفا نہیں کی ان کی کہانی پیشِ خدمت ہے۔

قصہ خوانی بازار کے ساتھ محلہ خداداد میں غلام سرور خان کے ہاں 1924 میں پیدا ہوئے۔ غلام سرور خان پشاور میں پھلوں کا کاروبار کرتے تھے۔ ناصر خان کی ابتدائی تعلیم مسجد اور گھر کے قریب انجمن اسلامیہ اسکول میں ہوئی۔ ناصر خان کا بچپن پشاور کے گلی کوچوں میں کھیلتے گزرا۔ ناصر خان کو بچپن سے پڑھائی میں دلچسپی نہیں تھی۔ پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد پشاور میں غلام سرور خان کا کاروبار زوال کا شکار ہوا تو انہوں نے بمبئی جانے کا فیصلہ کیا۔ بمبئی کی کرافورڈ مارکیٹ میں ایک دکان کرایہ پر لے کر انہوں نے نئے سرے سے پھلوں کا کاروبار شروع کیا۔ جب غلام سرور خان کا کاروبار چل پڑا اور ساکھ بحال ہوئی تو انہوں نے پشاور سے اپنی بیوی اور بچوں کو بمبئی بلا لیا۔ ناصر خان کو بمبئی کے اسلامیہ انجمن اسکول میں داخل کرایا گیا۔ ناصر خان کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے مگر ناصر خان والدین کی یہ خواہش پوری نہ کر سکے۔ ایک دن وہ اپنے دوستوں کے ہمراہ فلمستان اسٹوڈیو میں ایک فلم کی شوٹنگ دیکھ رہے تھے کہ مشہور ڈائریکٹر نتن بوس کی نظر ناصر خان پر پڑی وہ ان کی مردانہ شکل صورت اور تاثرات سے متاثر ہوئے نتن بوس نے ناصر خان کو اپنی فلم مزدور میں بطور ہیرو کاسٹ کیا۔ فلم کی ہیروئن ویرا تھیں۔ ماہوار 350 روپے پر ناصر خان نے والدین کی اجازت کے بغیر کنٹریکٹ پر دستخط کر دیے۔ معاوضے کی پہلی قسط لے کر، اپنے والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ناصر خان نے بڑے فخر سے اپنے والد کو 350 روپے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری پہلی کمائی ہے اب تو آپ مجھے نکھٹو نہیں کہیں گے۔ ہر ماہ مجھے یہ رقم ملتی رہے گی۔ میں نے بطور ہیرو فلم میں کام شروع کر دیا ہے۔

سرور خان یہ سن کر آگ بگولا ہو گئے۔ انہوں نے غصے سے کہا کیا میں نے تمہیں پشاور سے ڈوم کنجر بنانے کے لیے بلایا ہے؟ غلام سرور خان کے بیٹے ہو کر تم نے گھٹیا کام شروع کر دیا اور مجھے خاندان کے سامنے ذلیل کر دیا۔ غلام سرور خان نے غصہ میں آکر تمام نوٹ پھاڑ کر کھڑکی کے باہر پھینک دیے اور ناصر خان کو برا بھلا کہتے ہوئے کمرے سے چلے گئے۔ مگر ناصر خان پر ان باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔

موسیقار اعظم نوشاد

فلم مزدور 1945 میں مکمل ہو کر ریلیز ہو گئی۔ ناصر خان کا کام پسند کیا گیا مگر کاروباری لحاظ سے فلم فیل ہو گئی۔ فلمستان کی دوسری فلم شہنائی سے ناصر خان کو شہرت ملی۔ فلم میں ریحانہ ان کی ہیروئن تھی۔ شہنائی 1947ء میں ریلیز ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ انہی دنوں پاکستان بن گیا۔ پاکستان میں فلموں کا کاروبار بھی ٹھپ ہو گیا۔

دلیپ کمار نے ناصر خان کو مشورہ دیا کہ پاکستان سے فلموں کا آغاز اچھا ہوگا۔

ڈائریکٹر لقمان سے دلیپ کمار کے بہت اچھے تعلقات تھے کیونکہ لقمان کے کہنے پر شوکت حسین رضوی نے جگنو، میں دلیپ کمار کو بطور ہیرو کاسٹ کیا تھا۔ جگنو سے پہلے دلیپ کمار کی دو فلمیں جوار بھاٹا اور ملن فلاپ ہو گئی تھیں۔ شوکت حسین رضوی اداکار رحمان کو جگنو میں ہیرو لینا چاہتے تھے۔ لقمان ایک کہنہ مشق اور تجربہ کار ہدایت کار اور شوکت صاحب کے چیف اسسٹنٹ تھے۔ پہلے وہ سہراب مودی کے یونٹ میں تھے بعد میں شوکت حسین رضوی کے اسسٹنٹ بنے۔ لقمان نے دلیپ کمار کو تسلی دی کہ میری فلم میں ناصر خان ہی ہیرو ہوں گے۔ پاکستان میں داؤد چاند فلم تیری یاد بنا رہے تھے۔ لقمان نے فلم شاہدہ میں ناصر خان کو ہیرو کاسٹ کیا۔ تیری یاد میں آشا پوسلے ہیروئن تھی جبکہ شاہدہ میں شمیم ناصر خان کی ہیروئن تھی۔ بعد میں اداکارہ شمیم نے انور کمال پاشا سے شادی کر لی تھی اور فلمی دنیا چھوڑ دی تھی۔ اگرچہ لقمان کی فلم شاہدہ کا آغاز دیگر فلموں سے پہلے ہوا تھا۔ لقمان پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر کا اعزاز حاصل کرنا چاہتے تھے مگر سرمائے کی قلت کی وجہ شاہدہ کی رفتار فلمبندی سست رہی۔ تیری یاد پہلے ریلیز ہوئی اور بعد میں شاہدہ۔ لیکن بدقسمتی سے دونوں فلمیں ناکام ثابت ہوئیں مگر داؤد چاند کو پاکستان کا پہلا ڈائریکٹر، ناصر خان کو پہلا ہیرو اور آشا پوسلے کو ہیروئن کا اعزاز حاصل ہوا۔ ناصر خان جب پاکستان آئے انہوں نے اداکار نذیر کی بیٹی ثریا سے شادی کی اور میکلوڈ روڈ رتن سینما کے سامنے اپنا ڈسٹری بیوشن آفس بھی قائم کیا۔ ستمبر 1948 تک ناصر خان کی دونوں فلمیں بری طرح فلاپ ہو گئیں بعد میں پاکستان میں ناکام فلموں کا سلسلہ شروع ہوا جن میں خانہ بدوش، بت شکن، بھیگی پلکیں، محبوب وغیرہ شامل ہیں۔ دوسری جانب انڈیا کی فلم انڈسٹری ترقی کی جانب گامزن تھی۔ ناصر خان کے دوستوں نے انہیں انڈیا آنے کے لیے لکھا۔ ناصر خان نے انڈیا جانے کے لیے رختِ سفر باندھ لیا مگر ان کی بیوی ثریا وہاں جانا نہیں چاہتی تھیں۔ مجبور ہو کر ناصر خان نے ثریا کو طلاق دے دی اور واپس بمبئی پہنچ گئے۔

ناصر خان کی خوش قسمتی تھی کہ فلم والوں نے ناصر خان کا اچھا استقبال کیا۔ فلموں میں ناصر خان اچھے اداکار تھے مگر غلط کہانیوں، کمزور ہدایت کاروں کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ناصر خان کو جتنی فلمیں ملیں وہ سب فلاپ ہو گئیں مگر 1951ء میں انہیں پانچ فلمیں ملیں جو بے حد کامیاب ہوئیں۔ اس سے پہلے ایک ناکام فلم کے ڈائریکٹر نے اداکار ناصر خان کی رقم دبالی۔ کسی بھی طرح وہ پیسے نہیں دینا چاہتا تھا۔ ناصر خان نے غنڈوں کی ٹیم بنا کر اس ڈائریکٹر اور فلمساز پر چڑھائی کر دی تو فلمساز نے وہ رقم ادا کر دی۔ یہ 1950 کا ذکر ہے اس دن سے ناصر خان کا نام دادا پڑ گیا۔ فلم والے ان سے بہت ڈرتے تھے۔ مختیار نے ناصر خان پر کہانی لکھی ”بمبئی کا دادا،“ دلیپ کمار کو پتا چلا تو انہوں نے ناصر خان کو اس فلم میں کام کرنے سے روکا۔ دلیپ کمار کے کہنے پر ناصر خان نے انکار کر دیا بعد میں اس فلم میں ردوبدل کر کے فلم ریلیز کر دی گئی۔ ان پانچ کامیاب فلموں میں اداکارہ مدھوبالا کی ذاتی فلم نازنین، بھی شامل ہے۔ اس فلم کے ڈائریکٹر اداکار جینت کے بھائی این کے زیدی

(نذیر خان زبیری) تھے۔ نازنین کی کاسٹ میں ناصر خان مدھوبالا جینت اور اوم پرکاش شامل تھے۔ اس فلم میں ناصر خان کی اداکاری دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اوم پرکاش پر باتیں کرتے کرتے سکتہ طاری ہوجاتا تھا۔ اوم پرکاش فلم میں مدھوبالا کے باپ بنے تھے۔ ناصر خان پر طلعت محمود کا ایک گانا فلمایا گیا جس کے بول یہ تھے۔

چاندنی راتوں میں جس دم یاد آجاتے ہو تم۔ فلم نازنین کے بعد ناصر خان نے فلم خزانہ میں کام کیا۔ ان کی ہیروئن مدھوبالا تھیں۔ انہوں نے نوتن کے ساتھ فلم نگینہ میں کام کیا۔ سی ایچ آتما کے گائے ہوئے نغمے میں ناصر خان نے بہت اچھے تاثرات دیے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ناصر خان کی آواز ہے گانے کے بول ہیں، دل بیقرار ہے میرا دل بیقرار ہے۔ اک بے قدر کا تیر میرے دل کے پار ہے۔ دنیا کے ساتھ ساتھ وہ بھی بدل گئے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے جنازے نکل گئے۔"

فلم آسمان میں بھی سی ایچ کا گانا ناصر خان پر فلمبند ہوا جو بے حد مقبول ہوا۔ ناصر خان کا یہ وہ دور تھا کہ وہ اپنے بھائی دلیپ کمار کو اداکاری میں پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ فلم نخرے میں گیتا بالی، سوداگر میں ریحانہ ناصر خان کی ہیروئن تھیں۔ ناصر خان کی کامیاب فلموں کی تفصیل طویل ہے ان کی مشہور فلموں میں شریمتی جی، آغوش، شبنم، لال کنور، سوسائٹی، ہنگامہ، دائرہ، چار مینار، سمندری ڈاکو، وغیرہ شامل ہیں۔ ناصر خان کی ہیروئنوں میں زیادہ تر شیاما، مینا کماری، مدھوبالا، نوتن، نادرہ اور ثریا شامل ہیں۔ 1956ء میں ناصر خان کو فلم "ہمجولی" ملی۔ بیگم پارہ اس فلم میں ڈاکو عورت کا کردار ادا کررہی تھی۔ اس فلم سے ناصر خان اور بیگم پارہ کا رومانس شروع ہوا تھا بعد میں دونوں نے شادی کرلی۔ بیگم پارہ خوبرو، بے باک اور آزاد خیال تھی، شادی کے بعد ناصر خان کے خاندان والوں سے بیگم پارہ کی نہ بنی تو ناصر خان نے اسے الگ کوٹھی خرید کردی۔ ناصر خان بیگم پارہ کو دل و جان سے چاہتے تھے۔

بیگم پارہ بھی ناصر خان کو بہت چاہتی تھی مگر آزاد خیالی اس کی فطرت میں شامل تھی۔ وہ خراب عورت نہ تھی لیکن آزاد خیال تھی اس کی شادی فلمی دنیا کی کامیاب شادیوں میں شمار ہوتی ہے۔ شادی کے بعد بیگم پارہ نے فلموں میں کام کرنا چھوڑ دیا۔

1958ء میں ناصر خان نے اپنے بھائی دلیپ کمار کے اشتراک میں فلم گنگا جمنا بنائی۔ ناصر خان اس فلم میں پولیس انسپکٹر تھے اور دلیپ کمار ڈاکو۔ دونوں کی اداکاری قابلِ تعریف ہے۔ خاص طور پر جب ناصر خان دلیپ کمار کو گولی مارتا ہے تو دونوں کے ڈائیلاگ اور تاثرات اتنے زبردست تھے کہ فلمی ناقدین یہ فیصلہ نہیں کرسکتے تھے کہ ان دونوں میں کس کی اداکاری اچھی ہے۔

گنگا جمنا 10 نومبر 1961 کو ریلیز ہوئی اور سال کی بہترین فلم قرار پائی۔ تین فلم فیئر ایوارڈز کے علاوہ بوسٹن (امریکا) میں بھی اس فلم کو ایوارڈ دیا گیا۔ کوئی غلط دوا کے استعمال سے ناصر خان کے بال اور بھویں اڑ گئے تھے۔ وہ کسی طرح ہیرو نظر نہیں آتے تھے ان کی آخری فلم سایہ تھی جس میں نگار سلطانہ ان کی ہیروئن تھیں۔ خاندان والوں کے ساتھ اختلاف شدت اختیار کرگئے تھے جسمانی لحاظ سے بدصورتی نے بھی ان کو فلم لائن سے الگ کردیا۔ 150 ایکڑ پر مشتمل ذاتی زمین پر ناصر خان نے پولٹری فارم کھولا۔ انکم ٹیکس اور حکومت کی بے جا مداخلت پر مجبوراً پولٹری فارم ختم کرکے فلمسازی کی جانب آئے۔ ضد کے نام سے فلم شروع کی۔ اس فلم میں سائرہ بانو، سنجے خان نے مرکزی کردار کیے تھے۔ فلم کافی بن چکی تھی کہ ایک روز شوٹنگ کے دوران ناصر خان پر جان لیوا دل کا دورہ پڑا اور وہ وفات پاگئے۔

3 جون 1974 کو ناصر خان کا انتقال ہوا۔ ناصر خان کی وفات کے بعد ان کی فلم بیراگ 1976 میں ریلیز ہوئی جس میں انہوں نے ڈاکٹر کا کردار کیا تھا۔ ناصر خان کی وفات سے بیگم پارہ کی دنیا اجڑ گئی۔ ناصر خان نے بیگم پارہ کے لیے کافی جائداد اور رقم چھوڑی تھی۔ فلم ضد کو نئے سرے سے بنانے کے لیے بیگم پارہ کراچی بھی آئی تھیں۔ ماڈرن اسٹوڈیو میں فلم کی اوپننگ ہوئی تھی۔ بیگم پارہ کو پاکستان کا مشرقی ماحول پسند نہیں آیا اور وہ فلم بنانے کا ارادہ ترک کرکے واپس چلی گئیں۔ ناصر خان سے بیگم پارہ کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ ایوب خان فلم لائن سے وابستہ ہیں جبکہ ایک بیٹی امریکا میں ہے۔ چاروں بچے مالی لحاظ سے مستحکم ہیں۔ یہاں کے فنکاروں میں ناصر خان کا بھی نمایاں مقام تھا۔ فلمی الف لیلہٰ کے پڑھنے والوں نے شہرِ خیال میں بیماری کے مدِنظر دعاؤں میں یاد کیا اللہ تعالیٰ ان سب کو اس کا اجرِ عظیم دے کہ ایک بیمار کو یاد کیا۔

جاری ہے

وہ خود میں منفرد اداکار تھا۔ اس میں بہت سی خصوصیت تھیں، اداکاری کا جوہر اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا، اس نے فلمی اداکاری میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

ایک بہت بڑے اداکار کا مختصر سا تذکرہ

شکیل ادریس

مارلن برانڈو

کوئی فن کار جب شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جائے تو اسے اپنی قدر و قیمت اور اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ وہ اپنی شہرت و عظمت سے دست بردار نہیں ہوتا، اپنے اسکینڈل بنواتا ہے، اپنے مداحوں سے مصافحہ کرتے وقت چمکیلے دانتوں کی نمائش کرتا ہے، انٹرویو دیتے وقت سیکڑوں ایسی چیزیں اپنی ذات سے جوڑ دیتا ہے جو اس کی ذات کا حصہ ہی نہیں ہوتیں۔ اخبارات میں تصویر چھپوانے کے لیے پوز دیتے وقت نئے زاویے تلاش کرتا ہے۔ مگر ایک اداکار ایسا بھی تھا جس کے پیچھے مداحوں کی بھیڑ ہوتی تھی اور وہ اپنے ہاتھوں میں آٹوگراف بک تھامے اس کے حسنِ نظر کے منتظر رہا کرتے تھے۔ لیکن وہ آٹوگراف دینے سے کتراتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میرے آٹوگراف کی کیا حیثیت ہے؟ میں اگر دس بار بھی بکس پر دستخط کروں تو وہ جان وین جیسے عظیم فن کار کے ایک دستخط کے ہم پلہ نہیں ہوسکتے۔

اس کے مداحوں کو اس کی یہ دلیل مطمئن نہ کرسکی۔ وہ تو اس کے آٹوگراف محفوظ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں حاصل کرنے کے لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ وہ اس بینک میں پہنچ گئے جہاں اس کا اکاؤنٹ کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے کیشیئر کو اپنے ساتھ ملا لیا کہ جب بھی ان کے محبوب اداکار کا

کوئی چیک کیش ہونے کے لیے آئے تو وہ اسے کیش نہ کرے اور انہیں فون کردے۔ وہ چیک پر لکھی رقم سے زیادہ رقم دے کر اس چیک کو خرید لیں گے۔ اضافی رقم وہ چاہے تو اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔

کیشیئر کو بھلا اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اس نے کئی چیک فروخت کرکے اچھی خاصی رقم کمالی اور اس اداکار کو دعائیں دیں جس کی بدولت وہ بیٹھے بٹھائے مال دار ہوا جارہا تھا۔

ربع صدی تک سلور اسکرین پر اس کا سکہ جما رہا اور وہ حسیناؤں کے خواب میں آتا رہا۔ وہ نئی نسل کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ اس لیے کہ وہ خاص انداز کی جیکٹ اور جینز پہنتا تھا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جینز اور جیکٹ کے پاگل پن میں نئی نسل اسی کی وجہ سے مبتلا ہوئی۔ چنانچہ جب مادام تساؤ کے عجائب گھر میں اس کا موی مجسمہ رکھا جانے لگا تو اسے موٹر سائیکل پر بٹھا کر اس کی تصاویر کھینچی گئیں اور پھر اس کا موی مجسمہ بنایا گیا۔

وہ حلیم، بُردبار اور نرم دل تھا۔ غریبوں کی مدد کرنا اس کا شیوہ تھا۔ خاص طور پر نیگروز سے اسے ہمدردی تھی۔ جب وہ دولت سے کھیل رہا تھا تو اس نے کالوں کی بہت سی تنظیموں کو چندہ دینا شروع کیا۔ بچہ بچہ اس کے نام اور کام سے واقف تھا۔ ویسے کسی زمانے میں جب وہ ہالی ووڈ آیا تھا تو اس کے جسم پر پھٹی ہوئی پتلون تھی اور اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور چھوٹے چھوٹے کردار ادا کرنے کے بعد ہیرو بنا اور پھر اس نے اپنی فن کاری سے بڑا مقام بنالیا اور اسے دنیا کے سب سے بڑے ایوارڈ کا مستحق قرار دیا گیا۔

اس اہم شخصیت کا نام مارلن برانڈو تھا۔

ماریو پزو کے شہرہ آفاق ناول ”گاڈ فادر“ کا ہیرو۔ جسے اس نے لازوال بنا کر اپنا نام فلم کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھوایا۔ اس کے بارے میں بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ آیا، اس نے دیکھا اور اس نے فتح کرلیا۔ رومن ایمپائر کو نہیں بلکہ ہالی ووڈ کو! مارلن برانڈو بلاشبہ عظیم ترین اداکار تھا۔ اگر کوئی اس کا مقابل تھا تو وہ صرف اولیور ریڈ تھا، جس کی قدرتی اداکاری کو دیکھ کر لوگ اسے خراجِ عقیدت پیش کرتے تھے مگر وہ بہر حال اسٹیج کا اداکار تھا جب کہ برانڈو نے فلم میں اپنی فن کاری کے جوہر دکھائے تھے۔ برانڈو اسٹیج سے نابلد نہیں تھا، البتہ اس نے تھوڑا عرصہ کام کرنے کے بعد 1949ء میں براڈوے کا اسٹیج چھوڑ دیا تھا۔ تنقید نگاروں نے اس کے اس اقدام کو اس وقت بچکانہ بلکہ احمقانہ قرار دیا جب 1960ء میں اس کی فلمیں باکس آفس پر فلاپ ہونے لگیں اور اس کی شہرت کا تارا گہنا گیا تھا۔

برانڈو اپنی فلموں کی ناکامی پر ہراساں اور پریشان نہیں تھا۔ یہ اس کی خود اعتمادی تھی جو اسے ایک بار پھر تاریکیوں سے نکال لائی۔ وہ امر ہوگیا۔ اس کی پہلی فلم ”اے اسٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر“ تھی جو 1951ء میں بنی تھی۔ طویل عرصہ تک اسکرین پر چھائے رہنے کا ریکارڈ اس کے سوا صرف جان بیری مور نے قائم رکھا تھا۔ اس کے علاوہ اسپنسر ٹریسی بھی تھا جس نے اپنی اداکاری کا سکہ کافی عرصے تک جمائے رکھا اور وہ ناظرین کی دلوں کی دھڑکن بنا رہا۔ مگر اولیور ہو یا ٹریسی کسی نے اداکاری کو اتنے حقیقی انداز میں نہیں برتا جیسا کہ برانڈو نے۔ اس کا سب سے بڑا ہتھیار اس کی منفرد آواز تھی۔ لوگ اس سے مسحور ہوجاتے تھے اور یہ تمنا کرتے تھے کہ برانڈو بولتا رہے اور وہ سنتے رہیں۔

مارلن برانڈو کے جدِ اعلیٰ جرمن، ڈچ، انگلستان اور آئرلینڈ سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ جرمنی سے ہجرت کرکے 1700ء میں نیویارک آئے تھے۔ برانڈو کی دادی میری ہالوے نے اس وقت خاندان کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیا جب برانڈو کے باپ کی عمر پانچ برس تھی۔ اس لیے کہ اسے اپنے شوہر کی شراب نوشی اور جوئے کے لیے رقم اکٹھا کرنا پڑتی تھی۔

برانڈو 3 اپریل 1924ء کو اوماہا نبراسکا کے ایک میٹرنٹی اسپتال میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک کیمیا فروش کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ کیلشیئم کاربونیٹ فروخت کیا کرتا تھا۔ وہ ایک اچھا فوٹو گرافر بھی تھا۔ اس کی ماں ڈوروتھی بیکر نے تین بچوں کو جنم دیا تھا۔ وہ ایک ہنر مند اور سلیقہ مند خاتون تھی۔ چونکہ اسے فلموں میں کام کرنے سے بھی دل چسپی تھی اس لیے وہ اس زمانے میں مردوں کی طرح پتلون پہنتی اور کار چلاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اسٹیج کی منتظمِ اعلیٰ بھی تھی۔ اس نے ہنری فونڈا کو اپنا کیریئر شروع کرنے میں مدد دی تھی۔

جب برانڈو کی عمر صرف گیارہ برس تھی تو اس کے والدین میں علیحدگی ہوگئی۔ (حالانکہ ان کی شادی عشق کا نتیجہ تھی) یہ 1935ء کا زمانہ تھا۔ اس کی ماں اپنے بچوں کو لے کر کیلیفورنیا چلی گئی، جہاں اس کی ماں رہتی تھی۔ 1937ء میں والدین میں صلح ہوگئی اور اس کا باپ اپنے خاندان کو لے کر لبرٹی وائل، ایلے نوائس چلا گیا جو شکاگو کا ایک مضافاتی علاقہ ہے۔

برانڈو کی بڑی ہمشیرہ جوکلائن نے اداکاری سیکھنے کے لیے ایک ادارے میں تربیت حاصل کی تھی، اس کے بعد وہ اسٹیج کے ڈراموں میں کام کرنے لگی۔ جب اس کی صلاحیتوں نے رنگ دکھانا شروع کیا تو اس نے ٹیلی وژن کے ڈراموں میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔

برانڈو کی دوسری ہمشیرہ فرینی کو آرٹ سے دلچسپی تھی۔ دونوں کو ہی اپنی قسمت آزمانے کا شوق تھا اور وہ اس شوق کے ہاتھوں مجبور ہوکر نیویارک جانا چاہتی تھیں۔ وہاں دنیا کے ہر خطے سے لوگ قسمت کا جوا کھیلنے آتے ہیں۔ کچھ جیت جاتے ہیں اور کچھ اندھیروں میں بھٹکتے رہ جاتے ہیں۔

جب برانڈو نے ہائی اسکول کے ڈراموں میں کام کرنا شروع کیا تو طالب علموں کے علاوہ اساتذہ نے اس کی تعریفیں کیں اور اس پر عقیدت کے پھول نچھاور کیے۔ چنانچہ اس کے دل میں بیٹھ گیا کہ اسے اداکار بننا چاہیے۔ دنیا میں اس کے سوا اور کوئی پیشہ اس کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اس کی ماں کو اس کے ارادوں کا علم تھا، وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی تھی۔

جنگ کے زمانے میں اسے فوج میں شامل نہیں کیا گیا اس لیے کہ فٹ بال کھیلنے کے دوران اس کے ایک گھٹنے میں چوٹ لگ چکی تھی اور اسے چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔ اسکول میں اسے فٹ بال بھی نہیں کھیلنے دیا جاتا تھا۔ کالج میں چونکہ اسے تعلیم سے زیادہ اداکاری کا شوق تھا اور وہ کلاس میں بھی اس کے نمونے پیش کرتا رہتا تھا۔ وہ نصابی کتابوں کے سبق یاد کرنے کے بجائے مشہور فن کاروں کی فلموں کے مکالمے یاد کرتا تھا اور موقع ملنے پر اپنے دوستوں کو بھی سنایا کرتا تھا، جب اساتذہ تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے اسے گریجویشن سے پہلے ہی کالج سے نکال دیا۔

کالج سے نکالے جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اسے موٹر سائیکل چلانے کا شوق تھا۔ اسی شوق میں وہ ایک بار کالج میں موٹر سائیکل لے کر آیا اور اس نے کلاسوں میں اور راہداریوں میں موٹر سائیکل چلانی شروع کردی۔ اساتذہ کو یہ بات ذرا بھی پسند نہیں آئی لہٰذا انہوں نے اسے کالج سے نکالنے کی درخواست دے دی، جو منظور بھی ہوگئی۔ یوں برانڈو کالج سے باہر آگیا اور اس کا تعلیمی سلسلہ پیچھے رہ گیا۔

انہی دنوں کا ایک دل چسپ واقعہ وہ بیان کرتا ہے کہ ملٹری کالج میں ایک گھنٹا لگا ہوا تھا جو تھوڑی تھوڑی دیر بعد بجا کرتا تھا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سپاہیوں کو کس وقت کیا کرنا ہے۔ برانڈو کو اس گھنٹے کی آواز بہت بری لگتی تھی۔ چنانچہ اس نے گھنٹا وہاں سے اتارا اور دور لے جا کر زمین میں دفن کر دیا۔ دو روز تک سناٹا چھایا رہا جو سپاہیوں کو قطعی اچھا نہ لگا، اس لیے کہ وہ اس کے مطابق کام کرنے کے عادی ہوچکے تھے۔ تیسرے دن منتظم نے وہ گھنٹا تلاش کرنے کی مہم شروع کی اور اسے زمین سے کھود کر نکال لیا۔ تب برانڈو نے قہقہے لگا کر اپنے دوستوں کو یہ واقعہ سنایا۔

اسے اداکاری کا شوق تھا لیکن باپ اس معاملے میں سنجیدہ نہیں تھا۔ والدین شراب پینے کے شوقین تھے اس لیے احساسات سے بے گانہ تھے۔ اس کے علاوہ ان میں سے کوئی نہ کوئی جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر آتا، اس لیے کہ وہ رات کو پی کر مغلظات بکتے ہوئے سڑکوں پر پھرتے تھے اور پولیس انہیں حوالات میں دھکیل دیتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ برانڈو صبح اٹھ کر منہ دھونے کے بعد اپنے والدین کی فکر کرتا اور انہیں قصبے کی جیل سے چھڑا کر لے آتا اور حوالدار صاحب سے معافی بھی مانگتا کہ آیندہ اپنے والدین کا پوری طرح خیال رکھے گا کہ وہ قانون کی خلاف ورزی نہ کریں۔

باپ نے جب دیکھا کہ برانڈو کے پاس کوئی کام نہیں ہے تو اسے گڑھے کھودنے پر لگا دیا۔ بجلی کی تاریں بچھانے کے لیے بجلی کی کمپنی مزدوروں سے گڑھے کھدواتی تھی۔ برانڈو کا اس کام میں دل نہیں لگا تو وہ کمپنی سے بھاگ آیا۔

باپ کے بارے میں اس کے خیالات زندگی کے آخری لمحات تک اچھے نہیں تھے۔ وہ اپنی خود نوشت میں لکھتا ہے کہ اگر میرا باپ اس دور میں زندہ ہوتا تو میں نہ جانے اس

برطانیہ سے شائع ہونے والے میگزین ایمپائر نے جب ہر زمانے کے سو بڑے اداکاروں کی فہرست بنائی تو برانڈو کو تیرھواں نمبر دیا۔ اس کے بعد جب ایمپائر میگزین نے 1995ء میں سب سے زیادہ دل کش فلمی اداکاروں کی فہرست تیار کی تو اسے 14واں نمبر دیا۔

فلموں کی شوٹنگ کے دوران اسے بھولنے کا مرض بھی ہوگیا تھا لہٰذا اس کے لیے کارڈ تیار کیے جاتے تھے جن پر اس کے مکالمے لکھے جاتے اور انہیں کسی مقام پر رکھ دیا جاتا تھا تاکہ کیمرے کی آنکھ اسے نہ دیکھ سکے۔ مثال کے طور پر فلم سُپر مین میں جو نومولود نونہال اس کی گود میں تھا۔ اس کے مکالمے نونہال کی چڈی پر لکھے ہوئے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے ساتھ کیا کر بیٹھتا۔ جب وہ مر گیا تھا تو میں سوچا کرتا تھا کہ اے خدا اسے صرف چند منٹ کے لیے زندہ کر کے میرے پاس بھیج دے تاکہ میں اس کا جبڑا توڑ سکوں۔

اپنے بارے میں وہ کہتا ہے کہ میری پیدائش نصف شب سے ایک گھنٹا پیشتر ہوئی تھی۔ مجھے برداشت اور تحمل اپنی ماں کی طرف سے ملا ہے جب کہ مجھ میں جو اکھڑ پن ہے وہ میرے باپ کا ورثہ ہے۔ جب وہ غصے میں ہوتا تھا تو خاموش ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد طوفانِ باد و باراں کی طرح پھٹ پڑتا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ ایک بندر نما انسان تھا۔ جب میری عمر تین یا چار برس کی تھی تو ایک گورنس ہمارے ساتھ رہنے کو آئی تھی۔ وہ اٹھارہ برس کی تھی۔ اس کے بال سیاہ مگر ریشمی تھے۔ وہ مجھے بہت چاہتی تھی، میں بھی اسے پوجنے لگا تھا۔ اس کے سہارے میں نے بہت کچھ سیکھا۔

ماں کو ہزاروں کی تعداد میں نغمے یاد تھے۔ وہ مجھے نغمے سنایا کرتی تھی۔ اسے نغمات کی تاریخ بھی یاد تھی، یعنی وہ کس گلوکار نے گائے اور کس نے موسیقی دی۔ اس کا حافظہ بلا کا تھا، میں نے بہت کم ماؤں میں ایسی یادداشت دیکھی ہے۔

☆☆☆

وہ جانتا تھا کہ ہدایت کار چاہے فلمی ہوں یا اسٹیج سے تعلق رکھنے والے، اس کی طرف اس وقت تک آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھیں گے جب تک کہ وہ کہیں نہ کہیں سے تربیت حاصل نہ کر لے گا۔ چنانچہ اس نے نیویارک کے پسکارٹر ڈرامیٹک ورک شاپ میں داخلہ لے لیا۔ وہاں اسٹیلا ایڈلر نامی معلمہ نے اسے تربیت دینا شروع کی۔ وہ ابتدا ہی سے ایک روسی ہدایت کار سے متاثر تھی جس کا کہنا تھا کہ اپنے تجربات پر غور و خوض کرو اور پھر انہیں پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ استعمال کرو۔

ورک شاپ میں قیام کا مناسب بندوبست تھا۔ اسے ایک لڑکے کے ساتھ ایک کمرا دیا گیا، جس کا نام ویلی کوکس تھا۔ وہ دونوں جلد دوست بن گئے۔ ان کی دوستی تادیر قائم رہی۔ کوکس جب اڑتالیس برس کی عمر میں عارضۂ قلب سے جانبر نہ ہو سکا تو برانڈو بہت اداس ہوا۔ اس نے ایک ماہ تک کسی فلم کی شوٹنگ نہیں کی۔ تھوڑے دنوں بعد اس نے کوکس کی بیوہ سے ...... شوہر کی خاک مانگی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسے سمندر میں جا کر بہانا چاہتا ہے۔ بیوہ نے اسے خاک دے دی لیکن برانڈو نے وہ خاک لے جا کر اپنے مکان کے تہ خانے میں رکھ دی۔ (یہ انکشاف اس نے اپنی سوانح حیات میں کیا ہے) پھر اس نے وصیت نامے میں لکھا کہ میری میرے بیٹے مانکو اور کوکس کی خاک ملا کر ڈیتھ ویلی، کیلیفورنیا میں چھڑک دی جائے۔ اس بات کا انکشاف مانکو نے ٹائمز کے نمائندے سے بھی کیا، جسے ٹائمز نے اپنی ستمبر 2004ء کی اشاعت میں جگہ دی۔ اس نے اپنی خودنوشت سوانح میں اس کا بھی انکشاف کیا ہے کہ وہ کوکس سے اتنا قریب تھا کہ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا جب وہ اس کے بارے میں نہ سوچتا ہو۔ حد یہ ہے کہ جب اس کی موت واقع ہوئی تو وہ جو پاجامہ پہنے تھا، برانڈو نے اسے اپنے پاس کئی برس تک محفوظ رکھا۔

☆☆☆

معلمہ ایڈلر جب اسے اداکاری کی تربیت دے رہی تھی تو اس دوران اس نے کلاس کے طالب علموں سے کہا کہ فرض کرو تم مرغی کے بچے ہو اور میں تم سے کہتی ہوں کہ اس اسکول کی عمارت پر بم گرنے والا ہے تو تم کیا کرو گے؟ یہ سن کر کوئی طالب علم میز کے نیچے چلا گیا اور کوئی کلاس سے باہر نکل کر زینے کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ جب کہ برانڈو اپنی جگہ پر بیٹھا رہا جیسے انڈا دینے والی مرغی ہو۔ اس کی معلمہ نے پوچھا کہ اس نے جان بچانے کے لیے کیا کیا؟ برانڈو نے جواب دیا کچھ نہیں۔ اس لیے کہ ایک مرغی کے بچے کو کیا معلوم کہ بم کیا ہوتا ہے اور اس کی تباہ کاریاں کیسی ہوتی ہیں؟

ایڈلر نے اسے جب اداکاری کی تربیت دے دی تو برانڈو نے براڈوے کے ڈراموں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اب وہ 1.75 میٹر کی قامت کا ہو چکا تھا۔ پہلی بار وہ 19 اکتوبر 1944ء کو اسٹیج پر آیا۔ اس نے چند ڈراموں میں کام کیا۔ اس کی پرفارمنس پسند کی گئی اور چند ہدایت کاروں نے اس کو اسکرین ٹیسٹ کے لیے بلایا۔ مگر جب برانڈو کے سامنے یہ شرط رکھی جاتی کہ اسے سات برس کے لیے فلم کمپنی کے ساتھ معاہدہ کرنا ہوگا اور وہ کسی اور کمپنی کے لیے کام نہیں کر سکے گا تو برانڈو بھاگ آتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس طرح سے لگے بندھے انداز میں کام کرنے سے وہ کبھی اچھا اداکار نہیں بن سکے گا۔

فلموں میں کام فوری نہیں ملا تو اس نے ملازمت شروع کر دی۔ پہلے ایک ہوٹل میں ویٹر بنا۔ چند ماہ کام کرنے کے بعد جب اس کا جسم بدبودار ہونے لگا تو اس نے بیرا گیری چھوڑ دی۔ اس کے بعد ایک شعبہ جاتی اسٹور میں لفٹ آپریٹر ہو گیا۔ یہ ملازمت بھی چند ماہ سے آگے نہ بڑھی۔ ان بے تکے کاموں سے گزارہ ہو رہا تھا اور رقم مل رہی تھی مگر دل میں اداکار بننے کی جو

کسک اور امنگ تھی وہ کسی طرح سے پوری نہیں ہو رہی تھی۔

وہ ہالی ووڈ چلا گیا۔ مشہور میگزین 'لائف' نے لکھا ہے کہ جب وہ ہالی ووڈ آیا تھا تو اس کے پاس کپڑوں کا ایک بیگ تھا جو خواتین کے وینٹی بیگ سے بھی چھوٹا تھا۔ وہ نیلی پتلون اور جیکٹ پہنے تھا۔ پتلون شکن آلود تھی اور کولہوں کے مقام پر سے گھسی ہوئی۔ وہ یقیناً بیٹھنے اٹھنے میں احتیاط کرتا ہوگا ورنہ وہ اس جگہ سے پھٹ جاتی۔ اس کی جیکٹ میں جا بجا سوراخ تھے۔ جیکٹ سے سردی کا بچاؤ ممکن نہیں تھا، البتہ وہ ائیر کنڈیشنڈ ضرور تھی۔

فوری طور پر ٹھہرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے برانڈو اپنی نانی کے ہاں ٹھہر گیا۔ نانی نے ایک بار لائف کو انٹرویو دیتے ہوئے بتایا کہ اسے (برانڈو) کھانے کی بھی تمیز نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گنواروں اور جاہلوں میں اٹھا بیٹھا ہو۔ وہ غذا کو منہ تک نہیں لے جاتا تھا بلکہ منہ کو غذا تک لے جاتا تھا۔ مجھے اس منظر سے بڑی کراہت ہوتی تھی۔ مجھے اس سے بہت محبت تھی لیکن میں شدت سے یہ چاہتی تھی کہ اسے کرائے کا کوئی مکان مل جائے اور وہ اس میں شفٹ ہو جائے۔

بہر حال تگ و دو کرنے کے بعد 1950ء میں اسے ہدایت کار سائمن پیٹرز کی فلم 'دی مین' میں کام مل گیا۔ اسے ایک سپاہی کا کردار نبھانا تھا۔ اس نے وہ کردار اتنی خوبی سے ادا کیا کہ اخبارات میں اس کی تصاویر شائع ہونا شروع ہو گئیں اور تبصرہ نگاروں نے اس کی اداکاری کی طرف بھی توجہ دینا شروع کر دی۔ یہ نیا چہرہ جو ہالی ووڈ کے افق پر طلوع ہو رہا تھا ان کی نگاہوں میں سمانے لگا۔

دنیا کے سب سے بڑے اشاعتی میگزین 'لائف' نے برانڈو اور اس کی ہمشیرہ کی تصویر اپنے سرورق پر شائع کی تو امریکا میں دھوم مچ گئی۔ سب کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی ہمشیرہ بھی ان دنوں براڈوے کے ڈراموں میں کام کر رہی تھی۔ لائف کے سرورق پر تصویر آنے کے بعد اس کی مارکیٹ ویلیو میں اضافہ ہو گیا۔

فلم 'دی مین' میں اس کا کردار ایک بیمار اور اپاہج سپاہی کا تھا۔ برانڈو نے بیماروں کا مشاہدہ کرنے کے لیے ایک اسپتال کی انتظامیہ سے اجازت لے کر بستر حاصل کر لیا اور بیمار بن کر لیٹ گیا۔ پریس نے اس واقعہ کو بھی اہمیت دی اور اس کی تصویریں شائع کیں۔ وہ اسپتال میں دن چڑھے تک سوتا رہتا تھا۔ البتہ کبھی کبھار کوئی دوست مریض اس کے رخسار پر طمانچہ لگا کر اسے جگا دیتا تھا۔ جب برانڈو پہلے جاگ جاتا تھا تو اس

1950ء میں مقبول ہونے والے اداکار منٹگمری کلف کے بارے میں لوگوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ وہ برانڈو کا کاروباری رقیب ہے۔ جس کی تردید برانڈو نے متعدد بار کی اور اس کا اعتراف کیا کہ وہ ایک بڑا اداکار ہے اور اس کا دوست۔ جب ہارٹ اٹیک کی بنا پر اس کی موت واقع ہوئی تو برانڈو نے اس کی زیر تکمیل فلم 'ریفلیکشنز ان اے گولڈن آئی' میں کام کرنا منظور کر لیا۔

☆☆☆

اس کے شائقین اس سے کتنی محبت کرتے تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کی چیزیں نیلام کی گئیں اور وہ لاکھوں ڈالر میں فروخت ہوئیں۔ مثلاً 1961ء میں مارلن منرو کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ برانڈو نے مارلن منرو کو جو خط لکھا تھا وہ نیلامی میں چھتیس ہزار ڈالر میں فروخت ہوا۔ جب کہ اس کی لائبریری کی کتابیں پینتالیس ہزار ڈالر میں فروخت ہوئیں۔

مریض سے بدلہ لیتا تھا۔ وہاں رہتے ہوئے اس نے کافی مریضوں کو دوست بنا لیا تھا۔ ان کی حرکات و سکنات سے اس نے بہت کچھ سیکھ لیا۔ ایک ماہ بعد وہ شوٹنگ کے لیے پوری طرح سے تیار تھا۔

'دی مین' میں اس کا ساتھی اداکار رچرڈ ایرڈ مین تھا۔ اس نے بعد میں اپنی ایک کتاب میں لکھا کہ برانڈو کو الم غلم کھانوں سے رغبت تھی۔ وہ اس سلسلے میں فربہ ہونے کی پروا نہیں کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر چائنز ڈشیں پسند کرتا تھا اور انہیں حلق سے اتارنے کے لیے دودھ پیتا تھا۔

1952ء میں 'ویوا زپاٹا' اور 1953ء میں 'جولیس سیزر' نامی فلم میں مارک انتونی کا کردار ادا کرنے کے بعد اس کے قدم فلم انڈسٹری میں جم گئے۔ ویوا زپاٹا ایک انقلابی کسان کی کہانی تھی جو مشہور ادیب جان اسٹین بک نے لکھی تھی۔ کسان زپاٹا لوگوں میں بیداری پیدا کرتا ہے اور پھر انقلاب لانے کے بعد میکسیکو کا حکمران بن جاتا ہے۔

ابتدائی زمانے میں جب وہ چھوٹے چھوٹے کردار ادا کر رہا تھا تو اس کی تنخواہ اسٹوڈیو سے اس کے باپ کو بھیج دی جاتی تھی۔ اس کا باپ اس رقم کو مویشیوں کے ایک باڑے میں خرچ کر دیتا تھا جس کا نام پینی پوک تھا۔ وہ برانڈو کے گزارے کے لیے ہر ماہ ڈیڑھ سو ڈالر الاؤنس بھیج دیا کرتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ برانڈو اس 'حقیری رقم' کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا اس لیے کہ بیس ڈالر میں تو اس کی سگرٹ کے پیکٹ آتے تھے، جب کہ باقی رقم وہ دوسرے دن ہی خرچ کر ڈالتا تھا۔

1953ء میں ہی اسے ایک اور فلم میں کام کرنے کا موقع ملا جس کا نام 'دی وائلڈ' تھا جس میں موٹر سائیکل سوار غنڈے ایک گاؤں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس فلم میں برانڈو نے اپنی ذاتی موٹر سائیکل 'تھنڈر برڈ' پر بیٹھ کر فلمبندی کرائی۔ فلم اتنی پسند کی گئی کہ مادام تساؤ کے عجائب گھر میں جب برانڈو کا موی مجسمہ سجایا جانے لگا تو برانڈو کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر اس کا ویسا ہی مجسمہ بنایا گیا۔ یہ مجسمہ آج بھی محفوظ ہے۔ اس فلم میں برانڈو نے چمڑے کا جیکٹ اور بلیو جینز پہنی تھی۔

اس فلم کی ریلیز کے بعد وہ نئی نسل کا کریز بن گیا۔ دکانوں پر شائقین کا ازدحام ہوگیا۔ سب کو چمڑے کی جیکٹ اور جینز کی پتلون چاہیے تھی۔ فیکٹریوں نے دن رات ایک کردیے اور مانگ پوری کرنے کے لیے اضافی اوقات میں کام کرایا لیکن مانگ پھر بھی پوری نہیں ہوئی۔ بچے فلم دیکھنے آتے تھے اور جب وہاں سے واپس آتے تھے تو برانڈو کے کردار سے اتنا متاثر ہوتے تھے کہ اپنے منہ سے موٹر سائیکل کی آواز گھوں گھوں نکالتے تھے۔

برانڈو کو موٹر سائیکل چلانے سے عشق تھا اور وہ چیونگم بھی شوق سے چبایا کرتا تھا۔ اس کا منہ بکری کی طرح ہر وقت چلتا ہی رہتا تھا۔

1954ء میں اس نے نپولین بونا پارٹ کا کردار 'ڈیزائر' نامی فلم میں ادا کیا۔ فلم مکمل ہونے کے بعد اس کا خیال تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہوگی۔ فلم چوں چوں کا مربا ہے مگر ناظرین نے اس مربے کو پسند کیا اور فلم کو کامیاب کرادیا۔

1957ء میں اس نے 'آن دی واٹر فرنٹ' میں کام کیا۔ اس کا کردار اور اداکاری ناقدین کو اتنی پسند آئی کہ انہوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ اگلے برس جب آسکر ایوارڈ کی تقریب ہوئی تو برانڈو کو اس فلم پر آسکر دیا گیا۔ یہ اس کی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔

1960ء میں جب وہ شہرت کی بلندیوں پر تھا، اس نے اچانک ڈائٹنگ شروع کردی مگر پھر اپنی کمزور قوتِ ارادی کی بنا پر اس نے ڈائٹنگ ترک کردی اور خوب ڈٹ کر ناشتا کرنا شروع کردیا جس میں کارن فلیکس، انڈے، کیلے، کریم اور کیک شامل تھے۔ اس طرح اناپ شناپ کھانے سے اس کا وزن بڑھ گیا۔

1961ء میں جب وہ فلم 'ون آئیڈ جیکس' نامی فلم کی شوٹنگ میں حصہ لے رہا تھا تو دو اسٹیک، دو ابلے آلو، مٹن پائی اور ایک کوارٹ دودھ پی رہا تھا۔ شوٹنگ کے دوران اس کی سالگرہ منائی گئی تو شرکت کرنے والوں نے اسے کمر پر باندھنے کے لیے ایک بیلٹ تحفے میں دیا جس پر لکھا تھا کہ 'اپنی توند کا ہر لمحہ خیال رکھو۔ اسے بڑھنے نہ دو۔' اس کے علاوہ کیک پر لکھا تھا۔ 'کیک ضرور کھاؤ مگر اپنے فلم ساز کو نہ کھاؤ۔'

وہ کھانے کا شوقین تھا۔ اس کی بیوی مووویٹا نے ایک اخباری نمائندے کو بتایا کہ اس اندیشے کے پیش نظر کہ وہ فربہ نہ ہوجائے میں ریفریجریٹر کا دروازہ لاک رکھتی تھی۔ ایک روز صبح میں نے اس کا تالا ٹوٹا ہوا پایا۔ اندر پیزا رکھا تھا جس پر دانتوں کے نشانات تھے۔ میں نے ملازمہ سے استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ یہ حرکت 'بڑے صاحب' کی ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ راتوں کو اٹھ کر کسی شبینہ ریستوراں کا رخ کرتا ہے اور وہاں ڈٹ کر برگر کھاتا ہے۔

☆☆☆

فلم 'اے اسٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر' کی فلم بندی شروع ہوئی۔ (پہلے اس کہانی پر ڈراما بھی بن چکا تھا جس میں برانڈو نے کام کیا تھا) فلم ساز نے برٹ لنکاسٹر کا نام تجویز کیا لیکن ہدایت کار نے برانڈو کا نام لیا اس لیے کہ وہ بہت سے ڈراموں میں اس کی اداکاری کے جوہر دیکھ چکا تھا۔ ڈرامے دیکھنے کے دوران اس نے محسوس کیا تھا کہ برانڈو کی شخصیت اتنی مقناطیسی ہے کہ لوگ اس پر سے نگاہ نہیں ہٹا پاتے۔ اس کے ساتھ کام کرنے والی لڑکیاں خاص طور پر اپنا کام بھول بھال کر اسے تکنا شروع کردیتیں تو اسٹیج ہدایت کار کو انہیں بلا بلا کر بتانا پڑتا کہ وہ اس وقت کہاں کھڑی ہیں اور انہیں کیا کرنا ہے۔ (یہ بالکل حسنِ یوسف والا معاملہ تھا)

اس فلم میں برانڈو کو کاسٹ کرنے میں ہچکچاہٹ یہ تھی کہ رائٹر نے وہ کردار پختہ عمر کے لیے لکھا تھا جب کہ برانڈو عمر کے لحاظ سے اس سے چھوٹا تھا۔ (اس کی عمر صرف 23 برس تھی) اس کے اور رائٹر ٹینیسی ولیم کے درمیان بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور اس نے برانڈو کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس کے کردار کو دوبارہ اس طرح سے لکھے گا کہ وہ برانڈو پر پورا اترے گا۔

کہانی پہلے اسٹیج ڈرامے کی شکل میں پیش کی گئی۔ برانڈو کو باکسنگ کا بہت شوق تھا۔ اسٹیج کے پیچھے ایک کمرا تھا۔ جب اس کا کام ختم ہوجاتا تھا تو وہ ساتھی اداکاروں سے کہتا کہ

باکسنگ کریں۔ ایک بار اس کے ساتھی اداکار نے باکسنگ کے دوران اس کی ناک پر اتنی زور کا مکا مارا کہ اس کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اور خون بہنے لگا۔ اسے ڈریسنگ روم میں لے جایا گیا لیکن کوئی ترکیب کارگر نہ ہوئی تو اسپتال کا رخ کیا گیا۔

ڈاکٹروں نے دوا لگا کر خون روک دیا اور بینڈیج کر دی۔ کچھ ہی دیر بعد برانڈو نے بینڈیج اتار دی۔ خون تو نہیں نکلا مگر اس کی ناک میں خفیف سا ٹیڑھا پن آگیا جس کا بعد میں بہت علاج کیا گیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ دراصل اس رات وہ ڈرامے میں کام کرنا چاہتا تھا تاکہ ڈراما ادھورا رہ جانے پر ہدایت کار کو نقصان نہ ہو! (اس نے ناک کا نقصان برداشت کرلیا لیکن ہدایت کار کو نقصان نہیں پہنچنے دیا) بعد میں لوگوں کا تبصرہ یہ تھا کہ ٹیڑھی ناک کے سبب وہ کچھ زیادہ ہی رومینٹک ہوگیا ہے۔ اس پر سے نگاہ ہٹانے کو دل نہیں چاہتا۔

جب لوگوں نے ڈرامے کو پسند کیا تو اس کہانی پر فلم بنائی گئی۔ برانڈو کو آسکر کے لیے نامزد کیا گیا۔ اسے ایوارڈ تو نہیں ملا مگر اس کی اداکاری اور شخصیت لوگوں کے دلوں میں بس گئی۔ پھر ایک کے بعد ایک اس نے متعدد فلمیں سائن کیں۔ فلم سازوں اور فلم کمپنیوں کے لیے اب وہ بڑا نام تھا اس لیے کہ اس کی فلمیں بزنس کررہی تھیں۔

اس نے ایک فلم میں مارک انتونی کا کردار ادا کیا۔ یہ کردار اس نے اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ ہدایت کار کو کہنا پڑا کہ اس کو فلم میں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی تاریک کمرے میں بھٹی کا دروازہ کھل رہا ہو۔ ایسا گمان ہوتا تھا جیسے وہ فلم کے اسکرین سے نکل کر باہر آگیا ہو۔ اس کے ساتھی اداکار جان گیلوڈ بھی اس کی فن کارانہ صلاحیتوں سے متاثر ہوا اور اس نے برانڈو کو دعوت دی کہ وہ اس کی کمپنی میں ملازمت کر لے، جو شیکسپیئر کے ڈرامے اسٹیج کرتی ہے۔ برانڈو نے یہ پیشکش منظور نہیں کی۔

1951ء سے لے کر 1960ء تک کے عہد کو اگر برانڈو کا عہد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس نے امریکی اداکاری میں ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔ اس کے ہم عصروں نے اس کے اسٹائل کو یہاں تک اپنایا کہ لوگ انہیں نقال کہنے لگے۔ مثال کے طور پر جیمز ڈین جس نے نہ صرف برانڈو کی اداکاری کی نقل کی بلکہ اس کا طرزِ زندگی (لائف اسٹائل) بھی اپنا لیا۔ نوجوان پال نیومین اور اسٹیو میکوئن بھی برانڈو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ وارن بیٹی نے 1961ء میں بننے والی فلم 'اسپلینڈر ان دی گراس' میں جس انداز کو اپنایا اس کی بنا پر

رچرڈ برٹن نے اعتراف کیا کہ برانڈو اس نسل کا سب سے بڑا اداکار ہے مگر اب اسے خاموش فلموں میں کام کرنا چاہیے اس لیے کہ اس کی آواز کا وہ معیار نہیں رہا ہے جو ابتدا میں تھا۔

اس کی آخری فلم جو مکمل نہیں ہوسکی 'دی مین آن فائر' تھی۔ فلم 2004ء میں بننا شروع ہوئی تھی لیکن ابھی اس کی شوٹنگ کو ایک برس سے بھی کم عرصہ ہوا تھا کہ وہ موت سے ہم کنار ہوگیا۔

وہ یہودیوں کے بارے میں کہتا تھا کہ انہوں نے امریکا پر قبضہ کر رکھا ہے اور اسے چلا رہے ہیں لیکن وہ دوسرے معاملات میں بھی قابلِ قدر کام کر رہے ہیں۔ امدادی کاموں میں کوئی ان سے آگے نہیں ہے۔ اس لیے میں اسرائیل کے قیام کے حق میں ہوں۔

☆☆☆

اتنی برس میں برانڈو کی پہلی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ اس سے پیشتر وہ اپنے اسکول کے ایک ڈرامے میں اداکاری کرتے ہوئے پھانسی پر لٹک گیا تھا تو ناظرین کی سانسیں رک گئی تھیں اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ وہ حقیقت میں مر چکا ہے۔ اس کی حقیقت سے قریب تر موت غالباً 'لاسٹ ٹینگو ان پیرس' میں تھی جب اس کی محبوبہ اسے گولی مار دیتی ہے۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو گرتا ہے اور بالکونی سے لٹک جاتا ہے (اسے بہرحال اتنا موقع ضرور مل گیا کہ اس نے اپنے منہ میں دبی ہوئی چیونگم نکال کر ریلنگ کے نیچے چپکا دی تاکہ مرتے وقت آخری مکالمے بول سکے۔

اس کی یہ موت ایسی ہی ہوئی جیسے کہ عام افراد کی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ وہ نئی نسل کا آزاد خیال اور شیطانی خیالات رکھنے والا فرد کہا جاتا تھا مگر اس کی موت کے بعد اس کے جسم سے کوئی ... شیطانی ہیولا نکلتے نہیں دیکھا گیا۔ اس نے تقریباً چالیس فلموں میں کام کیا اور اس کی چار فلمیں 'امریکن فلم انسٹی ٹیوٹ' کی فہرست میں بہترین فلموں کی حیثیت سے درج کی گئیں، جن کے نام یہ ہیں: اے اسٹریٹ کار نیمڈ ڈیزائر۔ آن دی واٹر فرنٹ۔ گاڈ فادر اور اپوکالپس ناؤ۔ وہ اپنے دوستوں، رفیقوں اور ہدایت کاروں کو اداس اور رنجور چھوڑ گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ آیا، اس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔ واقعی اس نے تیس برس کی عمر میں ہالی ووڈ کو فتح کرلیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

لوگ اسے "نیو برانڈو" کہنے لگے۔ آگے جاکر 1971ء میں جیک نکلسن نے اعتراف کیا کہ ہم سب اداکاری کے معاملے میں برانڈو کے بچے ہیں۔ وہ حقیقت میں امریکی اداکاری کا "گاڈ فادر" ہے جب کہ اس کی عمر صرف تیس برس ہے۔

شادی اور بچے ہر شخص کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتے ہیں لیکن برانڈو نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں اپنی شادیوں کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔

برانڈو کی پہلی شادی اینا کاشفی سے 11 اکتوبر 1957ء کو ہوئی مگر 22 اپریل 1959ء کو دو برس بعد ہی طلاق ہوگئی۔ کاشفی سے اس کا ایک بیٹا 1958ء میں ہوا، جس کا نام کرسچین برانڈو رکھا گیا۔ کاشفی ایک خوش جمال و خوش ادا اداکارہ تھی۔ اس کی خوب صورتی دیکھ کر لوگ اسے دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ وہ کلکتہ میں پیدا ہوئی تھی اور اس کا خاندان 1947ء میں ویلز سے انڈیا چلا گیا تھا۔ اس کا باپ ولیم کالا گھان فولاد کے کارخانے کا مالک تھا۔ وہ انڈین اسٹیٹ ریلوے کا سپرنٹنڈنٹ بھی تھا۔ اپنی کتاب میں کاشفی نے انکشاف کیا ہے کہ کالا گھان اس کا حقیقی باپ نہیں تھا۔ اسے سوتیلا کہا جاسکتا ہے۔ اس کا حقیقی باپ ایک ہندو تھا۔ وہ ناجائز ملاپ سے وجود میں آئی تھی۔

☆☆☆

بعد کے برسوں 1955ء سے لے کر 1962ء تک برانڈو نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی۔ اب اسے دنیا کے دس بڑے اداکاروں کی فہرست میں شامل کیا جانے لگا۔ 1957ء میں اس کی فلم 'سایونارا' ریلیز ہوئی تو اسے پانچویں بار آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ یہ فلم جاپان میں فلمبند ہوئی تھی۔ اس میں ہیروئن کا کردار ایک جاپانی اداکارہ نے ادا کیا تھا جو شوٹنگ کے دوران برانڈو کے چہرے کی طرف زیادہ دیکھتی اور اداکاری کرنا بھول جاتی تھی۔ اس اداکارہ کا نام سائینا تھا جس کی تصاویر نہایت اہتمام سے ٹائم میگزین نے شائع کی تھیں۔

اداکاری کے بام عروج پر پہنچنے کے بعد برانڈو نے اپنی فلم کمپنی 'پینی بیکر پروڈکشن' بنائی اور ایک تفریحی فلم کی ہدایت دی جس کا نام 'ون آئیڈ جیکس' تھا۔ کمپنی کا نام اس کی ماں کے نام پر تھا۔ پہلے اس نے ڈائرکشن کے لیے ہدایت کار کیبرک کی خدمات حاصل کی تھیں، لیکن جب انہوں نے کئی بار منظر نامے پر بحث و تکرار کی اور کیبرک کو محسوس ہوا کہ برانڈو کچھ زیادہ ہی عقل مند بن رہا ہے تو کیبرک نے اس فلم کی ہدایت کاری سے توبہ کرلی اور اپنی بیوی کو بتایا کہ حقیقت میں برانڈو اس فلم کو خود ڈائرکٹ کرنا چاہتا ہے چنانچہ حد سے زیادہ جذباتی ہو رہا ہے۔ فلم کی ہدایت برانڈو نے ہی دی اور ریلیز ہونے کے بعد فلم نے اچھا بزنس کیا مگر فلم پر ساٹھ لاکھ ڈالر کے اخراجات ہوئے تھے جب کہ اتنا بزنس نہیں ہوا تھا، لہٰذا فلم کو مجموعی طور پر نقصان اٹھانا پڑا۔ اس تجربے کے بعد برانڈو کو پھر کبھی ہدایت کار بننے کی ہمت نہ پڑی۔

برانڈو کی جمالیاتی زندگی رنگین اور بڑی حد تک سنگین تھی۔ وہ ہر شام کسی نہ کسی اداکارہ کے ساتھ رقص کرتا دیکھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود 1960ء میں اس نے موویتا سے دوسری شادی کرلی۔ یہ شادی 4 جون 1960ء کو ہوئی اور 1962ء تک قائم رہی۔ نتیجہ طلاق کی صورت میں ظاہر ہوا اس دوران موویتا سے دو بچے ہوئے۔ مائکو جو 1961ء میں پیدا ہوا اور ربیکا برانڈو جو 1962ء میں پیدا ہوئی۔

موویتا میکسیکو کی ایک اداکارہ تھی جو اس سے عمر میں سات برس بڑی تھی۔ اس نے 1935ء میں بننے والی 'میوٹنی آن دی باؤنٹی' میں کام کیا تھا۔ دوسری بار بننے والی فلم سے 27 برس پیشتر! اس کے باوجود برانڈو اس پر فریفتہ ہوگیا۔

☆☆☆

1959ء میں برانڈو نے 'فیوجیٹیو کائنڈ' میں کام کیا۔ جب اس فلم کی شوٹنگ ختم ہوگئی تو مشہور و مقبول ہدایت کار ڈیوڈ لین نے اسے اپنی فلم 'لارنس آف اریبیا' میں کام کرنے کی پیشکش کی لیکن برانڈو نے اسے قبول نہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ڈیوڈ لین بہت سست ہدایت کار ہے۔ وہ یقیناً اسے دو سال تک اونٹ کی پیٹھ پر بٹھا کر ریگستانوں میں دوڑاتا پھرے گا (ڈیوڈ لین کی خواہش تھی کہ وہ اس کی کسی فلم میں کام کرے۔ بعد میں اس نے برانڈو کو ایک فلم 'نوسٹرمو' میں کام کرنے کی پیشکش کی جو اس نے منظور کرلی لیکن ڈیوڈ لین کی زندگی نے وفا نہ کی اور دنیا کا سب سے بڑا ہدایت کار دنیا کے سب سے بڑے اداکار کے ساتھ کام نہ کرسکا)

اسے 'میوٹنی آن دی باؤنٹی' کے مرکزی کردار کے لیے پیشکش ہوئی جو 1935ء میں بننے والی فلم کا ری میک تھی۔ اس وقت اسے اسٹوڈیو سے اتنی تنخواہ مل رہی تھی جو کسی اور اداکار کے نصیب میں نہیں تھی۔ اسے دس لاکھ ڈالر مل رہے تھے۔ فلم کے معاہدے کے وقت یہ بھی طے پایا تھا کہ اسے منافع میں سے دو لاکھ ڈالر ملیں گے۔ اس فلم کے لیے لوئس مائل اسٹون جیسے ہدایت کار کی خدمات حاصل کی

گئیں۔ شوٹنگ میں تاخیر ہو رہی تھی۔ ایک کاک ٹیل پارٹی میں صدر جان ایف کینیڈی نے ہدایت کار سے پوچھا۔ "فلم کی شوٹنگ کیا تیز رفتاری سے نہیں ہوسکتی؟"

اس لیے کہ برانڈو نے 1960ء کے صدارتی انتخابات میں جان ایف کینیڈی کی حمایت کی اور اس سلسلے میں مہم بھی چلائی تھی۔ اس کے ساتھ برٹ لنکاسٹر، سڈنی پوئٹر اور جیمز گارنر اور چارلٹن ہسٹن نے بھی اس مہم میں حصہ لیا اور انتخابات کے لیے عطیات جمع کیے۔

☆☆☆

فلم 'میوٹنی آن دی باؤنٹی' کی شوٹنگ کے لیے جزیرہ تاہیٹی چنا گیا جو جنوبی امریکا میں انتہائی آخر میں واقع ہے۔ مارلن برانڈو نے لوکیشن دیکھی اور ناک بھوں سکیڑ کر بولا کہ یہاں تو مچھر بہت ہیں۔ مجھے تو نیند نہیں آسکتی۔ چنانچہ مجھے نیویارک کے کسی ہوٹل میں کمرا لے کر دیا جائے۔ فلم ساز نے پوچھا کہ اتنی دور سے آنا جانا کیسے ہوگا؟ مارلن برانڈو نے جواب دیا کہ طیارے کے ذریعے سے۔ ایک طیارہ مجھے شوٹنگ ختم ہونے کے بعد جزیرے سے نیویارک پہنچائے گا۔ یہ ایک طویل فاصلہ تھا، جس کا ٹکٹ بھی بھاری تھا، لیکن فلم ساز نے اسے منظور کرلیا اور یہ شرط معاہدے میں لکھی گئی۔

تاہیٹی میں جاکر برانڈو کے کھانے کا شوق ختم نہیں ہوا بلکہ کچھ بڑھ گیا۔ اس کے ساتھی اداکار جیمز ٹیلر نے انکشاف کیا کہ برانڈو کے کولہے اتنے بھاری ہوچکے تھے کہ شوٹنگ کے دوران اس کی پتلون پھٹ جایا کرتی تھی۔ جب فلم کی شوٹنگ ختم ہوئی تو ہدایت کار کا کہنا تھا کہ برانڈو نے شوٹنگ کے دوران 45 پتلونیں پھاڑی تھیں۔ اس زمانے میں اسے آئس کریم کھانے کا شوق تھا۔ مختلف اوقات میں وہ بلا مبالغہ پانچ گیلن آئس کریم کھا جایا کرتا تھا۔ جب فلم کی شوٹنگ ختم ہوئی تو برانڈو کے وزن میں چالیس پونڈ کا اضافہ ہوچکا تھا!

'میوٹنی آن دی باؤنٹی' ریلیز ہوئی اور باکس آفس پر کامیاب رہی۔ وہ 1962ء کی سب سے زیادہ بزنس کرنے والی فلم تھی۔ سال کے اختتام پر اسے سال کی بہترین فلم کے لیے آسکر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا۔

1961ء میں آرون شا کے ناول 'دی ینگ لوائن' میں کام کیا۔ آرون شا برانڈو کی اداکاری سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے بہت ناک بھوں سکیڑی لیکن جب فلم پردۂ سیمیں پر پیش کی گئی تو پبلک نے شا کے نظریے کو غلط ثابت کردیا۔ فلم نے کھڑکی توڑ بزنس کیا۔ یہ فلم برانڈو کی کامیاب ہونے والی

ایک انٹرویو میں جب مشہور کمپیئر لیری کنگ نے پوچھا کہ اس نے اداکاری کو کیوں اپنایا تو اس نے جواب دیا کہ زندہ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی پیشہ تو اپنانا ہی تھا، میں نے اداکاری کو چن لیا۔ ویسے میرے خیال میں ہر شخص اداکار ہوتا ہے، کوئی کم کوئی زیادہ۔ جہاں تک فلم میں اداکاری کا تعلق ہے تو جب اداکار اسٹار بن جاتا ہے اور اس کی مارکیٹ ویلیو ہوجاتی ہے تو عجیب عجیب کہانیاں گڑھنے لگتا ہے۔ منہ ٹیڑھا کرکے کہتا ہے کہ اداکاری تو اس کی رگوں میں بھری ہوئی تھی اور وہ پیدائشی اداکار ہے۔ حالانکہ یہ سب لغو باتیں ہیں۔ سب پیسا کماتے ہیں۔

فلموں میں آخری فلم تھی، اس کے بعد دس برس کا خلا پیدا ہوگیا اور اس کی فلمیں ناکامی سے دوچار ہونے لگیں۔

فلموں سے عشق کے علاوہ اداکاراؤں سے بھی اس کا عشق جاری رہا۔ برانڈو نے تاریتا سے تیسری شادی 10 اگست 1962ء کو کی۔ تاریتا نے 'میوٹنی آن دی باؤنٹی' میں ایک چھوٹا سا کردار ادا کیا تھا۔ یہ شادی جولائی 1972ء تک قائم رہی اور تاریتا سے اس کے دو بچے ہوئے 'سائمن برانڈو، پیدائش 1964ء اور اسٹیفنو برانڈو، پیدائش 1967ء۔ اس طرح مجموعی طور پر اس کے پانچ بچے ہوئے۔

تاریتا کی عمر صرف بیس برس تھی اور وہ برانڈو سے اٹھارہ برس چھوٹی تھی۔ وہ فرانسیسی نژاد تھی جب کہ برانڈو فرانسیسی روانی سے بولتا تھا، ممکن ہے دونوں اسی بنا پر نزدیک آگئے ہوں۔ برانڈو نے کئی انٹرویو فرانسیسی میں دیے اور کسی بھی موقع پر گفتگو میں نہیں اٹکا۔ جولائی 1972ء میں تاریتا سے علیحدگی ہوگئی۔ مگر حیرت ہے کہ شادی کی تیسری گاڑی بغیر کسی رکاوٹ کے دس برس تک چلتی رہی!

1963ء کا سال اس کے لیے سازگار نہیں تھا۔ اس وقت پے درپے اس کی کئی فلمیں ناکام ہوئیں۔ پیراماؤنٹ اور ایم جی ایم جیسے بڑے اداروں کو سانپ سونگھ گیا۔ 'اگلی امریکن' 1963ء، 'چیز' 1966ء اور 'دی ریفلیکشن ان اے گولڈن آئی' 1967ء ناکامی سے ہم کنار ہوئیں۔ اسے 'باکس آفس کا زہریلا ناگ' کہا جانے لگا۔ برانڈو پر ڈپریشن اور مایوسی طاری نہیں ہوئی۔ جب اسے فلموں میں چانس ملنا کم ہوگیا تو اس نے خود ایک فلم 'برن' کی ہدایت دینے کا منصوبہ بنایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کا کہنا تھا کہ اس نے گزشتہ پانچ برسوں میں ہالی ووڈ کے عظیم ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا ہے جن میں آرتھر پین، جان ہوسٹن اور چارلی چپلن شامل ہیں اس لیے اسے ناکامی کا تنہا ذمے دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ غلطی ان لوگوں سے بھی ہوسکتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ رائٹر نے کہانی اچھی نہ لکھی ہو۔ فلم میں تنہا اداکار تو اسے اپنے کاندھے پر اٹھائے نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ میں اسکرین کے بڑے ستاروں کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہوں جن میں ڈیوڈ نیون، یوئل برنر، صوفیہ لارین اور الزبتھ ٹیلر شامل ہیں۔ چنانچہ اگر میں اسکرین پر معرکہ آرا اداکاری کا نمونہ پیش نہیں کرسکا تو ان لوگوں کو کیا ہوا تھا؟ پس ثابت ہوا کہ فلموں کا سبجیکٹ ایسا تھا جو ناظرین کو متاثر نہ کرسکا۔ جہاں تک میری اداکاری کا تعلق ہے تو ناقدین سے پوچھا جاسکتا ہے کہ میں نے کس معیار کی اداکاری کی ہے؟

اس کی دلیلوں اور وضاحتوں کے باوجود کوئی تقسیم کار مطمئن نہ ہوسکا۔ انہوں نے اس کی فلمیں بک کرنا بند کر دیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آیندہ تین برس تک یعنی 1971ء تک اسے کسی فلم میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔

1969ء میں اسے مشہور ہدایت کار کازان نے اپنی فلم 'دی اگریمنٹ' میں سائن کیا تھا لیکن جب کچھ ہی دنوں بعد مارٹن لوتھر کنگ کا قتل ہوگیا تو برانڈو اس سانحے سے بہت دل گرفتہ ہوا اور اس نے ہدایت کار سے کہا کہ وہ اب ہالی ووڈ کی فلموں میں کام نہیں کرسکتا۔ پال نیومین کے ساتھ اسے ایک فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی گئی تھی مگر اس نے یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی تھی۔

اس نے ہدایت کار کی حیثیت سے فلم 'برن' بنائی تھی جو ناظرین کی خاطر خواہ توجہ حاصل نہ کرسکی۔ تاہم تبصرہ نگاروں نے اس کی کاوش کو مثبت لفظوں سے سراہا۔ برانڈو ہدایت کار کی حیثیت سے زیادہ جم نہ سکا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے فلم کی تدوین (ایڈیٹنگ) کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ جب کہ اچھی تدوین سے فلم کچھ کی کچھ بن جاتی ہے۔

چارلٹن ہسٹن نے مارلن برانڈو کے ساتھ مارٹن لوتھر کنگ کے جنازے میں مارچ 1963ء میں واشنگٹن میں شرکت کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ مارلن برانڈو اس نسل کا سب سے حساس اداکار ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے یاد ہے کہ 1960ء میں اس نے ایک فلم کا معاہدہ کرنے سے انکار کردیا تھا اور یہ کہا تھا کہ جب انڈیا میں لوگ فاقوں سے دم توڑ رہے ہوں تو میں فلموں میں اداکاری کیسے کرسکتا ہوں؟

کازان کا شمار ہالی ووڈ کے بڑے ہدایت کاروں میں ہوتا تھا، اس نے ایک بیان میں کہا کہ میں نے جن اداکاروں میں اداکاری کی خداداد صلاحیتیں دیکھی ہیں ان میں مارلن برانڈو اور رچرڈ برٹن شامل ہیں۔ برانڈو کے ساتھ قباحت یہ ہے کہ کم عمری ہی میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔

جب اس نے 'میوٹنی آن دی باؤنٹی' کی شوٹنگ مکمل کر لی تو اس جزیرے کے عشق میں مبتلا ہوگیا۔ وہاں کے لوگوں کا اخلاق اسے پسند آیا تھا۔ اس نے مشاہدہ کیا کہ اگر وہ تاہیتی میں کسی شخص سے ٹکرا جاتا ہے تو وہ ٹھہر جاتا ہے اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ جب کہ نیویارک میں ایک بار وہ ایک کار سے ٹکرا گیا اور ہائے ہائے کرنے لگا تب بھی کسی نے آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

وہ ہالی ووڈ کی گہما گہمی سے اکتا گیا تھا۔ فلک بوس عمارات اور ہر شخص اتنا مصروف کہ اسے دوسری طرف دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ سب سے پیچھا چھڑا کر کہیں دور جا بسنا چاہیے۔

اس نے بحر اوقیانوس کے شمال میں ایک جزیرہ ٹیٹوورا خرید لیا، جو تاہیتی سے نزدیک ہی تھا۔ اس نے ایک بڑے نقشہ نویس سے اس کا نقشہ بنوایا اور تکمیل کے بعد اس میں سکونت اختیار کر لی۔ اس عظیم الشان مکان میں سمندری عجائب گھر بھی تھا جس میں سمندری مخلوق اور جزیرے پر آنے والے پرندوں کے زندہ نمونے تھے۔ اس نے کوشش کی تھی کہ محل نما مکان کے گرد و پیش میں کوئی بڑی تبدیلی نہ کی جائے۔ طالب علموں کو اجازت تھی کہ وہ وہاں آسکتے ہیں اور قدرتی مناظر کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ یہ جزیرہ اس کی موت یعنی 2004ء تک اسی کے پاس رہا۔ وہ وہاں خوب کھاتا پیتا تھا اور اسے 'سکون کا مرکز' کہتا تھا۔ جہاں اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ افسوس کہ اس جزیرے میں 1983ء میں طوفان آگیا اور مکان کا بڑا حصہ تباہ و برباد ہوگیا۔ آج کل برانڈو کا بیٹا سائمن وہاں قیام پذیر ہے اور وہی اس کا مالک ہے۔ برانڈو کے نام سے جزیرے پر ایک ہوٹل زیر تعمیر ہے جو امید ہے کہ 2014ء میں مکمل ہوجائے گا۔

وہ نو برس تک فلموں سے دور رہا اور سلور اسکرین پر لوگوں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔ وہ اس ناکارہ گھوڑے کی مانند تھا جس پر کوئی داؤ لگانا پسند نہیں کرتا۔ قسمت نے پلٹا کھایا تو 1971ء میں ہدایت کار فرانسس فورڈ کپولا نے ماریو پزو کے ناول 'گاڈ فادر' کو فلمانے کا اعلان کیا تو اس کے ذہن میں مرکزی کردار کے لیے بہت سے اداکار تھے جن میں لارنس اولیور بھی شامل تھا مگر شومیٔ قسمت لارنس اولیور ان دنوں بیمار

پڑا ہوا تھا۔ جیمز میسن نے بھی ذاتی مجبوریوں کی بنا پر انکار کر دیا۔ قرعۂ فال برانڈو کے نام پڑا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ گاڈ فادر کا کردار ادا کرنے میں اسے ہچکچاہٹ ہو رہی، اس کا کہنا تھا کہ میں کسی ایسی فلم میں کام نہیں کرنا چاہتا جس سے مافیا کا نام چمکے۔ تب ناول کے مصنف ماریو پزو نے اسے خط لکھا اور ناول کی ایک کاپی ارسال کی کہ وہ اسے پڑھ کر فیصلہ کرے۔ برانڈو نے ناول پڑھ کر فلم میں کام کرنے کی ہامی بھر لی (اس کی موت کے بعد یہ خط نیلام ہوا اور ایک لاکھ بیس ہزار ڈالر میں فروخت ہوا۔

فلم گاڈ فادر کے لیے اس کا اسکرین ٹیسٹ ہوا۔ برانڈو نے اپنا میک اپ کردار کے مطابق خود کیا اور چہرے پر جھریاں ڈالیں۔ (اس نے ایک خاص انداز سے روئی کے ٹکڑے چہرے پر چپکا کر جھریاں بنائی تھیں) جب پیراماؤنٹ کے صدر چارلس بلہوڈورن نے اسکرین ٹیسٹ کا رزلٹ دیکھا تو حیرت سے بولا۔ "ارے! یہ کون ہے؟ ہم کسے دیکھ رہے ہیں؟ برانڈو تو ایسا نہیں ہے۔ یہ تو فلم کا مرکزی کردار ہی ہے، جو ہمارے پاس خود چل کر آگیا ہے۔ ہمیں اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔"

فلم بنی اور کامیاب ہوئی۔ برانڈو کو آسکر ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا۔ یہ اسے دیا جانے والا دوسرا آسکر تھا۔ برانڈو خود ایوارڈ لینے نہیں گیا۔ اپنے بجائے اس نے فلم کے ایک کردار اپاچی کو ایوارڈ لینے کے لیے بھیج دیا جس نے اپاچیوں جیسا چمڑے والا لباس پہنا ہوا تھا۔ کمیٹی نے اسے ایوارڈ دینے سے انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جس اداکار کو ایوارڈ ملا ہے، وہی اسے یہاں آکر لے جائے۔ آسکر ایوارڈ پیپسی کی بوتل نہیں ہے کہ جب چاہا اور جسے چاہا تھما دیا۔

پیراماؤنٹ پکچرز کا تھیلا سونے کے سکوں سے بھر گیا۔ فلم اب تک بننے والی فلموں میں بزنس کے اعتبار سے چوٹی کی فلموں میں شمار کی گئی۔ زمانہ ابتلا گزر گیا اور برانڈو کو ایک بار پھر عروج حاصل ہوگیا۔ اس کا شمار دنیا کے ان دس بڑے فن کاروں میں ہونے لگا جن کی فلمیں ہمیشہ باکس آفس پر کامیاب ہوتی ہیں۔ اس کی قسمت کا تارا جو گہنا گیا تھا ایک بار پھر چمکنے لگا۔ وہ بام عروج پر پہنچ گیا۔

اس سال کے اختتام پر ٹائم میگزین نے اس کی تصویر سرورق پر شائع کی اور وہ ایک بار پھر موشن پکچرز کی تاریخ میں سب سے زیادہ معاوضہ لینے والا فن کار بن گیا۔ فلم گاڈ فادر اس کی زندگی کے لیے ایک انوکھا موڑ ثابت ہوئی تھی۔

گالف (Golf)

گیند سے کھیلے جانے والا کھیل جسے کسی باغ یا بڑے میدان میں کھیلتے ہیں۔ کھیلنے والوں کی تعداد عموماً چار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ گیند چھوٹی سی سفید رنگ کی ہوتی ہے۔ اس پر ربر کا ایک چھلا سا چڑھا رہتا ہے اور یہ گٹا پارچے سے منڈھی ہوئی ہوتی ہے۔ بلے مختلف ضروریات کے لیے مختلف شکل اور وضع کے ہوتے ہیں۔ گیند کو دور پھینکنے کے لیے بڑا بلا (driver) استعمال کرتے ہیں۔ درمیانی فاصلوں تک مارنے کے لیے لوہے کا بلا درکار ہوتا ہے اور گیند کو گڑھے میں ڈالنے کے لیے پٹر (Putter) لینا پڑتا ہے۔ کھیل شروع ہونے پر ہر کھلاڑی اپنی گیند ایک چوبی کھونٹے (tee) پر رکھتا ہے اور اس کو حتی المقدور دور تک پھینکنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ گیند جس مقام پر گرے وہ جگہ صاف ہو۔ اگر گیند ناہموار مقام پر پہنچ گئی جہاں جھاڑیوں کی زیادتی ہوئی تو پھر کھیلنے والے کو ایک اسٹروک (stroke) کا نقصان رہتا ہے۔ گیند کے راستے میں کچھ قدرتی یا مصنوعی رکاوٹیں، مثلاً ریت، گڑھے، ٹیلے وغیرہ بھی ہوتے ہیں جن سے کھلاڑی کو ہوشیاری سے بچنا ہوتا ہے۔ گڑھا جس میں گیند ڈالنا ہوتی ہے ہموار گھاس کے میدان کے بیچ میں ہوتا۔ اس کا قطر 4.1/2 ہوتا ہے۔

مرسلہ: ظہیر شاہ پشاور

معاوضے کے لحاظ سے بعد میں آنے والی فلم 'سپرمین' میں بھی اس نے ریکارڈ قائم کیا۔ تیرہ دن کی شوٹنگ کے لیے اسے 3.7 ملین ڈالر ادا کیے گئے۔ اس کے علاوہ فلم کی آمدنی میں سے دس فی صد منافع بھی دیا گیا (اس ریکارڈ کو ہیریسن فورڈ جس نے فلموں میں انڈیانا جونز کا کردار ادا کیا ہے، توڑا) فلم ریلیز ہوئی اور اس نے مقبولیت حاصل کی۔ اسے آٹھویں بار آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ ہالی ووڈ میں کسی کو آسکر کے لیے نامزد کیا جانا بھی ایک اعزاز ہے اور اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ سپرمین میں اس نے سپرمین کے باپ کا کردار ادا کیا تھا۔

1973ء میں بننے والی فلم 'لاسٹ ٹینگو ان پیرس' بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

فری میسن Freemason

ایک پراسرار بین الاقوامی انجمن۔ بیس برس سے زیادہ عمر کے لوگ اس کے ممبر بن سکتے ہیں۔ اخلاق ومعتقدات کا اتحاد اور چند رازدارانہ روایات کا پاس اس انجمن کے ممبروں کی خصوصیت ہے۔ باہم سلام کرتے ہیں اور چند مخصوص کلمات دہراتے ہیں۔ بظاہر فری میسن کا مقصد اپنے ممبروں کے درمیان سوشل رابطہ پیدا کرنا ہے۔ مختلف ممالک میں فری میسن کی عمارات کی موجودگی اس انجمن کے ممبروں کو ہر ملک میں دوستانہ ماحول اور امداد فراہم کرتی ہے۔ فرانس اور دیگر یورپی ممالک میں فری میسن سیاسیات میں حصہ لینے لگے۔ رومن کیتھولک نے خفیہ سوسائٹی کی حیثیت سے اس کی مخالفت کی اور اکثر حکومتوں نے اس کو دبایا۔ انجمن کا سربراہ ہمیشہ کسی شاہی خاندان کا رکن ہوتا ہے۔ برطانیہ اور امریکا کی انجمنیں اپنے بیمار اور معمر اراکین کے لیے اسپتال اور خیراتی ادارے بناتی اور ان کے یتیموں کی تعلیم وتربیت کے لیے مدرسے کھولتی ہیں۔ امریکا میں فری میسن کے ممبروں کی تعداد 80 لاکھ ہے۔ پاکستان میں اس انجمن کے ادارے، جنہیں اصطلاح میں لاج (Lodge) کہتے ہیں کراچی، لاہور، پشاور، راولپنڈی، حیدر آباد میں تھے۔ اب انہیں قانوناً بند کردیا گیا ہے۔ ان کلبوں کا آغاز برطانیہ میں 1771ء میں ہوا جس کے بعد یہ دنیا کے اکثر ممالک میں قائم ہوگئے۔ فری میسنز کو ایک خفیہ صیہونی تحریک بھی سمجھا جاتا ہے۔ صیہونی تحریک سمجھے جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رومن کیتھولک کلیسا نے اس کی مذمت کی اور اس پر طرح طرح کے الزامات لگا کر لوگوں کو اس میں شامل ہونے سے روکنے کے لیے سرتوڑ کوشش کی۔ ان کلبوں کے لیے لفظ فری میسن یا ''میسانک لاجز'' استعمال کرنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ شروع شروع میں جن ایوانوں میں یہ کلب قائم کیے گئے تھے وہ دراصل معمار پیشہ لوگوں نے ازمنہ وسطیٰ میں تعمیر کی تھیں، لہٰذا ان معماروں کے نام اور بعض رسومات کو برقرار رہنے دیا گیا۔

مرسلہ: ناہید سلطانہ، کراچی

اس کی کامیاب فلموں میں شمار ہوتی ہے، جس میں اس کی اداکاری عروج پر تھی اسی لیے اسے آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ فلم کی شوٹنگ کے دوران اس کے بیٹے کرچیئن کو کچھ لوگوں نے اغوا کرلیا اور اس کی ماں اینا کاشفی سے مطالبہ کیا کہ وہ تیس ہزار ڈالر ادا کرے تو اس کے بیٹے کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اینا کاشفی نے ہنی لوگوں کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا تو انہوں نے 13 سالہ کرچیئن کی آبروریزی کی اور اسے میکسیکو کے ایک مکان میں لے جا کر چھوڑ دیا۔

جب اس کے اغوا کے بارے میں برانڈو کو معلوم ہوا تو اس نے ایک سراغرساں کو بیٹے کی تلاش پر مامور کیا۔ وہ مل گیا تو معلوم ہوا کہ اسے نمونیہ ہوچکا ہے۔ برانڈو کی اینا کاشفی سے علیحدگی ہوچکی تھی اس لیے برانڈو بیٹے کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے عدالت سے رجوع کیا تو عدالت نے اس کی اجازت دے دی۔ اس لیے کہ برانڈو نے یہ بھی ثابت کردیا تھا کہ اینا کاشفی کا سلوک کرچیئن کے ساتھ اچھا نہیں ہے وہ اسے گالیاں دیتی، مارتی کاٹتی اور ہر وقت نشے میں رہتی ہے۔ عدالت نے تحقیق کرائی تو ساری باتیں درست نکلیں۔ چنانچہ فیصلہ برانڈو کے حق میں دے دیا گیا۔

☆☆☆

1979ء میں اسے ہدایت کار کپولا کی ایک اور فلم 'اپوکلاپس ناؤ' میں کام کرنے کی پیشکش کی گئی مگر اس کے ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کی گئی کہ وہ اپنا وزن کم کرے گا۔ برانڈو نے اس کا وعدہ کرلیا لیکن جب وہ شوٹنگ کے لیے سیٹ پر پہنچا تو یہ دیکھ کر کپولا کی روح فنا ہوگئی کہ اس کے سامنے تبت کا روحانی پیشوا گوتم بدھ کھڑا ہے جس کا پیٹ مٹکے کی طرح نمایاں تھا۔ رول کے مطابق اس نے اپنے سر پر استرا بھی پھروالیا تھا۔

کپولا نے وقت ضائع کرنے کے بجائے فلم کی شوٹنگ شروع کرادی۔ برانڈو کا تربوز نما پیٹ ناظرین کو نظر نہ آئے اس کے لیے اس نے زیادہ تر شوٹنگ سائے میں کی تاکہ اس کا تربوز نما پیٹ ناظرین کو نظر نہ آئے۔ اس نے تاریکی کے مناظر فلم میں بھی پکچرائز کیے۔ کئی مناظر میں اس کا ڈپلی کیٹ بھی استعمال کیا گیا۔ کاروباری لحاظ سے فلم باکس آفس پر ہٹ ہوگئی۔ اس فلم میں برانڈو کو فی ہفتہ دس لاکھ ڈالر کا معاوضہ ادا کیا گیا (گویا کپولا کا فیصلہ درست تھا کہ برانڈو کی گڈی چڑھی ہوئی ہے اس لیے اس کے گنبد نما پیٹ کو نظر انداز کردینا چاہیے اور اس سے کام لینا چاہیے۔ ناظرین سے اس کا پیٹ چھپانے کے لیے اس نے اپنی ہدایت کارانہ صلاحیتوں کا استعمال کیا تھا)

درج بالا تین فلموں کی لگاتار کامیابی کے بعد فلم سازوں کو اس پر اعتماد ہوگیا۔ وہ ایک بار پھر اس جیتنے والے گھوڑے پر داؤ لگانے لگے۔ 1980ء میں اس نے فلم 'دی فارمولا' میں کام کیا اور قسمت کی دیوی کی مہربانی سے اس فلم نے اچھا بزنس کیا۔

☆☆☆

شادیاں وہ کرچکا تھا اور پانچ بچے بھی ہوچکے تھے، جو برانڈو کے پہلو بہ پہلو کھڑے ہوجاتے تو قامت میں اس کے برابر تھے۔ بہرحال اس کا عشق جاری تھا۔ اس بار اداکاراؤں کے بجائے اس نے گھریلو قسم کا عشق کیا۔۔۔ اپنی مالکہ مکان ماریہ روئز سے جس سے اس کے تین بچے ہوئے۔ نینا برانڈو (پیدائش مئی 1989ء) مائلس جوناتھن برانڈو (پیدائش جنوری 1992ء) تموتھی گاہان برانڈو (پیدائش جنوری 1994ء) ممکن ہے ماریہ روئز سے اس کے خفیہ تعلقات کسی پر ظاہر نہ ہوتے، لیکن ماریہ نے عدالت میں مقدمہ دائر کردیا کہ برانڈو نے اس سے پندرہ برس تک عشق کیا ہے مگر اب اپنے بچوں کی کفالت نہیں کررہا ہے اور سارا بوجھ اس نے میرے کاندھوں پر ڈال رکھا ہے۔ مجھے اس سے ایک سو ملین ڈالر دلوائے جائیں۔ برانڈو نے اپنے معاملات عدالت سے باہر طے کرلیے اور ان بچوں کی کفالت پر آمادہ ہوگیا۔

اس نے اپنی سوانح حیات میں اس کا انکشاف کیا ہے کہ اس کے چار بچے اور بھی ہیں لیکن وہ ان کی ماؤں کے نام ظاہر نہیں کرے گا (اس کے بچوں کی مجموعی تعداد کتنی ہوئی؟ یہ آپ خود گن سکتے ہیں)

1989ء میں اس نے فلم 'اے ڈرائی وھائٹ سیزن' میں کام کرنے کے لیے شرط رکھی کہ فلم ساز پہلے تین ملین ڈالر (معاوضے کے طور پر) ایک خیراتی ادارے کو ادا کرے۔ 1990ء میں اس نے 'فریش مین' میں کام کیا جس کے لیے اسے چار ملین ڈالر ادا کیے گئے۔ یہ رقم بھی اس نے غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کردی۔ وہ دل کا غنی تھا اس لیے کئی فلاحی اداروں کی سرپرستی کیا کرتا تھا۔

گاڈ فادر حصہ دوم اور سپر مین حصہ دوم میں اس نے کام کرنے سے انکار کردیا کہ جب اس نے ایک بار کردار ادا کردیا تو دوسری بار انصاف نہیں کرسکے گا۔ حالانکہ اسے پچھلے معاوضے سے تین گنا زیادہ پیشکش کی گئی تھی۔

اگر وہ فلم میں ہیرو کا کردار ادا نہیں کررہا ہوتا تھا تب بھی سب سے زیادہ معاوضہ لیا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر 2001ء میں صرف چار منٹ کے پادری کے ایک کردار کے لیے اسے

فرینکس (Franks)

جرمن قبائل کا ایک گروہ، جس نے تیسری صدی عیسوی میں فرانس پر اپنا تسلط قائم کرلیا، بعدازاں انہی لوگوں کے نام پر فرانس کا موجودہ نام مشہور ہوا۔ یہ لوگ نیلگوں آنکھوں والے، دراز قامت اور خوش وضع افراد تھے۔

فرینکفرٹ (Frankfurt)

دریائے مائین کے کنارے جرمنی کا ایک پرانا شہر۔ 1866ء سے پہلے ایک آزاد شہر تھا۔ اس کے بعد سلطنت جرمنی میں شامل کرلیا گیا۔ پہلے بہت بڑا تجارتی اور صنعتی شہر تھا لیکن عالمگیر جنگ 1939-1945ء میں بری طرح تباہ ہوگیا۔ 1947ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ان افواج کا ہیڈ کوارٹر بن گیا جو جرمنی کے امریکی خطے میں موجود تھیں۔ یہاں موٹر سازی ادویات، بجلی کے سامان اور کپڑے کی صنعتیں ہیں۔

چوھدری فضل القادر

1919-1973ء سیاسی رہنما۔ گوہیرا (بنگال) میں پیدا ہوئے۔ پریزیڈنسی کالج کلکتہ میں تعلیم پائی۔ آزادی کے بعد ڈھاکا یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لی۔ 1941ء میں آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ 1954ء میں مشرقی پاکستان صوبائی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ایوبی دور میں قومی اسمبلی کے رکن چنے گئے اور اسپیکر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ایوب خان کے ریٹائر ہونے کے بعد فضل القادر چوہدری کنونشن مسلم لیگ کے قائم مقام صدر منتخب ہوئے۔ 1970ء کے انتخابات میں شکست کھائی۔ آخر دم تک بنگلہ دیش کے قیام کے مخالف رہے۔ مشرقی پاکستان پر بھارتی فوجی قبضے کے بعد دیگر محب وطن بنگالی رہنماؤں کے ساتھ آپ کو بھی قید میں ڈال دیا گیا۔ اسی قید وبند کی حالت میں وفات پائی۔ 1990ء میں حکومت پنجاب نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں تحریک پاکستان گولڈ میڈل دیا۔

مرسلہ: نیاز ہمدانی، ملتان

WWW.PAKSOCIETY.COM

دو ملین ڈالر (بیس لاکھ ڈالر) کی پیشکش کی گئی جو اس نے نامنظور کر دی اس لیے کہ اس پر اپریل 2001ء میں نمونیا کا حملہ ہو چکا تھا۔ اس کردار کو بعد میں جیمز وڈ نے ادا کیا۔

مئی 1990ء میں اس کی بیٹی چے نی کے عاشق ڈاگ ڈورلٹ کو چے نی کے سوتیلے بھائی کرسچین نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ موت سے پیشتر اس کی جھڑپ کرسچین سے ہوئی تھی۔ یہ واقعہ برانڈو کے بیورلے ہلز کے پہاڑی والے مکان میں پیش آیا تھا۔ کرسچین کی عمر اس وقت 31 برس تھی۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے عدالت میں بیان دیا کہ وہ نشے میں تھا اور گولی اس سے اتفاقاً چل گئی تھی۔ اخبارات میں کافی چرچا ہوا۔ برانڈو اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے عدالت تک پہنچ گیا۔

عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ وہ کافر نہیں ہے اور خدا کو مانتا ہے لیکن جب وہ اپنے بیٹے کے مقدمے میں بیان دینے کے لیے عدالت میں آیا تو وکیل نے اس کے سامنے بائبل پیش کی اور جج نے کہا قسم کھاؤ کہ "تم جو کچھ کہو گے سچ کہو گے" تو برانڈو نے کہا۔ "میں خدا پر یقین رکھتا ہوں مگر اس طرح سے نہیں جیسے دوسرے رکھتے ہیں۔ چنانچہ بہتر ہے کہ میں بائبل پر ہاتھ رکھ کر قسم نہ کھاؤں۔"

اپنے بیٹے کو بچانے کے لیے اس نے بھی عدالت کو یقین دلایا کہ اس کا بیٹا نشے میں تھا اور اس نے ریوالور نکال کر فائرنگ شروع کر دی۔ ڈورولٹ اس کی زد میں آ گیا۔

یہ دلیل بودی اور ناقص مانی گئی۔ جیوری پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ تمام ثبوت اور شواہد کرسچین کے خلاف تھے اس لیے عدالت نے اسے دس سال قید کی سزا دے دی۔ وہ مارچ 1991ء کو جیل کی دیواروں کے پیچھے گیا اور جنوری 1996ء میں رہا ہوا۔

اس کی بیٹی چے نی کو کار کا حادثہ پیش آ گیا۔ وہ اپنے محبوب کے قتل سے دل گرفتہ تھی۔ حادثے میں چونکہ اسے شدید چوٹیں آئی تھیں چنانچہ اس نے 1995 میں خودکشی کر لی۔ اس وقت اس کی عمر پچیس برس تھی۔ اس کا سوتیلا بھائی کرسچین نمونیا میں مبتلا ہو کر 49 برس کی عمر میں 26 جنوری 2008ء میں موت کا شکار ہوا۔

☆☆☆

اپنے کھانے پینے کی عادت اور اطمینان سے زندہ رہنے کے فلسفے کی بنا پر 1980ء اور 1990ء کے درمیانی عرصے میں وہ بہت فربہ ہو گیا تھا اور اس کا وزن 300 پونڈ ہو گیا تھا۔ یہ موٹاپا اسے خود ناگوار گزرتا تھا لیکن اس کے چاہنے والے اسے مسکرا کر دیکھتے تھے اور حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ اتنا ڈیل ڈول رکھنے کے باوجود وہ آخر تک ایک بڑا اداکار کیسے رہا؟ بہرحال اپنے موٹاپے کے سبب اسے ذیابیطس ہو گیا۔ مشہور ہدایت کار آرسن ویلز کی طرح اس کا وزن کم اور زیادہ ہوتا رہا۔

مشہور پاپ سنگر مائیکل جیکسن سے برانڈو کی گہری دوستی تھی۔ وہ اس کے پاس گٹار سیکھنے بھی جایا کرتا تھا۔ وہاں اسے جیکسن کوئی کمی محسوس نہ ہونے دیتا۔ برانڈو کے لیے ایک باورچی، ڈرائیور اور باڈی گارڈ چوبیس گھنٹے کے لیے موجود رہتے۔ جب مائیکل جیکسن 2001 میں اپنی 30 ویں سالگرہ منا رہا تھا تو برانڈو نے بھی اس میں شرکت کی تھی۔ اس موقع پر تیرہ منٹ کی ایک ویڈیو فلم بھی بنائی گئی تھی جس میں کیمرا برانڈو کی طرف بھی رہا۔ اس موقع پر برانڈو نے ایک چھوٹی سی تقریر بھی کی۔ جس کا موضوع انسانیت کی خدمت تھا، چونکہ تقریر کسی پروگرام کے بغیر تھی، لہٰذا اس میں کسی نے دلچسپی نہیں لی۔ ان کی دوستی میں بعد میں کانٹے پڑ گئے اس لیے کہ برانڈو نے مائیکل جیکسن کے بٹلر سے ناگواری سے کہہ دیا تھا کہ مائیکل ان بچوں کے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ اس نے عجیب شوق پال لیا ہے (واضح ہو کہ مائیکل جیکسن پر بچوں کے ساتھ منہ کالا کرنے کے الزامات تھے اور اس سلسلے میں اس نے عدالت میں حاضری بھی دی تھی) بٹلر نے یہ بات مائیکل جیکسن کو بتا دی۔ چنانچہ تعلقات میں دراڑیں پڑ گئیں۔

برانڈو کا بیٹا مائیکو کافی عرصے تک مائیکل جیکسن کے باڈی گارڈ اور معاون کے طور پر اس کے پاس ملازم رہا۔ جیکسن کی اس سے بھی دوستی تھی اور وہ اس سے مشورے بھی کیا کرتا تھا۔

یکم جولائی 2004ء کو برانڈو 80 برس کی عمر میں اس دنیائے فانی سے لاس اینجلس کے اسپتال میں کوچ کر گیا۔ اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور دوسری بیماریوں میں ذیابیطس اور نمونیا شامل تھا۔ اس کے جگر میں ایک رسولی تھی جو سرطان کے سبب تھی۔ (جس کی بنا پر اس کی بینائی کم ہو گئی تھی) اس سے پہلے کہ ڈاکٹر آپریشن کر کے اسے نکال دیتے، اس کی موت واقع ہو گئی۔

اپنے پیچھے اس نے تیرہ بچے چھوڑے تھے۔ جن میں سے دو بچے اس کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ جب کہ پوتوں اور پوتیوں کی تعداد (ماشاء اللہ سے) 30 کے قریب تھی۔

عزمِ مصمم

طارق عزیز خان

ڈاکٹرز اسے بستر سے اترنے کی اجازت دینے کو تیار نہ تھے اور وہ ہمالیہ کی چوٹی سر کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ صرف عزم و ہمت کے بھروسے پر وہ ناممکن کو ممکن کر دکھا رہا تھا، مہم جوئی اس کی سرشت میں شامل تھی۔

ایک معروف مہم جو کی زندگی کا عکس

"آج سے تم اپنے گھر کی نچلی منزل پر شفٹ ہو جاؤ۔" ڈاکٹر نے اپنے ہاتھ میں پکڑی میڈیکل رپورٹس کو لہراتے ہوئے سامنے بیٹھے مریض کی طرف دیکھا۔

"کیوں کیا ہوا؟" مریض نے پُرسکون لہجے میں سوال کیا۔

"تم بوڑھے ہو چکے ہو اور اب سیڑھیاں چڑھنا تمہارے کمزور دل کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" مریض بے پروائی سے مسکرایا۔ "لیکن کیا تم مجھے پہاڑ پر چڑھنے کی اجازت دے سکتے ہو؟"

"دیکھو کچھ الٹا سیدھا مت سوچو، تمہارا دل کمزور ہے اور میں زیادہ سے زیادہ تمہیں گھر سے مارکیٹ تک پیدل واک کی اجازت دے سکتا ہوں۔"

"کاش تم نے یہ سب کچھ ایک ہفتے پہلے کہا ہوتا؟"

"کیا مطلب" ڈاکٹر نے چونک کر مریض کو گھورا جو اس کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہا تھا۔

"وہ دراصل بات یہ ہے کہ میں۔۔۔ ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔"

ڈاکٹرز کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے سامنے بیٹھا جنونی شخص مذاق نہیں کر رہا تھا۔

وہ مشہور انگریز مہم جو سر ران فینس (Sir Ranulph Fiennes) تھا جس کی پوری زندگی مہم جوئی سے عبارت تھی۔

وہ عزم مصمم کا مالک ایک ایسا انسان تھا جس کے دماغ میں کچھ الگ کرنے کا جنون ہر وقت سوار رہتا تھا۔ برطانوی حکومت اسے سر کے خطاب سے نواز چکی تھی جبکہ اس کے عزم و ہمت کو دیکھ کر گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ کے 1984ء ایڈیشن میں اسے دورِ حاضر کا سب سے بڑا مہم جو قرار دیا گیا تھا۔ اکتوبر 2007ء میں مشہور برطانوی اخبار ٹیلی گراف نے دنیا کے سو ذہین ترین افراد کی فہرست شائع کی جس میں اس کا 94واں نمبر تھا۔ اس کا سب سے نمایاں کارنامہ 82-1979ء میں کرۂ ارض کے گرد لگایا گیا پہلا عمودی (Vertically) چکر ہے۔ اس نے اس مہم کے دوران قطب جنوبی و شمالی تک رسائی حاصل کی اور براعظم انٹارکٹیکا کو پیدل پار کیا۔ ران فینس کا ایک اور نمایاں کارنامہ لگاتار سات دن تک دنیا کے سات براعظموں میں سات کار ریسوں میں شمولیت ہے۔ یاد رہے کہ وہ اس انوکھی کار ریس میں حصہ لینے والا اکیلا ڈرائیور تھا۔ اس نے 64 سال کی عمر میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی کوشش کی۔ وہ چوٹی کے انتہائی قریب تھا کہ اسے دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹرز نے اسے آرام کا مشورہ دیا، تاہم جنونی ران فینس نے اگلے ہی سال دنیا کے بلند ترین مقام کو سر کر کے سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ ایسا کرنے والا دنیا کا پہلا معمر ترین انسان تھا۔

ران فینس 7 مارچ 1944ء کو اسکاٹ لینڈ کے دارالحکومت گلاسگو میں پیدا ہوا۔ اس کی پیدائش سے چند دن پہلے اس کے والد لیفٹیننٹ کرنل سر رالف ٹوئس لیٹن وائٹک ہام فینس کا جنگ عظیم دوم کے دوران مشرقی یورپ کے محاذ پر انتقال ہو چکا تھا۔ فینس کی تیسری سالگرہ پر خاندان والوں نے اسے باپ کا قائم مقام بنایا۔ اس کا بچپن جنوبی افریقا میں گزرا جہاں وہ اپنے خاندان کے ہمراہ 12 سال کی عمر تک مقیم رہا۔

1956ء میں وہ انگلینڈ چلا آیا۔ اس نے جنوبی انگلینڈ کی Witshire کاؤنٹی میں قائم Sandroyd School میں داخلہ لیا اور برکشائر کاؤنٹی کے مشہور تعلیمی ادارے Eton College میں تین سال تک پڑھا۔ 59-1958ء میں وہ برطانوی فوج میں اپنے والد کی رجمنٹ Royal Scots Greys سے وابستہ ہوا۔ تاہم مزاج کے کھلنڈرے پن کی وجہ سے وہ فوج کے گلے بندھے اصول و ضوابط پر پورا نہ اتر سکا اور صرف 8 سال بعد فوج سے الگ ہو گیا۔ مہم جوئی پر مائل طبیعت اسے 1968ء میں سلطان آف اومان کی فوج میں لے گئی جہاں اس نے دو سال گزارے۔ فینس کی مہم جویانہ زندگی کا آغاز 1969ء کے آخر میں ہوا جب اس نے سوڈان کے علاقے میں بہنے والے دریائے نیل کی شاخ "نیل ابیض" (White Nile) کو ایک ہوور کرافٹ (hovercraft) کے ذریعے پار کیا۔ سوڈان کے بعد وہ ناروے پہنچا، جہاں اس نے 1970ء کی گرمیوں میں جنوبی ناروے میں واقع برفانی تودے Jostedalsbreen Glacier کو پار کیا۔

لگ بھگ 65 کلومیٹر لمبے اور 33 کلومیٹر چوڑے برفانی تودے پر سفر کے دوران فینس کو ایک انوکھا خیال سوجھا۔ اس نے طے کیا کہ اگر اسے موقع ملا تو وہ دنیا کے گرد عمودی چکر لگاتے ہوئے قطبین تک رسائی کی کوشش کرے گا۔ فینس نے 9 ستمبر 1970ء کو جینی نامی خاتون سے شادی کی۔ شادی کے بعد وہ سمرسٹ کاؤنٹی میں ایک فارم ہاؤس میں منتقل ہو گیا۔

ایک رات تاروں کی چھاؤں میں ڈرنک کرتے ہوئے فینس نے جینی سے اپنے منصوبے کا ذکر کیا۔ جینی جانتی تھی کہ دنیا کے گرد پہلا کامیاب چکر لگانے کا اعزاز پرتگالی نژاد ہسپانوی مہم جو فرڈی ننڈ میگلن کے سر جاتا ہے جس نے 1519ء سے 1522ء کے دوران یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ میگلن کی اس بحری مہم کا مقصد بحرالکاہل کی طرف سے ایشیا تک رسائی کا بحری راستہ تلاش کرنا تھا جس میں وہ کامیاب رہا۔ جینی جانتی تھی کہ اس کا شوہر لکیر کا فقیر نہیں ہے۔ اس کے دماغ میں کچھ اور ہی چل رہا ہے۔

"جہاں تک مجھے معلوم ہے میگلن کے پہلے سفر سے لے کر آج تک یہ کارنامہ سیکڑوں بار دہرایا جا چکا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو ڈارلنگ۔" فینس نے اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھا۔ "میں اوپر سے نیچے اور پھر نیچے سے اوپر سفر کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" جینی نے چونک کر فینس کی طرف دیکھا۔

"مطلب صاف ہے، میں دنیا کے گرد عمودی چکر لگانے کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔" فینس نے جینی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "کیا تم نے سنا کہ کبھی کسی نے ایسا کیا ہو؟"

"تم یورپ، افریقا اور انٹارکٹیکا کو پیدل پار کرنے کا سوچ بھی کیسے سکتے ہو؟" جینی حیرت سے چلا اٹھی۔ "بین الاقوامی سمندر میں سفر کرنے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن درجنوں ممالک تمہیں اپنی سرزمین میں پیدل سفر کرنے کا اجازت نامہ کیسے دیں گے، اور پھر انٹارکٹیکا کی برفیلی سرزمین؟"

"میں کچھ ایسا ہی سوچ رہا ہوں۔" فینس کے لہجے میں عزم جھلک رہا تھا۔

"مجھے تمہاری صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد ہے۔" جینی نے فینس کی حوصلہ افزائی کی۔ "لیکن اس سب کے لیے سرمایہ کہاں سے آئے گا؟"

"دراصل میں اس فارم ہاؤس میں آیا ہی اس لیے تھا کہ تم سے بات چیت کر کے اپنے منصوبے کی نوک پلک پر غور کر سکوں۔"

کرۂ ارض کے گرد عمودی چکر ایک بہت بڑا منصوبہ تھا جس کے لیے اعلیٰ معیار کی منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ کثیر سرمائے کی ضرورت تھی۔ فینس نے آنے والے سالوں کے دوران اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دن رات کام کیا۔ اس نے اپنے تاریخی سفر کو "کرۂ ارض کے گرد مہم" (Transglobe Expedition) کا نام دیا۔ اس نے طے کیا کہ وہ لندن میں واقع مقام گرین وچ سے مہم کا آغاز کرتے ہوئے مشرقی نصف کرے میں پرائم میری ڈیان (Prime Meridian) اور بحرالکاہل میں مغربی نصف کرے کی حدود میں بین الاقوامی تاریخی لائن کے فرضی خط کے قریب قریب سفر کرے گا۔ فینس نے منصوبے کے لیے سرمایہ اکٹھا کرنے کی غرض سے یورپ اور امریکا میں تشہیری مہم چلائی۔ اسے پہلی بڑی کامیابی اس وقت ملی جب برطانوی ولی عہد شہزادے چارلس نے مہم کی سرپرستی کا اعلان کیا۔ شہزادے چارلس کی حمایت حاصل ہوتے ہی مہم کے لیے سرمایہ فراہم کرنے والوں کی لائن لگ گئی۔ 1978ء کے وسط تک اس کے ساتھ معاونت کرنے والوں کی تعداد 1900 ہو چکی تھی۔ مہم کے لیے ضروری فنڈ جمع کرنے کے بعد فینس نے زمینی سفر کے لیے راستے میں آنے والے ممالک سے سفر کا اجازت نامہ حاصل کیا۔ اس نے سمندری سفر کے لیے 1952ء میں تیار ہونے والے بحری جہاز ایم وی بنجمن بورنگ کا انتخاب کیا جس کا وزن 1250 ٹن تھا۔ بحری جہاز پر ضروری سامان کے ساتھ برف پر چلنے والی کتا گاڑیاں، چھوٹی کشتیاں، پیراشوٹ اور خیمے موجود تھے۔ مہم کی فلمبندی اور نگرانی کے لیے 5700

ران فینس کی مشہور کتابیں

- A Talent for Trouble
- Ice Fall in Norway
- The Headless Valley
- Hell on Ice
- To the Ends of the Earth
- Atlantis of the Sands
- The Sett
- Beyond the Limits
- The Secret Hunters
- Mad, Bad and Dangerous to Know
- Mad Dogs and Englishmen

ران فینس کے نمایاں اعزازات

- French Parachute Wings 1968
- Dhofar Campaign Medal 1968
- Sultan of Oman's Bravery Medal 1970
- Man of the Year 1982
- Livingstone Gold Medal
- Royal Scottish Geographical Soc 1983

کلوگرام وزنی ہوائی جہاز بھی حاصل کیا گیا۔ جس کا ماڈل Ratt & Whitney PT6A-27 free turbine engines تھا۔ مہم کے لیے 52 افراد کا انتخاب کیا گیا جن میں 49 افراد پر مشتمل تکنیکی عملہ اور 3 مہم جو شامل تھے۔ مہم جوؤں میں فینس کے علاوہ برٹش اسپیشل ائیر سروس سے تعلق رکھنے والے 37 سالہ چارلس رابرٹ برٹن (2002-1942) اور 33 سالہ اولیور شیپرڈ (1946) شامل تھے۔ 1979ء کے موسم بہار میں ران فینس نے لندن میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے رواں سال خزاں میں مہم کا باقاعدہ آغاز کرنے کا اعلان کیا۔

ران فینس کی قیادت میں تین افراد پر مشتمل گروپ نے ستمبر 1979ء میں لندن میں واقع مقام گرین وچ سے پیدل مہم کا آغاز کیا۔ وہ جنوب میں پیدل سفر کرتے ہوئے رود بار انگلستان کے ساحل پر پہنچے جہاں وہ بحری جہاز پر سوار ہو کر

فرانس کی سرزمین پہ اترے۔ انہوں نے فرانس اور اسپین کی سرزمین پہ کچھ سفر پیدل اور کچھ جیپ میں کیا۔ وہ اکتوبر کی شروعات میں بحیرہ روم کے کنارے پہنچے جہاں ان کا بحری جہاز لنگر انداز تھا۔ انہوں نے بحیرہ روم پار کیا اور الجزائر کی سرزمین میں قدم رکھا۔ فینس نے اکتوبر کے دوران صحرائے اعظم کو جنوب کی طرف سفر کرتے ہوئے پار کیا۔ اس نے مالی کے تاریخی شہر ٹمبکٹو شہر کی سیاحت کی اور آئیوری کوسٹ کے دارلحکومت اور جنوبی بحراوقیانوس کی بندرگاہ عابد جان پہنچ گیا۔ فینس کے گروپ نے بحری جہاز بنجمن بورنگ کے ذریعے جنوبی بحراوقیانوس کو پار کیا اور دسمبر 1979ء میں جنوبی افریقا کی بندرگاہ کیپ ٹاؤن پہنچے۔ انہوں نے موسم سرما جنوبی افریقا میں گزارہ۔ اس نے جولائی کے دوران بحر ہند اور بحراوقیانوس کے سنگم کو پار کیا اور اگست 1980ء میں انٹارکٹیکا کی برفیلی سرزمین کو چھوا۔

ران فینس نے خط استواء سے 70 ڈگری جنوب اور 2 ڈگری مغرب کے خط پر انٹارکٹیکا میں واقع جنوبی افریقا کے ریسرچ اسٹیشن سانے (Sanae) کے قریب اپنا بیس کیمپ قائم کیا۔ یہ انٹارکٹیکا کی سرزمین پہ چھ ماہ پر مشتمل موسم گرما کے دن کی شروعات تھی۔ فینس نے چارلس برٹن کے ساتھ مل کر اکتوبر کے آخر میں انٹارکٹیکا کی سرزمین پر پیدل مہم شروع کی۔ اس نے 17 دسمبر 1980ء کو قطب جنوبی پر پہنچ کر برطانیہ کا پرچم لہرایا۔ فینس نے سفر جاری رکھا اور انٹارکٹیکا کو پار کرکے فروری 1981ء میں بحیرہ روز کے ساحل پر پہنچ گیا، جہاں بنجمن بورنگ اس کا منتظر تھا۔ وہ بحیرہ روز میں سے ہوتا ہوا جنوبی بحرالکاہل کے کھلے سمندر میں داخل ہوا۔ فینس کے بحری جہاز نے مارچ 1981ء میں نیوزی لینڈ کے شہر آک لینڈ اور اپریل میں آسٹریلیا کے شہر سڈنی میں لنگر گرائے۔

آسٹریلیا کے بعد فینس کی اگلی منزل امریکا تھا۔ اس نے شمال کی طرف سفر کرتے ہوئے بحرالکاہل پار کیا اور مئی 1981ء میں لاس اینجلس کی بندرگاہ پہنچا۔ وہ جون میں مغربی کینیڈا کی بندرگاہ وینکوور میں تھا جہاں اس نے چند دن گزارے۔ جولائی کی شروعات میں فینس نے خلیج الاسکا کو پار کیا اور مغربی الاسکا کی سرزمین پہ قدم رکھا۔ فینس کی قیادت میں اس کے گروپ نے الاسکا میں پیدل مہم شروع کی۔ انہوں نے موسم گرما کے دوران الاسکا اور شمال مغربی کینیڈا کو پار کرکے شمال مغربی بحری راستے کا نظارہ کیا۔ جہاں ان کا بحری جہاز لنگر انداز تھا۔ فینس نے نومبر دسمبر شمال مغربی بحری راستے پر سفر مکمل کیا۔ وہ شمالی کینیڈا کے جزیرے ایلس میری اور شمالی گرین لینڈ کی سیاحت کرتا ہوا جنوری 1982ء میں بحر منجمد شمالی کے جمے ہوئے سمندر کے کنارے پہنچا۔ فینس نے 82 ڈگری شمال کے خط پر بحر منجمد شمالی میں پیدل مہم کی شروعات کی۔ اس نے شمال کی طرف سفر جاری رکھا اور 11 اپریل 1982ء کو قطب شمالی پر برطانیہ کا پرچم لہرایا۔

دنیا کے انتہائی شمالی مقام پر چند گھنٹے گزارنے کے بعد فینس نے شمال سے جنوب کی طرف مہم کا آغاز کیا۔ اس نے پرائم میریڈیان کی فرضی لائن پر جنوب کی طرف سفر جاری رکھا۔ اس کے گروپ نے مئی جون کے دوران جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے گرین لینڈ اور ناروے کے جزیرے سپٹس برگن کے درمیان واقع بحیرہ گرین لینڈ میں رسائی حاصل کی جہاں سے وہ دوبارہ بنجمن بورنگ پر سوار ہوئے۔ ان کے بحری جہاز نے بحیرہ ناروے اور بحیرہ شمالی کو پار کرکے اگست کی شروعات میں انگلینڈ کے ساحلوں پر لنگر گرائے۔ ران فینس نے انگلینڈ کی سرزمین پر مہم کے آخری پیدل مرحلے کا آغاز کیا اور کامیابی کے شادیانے بجاتا ہوا 29 اگست 1982ء کو واپس گرین وچ (لندن) پہنچ گیا۔

ران فینس نے کرۂ ارض کے گرد پہلے عمودی چکر کے

گنیز بک ورلڈ ریکارڈ ایڈیشن 1984ء نے دنیا کے حیات مہم جوؤں میں ران فینس کو سب سے عظیم قرار دیا۔

Gold Medal NY Explorers Club 1984

Fndr's Medal RGS 1984

The Polar Medal 1984

ITV Award for Event of the Decade 1990

Explorers Club (Br Chapter) Millennium Award for Navigation 2000

Oldie of the Year Award 2004

مختلف یونیورسٹیز کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی گئی جن میں 2000ء میں یونیورسٹی آف گلاسکوز اور 2005ء میں یونیورسٹی آف شیفیلڈ نمایاں ہیں۔

اکتوبر 2007ء میں مشہور اخبار دی ڈیلی ٹیلی گراف نے دنیا کے 100 ذہین افراد کی فہرست شائع کی جس میں فینس 94 نمبر پر تھا۔

دوران مجموعی طور پر 84 ہزار کلومیٹر (52000 میل) کے قریب فاصلہ طے کیا۔ اس میں رود بار انگلستان میں 200 کلومیٹر، مغربی یورپ میں 2 ہزار کلومیٹر، بحیرہ روم میں 700 کلومیٹر، مغربی افریقا میں 6 ہزار کلومیٹر، جنوبی بحراوقیانوس میں 15 ہزار کلومیٹر، انٹارکٹیکا پر 4 ہزار کلومیٹر، بحرالکاہل میں 34 ہزار کلومیٹر، شمالی امریکا کی سرزمین پر 3 ہزار کلومیٹر، شمال مغربی بحری راستے پر 9 ہزار کلومیٹر، بحر منجمد شمالی (بشمول قطب شمالی) پر 7 ہزار کلومیٹر اور شمالی بحراوقیانوس (واپسی) میں 3 ہزار کلومیٹر کے قریب سفر شامل ہے۔ فینس نے نہ صرف دنیا کے گرد پہلا عمودی چکر مکمل کیا بلکہ وہ انٹارکٹیکا کی سرزمین کو پیدل پار کرنے والا پہلا انسان بھی کہلایا۔

امریکا کے مشہور اخبار نیویارک ٹائمز نے فینس کی مہم کو دنیا کا آخری عظیم ایڈونچر قرار دیا جبکہ مہم کے سرپرست برطانوی شہزادے چارلس نے اسے "حیران کن جنون" سے تشبیہ دی۔ 1983ء کے آخر میں فینس کی کتاب To The Ends of the Earth منظر عام پر آئی جس کی ریکارڈ فروخت نے اسے شہرت کی نئی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ برطانوی حکومت نے اسے "سر" کا خطاب دیا۔ لندن کی رائل جیوگرافیکل سوسائٹی نے فینس کے کارنامے کو سراہا اور اسے گولڈ میڈل سے نوازا جبکہ Loughboroth یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دینے کا اعلان کیا۔

دنیا کے گرد پہلے عمودی چکر کے بعد ران فینس نئی منصوبہ بندیوں میں مصروف رہا۔ اس کی قیادت میں برطانوی اور امریکی ماہر آثار قدیمہ پر مشتمل ٹیم نے 1992ء میں اومان میں یمن کی سرحد کے قریب واقع "یوبار" (Ubar) کے گم شدہ شہر کو دریافت کیا۔ یاد رہے کہ فینس کی مہم سے پہلے 26 سال کے دوران یوبار کو تلاش کرنے کی 7 کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ اس نے 1993ء میں برطانوی ماہر خوراک ڈاکٹر مائیک سٹراؤڈ (Mike Stroud) کے ساتھ مل کر ایک بار پھر انٹارکٹیکا کو پیدل پار کرنے کی کوشش کی۔ دونوں ساتھی اس مہم کے دوران 95 دن انٹارکٹیکا کے برفستان میں بھٹکتے رہے۔ وہ خوراک کی کمی کا شکار ہو کر موت کے منہ میں پہنچ چکے تھے کہ ایک امدادی ٹیم نے انہیں بحیرہ روز کے ساحل کے قریب سے بازیاب کروایا۔ فینس کی قیادت میں انٹارکٹیکا کی سرزمین پر انجام دی گئی یہ تاریخ کی سب سے طویل مہم مانی جاتی ہے۔ فینس اس مہم کی ناکامی سے دل برداشتہ ضرور ہوا تاہم اس نے ہار نہیں مانی اور 1996ء میں چھاتی کے کینسر کا علاج کرنے

فرنگی محل

فرنگی محل، لکھنؤ کا ایک محلہ ہے۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں یہاں ایک فرنگی تاجر مقیم تھا جس کی نسبت سے یہ علاقہ فرنگی محل کہلاتا ہے۔ جب یہ تاجر لاوارث مرگیا تو زمین بحق سرکار ضبط ہوگئی۔ اورنگزیب کے زمانے میں مُلا قطب الدین نے فروغ حاصل کیا۔ وہ قصبہ سہالی میں رہتے تھے، جو قریب ہی ہے۔ اس جگہ انصاریوں اور عثمانیوں میں زمینداری پر کچھ جھگڑا ہوگیا۔ مُلا قطب الدین انصاری تھے۔ 1691ء کی ایک رات کو کچھ عثمانی ان کے گھر پر چڑھ آئے اور مُلا کو شہید کرکے ان کا گھر جلا دیا۔ ان کے صاحبزادے مُلا محمد سعید سہالوی نے عالمگیر کی خدمت میں حاضر ہوکر شکایت کی تو فرنگی محل کا علاقہ انہیں جاگیر میں دے دیا گیا۔

مُلا قطب الدین نے مُلا عبدالسلام کے شاگرد ملا دانیال اور قاضی محب اللہ الٰہ آبادی کے شاگرد قاضی نگاسی سے علم حاصل کیا تھا۔ آپ کی تصانیف میں سے ایک شرح عقائد علامہ دوانی پر حاشیہ لکھا تھا جو آپ کے گھر کی تباہی میں تلف ہوگیا۔ آپ کے چار بیٹے تھے جو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے اور انہی کی وجہ سے ہندوستان میں آپ کا فیض جاری رہا۔

فریسر ڈان (Fraser Dawn)

آسٹریلیا کی عالمی شہرت یافتہ تیراک۔ وہ واحد تیراک ہیں جنہوں نے 100 میٹر فری اسٹائل مقابلوں میں مسلسل تین مرتبہ 1956ء، 1960ء اور 1964ء اولمپکس ٹائٹل جیتا۔ 1956ء میں چار سو میٹر کی فری اسٹائل ریلے میں گولڈ میڈل لیا لیکن ان کی زندگی میں اپنے آفیشلز کے ساتھ اختلافات کیریئر کا حصہ بن گئے۔ سب سے زیادہ تنازعہ ٹوکیو کے اولمپکس میں ہوا جب ان پر دس سال کے لیے کھیلنے پر پابندی عائد کردی گئی۔ انہوں نے 39 عالمی ریکارڈ بنائے۔

مرسلہ: راحیل جعفری، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

والے خیراتی ادارے کی معاونت کے لیے انٹارکٹیکا میں تنِ تنہا پیدل مہم سرانجام دی۔

2000ء کا سال بھی فینس کے لیے یادگار رہا۔ اس سال کے موسم گرما میں اس نے برف پر چلنے والی گاڑی کے ذریعے تنِ تنہا قطب شمالی تک رسائی کی مہم شروع کی۔ وہ منزل کے قریب تھا کہ پانی پر جمی برف کی پتلی تہ چٹخ گئی۔ فینس گاڑی سمیت برفیلے پانی میں جا گرا۔ اس نے اپنے حواس قائم رکھے اور کسی نہ کسی طرح تیر کر باہر نکل آیا۔ فینس جانتا تھا کہ گاڑی کے بغیر وہ دو قدم بھی نہیں چل سکے گا۔ اس نے ہاتھ پانی میں ڈال کر گاڑی کو باہر کھینچنے کی کوشش کی، وہ لگاتار کوشش کرتا رہا جس کے نتیجے میں اس کا بایاں ہاتھ "پالے" (Frostbite) کا شکار ہو گیا۔ اس کی انگلیاں منجمد ہو کر سیاہ پڑ گئیں۔ وہ مہم ادھوری چھوڑ کر انگلینڈ پہنچا جہاں ایک طویل سرجری کے بعد اس کی انگلیاں کاٹ دی گئیں۔

مسلسل مہمات سرانجام دینے سے فینس تھکاوٹ کا شکار ہو کر بیمار پڑ گیا۔ 2002ء میں اسے دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں نے اسے آرام کا مشورہ دیا جس کے جواب میں جواں ہمت فینس نے برٹش ہارٹ فاؤنڈیشن کے زیرِ انتظام دنیا کے سات براعظموں میں لگاتار سات دن کے دوران سات کار ریس کرنے کا پروگرام ترتیب دیا۔ Land Rover 7x7x7 Challenge کے عنوان تلے ہونے والے اس ایڈونچر میں فینس کا پرانا ساتھی ڈاکٹر مائیک اسٹراؤڈ بھی اس کے ساتھ تھا۔ ان ریسوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

پہلی ریس: 26 اکتوبر 2003ء کے دن براعظم جنوبی امریکا کے مقام پیٹا گونیا (ارجنٹائن) میں ہوئی۔

دوسری ریس: 27 اکتوبر 2003ء کے دن براعظم انٹارکٹیکا کے قریب جزائر فاک لینڈ میں ہوئی۔

تیسری ریس: 28 اکتوبر 2003ء کے دن براعظم آسٹریلیا کے شہر سڈنی (آسٹریلیا) میں ہوئی۔

چوتھی ریس: 29 اکتوبر 2003ء کے دن براعظم ایشیا کے ملک سنگاپور میں ہوئی۔

پانچویں ریس: 30 اکتوبر 2003ء کے دن براعظم یورپ کے شہر لندن (انگلینڈ) میں ہوئی۔

چھٹی ریس: 31 اکتوبر 2003ء کے دن براعظم افریقا کے شہر قاہرہ (مصر) میں ہوئی۔

ساتویں ریس: 1 نومبر 2003ء کے دن براعظم شمالی امریکا کے شہر نیویارک (امریکا) میں ہوئی۔

فینس کے مطابق پہلی ریس انٹارکٹیکا کے جزائر کنگ جارج جبکہ دوسری چلی کے دارالحکومت سان تیاگو میں ہونی تھی جو موسم کی خرابی کی وجہ سے دوسرے مقامات پر منتقل کرنی پڑی۔

فینس نے آخری ریس کے اختتام پر ایک انٹرویو میں کہا کہ ریس کا آئیڈیا ڈاکٹر مائیک کا تھا جو اسے پسند آیا اور اس نے یہ انوکھا ایڈونچر کرنے فیصلہ کیا۔ اس تاریخی ریس کے ٹھیک چار ماہ بعد فینس کو ڈبل ہارٹ بائی پاس آپریشن کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ فروری 2004ء میں معدے کے کینسر کی وجہ سے فینس کی بیوی جینی کا انتقال ہو گیا۔ جس کے بعد اس نے مارچ 2005ء میں لوئی ملنگ ٹن نامی خاتون سے دوسری شادی کی۔ اپریل 2006ء میں فینس کی بیٹی الزبیتھ کی پیدائش ہوئی جو اس کی واحد اولاد ہے۔

مارچ 2007ء میں Marie Curie Cancer Care آرگنائزیشن نے ادارے کی تشہیر کے لیے فینس کو 1.5 ملین ڈالر کی رقم سے مہم شروع کرنے کی پیش کش کی۔ ادارے نے مہم کی نوعیت کے انتخاب کا فیصلہ فینس پر چھوڑ دیا جس نے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا اعلان کر کے دنیا کو حیران کر دیا۔ اس نے 24 مئی 2008ء کو نیپال میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی پہلی کوشش کی۔ وہ ایورسٹ کی چوٹی کے انتہائی قریب تھا کہ آکسیجن کی کمی اور تھکاوٹ کی وجہ سے اچانک اسے سینے میں درد محسوس ہوا۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے فینس کو چوٹی سے چند میٹر پہلے ناکام واپس آنا پڑا جس کا اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود اگلے سال ایک اور کوشش کرنے کا اعلان کیا۔ وہ ایک نئے عزم کے ساتھ نیپال پہنچا اور اس نے 20 مئی 2009ء کو 65 سال کی عمر میں ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کا اعزاز حاصل کر لیا۔

6 مارچ 2010ء کو فینس ایک کار حادثے میں معمولی زخمی ہوا۔ آج کل (اکتوبر 2013) وہ سمرسٹ کاؤنٹی کے مقام Exmoor میں مقیم ہے۔ وہ روزانہ دو گھنٹے کی واک کرتا ہے۔ اس کا دل اور ارادے ابھی تک جوان ہیں۔ گزشتہ دنوں فینس نے انگلینڈ کے مشہور مارننگ شو Top Gear میں انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ سالوں پہلے وہ مشہور ہیرو جیمز بونڈ کے کردار کے لیے منتخب کیے گئے چھ بہترین افراد میں شامل تھا، تاہم یہ کردار راجر مور کو ملا۔

برفانی ریگستان

امجد رئیس

وہ شومئی قسمت سے اس علاقے میں جا پھنسا جہاں دور دور تک انسانی بستیوں کا وجود نہ تھا، موت اس کے ہمرکاب تھی مگر دل میں عزم وہمت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جو اسے مہمیز کررہا تھا۔

ایک باحوصلہ شخص کی رودادِ عزم

31 سالہ رابن ساشی کئی ہفتوں سے شمالی پہاڑوں میں تنہا اسکائی ٹرپ کے لیے سرگرداں تھا۔ وہ کیلیفورنیا کی سانتا کروز برانچ کے کیمپس میں ریسٹورنٹ چلاتا تھا۔ وہ کچھ عرصے سے بوریت محسوس کر رہا تھا۔ اسی یکسانیت کو دور کرنے کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔

وہ ایک ماہر کراس کنٹری اسکیٹر تھا اور اسپورٹس کی کلاسز بھی لیتا تھا۔ جب وہ اسکیٹنگ کے لیے تنہا نکلتا تو بھی خود کو اکیلا محسوس نہیں کرتا کیونکہ وہ پہاڑوں سے ایک قسم کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

روحانی وابستگی محسوس کرتا تھا۔

اپریل 1986ء کی آخری تاریخوں میں وہ دس ہزار فٹ بلند پیفیک کریسٹ کے سفر کی منصوبہ بندی میں لگ گیا۔ اس کی پلاننگ مکمل اور خطرے سے پاک ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ کسی بھی حادثے کی صورت میں وہ امدادی پارٹیوں سے بارہ میل سے زیادہ فاصلے پر نہ ہو۔

وہ نہایت احتیاط سے سامان پیک کر رہا تھا کیونکہ اس کے سفر کا دورانیہ دس یوم تھا اور فاصلہ سو میل۔ اس نے کھانے پینے کی اشیا، فرسٹ ایڈ کٹ اور ہلکے وزن کا چھوٹا سا مگ، مضبوط بیلچہ ساتھ رکھا تھا۔ رسی، اسٹوو، کھانا تیار کرنے کا ایندھن، کپڑے اور سونے کے لیے مخصوص بیگ بھی لے لیے تھے۔ ان تمام اشیا کا وزن اس نے چیک کیا جو ستر پونڈ تھا۔

اپریل 23 کی صبح اس نے سفر کا آغاز کیا۔ وہ برفانی ڈھلوان پر اسکیئنگ کرتا رہا۔ دوپہر میں کچھ دلیا پکایا۔ پیٹ پوجا کرتے ہوئے وہ اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ اسے کچھ دوری پر معمولی ترچھا برف سے عاری خطہ نظر آیا۔ یہ نیم دائرے کی شکل کے بڑے پتھر تھے۔ ان کے نیچے ایک خوب صورت برفانی ڈھلوان تھی جو نیچے کی جانب چالیس ڈگری کا زاویہ بنا رہی تھی۔ رابن اس راستہ کے ذریعے ہوپ ویلی پہنچ سکتا تھا۔ اس نے اس شارٹ کٹ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس نے اسکیز جوڑے اور پول اٹھالیے پھر حرکت شروع کی۔ وہ پتھریلا خطہ جو بظاہر خشک نظر آ رہا تھا درحقیقت ان پر پھسلتی ہوئی برف کی باریک تہ تھی۔ سورج کی کرنوں کے ناموافق زاویہ کی وجہ سے رابن اسے نہ دیکھ سکا تھا۔ اس نے دوسری جانب برفیلی ڈھلوان پر جانے کے لیے پتھریلے راستے پر چڑھنا شروع کیا تو وہ اوپر جانے سے زیادہ نیچے کی جانب واپس پھسل رہا تھا۔

گزشتہ بارہ برسوں میں رابن کو کسی حادثے کا سامنا نہیں کرنا پڑا لیکن اس وقت معاً اسے احساس ہوا کہ وہ مشکل میں ہے۔ اس نے پیٹھ پر موجود سامان کی بندشوں کو فوراً جھٹک دیا جو پہاڑی سے نیچے جا پڑا۔ اس نے اسکیز اور پولز سے بھی چھٹکارا حاصل کرلیا تاہم کوئی فرق نہیں پڑا۔ وہ اب بھی پھسل رہا تھا۔ پھسلتے ہوئے وہ چھ فٹ نیچے دوسرے پتھریلے ٹکڑے سے ٹکرایا۔ اس نے خود کو یہاں روکنے کی کوشش کی لیکن پتلی برف کی پرت کی پھسلن اس کی کوشش کو ناکام بنا رہی تھی۔ رابن کے پھسلنے کی رفتار بڑھ رہی تھی۔ اس کا جسمانی وزن پھسلنے کی رفتار میں اضافہ کر رہا تھا۔ وہ اب بے قابو ہو چکا تھا۔ بالآخر تقریباً 100 فٹ پھسلنے اور جھٹکے کے بعد وہ ایک جگہ ہاتھ جمانے میں کامیاب ہوگیا۔ یکلخت وہ رکا تو اس کے کندھوں کو شدید جھٹکا سہنا پڑا۔

☆☆☆

چند منٹ تک رابن ساکت لیٹا رہا۔ وہ خیالات اور احساسات کو یکجا کرنے میں لگا تھا۔ ابھی ہوش میں تھا۔ دوسری اچھی بات یہ ہوئی کہ اس کا گرنا کسی ”ایوالانچ“ کا نتیجہ نہیں تھا۔ حواس سنبھلنے کے بعد اس نے حرکت کی تو اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی پشت کے زیریں حصے میں شدید تکلیف تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ٹھیک تھے۔ انہیں اس نے پینٹ کی جیبوں میں گھسا لیا۔ ٹانگیں اٹھانے کی کوشش کی تو اسے ناکامی ہوئی، بائیں ٹانگ میں فریکچر آگیا تھا۔ ٹخنہ اپنی قدرتی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔ بالفاظ دیگر بائیں ٹانگ بے کار ہو چکی تھی۔

رابن کا ہمیشہ اعتقاد تھا کہ خدا اس انسان کے دل میں ہوتا ہے جسے خدا پر یقین ہو۔ اس نے اطمینان اور تقویت محسوس کی کہ ایک لامحدود طاقت اس کے ساتھ ہے۔

اس نے نئے سرے سے سوچنا شروع کیا۔ جان بچانے کے لیے اسے امید اور ہمت کو قائم رکھنا تھا کیونکہ خوف اور پریشانی اس کی تباہی پر مہر ثبت کردیتی۔

اس نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو ٹانگ نے یہ کوشش ناکام بنادی۔ وہ بیٹھی ہوئی حالت میں آگیا۔ معاً اسے اپنے اوپر غصہ آیا کہ تمام تر تجربہ اور تیاری کے بعد وہ کیونکر ایک عام سے پھندے میں پھنس گیا۔

وہ جہاں بیٹھا تھا وہاں سے اس نے نیچے دیکھا۔ اسے اپنا سامان 100 فٹ دور نظر آیا۔ اس نے آگے کھسکنا شروع کیا۔ اسکیز اور ایک پول اسے مل گیا۔ اکلوتے پول کو اس نے دائیں بغل میں بیساکھی کی مانند جمایا اور دیگر سامان اکٹھا کرنے کے لیے بڑھا۔ جب وہ اشیا والے بیگ کے قریب پہنچا تو تکلیف مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ آرام کے لیے برف پر لیٹ گیا۔ ٹانگ سے زیادہ پشت کی تکلیف اسے پریشان کر رہی تھی۔ سورج اپنے سفر کے اختتام پر تھا۔ کچھ دیر میں اندھیرے کی چادر پھیل جاتی پھر اسے جان بچانے کے لیے توانائی کی بھی ضرورت تھی۔ اس نے برف پگھلا کر دلیا تیار کیا اور پی گیا۔

پھر رات گزارنے کے لیے انتظام کرنے لگا اس نے چھوٹا بیلچہ سنبھالا اور برف میں سوراخ کرنے لگا۔ سوراخ کی اندرونی دیواروں کو اس نے بیلچے کی پشت سے ضربیں لگا کر پکا کیا اور برف کی اینٹیں بنا کر سوراخ کے ایک طرف ہوا کے لیے رکاوٹ کھڑی کر دی۔

تمام عمل کے دوران وہ بے دم ہو گیا۔ مجبوراً بوٹس اتار کر سلیپنگ بیگ میں اسے گھسنا پڑا مگر ٹخنے اور پشت کی تکلیف نے اسے ٹھیک طرح سے سونے نہیں دیا۔ صبح اس کے متورم ٹخنے نے بوٹ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

اس نے نقشہ نکال کر جائزہ لیا اور فیصلہ کیا کہ اگر وہ موجودہ ڈھلوان پر جنوب مغرب کی سمت اسکیٹنگ کرے تو دس میل دور گلین اولین کیمپ تک پہنچ سکتا ہے لیکن وہ اسکیٹنگ کے قابل ہی کہاں تھا۔

دس میل کا فاصلہ اس حال میں ناقابلِ عبور لگ رہا تھا۔ تاہم اس کا عزم اور عقیدہ جوان تھا۔ کھانے کی اشیا وہ بارہ دن تک چلا سکتا تھا۔ پانی مزید دو ہفتے تک چلتا۔ اسی اثاثے کے ساتھ اسے اس برفیلے جہنم سے نکلنا تھا۔

رابن نے بیگ سے رسی نکال کر دونوں اسکیز کو آپس میں ملا کر جوڑا اور اسکیٹنگ کا مخصوص بستہ ان پر رکھ کر باندھا پھر اس کے اوپر اکلوتی اسٹک رکھ دی۔ سلیج ٹائپ کی چیز بن گئی تھی جسے ٹوبوگان کہتے ہیں۔ بائیں ٹانگ ساتھ گھسٹ رہی تھی۔ وہ دو ہاتھ اور دائیں ٹانگ ہی استعمال کر سکتا تھا۔ اس نے بایاں ہاتھ اور دائیں ٹانگ کے گھٹنے کے زور پر آگے بڑھنا شروع کیا۔ اس کی رفتار کم تھی تاہم وہ پُرامید تھا۔ اگر اسے پھسلنے والی ڈھلوان مل جاتی تو وہ سامان پر بیٹھ کر اکلوتی اسٹک کے سہارے پھسل کر رفتار بڑھا سکتا تھا۔

دوپہر کی تپش نے برف کو نرم کر دیا تو اس نے سفر روک دیا۔ اس صورت میں سفر جاری رکھنے سے اسے دوگنی توانائی خرچ کرنی پڑتی جبکہ وہ توانائی کے ضیاع کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ جتنی توانائی ضائع ہوتی، خوراک بھی اسے زیادہ لینی پڑتی۔

رابن نے برف میں ایک اور پناہ گاہ کا بندوبست کیا کیونکہ اس کی ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔ تکلیف کی شدت کو کم کرنے کے لیے اس نے سامان میں سے ہرمن ہس کی کتاب ”اسٹیپن وولف“ نکالی اور ورق گردانی شروع کر دی تاکہ ذہن پُرسکون رہے۔ کتاب کے مرکزی کردار کا عقیدہ تھا کہ انسانیت کا کوئی مستقبل نہیں۔

”اگر موت ایک عظیم منصوبے کا حصہ ہے تو کوئی بات نہیں، اس طرح بھی صحیح ہے۔“ رابن بڑبڑایا۔ ”لیکن میں اسے دعوت نہیں دوں گا۔ نہ قبول کروں گا نہ ہاروں گا۔ اگر اسے آنا ہے تو آئے مگر مجھے جدوجہد ہی کرتا پائے گی۔“

چوتھے دن صبح رابن نے خود کو نسبتاً بہتر محسوس کیا۔ چھوٹی شفاف برف اسے سفر پر اکسا رہی تھی۔ پرندوں کی آوازیں اس کے ساتھ تھیں۔ اسے اپنے قریبی دوست یاد آئے۔ جو سوچ رہے ہوں گے کہ رابن معمول کے مطابق اپنے پسندیدہ ٹرپ سے لطف اندوز ہو رہا ہوگا۔

ہر گزرتا ہوا دن مشکل اور تکلیف دہ ہوتا جا رہا تھا۔ مزید برآں اس کی توانائی بھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ چٹانیں اور درخت کچھ زیادہ دکھائی دے رہے تھے جو اس کی جدوجہد میں مشکلات کھڑی کر رہے تھے اور رابن کو دوگنی توانائی خرچ کرنی پڑ رہی تھی۔

اس کا ذہن مایوسی کا شکار تھا لیکن اسے مقابلہ کرتا تھا۔ اسے ہر حال میں پُرسکون رہنا تھا۔ اس نے ایک شاخ کے دو ٹکڑے کر کے واٹر پروف پیڈ بائیں ٹانگ کی پنڈلی پر لگا کر شاخ کے ٹکڑوں سے باندھ دیا۔ اس عمل سے پنڈلی اور ٹخنے کو قدرے آرام ملا تھا۔

☆☆☆

دسویں روز جمعہ کا دن تھا۔ دوپہر سے کچھ قبل اسے ایک آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا کراس کنٹری اسکیٹر دکھائی دیا۔ وہ رابن سے تقریباً 100 فٹ کی دوری پر تھا۔ رابن کے ذہن میں امید کی کرن جاگی۔

”ہیلو۔“ وہ چلایا۔

اسکیٹر 22 سالہ جان اسٹینسز تھا۔ سانتا کروز اسٹیٹ پارک کا لائف گارڈ۔ وہ بھی تنہا اسکیٹنگ کا عادی تھا۔

رابن کی آواز اس کی سماعت تک پہنچ گئی اور وہ بہ آسانی زخمی رابن تک پہنچ گیا۔

”کیا ہوا تھا؟“

”میری ٹانگ اور کمر زخمی ہے۔“

”تم کب سے بھٹک رہے ہو؟“ جان نے سوال کیا۔

”دس دن۔“

”مجھے 45 منٹ لگیں گے ٹمک کیبل لیک تک پہنچنے میں۔“

”اور مجھے چھ دن۔“ رابن نے جواب دیا۔

دونوں نے مل کر نقشوں کا جائزہ لیا۔ اس وقت تین بج رہے تھے۔ جان کے مطابق وہ ٹولم میڈوز میں رینجرز کیبن تک جائے گا اور وہاں سے یوسمائٹ کے رینجرز ہیڈکوارٹر سے مدد طلب کرے گا۔ اس نے کچھ مزید کھانے کی اشیا رابن کے پاس چھوڑیں اور حوصلہ مند رہنے کے لیے کہا۔

اس کے جانے کے بعد رابن کو دھڑکا لگا کہ کہیں وہ جلد بازی اور بے احتیاطی کا مظاہرہ نہ کرے اور خود بھی کسی مصیبت میں پھنس جائے۔

جان نے منزل پر پہنچ کر ہیڈکوارٹر فون کیا تو پتا چلا کہ ہیلی کاپٹر کی مرمت کی جا رہی ہے۔ چنانچہ کمرشل ہیلی کاپٹر حاصل کرنے کی کوشش کا آغاز ہوا۔

دوپہر میں رابن کو موسم کے تیور ٹھیک نہیں لگے۔ بادل جمع ہو رہے تھے اور برف باری کا آغاز ہو گیا تھا۔ رابن نے خود ساختہ برف کے گڑھے میں خود کو مقید کر لیا۔ برفباری دوسرے روز تک ہوتی رہی۔ رابن کی پناہ گاہ ایک فٹ برف کے نیچے دب گئی تھی۔

دوپہر میں برف باری کا طوفان رکا اور رابن نے برف کی تہ ہٹانی شروع کی۔ جان کی دی ہوئی اضافی غذا اس کے کام آ رہی تھی۔ تبھی سورج نے جلوہ دکھایا اور ہیلی کاپٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ دیوانہ وار اپنی سرخ جیکٹ کو لہرا کر چیخنے لگا لیکن ہیلی کاپٹر نوٹس لیے بغیر گزر گیا۔ وہ مشرقی افق میں غائب ہوا تھا۔ رابن امید و بیم کی کیفیت میں اس کو دیکھتا رہا۔

دس منٹ گزرے تھے کہ ہیلی کاپٹر پھر نمودار ہوا۔ رابن پھر چوکس ہو گیا۔ تاہم اس بار بھی ہیلی کاپٹر گزرتا چلا گیا۔ رابن نے امنڈتی ہوئی مایوسی کو جھٹکا۔ تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا۔ رابن حیران تھا کہ جان نے نقشوں پر اس کی پناہ گاہ کا تعین کر لیا تھا تو پھر یہ کیا ہو رہا ہے۔ چوتھی بار ہیلی کاپٹر کافی نیچی اڑان کے ساتھ آیا۔ پائلٹ نے اسے دیکھ لیا اور ہاتھ ہلا کر اطمینان دلایا اور مخالف سمت پرواز کر گیا۔

رابن کو تعجب ہوا کیونکہ اس نے نوٹ نہیں کیا تھا کہ یہ رینجرز کا ہیلی کاپٹر نہیں ہے اور پائلٹ برف باری کے بعد نرم برف پر اترنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ ہیلی کاپٹر نصف میل دور پختہ برف پر اترا اور کرک جانسن کو رابن کی جانب روانہ کیا۔

کرک جانسن کو جان نے بتا دیا تھا کہ رابن کے زخموں کی نوعیت کیا ہے لہٰذا وہ ضروری سامان سے لیس تھا۔

☆☆☆

اب جا کر رابن کو سیدھا کھڑا ہونے کا موقع ملا لیکن جانسن نے اسے دوبارہ لٹا دیا پھر ہیلی کاپٹر کو ریڈیو کے ذریعے ضروری ہدایت دی۔

ایک گھنٹے بعد ہیلی کاپٹر پھر نمودار ہوا۔ اس مرتبہ جان بھی ساتھ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور ہاتھ ملایا۔

اگلے تین ماہ میں رابن کی پشت کی تکلیف ختم ہو گئی۔ اس نے وہیل چیئر چھوڑ دی۔ دھیرے دھیرے اس کی طاقت واپس آ گئی تھی۔ تاہم اس کے بائیں ٹخنے کی سختی برقرار رہی۔ وہ گھنٹوں پیدل چلتا اور تیس سے چالیس میل سائیکل چلاتا۔

کچھ عرصہ بعد اس کی ساتھی اسکیٹر سے ملاقات ہوئی جس نے بتایا کہ ”اگر وہ رابن کی جگہ ہوتا تو زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے زندہ رہ پاتا۔“

رابن سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اسکیٹر کو پتا نہیں کہ اس خوف ناک حادثے نے رابن کو اور مضبوط کر دیا تھا۔ قدرت نے اسے سخت آزمائش میں ڈالا تھا اور اس نے چیلنج قبول کر لیا تھا۔

یہ اس کی زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش تجربہ تھا۔

حکیم فقیر محمد چشتی

1870-1937ء

طبیب، ادیب، مولد جگراؤں ضلع لدھیانہ (مشرقی پنجاب) ہے۔ عربی، فارسی وغیرہ کی تحصیل کے بعد مدرسہ طبیہ دہلی میں طب پڑھی۔ 1909ء میں لاہور آ کر مطب جاری کیا اور قلیل عرصے ہی میں آپ کی قابلیت کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا اور حکومت سے شفاء الملک کا خطاب ملا۔ آپ ایک اعلیٰ طبیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے ادیب، خوشنویس اور اچھے مصور بھی تھے۔ بڑے بذلہ سنج، سخن شناس اور شگفتہ مزاج تھے۔ اُدبا و شعرا آپ کی صحبت میں بیٹھنے کو نعمت تصور کرتے تھے۔ حضرت علامہ اقبال کی فارسی نظم میں پہلی کتاب ”اسرار خودی“ کا پہلا ایڈیشن آپ ہی کے زیرِ اہتمام شائع ہوا تھا۔ حکیم صاحب بے اولاد تھے۔ آپ نے اپنا رہائشی مکان ”شفا منزل“ طبیہ کالج دہلی کے نام وقف کر دیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

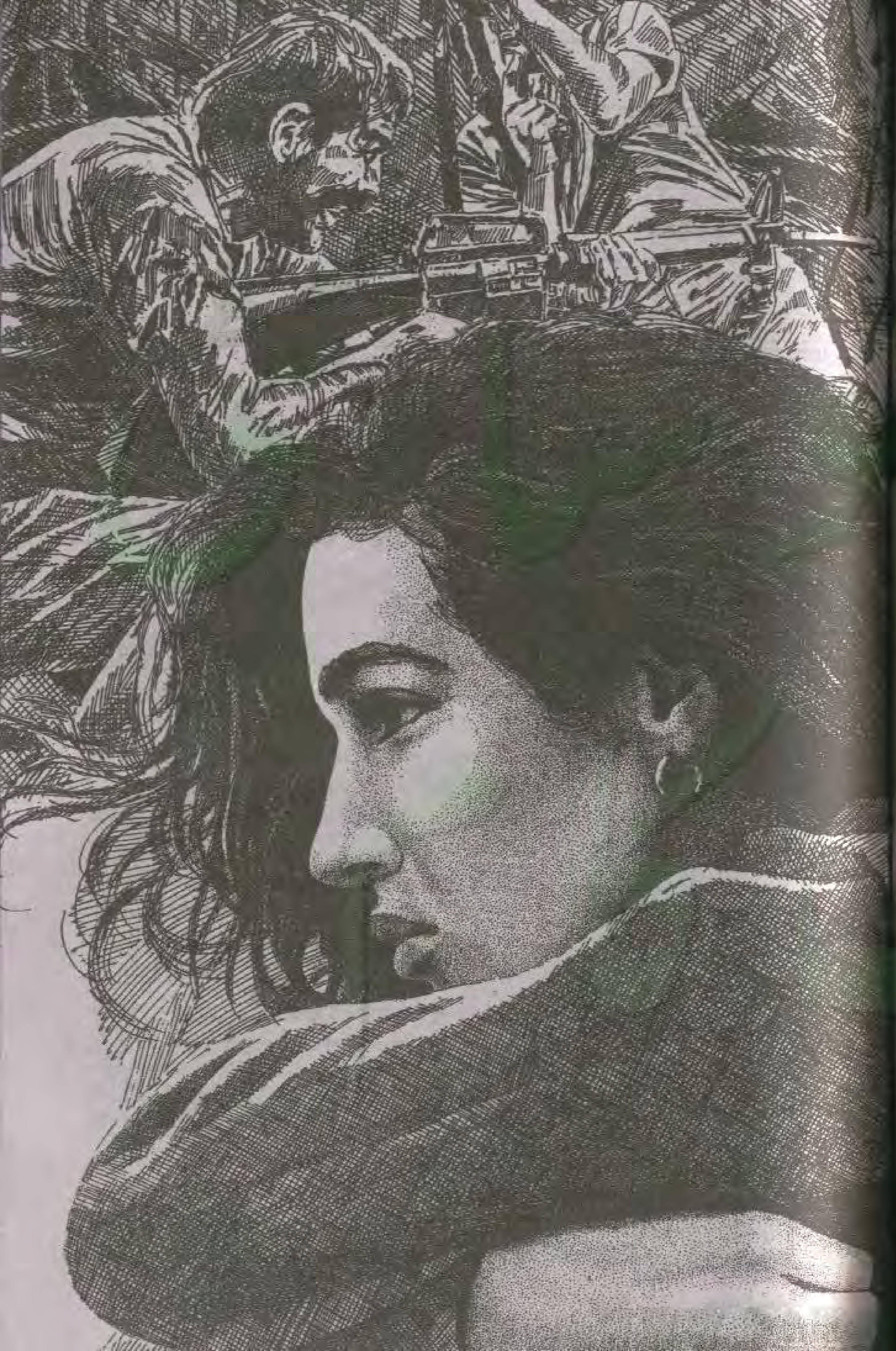

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 81

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

(گذشتہ اقساط کا خلاصہ)

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی۔ میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور برٹ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہو گیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تا کہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کر لوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوا لیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی مار دی۔ مرتے وقت برٹ بڑبڑایا "نارتھ...... بکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہو گیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کر دیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زوروکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ ہم اس گھر سے نکل کر مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہر وتی تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زوروکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زوروکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی ہیں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر کر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کر کے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوا لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی تو بانو رہا ہو جائے گی۔ میں نے رامن پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ نشی دل آ گیا اور اس نے رامن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہاتھ مارا پستول نکل کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام اور رینا کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ شملہ پہنچ کر راجا صاحب سے بات کی۔ انہوں نے ہوٹل میں کمرا دلوا دیا۔ میں راج کنور کو یرغمال بنا کر پاکستان پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسپتال جہاں کنور کو رکھا گیا تھا وہاں سے نکل رہا تھا کہ پستول کی نال میری گردن پر آ گئی اور رامن کی آواز ابھری۔ "ہلنا مت شہباز۔" میں نے اسے گھونسے مار کر بے ہوش کیا اور عقبی گلی سے نکل آیا، ہوٹل پہنچ کر اسکائپ کے ذریعہ تمام دوستوں اور اپنے گھر والوں سے بات کی۔ میں نے پلان بنایا تھا کہ کنور کو اغوا کر کے ہیلی کاپٹر کے ذریعہ بارڈر کراس کر لوں گا۔ اسے اغوا کرنے اسپتال پہنچا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا ڈاکٹر امرت سنگھ سامنے آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سرجیکل نائف تھی۔

(اب آگے پڑھیں)

ڈاکٹر امرتسر مجھے دیکھ کر چونکا۔ "آپ.... یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"ڈاکٹر راج کنور کہاں ہے؟"

"وہ....؟" وہ کسی قدر بوکھلایا۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

ڈاکٹر کے انداز سے لگ رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اس سے سوال جواب کا وقت نہیں تھا میں نے سوچا اور پستول نکال کر اس پر تان لیا۔ "ڈاکٹر شرافت سے بتا دو کہ راج کنور کہاں ہے؟ ورنہ تمہارے جسم میں ایک سوراخ اور ہو جائے گا۔"

اس نے بوکھلا کر دونوں ہاتھ اوپر کر لیے تھے۔ مگر سرجیکل نائف بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ "مینوں... نن..... نہیں معلوم۔"

میں نے اس کا چاقو والا ہاتھ تھام کر اسے آگے کھینچا اور لات مار کر دروازہ بند کر دیا۔ اس نے قطعی مزاحمت نہیں کی اور میں نے اس کا ہاتھ مروڑا تو اس نے بلبلا کر چاقو چھوڑ دیا۔ "اوئے میرا ہاتھ ٹوٹ جائے گا۔"

میں نے اس کے واویلے پر توجہ دیے بغیر اسے گھما کر اوندھے منہ بستر پر گرایا اور گھٹنا اس کی ریڑھ پر جمایا۔ پھر اس کے ماتھے پر ہاتھ جما کر گردن پیچھے کھینچی تو وہ اس پوزیشن میں آ گیا کہ اس کی گردن اور کمر دونوں ٹوٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ اس نے مرتی بکری جیسی آواز نکالی۔ اب آواز نکالنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ "سردار، میں نے ذرا زور دیا تو تمہاری گردن یا ریڑھ کی ہڈی میں سے ایک کوئی چیز ٹوٹ جائے گی۔ دونوں صورتوں میں تم مرنے سے بچ گئے تب بھی ہمیشہ کے لیے بستر پر لیٹ جاؤ گے اور ڈاکٹر سے مریض بن جاؤ گے۔ کیا تم ایسا چاہتے ہو؟"

"نن..... نہیں" وہ رو دینے والے انداز میں بولا۔

"تب میرے سوال کا جواب دو۔ راج کنور کو یہاں سے کون اور کیسے لے گیا ہے۔"

"اس کا وہی آدمی جو یہاں نگرانی کرتا تھا۔" امرتسر نے جواب دیا۔

میری گرفت نرم پڑ گئی۔ "رامن..... گورا سا جس کے ماتھے پر چوٹ کا نشان ہے۔"

"وہی حرامی لے جا رہا تھا..... میں آ گیا اور پوچھا کہ مریض کو بغیر اجازت کہاں لے جا رہے ہو تو اس نے میرے منہ پر مُکا مارا۔ دانت ہلا دیا۔"

میں نے اسے سیدھا کیا اور پستول اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ "کتنی دیر ہوئی ہے اور وہ کیسے لے گیا ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ بس لے گیا ہے اس نے مجھ سے زبان بند رکھنے کو کہا۔ پر آپ تو اس سے بھی ظالم ہو۔ اس نے تو دھمکی دی تھی آپ گولی مار دو گے۔"

"صرف دھمکی دی تھی؟" میں نے شک سے پوچھا اور اس کی تلاشی لی۔ اس نے مزاحمت کی لیکن کوٹ کی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالنے سے نہ روک سکا تھا۔ "خبیث آدمی تم نے اس سے بھی رشوت لی ہے۔ میرے بارے میں بھی بتایا ہوگا۔" میں مشتعل ہو گیا۔ میرے تاثرات دیکھ کر وہ کانپنے لگا تھا۔

"نہیں، مینوں رب دی سوں.... میرے بچوں دی سوں، میں نے تمہارا نہیں بتایا۔"

"یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟"

"مشکل سے دس منٹ کی۔"

بازی پلٹ گئی تھی جیسا میں نے سوچا تھا ویسا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے الٹ ہی ہو گیا تھا۔ آپ نے گھوڑے کے پہلے پھونک مارنے والا قصہ تو سنا ہوگا یہاں بھی وہی کیس ہو گیا تھا گھوڑے نے پہلے پھونک مار دی تھی۔ رامن راج کنور کو نکال کر لے گیا تھا۔ اب پتا نہیں اس نے یہ کام اپنی مرضی سے کیا تھا یا بڑے کنور نے اسے حکم دیا تھا۔ میں نے امرتسر سنگھ سے پوچھا۔ "وہ ان کا آدمی تھا پھر اس طرح لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"پتا نہیں جی مجھے بھی حیرت ہوئی تھی۔ تبھی تو سوال کیا۔" اس نے داڑھ سہلا کر کہا۔ اب مجھے جانا تھا اور

سردار کو ایسے ہی چھوڑ جاتا تو اس نے ایک منٹ سے بھی پہلے سارا اسپتال جمع کر لینا تھا۔ میں نے سہلانے کے لیے ایک جگہ کا بندوبست اور کیا یعنی اس کی گدی پر پستول کا دستہ رسید کیا۔ سر پر پگڑی تھی جو حفاظتی خود سے کم نہیں تھی۔ اس کے لیے سردار جی کو پلٹنا پڑا تھا۔ اس کے حلق سے اوق کی آواز نکلی اور وہ بستر پر اوندھے منہ گر گیا۔ میں نے نبض چیک کی جو دھیمی لیکن مستقل تھی۔ اس کے دو ڈھائی گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے اسے بستر کے نیچے دھکیل دیا جہاں سے وہ خود ہی نکلتا کسی کے دیکھ لینے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ باہر نکل کر میں نے دروازہ بند کر دیا۔ رامن بازی لے گیا تھا اور اب مجھے جواب دینا تھا۔ باہر ایمبولینس والا منتظر تھا۔ میں نے اس سے گیٹ تک چلنے کو کہا وہ حیرت سے بولا۔ ”صاحب پیشنٹ نہیں لایا؟“

”نہیں اسے دوسری ایمبولینس میں لے جایا گیا ہے۔“

میں نے گیٹ پر ایمبولینس رکوائی اور گیٹ کیپر کے پاس آیا۔ وہ مجھے ڈاکٹر اور اسپتال سے متعلق سمجھ کر مستعد ہو گیا۔ ”یس سر؟“

”کچھ دیر پہلے کوئی ایمبولینس یہاں سے نکلی ہے۔“

”یس سر ایک سفید پرائیویٹ ایمبولینس نکلی ہے۔“

گیٹ کیپر نے تصدیق کی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ریکارڈ وقت کے مطابق ایمبولینس دو بج کر تیس منٹ پر نکلی تھی جب کہ ابھی پونے تین کا وقت تھا یعنی ایمبولینس کو نکلے ہوئے پندرہ منٹ ہو چکے تھے اور وہ یقیناً یہاں ہماری آمد سے پہلے جا چکی تھی۔ پندرہ منٹ کافی وقت تھا اور میں اگر جانتا بھی کہ وہ کہاں گئی ہے تب بھی اسے پکڑنا مشکل تھا۔ میں ایمبولینس کے ہمراہ باہر آیا تو بانو باڑھ کے پیچھے سے نکل آئی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں پھر ایمبولینس سے اتر گیا۔ ڈرائیور کے سامنے بات ممکن نہیں تھی۔ اس لیے بانو کو ایک طرف لے جا کر بتایا تو وہ مضطرب ہو گئی۔

”اب کیا ہو گا ہمارا سارا پلان ہی راج کنور پر منحصر ہے۔“

میں نے خیال ظاہر کیا۔ ”شاید رامن اسے کنور پیلس کی طرف ہی لے گیا ہے۔“

”مجھے تو راج کنور خطرے میں نظر آ رہا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”بڑے کنور کو اسے اس طرح بلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔“

”اور مجھے لگ رہا ہے کہ رامن نے اس طرح مجھے چیلنج کیا ہے۔ اس نے راج کنور کو لے جا کر مجھ سے کہا ہے کہ میں اسے چھڑا لوں۔“

”تب آپ کیا کریں گے؟“

میں نے سرد آہ بھری۔ ”میرے پاس اس چیلنج کو قبول کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔“

”ہم کیا کریں گے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا اور واپس اسپتال کے گیٹ کیپر کے پاس آیا اور اس سے ایمبولینس کا رنگ اور سائز پوچھا۔ اس نے مجھے تفصیل سے بتایا۔ یہ سفید رنگ کی بڑے سائز کی ایمبولینس تھی۔ اس پر چاروں طرف اور اوپر بھی سرخ رنگ سے کراس کا نشان تھا۔ میں ایمبولینس تک آیا اور بانو سے کہا۔ ”ہم ائر کلب جا رہے ہیں۔“

”راج کنور کے بغیر۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا اور ہم روانہ ہو گئے۔ ایمبولینس ڈرائیور کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ ہم بغیر کسی مریض کے جا رہے تھے اور اس کی ایمبولینس کو ٹیکسی کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ میں ادائیگی کر چکا تھا اس لیے اسے کہیں بھی لے جانے کے لیے آزاد تھا۔ میں نے اسے رفتار تیز رکھنے کو کہا اور سنکاری کو کال کی۔ ”ہم آدھے گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں تم پرواز کے لیے تیار رہو۔“

”میں تیار ملوں گا۔“ اس نے جواب دیا۔ بانو فکرمند تھی لیکن ڈرائیور کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ صورت حال کی اچانک تبدیلی نے ہم دونوں کو ہی پریشان کر دیا تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو اس تبدیلی سے آگاہ نہیں کیا ہے وہ یقیناً میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں نے لیپ ٹاپ نکال کر اس میں یو ایس بی ڈیوائس لگائی اور آن کر کے دیکھا۔ اس جگہ سگنل آ رہے تھے میں نے ڈرائیور سے ایمبولینس سڑک کے کنارے روکنے کو کہا۔ وہ حیران ہوا تھا لیکن اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں ایمبولینس رکتے ہی نیچے اتر آیا۔ ”تم چند منٹ انتظار کرو میں ابھی آتا ہوں۔“

میں ایمبولینس سے اتنا دور چلا گیا کہ ڈرائیور میری آواز نہ سن سکے پھر میں نے وسیم کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ”یہ آپ ہیں؟“ اس نے نام لینے سے گریز کیا۔

”ہاں میں ہوں، ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔“

”کیسی گڑبڑ؟“

”راج کنور غائب ہے اسے رامن اسپتال سے نکال کر لے گیا ہے۔ راج کنور کے بغیر ہم سرحد کراس نہیں کر سکتے ہیں۔“

وسیم پریشان ہو گیا۔ ”یہ تو بہت برا ہوا۔ اب آپ کیا کریں گے؟“

”میں راج کنور کے پیچھے جا رہا ہوں۔“

”کیسے؟“ اس نے پوچھا۔ ”آپ کو پتا ہے وہ کہاں ہے؟“

”میں ایک چانس لے رہا ہوں۔ میں اسی ہیلی کاپٹر میں نکلوں گا اور کنور پیلس کی طرف جانے والی سڑک پر ایمبولینس تلاش کروں گا۔ اگر کامیاب رہا تو راج کنور کو واپس حاصل کرنے کی کوشش کروں گا اور اس میں بھی کامیاب رہا تو پلان مکمل کیا جا سکتا ہے۔“

”آپ فیصلہ کر چکے ہیں؟“

”ہاں تم لوگوں کو آگاہ کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کچھ دیر بعد دوبارہ رابطہ کروں۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ واپس ایمبولینس کی طرف آیا بانو نے نیچے اترنے یا میرے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے بیٹھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا۔ ”ہر ممکن تیزی سے چلو وقت کم ہے۔“

اس نے ایمبولینس آگے بڑھا دی عقب سے بانو نے پوچھا۔ ”بات ہو گئی۔“

”ہاں میں نے بتا دیا ہے کچھ مسئلہ ہو گیا ہے دیر ہو جائے گی اس لیے پریشان نہ ہوں۔“

ڈرائیور یہی سمجھ رہا تھا کہ مریض کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے اور لواحقین پریشان ہو رہے ہیں اگر اسے ذرا بھی بھنک لگ جاتی کہ یہ معاملہ کیا ہے تو وہ شاید ایمبولینس چھوڑ کر بھاگ نکلتا۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہم ائر کلب کے پاس تھے۔ ایمبولینس کی وجہ سے گیٹ پر موجود گارڈز نے بغیر تعرض کے جانے دیا ورنہ پہلے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کس سے ملنے آیا ہوں۔ میں نے ایمبولینس کلب کی عمارت کے سامنے رکوائی لیکن پھر مجھے سنکاری نظر آ گیا وہ اپنے ہیلی کاپٹر کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔ ”تم یہیں رک کر انتظار کرو گے۔“

”کب تک صاحب؟“

”جب تک ہم واپس نہیں آتے، تم ایمبولینس کو پارکنگ میں لے جاؤ۔“

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ میں بانو کے ساتھ سنکاری کی طرف بڑھا۔ وہ ہیلی کاپٹر میں ایندھن بھروا رہا تھا اور یہ عمل آخری مراحل میں تھا۔ ایک چھوٹا ٹینکر فیولنگ کر رہا تھا۔ جیسے ہی ہیلی کاپٹر کا ٹینک فل ہوا۔ اس نے فیولنگ بند کر دی اور پھر ٹینکر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سنکاری نے مجھے اور بانو کو دیکھا۔ ”بس تم دو ہے؟“

”ہاں ہم دونوں نے جانا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وقت کم ہے فوری روانگی اختیار کرنی ہے۔“

”تمہارا لک آج موسم بہت اچھا ہے۔“ اس نے ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ یہ درمیانے سائز کا ہیلی کاپٹر تھا۔ اس میں آگے دو افراد اور پیچھے تین افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ بانو پیچھے چلی گئی اور میں فرنٹ سیٹ پر آ گیا۔ ہیلی کاپٹر کا اگلا حصہ تقریباً سارا ہی شیشے کا تھا اس سے نہ صرف سامنے بلکہ نیچے دیکھنے میں بھی آسانی رہتی۔ سنکاری نے ہمیں کانوں کو ڈھانپ لینے والے ہیڈ فون دیئے۔ ”یہ پہن لو ورنہ دماغ خراب ہو جائے گا۔“

”کیا ہم بات کر سکیں گے؟“

”ہاں اس سے آسانی رہے گا۔ اس میں ہیڈ فون اور مائک دونوں ہیں۔“ اس نے بھی ہیڈ فون پہنتے ہوئے کہا اور پھر کنٹرول والوں سے پرواز کی اجازت لینے لگا۔ یہ کام کر کے اس نے ریڈیو بند کر دیا۔ پھر اس نے انجن آن کیا۔ پر گھومنے لگے اور ایک منٹ سے بھی پہلے وہ پوری رفتار پر آ گئے۔ کانوں پر ہیڈ فون کے باوجود شور کانوں میں گھسا جا رہا تھا۔ ہم نے سیٹ بیلٹ باندھ لی۔ سنکاری نے فلائنگ اسٹک کھینچی اور ہیلی کاپٹر ایک ہلکے سے دھچکے سے اوپر اٹھ گیا۔ بلندی پر آنے کے بعد سنکاری نے اس کا رخ شمال کی طرف کر دیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ میں اسے گائیڈ کرتا میں نے بلند آواز سے کہا۔

”ہیلی کاپٹر کو شمال کی طرف جانے والی ہائی وے کے اوپر رکھو۔“

اس نے میری طرف دیکھا۔ ”تم نے ہمالیہ نہیں دیکھنا ہے؟“

”دیکھنا ہے لیکن ہم ہائی وے دیکھتے ہوئے جائیں گے۔“

سنکاری نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے اس میں بہت وقت اور ایندھن لگے گا۔“

”لگنے دو، جیسا کہا ہے ویسا کرو۔“

”یہ فلائٹ پلان کے خلاف ہو گا۔“ اس نے احتجاج

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیا۔

سنکاری وقت ضائع کر رہا تھا اس نے ہیلی کاپٹر بلند کر لیا تھا اور اب مجھے شملہ کے شہر کے ساتھ شمال کی طرف جانے والی ہائی وے بھی دکھائی دے رہی تھی۔ ایمبولینس کو روانہ ہوئے تقریباً ایک گھنٹا ہونے والا تھا اور اس سڑک پر وہ تیس پینتیس کلومیٹرز سے زیادہ آگے نہیں جا سکی ہوگی۔ پیلس تک کا سفر کئی گھنٹے پر مشتمل تھا۔ اگر وہ سڑک پر تھی تو ہم اسے روک سکتے تھے لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ جلد از جلد اس تک پہنچ جائیں۔ ورنہ وقت ضائع ہوتا اور ہماری سرحد پار روانگی خطرے میں پڑ جاتی۔ جب کہ میں بہر صورت آج کے دن سرحد پار کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ یہ موقع دوبارہ مشکل سے ملتا۔ میں نے پستول نکال لیا اور سنکاری دم بہ خود رہ گیا۔ "تم ویپن کے ساتھ ہے۔"

"ہاں۔" میں نے پستول اس کی گردن سے لگا دیا اور ہاتھ بڑھا کر ریڈیو کا پاور بٹن آف کر دیا۔ "جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔"

"ہم کو مارنا مت ہم ویسا ہی کرے گا۔" وہ گھگیایا۔ "فور گاڈ ہم کو مت مارنا۔"

"گاڈ کے لیے نہیں ماروں گا اپنی جان بچانے کے لیے ماروں گا اس لیے شرافت سے رہو اور زندہ رہو۔"

"بائی گاڈ ہم شریف رہے گا۔ زندہ رہے گا۔" اس نے کہا اور فوری طور پر ہیلی کاپٹر کو شمال کی طرف جانے والی شاہراہ کے اوپر لانے لگا۔

"اس شاہراہ پر اس طرح چلو کہ اس کا کوئی حصہ نظر سے اوجھل نہ رہے۔"

وہ ہچکچایا پھر اس نے پوچھا۔ "تم کو کسی کا تلاش ہے؟"

"ایک بڑی سفید ایمبولینس کا.... اس پر سرخ رنگ سے کراس بنے ہیں۔"

"ایمبولینس میں کون ہے۔"

"میری محبوبہ۔" میں نے سرد آہ بھری۔ "میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کا باپ شادی کے لیے تیار نہیں تھا اور اس کی ٹانگیں توڑ کر اسے اسپتال میں لٹا دیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اسے اسپتال سے لے کر بھاگ جاؤں مگر میرے رقیب نے محبوبہ کے باپ کی آشیر واد سے اس منصوبے پر پہلے عمل کر لیا۔"

کیونکہ انڈیا میں فلموں کا رواج ہے اور معاشرہ ان سے متاثر ہے اور اتفاق سے ان فلموں میں کہانیاں بھی اس قسم کی ہوتی ہیں اس لیے سنکاری نے اس کہانی پر یقین کر لیا اور فکر مند ہو کر بولا۔ "تمہارا رقیب بھی ویپن والا ہوگا۔"

"بالکل ہوگا۔ وہ میرا ہم پلہ ہے۔"

"تب تم اپنی لور کو واپس لے گا تو وہ بلٹ چلائے گا؟"

"اس کا امکان ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"تب ہم مارا جائے گا۔"

"تم فکر مت کرو تم کو کچھ نہیں ہوگا۔"

"بابا جب بلٹ چلتا ہے تو کسی کو نہیں دیکھتا۔"

"پر بلٹ چلانے والا دیکھتا ہے اور میرا رقیب رقابت میں اندھا ہے لیکن آنکھ سے اندھا نہیں ہے۔ تم میں اور مجھ میں بہت فرق ہے اس لیے فکر نہ کرو وہ دیکھ کر بلٹ چلائے گا۔"

سنکاری کی حالت خراب تھی۔ مگر وہ مجبور تھا۔ یہاں بھی اس کے سر کے ساتھ پستول لگا ہوا تھا اور اس میں بھی بلٹ تھا۔ چند منٹ میں ہم شملہ سے آگے نکل گئے تھے اور اب ہیلی کاپٹر ہائی وے کے ساتھ ساتھ پہاڑوں میں گھوم رہا تھا۔ میری نظر ہائی وے پر آتی جاتی گاڑیوں پر مرکوز تھی۔ میں نے سنکاری سے پوچھا۔ "ہیلی کاپٹر میں کمیونیکیشن کا کوئی اور سسٹم بھی ہے؟"

"نہیں ریڈیو ہوتا ہے اور ایک ٹرانسپونڈر ہوتا ہے جو چوپر کا بتاتا ہے۔"

"اسے بھی بند کر دو۔" میں نے حکم دیا تو اس نے ڈیش بورڈ پر لگا ہوا ایک سوئچ آف کر دیا۔ مجھے طیاروں اور ہیلی کاپٹر میں استعمال ہونے والے آلات کا اتنا علم نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی مواصلاتی آلہ کام کر رہا ہوتا اور مجھے اس کا علم نہ ہوتا۔ بہر حال بہت کچھ انسان کو تقدیر پر بھی چھوڑ دینا ہوتا ہے۔ اپنے طور پر میں پوری طرح چوکس تھا۔ بانو نے سیٹ بیلٹ باندھ لی تھی کیونکہ اس کی سیٹ سیدھی تھی اور اس میں پھسلنے کا خطرہ تھا۔ ہم شملہ سے کوئی دس بارہ کلومیٹرز آگے نکل آئے تھے۔ سڑک کے لحاظ سے یہ فاصلہ کوئی بیس بائیس کلومیٹرز تھا۔ اب تک ایمبولینس نظر نہیں آئی تھی لیکن اب اس کے نظر آنے کا امکان بڑھ گیا تھا۔ اس لیے میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور سنکاری سے کہا۔ "اب ہیلی کاپٹر کو ذرا آہستہ کر لو۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اس وقت وہ تقریباً سو کلومیٹرز

فی گھنٹے کی رفتار سے پرواز کر رہا تھا۔ سنکاری نے اسے مزید آہستہ کر لیا۔ اب وہ تقریباً ٹہل رہا تھا۔ بانو نے کچھ دیر بعد کہا۔ "اگر ایمبولینس مل گئی تو کیا کرنا ہے؟"

"اسے روکنا ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہ کام میں کروں گا۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔"

"نہیں تم ہیلی کاپٹر میں رکو گی۔" میں نے انکار کیا تو وہ سمجھ گئی کہ میں اسے سنکاری کے سر پر چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔

"جیسے آپ کی مرضی لیکن آپ اکیلے....."

"فکر مت کرو اس سے پہلے بھی بہت سے معرکے اکیلے ہی سر کیے ہیں۔" میں نے کہا۔ میرے پاس چار عدد پستول تھے۔ ایک سائلنسر والا تھا اور ان سب کے کئی فاضل میگزین بھی تھے اس لیے اسلحے کے لحاظ سے پوزیشن تسلی بخش تھی۔ مگر دوسری طرف رامن اینڈ کمپنی دانتوں تک مسلح ہوتی اور ان کے پاس خودکار ہتھیاروں کی موجودگی بھی عین ممکن تھی۔ وہ تعداد میں بھی زیادہ ہوتے۔ اس کے باوجود مجھے ان کو روکنا تھا اور راج کنور کو واپس حاصل کرنا تھا۔ میں سوچ میں تھا اور بہ ظاہر نیچے دیکھ رہا تھا مگر نگاہیں فوکس نہیں تھیں اس لیے ایمبولینس سنکاری نے دیکھی اس نے کہا۔

"وہ دیکھو...... نیچے....."

سڑک پر ایک بڑی سفید ایمبولینس جا رہی تھی، اس کی چھت پر فلیش پٹی لگی تھی۔ حلیے سے وہی ایمبولینس لگ رہی تھی میں نے سنکاری سے کہا۔ "ہیلی کاپٹر اس کے قریب لاؤ۔"

وہ ہیلی کاپٹر کو نیچے لانے لگا۔ تقریباً دو سو فٹ کی بلندی سے ایمبولینس کے اطراف میں لگے سرخ رنگ کے کراس بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ یہ وہی ایمبولینس تھی۔ اس کے آس پاس کوئی دوسری گاڑی نہیں تھی اس کا مطلب تھا کہ سب ایمبولینس میں تھے۔ اس سے مجھے امید ہوئی کہ شاید رامن ایمبولینس کے ساتھ نہیں تھا مگر یہ بات یقینی تھی کہ اس کا کوئی نہ کوئی گرگا یا گرگے ایمبولینس میں موجود ہوں گے۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے روکا کیسے جائے۔ فضا سے روکنا تو ناممکن تھا۔ الٹا ہمیں لینے کے دینے پڑ سکتے تھے کیونکہ اگر نیچے سے کیا جانے والا فائر ہیلی کاپٹر کے کسی نازک مقام پر لگ جاتا تو یہاں کریش لینڈنگ کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ مجھے جو کرنا تھا کہیں اتر کر کرنا تھا۔ ایک منٹ بعد میں نے سنکاری سے دوبارہ ہیلی کاپٹر اوپر کرنے کو کہا۔ اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ "واپس جانے کا ہے؟"

"آگے چلو اور جب ایمبولینس سے دو تین کلومیٹرز آگے نکل جاؤ تو ہیلی کاپٹر نیچے لے آنا۔"

سنکاری کا منہ لٹک گیا تھا لیکن اس نے حکم کی تعمیل کی۔ بانو نے پوچھا۔ "اگر آپ نے اترنے کا ارادہ کیا تو اس جگہ ہیلی کاپٹر کیسے اترے گا؟"

سنکاری نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "سو ڈینجرس..... چوپر ادھر نہیں اتر سکتا۔"

"ہونے کو سب ہو سکتا ہے۔" میں نے نیچے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب ہیلی کاپٹر نیچے لے آؤ۔ سڑک سے سو فٹ اوپر رکھنا۔"

"یہ بھی ڈینجرس ہے۔"

"ڈینجرس یہ پستول بھی ہے۔" میں نے کہا تو وہ بادل ناخواستہ ہیلی کاپٹر نیچے لے آیا۔ سڑک سے صرف سو فٹ کی بلندی پر یہ عملاً پہاڑوں کے درمیان اڑ رہا تھا۔ اس نے میرے کہنے پر رفتار سست کر لی تھی۔ میری نظریں سڑک کے ساتھ کسی موزوں جگہ کی تلاش میں تھیں۔ میں وقفے وقفے سے سنکاری سے پوچھ رہا تھا کہ ہم اس جگہ سے کتنی دور نکل آئے تھے جہاں ایمبولینس دیکھی تھی۔ وہ فاصلہ بتا رہا تھا۔ تقریباً سات آٹھ کلومیٹرز آگے نکلنے کے بعد مجھے ایک جگہ موزوں لگی۔ میں نے سنکاری سے ہیلی کاپٹر اس کے پاس لانے کو کہا۔ وہ چوپر سڑک سے صرف بیس پچیس فٹ کی بلندی پر لے آیا اور مجھے مطلع کیا۔

"اس سے نیچے نہیں آسکتا ہے۔"

یہاں درخت نہیں تھے مگر ایک طرف ڈھلان تھی اگر ہیلی کاپٹر زیادہ نیچے آتا تو اس کے پنکھے ڈھلان سے ٹکرا سکتے تھے۔ میں نے سڑک کے دوسری طرف ڈھلان والی اس جگہ کو غور سے دیکھا اور یہ مجھے اپنے کام کی لگی تھی۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ "آگے چلو اور کوئی ایسی جگہ تلاش کرو جہاں ہیلی کاپٹر اتارا جا سکے لیکن اس جگہ سے زیادہ دور نہ ہو۔"

"اس جگہ۔" وہ کراہا۔ "ادھر اڑانا مشکل ہے تم اتارنے کو بولتا ہے۔"

رونے کے باوجود اس نے ہیلی کاپٹر آگے بڑھا دیا تھا اب وہ سڑک کے دوسری طرف نیچے کی ڈھلان کی طرف اڑ رہا تھا اور کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہا تھا جہاں ہیلی کاپٹر اتارا جا سکے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ مناسب جگہ کوئی نصف کلومیٹر کے بعد ملی۔ یہاں سڑک چوڑی تھی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہاڑ والی طرف بھی زمین ہموار تھی۔ کسی قدر کوشش سے ہیلی کاپٹر اتارا جاسکتا تھا۔ سنکاری نے مجھے آگاہ کیا اور ہیلی کاپٹر نیچے لانے لگا۔ وہ بہت احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر ایسی مشین ہے جو تیز رفتاری میں توازن رکھتی ہے لیکن جب یہ ہوا میں معلق ہو تو بے توازن ہو کر ڈولنے لگتی ہے۔ اس وقت بھی ہیلی کاپٹر ڈول رہا تھا۔ اس کے اسکیز سڑک کے پاس ہوتے جارہے تھے۔ اچانک بانو چیخ اٹھی۔ ”ٹرک....“

سنکاری نے عجلت میں بے اختیار ہیلی کاپٹر اوپر کیا اور مخالف سمت سے آتا ٹرک پریشر ہارن بجاتا نیچے سے گزر گیا۔ میری اور سنکاری دونوں کی نظر سڑک پر مرکوز تھی اور خوش قسمتی سے بانو نے آتے ٹرک کو دیکھ لیا۔ اس کے ڈرائیور نے بھی بالکل قریب آکر ہیلی کاپٹر دیکھا تھا۔ سنکاری نے دہشت زدہ ہو کر چیخ ماری۔ ”ڈیم اٹ.... ابھی ہم سب مرتا.... بائی گاڈ سب مرتا.... تم سب کو مرواتا۔“

”مرا نہیں ہے۔“ میں نے اسے ڈانٹا۔ ”مرد ہو.... فلائنگ کرتے ہو اتنا سا دل ہے تمہارا؟“

”ہم بال بچے والے ہیں۔“

بانو بولی۔ ”مجھے تو لگ رہا ہے ٹرک چھوتا ہوا گیا ہے۔“

”بہت ڈینجرس جگہ ہے۔“ سنکاری لرزتی آواز میں بولا۔ ”ادھر اترا تو مارا جائے گا۔“

”ابھی تو تم اترو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ویسے وہ صحیح کہہ رہا تھا اوپر سے سڑک ڈھلان پر گھومتی ہوئی آرہی تھی۔ یہ پہاڑی کا ایک ڈسک نما حصہ تھا جس پر سڑک گھومتی تھی اسی وجہ سے پہاڑ یہاں کسی قدر ہموار تھا مگر سڑک پر آنے والی گاڑی مشکل سے پچاس گز پہلے سڑک پر موجود کسی چیز کو دیکھ سکتی تھی اور بیس کلومیٹرز فی گھنٹے کی رفتار سے یہ فاصلہ صرف چند سیکنڈ میں طے ہو جاتا۔ اگر ڈرائیور کا دھیان ذرا بھی ہٹا ہوتا تو آنے والی گاڑی ہیلی کاپٹر سے ٹکرا سکتی تھی۔ مگر اس کا حل تھا۔ سنکاری نے چوپر نیچے اتار لیا اور میرے کہنے پر اس کا انجن بند کر دیا۔ فوراً ہی اس کا عذاب ناک شور مدہم پڑ گیا اور ایک منٹ بعد اس کے پنکھے رک گئے تھے۔ میرے اشارے پر بانو اور سنکاری نیچے اتر آئے۔ بانو نے اپنا پستول نکال کر اس کا معائنہ کیا اور واپس رکھ لیا۔ یہ اشارہ تھا سنکاری کے لیے کہ اسے اکیلا نہ سمجھے۔ ویسے وہ خالی ہاتھ سے بھی سنکاری کو آسانی سے قابو کر سکتی تھی۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ ”تم اس کے ساتھ دوسری طرف جاؤ اور سڑک پر پتھر رکھ کر اسے بند کر دو اس طرح امکان نہیں رہے گا کہ کوئی گاڑی بے خبری میں تمہارے ہیلی کاپٹر سے ٹکرا جائے۔“

”آپ جائیں ہم یہ کام کرلیں گے۔“ بانو بولی۔

میں نے سنکاری کو خبردار کیا۔ ”کوئی چالاکی مت کرنا ورنہ میری ساتھی تمہیں بے دریغ شوٹ کر دے گی۔ اگر یہاں سے تم فرار ہو بھی گئے تو ہم تمہارے گھر بھی آسکتے ہیں تم چھپ نہیں سکو گے۔“

”ہم کیا کر سکتا ہے۔“ اس نے سرد آہ بھری اور بانو کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں واپس شملہ کی طرف روانہ ہوا۔ چند لمحے بعد میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ کیونکہ جو جگہ میں نے منتخب کی تھی وہاں تک ایمبولینس پندرہ بیس منٹ میں پہنچ سکتی تھی اور اس میں سے دس بارہ منٹ گزر چکے تھے مجھے جگہ کا معائنہ کرنا تھا اور پھر لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ ایک خیال تو ذہن میں تھا لیکن اس پر عمل کا حتمی فیصلہ میں اس جگہ کو دیکھ کر ہی کر سکتا تھا جو اوپر سے دیکھی تھی۔ اوپر سے دیکھنے اور زمین سے دیکھنے میں خاصا فرق ہو سکتا تھا۔ چند منٹ بعد میں اس مقام پر تھا اور ابھی تک دور پہاڑوں میں بل کھاتی سڑک پر سفید ایمبولینس نمودار نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سڑک کے کنارے اتر کر اس جگہ کو دیکھا۔ یہاں ڈھلان پر تقریباً چالیس درجے کے زاویے سے ہموار جگہ تھی اور کوئی دس گز نیچے پاس پاس بڑے تنوں والے مضبوط درخت لگے تھے۔

میں نے ان کا معائنہ کیا۔ اگر ایمبولینس اس ڈھلان پر اتر جاتی تو یہ درخت اسے مزید نیچے گرنے سے روک سکتے تھے۔ مگر اس کا بھی امکان تھا کہ وزنی اور بہت قوت سے آنے والی ایمبولینس ان درختوں کو بھی گراتی نیچے کھائی کی طرف نکل جاتی۔ ذرا آگے ڈھلان یک دم بہت زیادہ ہو گئی تھی اور اس صورت میں ایمبولینس تقریباً دو سو فٹ نیچے گرتی اور کسی کے بچنے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ واپس اوپر آیا تو ایمبولینس نمودار ہو چکی تھی اور وہ ابھی تقریباً ایک کلومیٹر دور تھی لیکن وہ جس رفتار سے آرہی تھی اسے یہاں تک آنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگتے۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھی۔ اور پھر سڑک کے ساتھ ڈھلان پر اس چھوٹے سے پتھر کے ساتھ دبک گیا جو مجھے پوری طرح چھپا تو نہیں سکتا تھا لیکن یہ کسی جوابی حملے سے کسی قدر تحفظ دے سکتا تھا۔ اس پتھر کے پیچھے پوری ڈھلان تھی۔ اس کے فوراً بعد وہ ڈھلان تھی جو میں نے منتخب کی تھی۔ اگر میرا پلان مکمل ہوتا اور سب ٹھیک رہتا تو ایمبولینس اس ڈھلان پر اتر کر معمولی حادثے کا شکار ہوتی۔ اس میں موجود افراد زخمی ہو سکتے تھے لیکن کسی کے مرنے کا امکان نہیں تھا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ ایمبولینس بڑے حادثے کا شکار ہو کر نیچے گر جاتی یا پھر حادثے سے بچ جاتی تو دونوں صورتوں میں میرا منصوبہ تقریباً ناکام ہو جاتا۔ راج کنور ہاتھ نہ آتا، یا آتا تو کسی قابل نہ ہوتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے لینے کے دینے پڑ جاتے اور خود میرا یہاں سے صحیح سلامت نکلنا ممکن نہ رہتا۔ یہ تمام امکانات میرے ذہن میں تھے۔ میں نے دو پستول نکال لیے تھے۔ سائلنسر والا چھوڑ دیا تھا اور چوتھا بانو کے پاس تھا۔ سائلنسر والا زیادہ کارآمد لیکن طاقت کے لحاظ سے کم تھا۔ اس وقت مسئلہ رازداری کا نہیں بلکہ دشمن کو کچل دینے کا تھا کہ وہ ذرا بھی مزاحمت کے قابل نہ رہے۔ میرے پاس وقت اور قوت دونوں کم تھیں۔

ایمبولینس اب اس موڑ تک آچکی تھی جہاں سے وہ مستقل میری نظر میں رہتی۔ یہاں سڑک کوئی ڈیڑھ سو گز تک سیدھی تھی اور پتھر کے پاس سے یہ تقریباً یوٹرن لے رہی تھی۔ یہاں بیس کلومیٹرز فی گھنٹا کی رفتار بھی زیادہ تھی۔ میرے حساب سے ڈرائیور کو دس سے اوپر نہیں جانا چاہیے تھا۔ مگر ایمبولینس خاصی رفتار سے آرہی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر دو افراد تھے۔ دور سے ان کی صورتیں واضح نہیں تھیں۔ پھر سورج ان کے عقب میں چلا گیا تھا اور اس وجہ سے بھی صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں مستعد اور تیار تھا۔ ایمبولینس کوئی تیس گز دور تھی کہ میں پتھر کی آڑ سے نکل آیا۔ میرے دونوں ہاتھ سیدھے تھے اور میرا نشانہ ایمبولینس کا اگلا بایاں ٹائر تھا۔ میں نے فائرنگ شروع کی۔ میری انگلیاں مشینی انداز میں چل رہی تھیں۔ تیسری یا چوتھی گولی پر ٹائر دھماکے سے پھٹا اور ایمبولینس لہرائی۔ اس کا رخ ڈھلان کی طرف ہو گیا۔ اسی وقت ڈرائیور اسٹیرنگ گھما رہا تھا مگر ٹائر کے برسٹ ہونے سے وہ ناکام رہا اور تب میں نے دیکھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر رامن تھا۔ دوسرا آدمی اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ جوابی کارروائی کر سکتے۔

ایمبولینس کا رخ میری طرف ہوا تھا۔ میں نے ذرا پیچھے ہوتے ہوئے اس بار پچھلے بائیں ٹائر کو نشانہ بنایا۔ ایمبولینس بری طرح لڑکھڑا رہی تھی اور رامن یقیناً اسٹیرنگ سے کشتی لڑ رہا تھا کہ گاڑی کو کھائی میں جانے سے روکے۔ اس کی یہ کوشش میں نے دوسرا ٹائر برسٹ کر کے ناکام بنا دی۔ جیسے ہی ٹائر پھٹا میں نے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی اور ایمبولینس تقریباً مجھے چھوتی گزر گئی۔ ایمبولینس زندگی کی علامت ہے۔ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا انسانوں کو حیات کی طرف لے جاتی ہے لیکن اس دن اگر ایمبولینس مجھ سے ٹکرا جاتی تو یہ قاتل بن جاتی۔ میں ڈھلان پر گرا اور لڑھکتا ہوا نیچے جانے لگا۔ میں نے پستول وہیں چھوڑ دیے تھے اور ہاتھ مارتے ہوئے خود کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ڈھلان زیادہ تھی اور میں زور سے پیچھے آیا تھا۔ پھر ایک پودے نے سہارا دیا میں نے اسے پکڑا ضرور مگر فوراً ہی وہ جڑ سے اکھڑ گیا۔

البتہ اس ذرا سے سہارے نے میری رفتار کم کی اور میں قلابازی کھا کر پیٹ کے بل ڈھلان پر گرا اور چھپکلی کی طرح اس سے چمٹ گیا۔ مگر چھپکلی لمبی اور ہلکی ہوتی ہے۔ میں انسان ہوں اور وزنی ہوں اس لیے سیدھا گرنے کے باوجود موومینٹ زیادہ تھا۔ کشش ثقل مجھے کھینچ رہی تھی اور حرکت کرتا جسم سر سے اٹھ کر دوبارہ گرنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ اگر ایک بار میں اور قلابازی کھا جاتا تو اس کے بعد اس ڈھلان پر رکنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے آخری کوشش کی اور پورا جسم سخت کر لیا۔ خاص طور سے گھٹنے سیدھے کر لیے اور پیروں پر زور ڈالا۔ میں دباؤ کو اتنا کم کر چکا تھا کہ دوبارہ منہ کے بل ڈھلان پر گرا۔ منہ بچانے کا وقت نہیں تھا اگر ہاتھ آگے کرتا تو اس کا جھٹکا مجھے دوبارہ پیچھے لے جاتا اس لیے میں نے خود کو سینے کے بل گرنے دیا اور ہاتھ پیچھے کر لیے۔ جھٹکے سے منہ زمین سے ٹکرایا۔ خوش قسمتی سے یہاں پتھر نہیں تھا بلکہ مٹی تھی اس کے باوجود خاصی چوٹ آئی تھی۔ بہرحال اس وقت جان پر بنی تھی اس لیے چوٹ کی پروا کسے تھی۔ زمین پر گر کر اس سے چمٹ گیا۔

میں جتنے آسان انداز میں بیان کر رہا ہوں یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ اگر میں جسمانی طور پر مضبوط اور فٹ نہ ہوتا تو یہ سب نہیں ہو سکتا تھا۔ گرنے کی قوت اور کشش ثقل مجھے نیچے کھینچ لیتی۔ چند لمحے میں پڑا ہانپتا رہا۔ پھر تیزی سے اٹھا۔ جب تک میں خود کو گرنے سے بچانے کی جدوجہد کر رہا تھا میں اردگرد سے مکمل غافل ہو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایمبولینس کے ساتھ کیا ہوا اور وہ کہاں گئی۔ میں اتنا غافل تھا کہ میں نے کوئی آواز بھی نہیں سنی۔ اوپر آتے ہوئے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے اپنے دونوں پستول اٹھائے۔ لڑھکنے کے دوران میں مجھے چوٹیں آئی تھیں لیکن فی الحال ان کی طرف توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ ایمبولینس سڑک پر نہیں تھی میں ڈھلان کی طرف بھاگا اور جب میں نے نیچے دیکھا تو ایمبولینس دو درختوں سے اسی طرح ٹکی نظر آئی جیسے میں نے سوچا تھا۔ ایمبولینس ساکت تھی اور اس کا انجن بھی بند تھا۔ مزید کوئی سرگرمی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

میں نے پستول سامنے کیے اور محتاط انداز میں ایمبولینس کی طرف آیا۔ اچانک اس کا فرنٹ سیٹ والا دروازہ کھلا اور ایک آدمی نیچے گرا۔ میں نے بے ساختہ فائر کیا۔ اسے گولی لگی مگر وہ پہلے ہی مر چکا تھا کیونکہ اس کی گردن غیر معمولی حد تک پیچھے مڑی ہوئی تھی۔ یہ رامن کا دوسرا ساتھی تھا۔ میں آگے آیا۔ جیسے جیسے میں آگے آرہا تھا ڈرائیونگ کمپارٹ نمایاں ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے جھٹکا لگا کہ رامن ڈرائیونگ سیٹ پر نہیں تھا۔ ایمبولینس اس کی طرف سے درخت کے تنے سے ٹکرائی تھی۔ ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی تھی لیکن کوئی اس سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ خطرے کے احساس نے مجھے چوکنا کر دیا اور میں تیزی سے ایمبولینس کے عقبی حصے میں آیا۔ میں نے ایک طرف ہوتے ہوئے اس کا دو پٹ والا دروازہ کھولا تھا کہ رامن کی منحوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ ”شہباز کوئی حماقت مت کرنا ورنہ میں راج کو مار دوں گا۔“

میں نے احتیاط سے ایک لمحے کے لیے اندر جھانکا تو رامن راج کنور کو جکڑے دکھائی دیا۔ اس نے راج کنور کی گردن کو نیک لاک لگایا ہوا تھا اور وہ ایک سیکنڈ میں اس کی گردن توڑ سکتا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیکن یہ اس کی مکاری بھی ہو سکتی تھی وہ اس طرح خود کو نہتا ظاہر کر کے مجھے سامنے آنے پر اکسا رہا تھا اور میں سامنے آتا تو اچانک مجھے شوٹ کر دیتا۔ اس لیے میں آڑ میں رہا۔ رامن کا چہرہ لہولہان تھا یقیناً اس حادثے میں اسے خاصے زخم آئے تھے مگر ان میں سے ایسا کوئی زخم نہیں تھا جو اسے ناکارہ کر دیتا۔ راج کنور بہ ظاہر ٹھیک لگ رہا تھا لیکن رامن کی گرفت کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا اور ایمبولینس کے نیچے بھی جھانک لیا کہ کہیں رامن کا مزید کوئی ساتھی نہ ہو۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

اگر رامن حادثے میں نہتا ہو گیا تھا تو اس نے حاضر دماغی سے کام لے کر اپنے بچاؤ کا فوری بندوبست کر لیا تھا یعنی راج کنور کو یرغمال بنا لیا۔ اسے اندازہ تھا کہ میں اس کے پیچھے آیا ہوں اگر میں نے رامن کو نہتا پا لیا تو اس بار اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کروں گا اور فوراً نرکھ روانہ کر دوں گا۔ درحقیقت میں نے سوچا بھی یہی تھا مگر رامن راج کنور پر قابو پا کر عارضی طور پر محفوظ ہو گیا تھا۔ میں تیزی سے سوچ رہا تھا۔ میری جنگ رامن کے ساتھ ساتھ وقت سے بھی تھی اور مجھے جلد از جلد راج کنور کو حاصل کر کے واپس جانا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ”تم بھی کوئی حماقت مت کرنا۔ ورنہ اس بار تم خود کو ہر رعایت سے محروم کر لو گے۔ راج کنور کو چھوڑ دو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔“

”میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر تم نے چھڑانے کی کوشش کی تو یہ مر کر چھوٹے گا۔“

”میرا خیال ہے تم کسی بڑی غلط فہمی کا شکار ہو کہ میں راج کنور کا ہمدرد بن گیا ہوں اور ہر قیمت پر اس کی جان بچانا چاہتا ہوں۔ اگر تم ایسا سوچ رہے ہو تو بہت بڑی غلطی پر ہو۔ میں راج کنور کا دشمن ہوں اور رہوں گا۔ اگر مجھے موقع ملے گا تو میں اسے ضرور مار دوں گا لیکن فی الحال مجھے اس کی ضرورت ہے۔“

وہ تشویش کا شکار ہو گیا۔ ”تمہیں اس کی ضرورت کیوں ہے؟“

”تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔“ میں نے لہجہ بدل کر کہا۔ ”رامن، میرے پاس وقت نہیں ہے، مجھے کچھ ہی دیر میں یہاں سے نکل جانا ہے۔ میں یا تو راج کنور کو لے کر جاؤں گا یا پھر تم دونوں کو ختم کر دوں گا۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے اور تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔“

”اس کے بعد تم توپ چلا دو گے۔“ رامن نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”اگر تم مجھے گولی مارو گے تو وہ راج کو لگے گی۔“

”نہیں میں تم پر یا راج پر نہیں ایمبولینس کے پیٹرول ٹینک پر گولی چلاؤں گا اور تم دونوں اندر ہی روسٹ ہو جاؤ گے۔ ایک طرف کھائی اور دوسری طرف میں ہوں جس طرف بھی گئے موت استقبال کرے گی۔ اب ڈیڑھ منٹ رہ گیا ہے۔“

میری بات پر رامن کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ حادثے میں پیٹرول ٹینک کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد

کہا۔ ”ایک منٹ رہ گیا ہے، ویسے جب تم آرام سے راج کنور کو اسپتال سے لے جا سکتے تھے تو اس طرح لانے کی کیا تک تھی؟“

”اس حرامی نے ہاسپٹل ایڈمنسٹریشن سے مدد مانگ لی تھی کہ اس کی مرضی کے بغیر اسے ڈسچارج نہ کیا جائے چاہے کوئی بھی کہے۔ معاملہ سرکار تک چلا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ یہ ہاتھ سے نکل جاتا میں اسے اغوا کر کے نکال لایا۔“

میں راج کنور کی چالاکی پر حیران ہوا تھا۔ اس نے مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ وہ انتظامیہ سے مدد مانگ چکا ہے۔ تو یہ وجہ تھی کہ رامن نے راست اقدام کیا۔ ”اس پر تمہارے خلاف اغوا کا کیس نہیں بنے گا۔ ڈاکٹر امر تسر سنگھ گواہ ہے۔“

رامن نے سردار جی کو ایک ناقابل بیان گالی دی۔ ”وہ..... کس منہ سے پولیس کو بیان دے گا۔ اس نے لاکھ روپے لے کر میری مدد کی ہے۔“

میں نے سر سہلایا۔ گھامڑ نظر آنے والا سکھ تو بہت ہوشیار نکلا دو مخالف پارٹیوں سے پیسے وصول کر لیے۔ اس کے پاس سے صرف دس ہزار برآمد ہوئے تھے یعنی باقی رقم اس نے کہیں چھپا دی تھی۔ وقت پورا ہو گیا تھا۔ میں نے رامن کو مطلع کیا اور کہا۔ ”مجھے جواب چاہیے ہاں یا نہ؟“

”میں راج کنور کو نہیں چھوڑ سکتا دوسری صورت میں تم مجھے نہیں چھوڑو گے۔“

”وہ تو میں تمہیں پہلی صورت میں بھی نہیں چھوڑوں گا۔“ میں نے واضح کیا۔ ”میرا خیال ہے تم نے جواب دے دیا ہے۔ بہر حال میں پھر بھی تین تک گن کر گولی چلاؤں گا۔ ایک.....دو.....تین.....“

”رک جاؤ۔“ رامن چلایا۔ پہلی بار اس کے لہجے میں خوف کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میں سچ مچ گولی چلا دوں گا۔ ”کیا ضمانت ہے کہ تم مجھے چھوڑ دو گے۔“

میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”کوئی ضمانت نہیں ہے تمہیں میرے کہے پر بھروسا کرنا ہوگا۔“

”اگر میں راج کنور کو چھوڑ دوں تو کیا تم مجھے جانے دو گے۔ مجھے شوٹ نہیں کرو گے؟“

میں نے سوچ کر جواب دیا۔ ”میں تمہیں ایک چانس دوں گا۔ تم اس ڈھلان سے اتر جاؤ میں وعدہ کرتا ہوں تیس سیکنڈ تک تم پر کوئی فائر نہیں کروں گا۔ بے شک تم سامنے بھی ہو اس کے بعد میں تمہیں شوٹ کر دوں گا تمہیں منظور ہے؟“

”تیس سیکنڈ کم ہیں؟“

”یہ وقت ایمبولینس سے باہر آنے پر شروع ہوگا۔“ میں نے کہا اسی لمحے مجھے بانو اور سنکاری اپنی طرف آتے دکھائی دیے، میں نے اشارے سے بانو کو وہیں رکنے کو کہا۔ وہ رک گئی۔ ”بولو کیا کہتے ہو؟“

”مجھے منظور ہے۔“ رامن نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

”تب راج کو چھوڑ کر ایمبولینس سے باہر نکل جاؤ۔ تمہارے باہر آتے ہی میں بلند آواز سے گننا شروع کروں گا۔ تیس تک تم جتنی دور جا سکتے ہو چلے جانا۔“

”تم میرے پیچھے آؤ گے؟“

”نہیں میں ڈھلان پر قدم نہیں رکھوں گا۔“ میں نے کہا ”نا میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو تو میں تمہاری بات مان لوں گا کہ تمہارے پاس وقت کم ہے۔“

”کس بات کا جواب؟“

”ہمارے اوپر اڑنے والے ہیلی کاپٹر میں تم تھے؟“

میں رامن کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ اس نے بہت عجلت میں درست نتیجہ نکالا تھا۔ ”اگر میں مان لوں تو اس سے میری بات کی تصدیق کیسے ہو گی؟“

”اس کا مطلب ہے تم راج کنور کو لے کر سرحد پار جانا چاہتے ہو۔ صرف راج کنور جانتا ہے کہ سرحدی حکام سے کیسے ڈیل کرنا ہے۔“

میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ رامن کچھ زیادہ ہی ذہین ثابت ہو رہا تھا بلکہ چند لمحے بعد مجھے پتا چلا کہ اس کے سر میں شیطان کا دماغ فٹ تھا، جب اچانک راج کنور کی چلانے کی آواز آئی۔ ”بچاؤ اس نے آگ لگا دی ہے۔“

مجھے ایک جھلک دکھائی دی تھی۔ رامن ٹوٹی ونڈ اسکرین سے نکلا تھا۔ میں اس کی طرف لپکا لیکن وہ فوراً ہی ڈھلان پر غائب ہو گیا۔ جب میں کنارے پہنچا تو وہ قلابازیاں کھاتا دکھائی دیا تھا اور چند لمحوں میں کوئی بیس گز نیچے جا چکا تھا میں نے اس پر لگاتار فائر کیے مگر کوئی گولی نشانے پر نہیں بیٹھی اور وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ جس رفتار سے نیچے جا رہا تھا اس کے بچنے یا کم سے کم صحیح سلامت رہنے کے امکانات بہت کم نظر آرہے تھے۔ میں واپس آیا کیونکہ راج کنور دہشت سے مسلسل چلا رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ جس اسٹریچر پر لیٹا ہوا تھا اس کے ساتھ ہی فرش پر شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اور یہ پھیل رہے تھے۔ مکار رامن نے کسی آگ پکڑنے والے محلول کی بوتل توڑ کر اسے آگ دکھادی تھی۔ اگر راج کنور کو فوری نہ نکالا جاتا تو شعلے اسے لپیٹ میں لے لیتے۔

راج کنور اسٹریچر پر نیم دراز تھا اور رامن نے اس کے پیچھے بیٹھ کر اسے قابو کیا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں اور سینہ بھی بیلٹوں سے بندھا ہوا تھا اسی وجہ سے وہ حادثے کے باوجود اپنی جگہ موجود رہا تھا۔ اگر وہ بندھا نہ ہوتا تو اسے مزید زخم لگ سکتے تھے اور وہ وفات بھی پا سکتا تھا۔ میں نے اسٹریچر کھینچا مگر وہ کسی میکنزم سے فٹ تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو ایک فولادی کلپ اسے پکڑے ہوئے تھا۔ اسے کھولا تو اسٹریچر آرام سے باہر نکل آیا تھا اس دوران میں شعلے اور دھواں بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ میں اسٹریچر کو کھینچتا ہوا سڑک تک لایا اور پھر اسے سڑک پر چڑھاتے ہوئے ایمبولینس سے دور بھاگا۔ اسٹریچر اوپر نیچے بھی ہو جاتا تھا۔ اس کے پہیے بڑے اور رواں تھے اس لیے مجھے کوئی دقت نہیں ہوئی۔ بانو اور سنکاری میری طرف آئے تھے۔ میں ان کے پاس پہنچا تھا کہ ایمبولینس کی طرف سے دھماکا ہوا اور شعلہ بلند ہوا تھا اس کا پیٹرول ٹینک پھٹ گیا تھا۔ سنکاری نے دہشت زدہ ہو کر سینے پر کراس بنایا۔ "گاڈ... گاڈ واٹ از دس۔"

"بلاسٹ۔" میں نے بدستور بھاگتے ہوئے کہا۔ "میری مدد کرو اس مردے کو کھینچنے میں ورنہ دوسرا بلاسٹ ہم سب کو اوپر پہنچا دے گا۔"

سنکاری دم بخود رہ گیا تھا۔ اول تو میری مبینہ محبوبہ کے بجائے اسٹریچر پر حرام صورت راج کنور تھا دوسرے وہ بالکل بھی مردہ نہیں تھا۔ سنکاری نے شک سے کہا۔ "یہ تمہارا محبوبہ ہے؟"

"تمہارا دماغ درست ہے یہ اس کا باپ ہے۔"

"پر تم نے تو کہا تھا..."

ڈھلان پر اسٹریچر ریس نے مجھے تھکا دیا تھا اس لیے میں رک گیا اور وقت گزاری کے لیے پستول سنکاری کی طرف سیدھا کیا۔ "لگتا ہے تم یہیں رہنا چاہتے ہو، ٹھیک ہے ہیلی کاپٹر ہم خود لے جائیں گے۔"

وہ گڑبڑایا۔ "میں نے کب انکار کیا؟"

اس نے جلدی سے آگے سے اسٹریچر پکڑ لیا اور اسے کھینچنے لگا۔ میں پیچھے سے دھکیل رہا تھا۔ بانو ساتھ دوڑ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا آپ کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں زخمی ہیں۔"

"معمولی زخم ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "پلان کامیاب رہا لیکن رامن نکلنے میں کامیاب رہا۔"

بانو تشویش زدہ ہو گئی۔ "یہ برا ہوا۔"

"اس سے بھی زیادہ برا یہ ہے کہ وہ اصل پلان سے واقف ہو گیا ہے کہ ہم کس طرح راج کنور کو استعمال کریں گے۔"

بانو مزید فکرمند ہو گئی۔ "کیا اس صورت میں پلان پر عمل کرنا مناسب ہوگا؟"

میں نے موبائل پر وقت دیکھا۔ "ابھی سوا چار ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے کافی وقت ہے ہمارے پاس۔ رامن ڈھلان پر لڑھک رہا تھا۔ اگر بچ بھی گیا تو اس کی ہڈی پسلی ایک ہو چکی ہوگی اور اگر ٹھیک رہا تب بھی یہاں سے نکل کر کسی ایسی جگہ پہنچنے میں اسے خاصا وقت لگے گا کہ وہ کسی سے رابطہ کر کے ہمارا راستہ رکوا سکے۔"

راج کنور ہماری گفتگو سن رہا تھا اس نے مداخلت کی۔ "یہ بہت خطرناک ہوگا۔ اگر رامن نے رابطہ کر لیا تو ہم مارے جائیں گے۔ درحقیقت اسی نے ہمارے لیے یہ سہولت حاصل کی تھی۔ وہ اس کے طریقۂ کار سے پوری طرح واقف ہے۔"

"مجھے یقین ہے وہ اس قابل نہیں ہوگا کہ اعلیٰ حکام سے رابطہ کر سکے۔"

"یہ رسک ہے۔" راج کنور نے کوشش جاری رکھی۔ "فرض کرو اس نے کر لیا تو..."

"تب تم ہمارے ساتھ ہی پرلوک سدھارو گے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "لیکن ایسا ہوگا نہیں، رامن گولی کی رفتار سے تقریباً تین سو فٹ گہری کھائی میں جا رہا تھا تم خود سوچو وہ زندہ بچ بھی گیا تو کیا چوٹیں اسے کچھ کرنے کے قابل چھوڑیں گی۔ اس لیے تم رامن کو اپنے ذہن سے نکال دو اور یہ سوچو کہ تم نے زندہ رہنا ہے اور اس کا ایک ہی طریقہ ہے۔"

راج کنور نے سر ہلایا اور رو دینے والے لہجے میں بولا۔ "اس کے بعد یہاں والے مجھے کہاں چھوڑیں گے؟"

"تم سے تفتیش ہوگی لیکن تمہیں پھانسی نہیں چڑھا دیا جائے گا۔ تم بچنا جانتے ہو اس لیے فضول کی بحث سے گریز کرو۔" کہتے ہوئے میرا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔ یہ شٹ اپ کا

حکم تھا اور راج کنور شٹ اپ ہو گیا۔ سنکاری کے کان بھی ہماری گفتگو پر لگے ہوئے تھے اور وہ سخت متوحش نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس نے سوالات سے گریز کیا اور ہم ہیلی کاپٹر کے پاس پہنچ گئے جس کے دوسری طرف کئی گاڑیاں کھڑی تھیں اور حیران پریشان لوگ ہیلی کاپٹر کے پاس جمع تھے کہ یہ کہاں سے سڑک پر آن ٹپکا اور اس کا عملہ کہاں ہے؟ ہمیں دیکھ کر کچھ لوگ آگے آئے مگر جب انہوں نے بانو کو مسلح دیکھا تو الٹے قدموں پیچھے لوٹ گئے۔ وہ خوفزدہ تھے اور مجھے بھی مسلح پا کر ان کے خوف میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ میں نے قریب جا کر کہا۔ "لیڈیز اینڈ جنٹل مین پیچھے ہٹ جائیں ابھی یہ ہیلی کاپٹر یہاں سے اڑے گا اور آپ کو راستہ مل جائے گا مگر ابھی پیچھے ہٹ جائیں۔"

یہ سنتے ہی لوگ عجلت میں پیچھے ہٹنے لگے۔ بلکہ آگے والے تو اپنی گاڑیاں بھی پیچھے لے جانے لگے اور یہ اچھی بات تھی کیونکہ پرواز کے وقت ہیلی کاپٹر کچھ ڈولتا بھی ہے۔ اس کے پنکھے کسی گاڑی سے ٹکراتے تو ہمارا مشن بارڈر کراس یہیں ختم ہو جاتا۔ میں نے سنکاری کی مدد سے راج کنور کو اٹھا کر عقبی نشست پر بٹھایا۔ اس کے بازو کا پلاسٹر کھول دیا تھا اور اب صرف سلینگ بندھی ہوئی تھی البتہ ٹانگ پر گھٹنے کا پلاسٹر برقرار تھا۔ اسے بٹھا کر سیٹ بیلٹ سے جکڑ دیا تھا۔ بانو اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ وہ دنیا میں جس فرد سے سب سے زیادہ نفرت کر سکتی تھی وہ راج کنور ہی تھا۔ لیکن یہ ضروری تھا۔ مجھے آگے بیٹھنا تھا تاکہ سنکاری پر پوری نظر رکھ سکوں۔ وہ بانو سے چھپا کر کوئی حرکت کر سکتا تھا لیکن مجھ سے چھپانا مشکل تھا۔ اب ایک ہیڈ فون راج کنور کو بھی دے دیا گیا۔ سرحد پار کرانے کے لیے اسے اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ سنکاری نے پائلٹ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "اب کدھر جانے کا ہے؟"

"ہمیں امرتسر تک جانا ہے کیا چوپر کا ایندھن کافی ہوگا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی فیول کم ہے۔ لینا پڑے گا۔"

"ہم نے مشکل سے پندرہ منٹ کی پرواز کی ہے؟"

"ہاں پر یہ لو لیول اور لو کروز تھا اس میں فیول بہت خرچ ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے فیول کہاں سے لوگے؟"

"اپنے ائر کلب سے..." اس نے جواب دیا۔ "ادھر سستا پڑتا ہے۔"

"تم سستے کے چکر میں مت پڑو۔ وہاں تمہارے بہت سے جاننے والے ہوں گے بلا وجہ آ جائیں گے۔ کسی ایسی جگہ سے لو جہاں زیادہ لوگ نہ ہوں اور کام آسانی سے ہو جائے۔" میں نے کہا۔ "ادائیگی میں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے پھر ادھر ہوشیار پور سے لے سکتا ہے۔ ادھر کئی چھوٹا ائر فیلڈ ہے اور کوئی زیادہ بات بھی نہیں کرتا ہے۔"

میں نے نقشے پر پہلے ہوشیار پور دیکھا۔ یہ تقریباً روٹ کی سیدھ میں آتا تھا۔ جب کہ سنکاری امرتسر منزل سمجھ رہا تھا۔ ہمیں اس سے اوپر جانا تھا۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے ہوشیار پور ہی چلو مگر کوئی ہوشیاری مت دکھانا۔ تم بار بار گاڈ کہتا ہے اس کا مطلب ہے گاڈ پر اور اس کے بتائے ہیل پر یقین رکھتا ہے۔ غلط حرکت کر کے ہیل جانے کی کوشش مت کرنا۔"

اس نے پستول کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "اس کے ہوتے ہم کیا ہوشیاری دکھا سکتا ہے۔"

"بس ایک خیال رکھنا کہ تم نے زندہ رہنا ہے اور اپنا انعام حاصل کرنا ہے۔"

وہ چونکا۔ "انعام...؟"

میں نے جیب سے ہزار کے نوٹ والی گڈی نکالی۔ "یہ ایک لاکھ روپے ہیں، اگر تم نے ہمیں منزل پر پہنچا دیا تو یہ تمہارے ہوں گے معاوضے کے علاوہ۔"

پہلی بار وہ خوش نظر آیا۔ "ہم پہنچائے گا... کیوں نہیں پہنچائے گا۔"

سنکاری نے انجن اسٹارٹ کرنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں بعد ہیلی کاپٹر کے پنکھے گردش میں آ گئے تھے اور ایک منٹ سے بھی پہلے انہوں نے پوری طاقت پکڑ لی۔ سنکاری نے اسٹک کھینچی اور ہیلی کاپٹر ایک ہلکے سے دھچکے سے اوپر اٹھ گیا تھا۔ لوگ اپنی گاڑیوں سمیت پیچھے ہٹ گئے تھے۔ چند لمحوں میں ہم خاصی بلندی پر آ گئے تھے۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ "اس بار رفتار ہر ممکن تیز رکھنا۔"

"مجھے ٹرانسپونڈر آن کرنے دو، ورنہ چوپر کا آئی ڈی نہیں آئے گا ریڈار پر مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

میں نے سوچا اور سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے آن کر لو۔ مگر کیا یہ ضروری ہے؟"

"ہاں... تیزی کے لیے اوپر جانا ہوگا چھ ہزار فٹ کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

بلندی پر ادھر ائر ٹریفک کم ہوتا ہے اس لیے چوپر تیزی سے چلتا ہے۔"

مغرب کی طرف جاتے ہوئے بتدریج ہیلی کاپٹر کی بلندی بھی بڑھ رہی تھی۔ ہم ویسے ہی چار ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ میں سنکاری کا مطلب سمجھ گیا تھا کہ بلندی پر اڑنے کی وجہ سے ہم ریڈار پر نظر آتے اور اگر ہیلی کاپٹر کی طرف سے ایک مخصوص آئی ڈی نہیں ملتی تو ائر ٹریفک کنٹرولر کوئی کارروائی بھی کرسکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ انڈیا میں بے پناہ غربت کے باوجود ایک خاص طبقے میں دولت کی ریل پیل تقریباً مغرب جیسی ہوگئی تھی اور اب یہ طبقہ مغربی ارب پتیوں کے انداز میں زندگی گزار رہا تھا۔ بے انتہا عالی شان محلات، قیمتی گاڑیاں اور نجی ہیلی کاپٹر و طیاروں کا استعمال۔ شملہ جیسی چھوٹی جگہ پر کئی ائر کلب تھے اور ہر ائر کلب میں درجنوں طیارے اور ہیلی کاپٹرز موجود تھے۔ راج کنور جیسے لوگوں کے ذاتی ہیلی پیڈ تھے۔ اس لیے مجھے امید تھی کہ میدانی علاقوں میں بے شمار ہیلی کاپٹرز اور نجی طیارے ہمہ وقت محو پرواز رہتے ہوں گے۔ ایسے میں ہمارا ہیلی کاپٹر کسی خاص توجہ کا مستحق نہیں رہے گا۔ بشرطیکہ اس کا ٹرانسپونڈر آن رہے۔

چھ ہزار فٹ کی بلندی پر آنے کے بعد ہیلی کاپٹر کی رفتار تیز ہوگئی تھی۔ اب یہ تقریباً دو سو کلو میٹر فی گھنٹے کی رفتار سے اڑ رہا تھا۔ ہوشیار پور شملہ اور پاکستان کے تقریباً وسط میں تھا۔ مجھے ایک اطمینان اور ہوگیا۔ پہلے مجھے خلش تھی کہ میں سنکاری کو استعمال کروں گا اور اسے پاکستان تک لے جاؤں گا اور پھر اسے واپس جانا ہوگا۔ اس کے پاس ایندھن اتنا نہیں ہوتا اور ممکن ہے اسے راستے میں کریش لینڈنگ کرنا پڑتی اور ممکن ہے وہ مارا جاتا۔ اب ہوشیار پور سے پورا فیول ٹینک بھر لینے کے بعد وہ آرام سے واپس ہوشیار پور تک آسکتا تھا بشرطیکہ بھارتی دفاعی حکام اسے پکڑ نہ لیتے۔ راج کنور کی وجہ سے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ وہ شوٹ ڈاؤن کردیتے۔ مگر بعد میں یقیناً اس کی کم بختی آتی اور اسے تفتیش کے رگڑے سے گزرنا پڑتا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "ہم کتنی دیر میں ہوشیار پور پہنچ جائیں گے؟"

"اب آدھا گھنٹا لگے گا۔" اس نے کنٹرول پینل دیکھتے ہوئے کہا۔

میرا ارادہ تھا کہ ہوشیار پور میں جب سنکاری ایندھن لے رہا ہوگا تو راج کنور سے بات کروں گا۔ اس سے مکمل تفصیل لوں گا کہ وہ سرحد کس طرح پار کرتا ہے۔ اگر مجھے محسوس ہوگا کہ اس طرح کوئی خطرہ ہے تو پھر بھارتی حکام سے بات نہیں ہوگی۔ مجھے امید تھی جب تک ان کا ائر ڈیفنس سسٹم حرکت میں آئے گا ہم سرحد پار کر جائیں گے لیکن اس کے لیے راج کنور سے بات کرنا ضروری تھی۔ میں سیٹ پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ ڈھلان پر گرنے پڑنے کے دوران جسم پر لگنے والی چوٹیں اب دکھ رہی تھیں اور یوں آرام کرنے سے مزہ آرہا تھا۔ لیکن میری نظریں پوری طرح چوکس تھیں اور سنکاری کی ایک ایک حرکت پر نظر تھی۔ عقب میں بانو اور راج کنور بالکل خاموش بیٹھے تھے۔ بانو اس سے شدید نفرت کرتی تھی اور بہت مجبوری کے عالم میں اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی ایک بار میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ سیٹ کے انتہائی کونے میں راج کنور سے ممکنہ حد تک دور بیٹھی تھی۔ اسی لمحے اس نے راج کنور کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں نفرت چھلکی تھی۔ راج کنور اس سے بے خبر اپنی خیریت کے بارے میں فکر مند لگ رہا تھا اس نے مجھ سے کہا۔ "شہباز تم بہت خطرناک کام کرنے جارہے ہو۔"

سنکاری چونکا۔ "تم مسلم ہے پر تم نے تو....."

"میں نے غلط بتایا تھا۔" میں نے غرا کر کہا۔ "اپنا منہ بند کرکے اپنا کام کرو۔"

"تم سرحد پار نہیں کرسکو گے۔" راج کنور نے شر انگیزی جاری رکھی۔

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "بس اتنا یاد رکھو کہ اگر تم زندہ رہے تو اس کا مطلب ہے میں سرحد پار جاچکا ہوں دوسری صورت میں تمہارے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے، میں نے رامن سے غلط نہیں کہا تھا۔ اگر تم میری ضرورت نہ ہوتے تو میں تم دونوں کو ایک ساتھ ہی دنیا سے رخصت کرتا۔"

قتل و خون سے بھرپور یہ گفتگو سن کر سنکاری کے چہرے پر تشویش کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے مگر وہ پوچھنے کی ہمت نہیں کر پارہا تھا۔ راج کنور کو دوا دینے کا موقع ہی نہیں ملا تھا اور پھر میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس خیال نے بھی مجھے باز رکھا کہ کہیں وہ ٹن نہ ہوجائے اور بہ وقت ضرورت کسی کام کا نہ رہے۔ مگر اب وہ شرارت پر آمادہ تھا۔ فی الحال میں اسے چپ نہیں کراسکتا تھا اس لیے صبر سے کام لے رہا تھا مگر بانو سے صبر نہیں ہوسکا۔ اچانک وہ کراہا تو میں نے مڑ کر دیکھا۔ بانو نے پستول سے اس کے شانے پر

ضرب لگائی تھی۔ بانو اس سے کہہ رہی تھی۔ "اپنا منہ بند رکھ کتے..... اب آواز نکالی تو زبان کاٹ دوں گی۔"

وہ تکلیف کے باوجود خباثت سے باز نہیں آیا تھا۔ "کاٹ دو پھر میں بات کیسے کروں گا۔"

بانو نے دوسری ضرب لگائی۔ "وہ تمہارا باپ بھی کرے گا زبان میں بعد میں کاٹ سکتی ہوں اور زبان کیا میں تمہارے ٹکڑے ٹکڑے بھی کرسکتی ہوں مجھے پہلے والی بانو مت سمجھنا۔"

بانو کا یہ روپ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا جب وہ اپنے عشرت کدے میں اسے بھگت چکا تھا۔ بانو نے اس کا نشہ ہرن کردیا تھا۔ راج کنور خوفزدہ ہوگیا۔ "شہباز نے تمہیں زبان دی ہے؟"

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم جو چاہے بکواس کرتے رہو۔" میں نے کہا۔ "اگر عتاب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی کوشش کرو ورنہ تمہارے ساتھ یہی ہوتا رہے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں یہ آپ کی شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہا ہے۔ میں اسے کتے کی دم کی طرح سیدھا کردوں گی۔"

"حالانکہ کتے کی دم کبھی سیدھی نہیں ہوتی ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں کرسکتی ہوں۔" بانو نے دعویٰ کیا۔

سنکاری نے خدا کا شکر ادا کیا۔ "تھینک گاڈ میں نے کوئی غلط بات نہیں کیا، یہ چھوکری تو بہت ڈینجرس ہے۔ زبان کاٹ دیتا ہے۔"

ہیلی کاپٹر میں ذرا سکون ہوا تو مجھے رامن کا خیال آیا۔ اس نے بہت چالاکی سے کام لیا۔ مجھے باتوں میں لگایا اور پھر ایسا کام کیا کہ میں اس کے پیچھے نہ جاسکوں۔ وہ بہت تیز ذہن شخص تھا اس نے باتوں کے دوران طے کرلیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے دوا یا محلول کی شیشی توڑی اور اسے آگ دکھادی۔ پھر وہ ونڈ اسکرین کے راستے نکل گیا، اس طرح وہ میرے سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ جان بچانے کے لیے وہ تقریباً خودکشی کے انداز میں نیچے گیا تھا۔ مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ مارا جائے گا۔ اس جیسی ڈھیٹ ہڈی اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔ مگر مجھے بڑی حد تک امید تھی کہ وہ اوپر والوں سے رابطہ نہیں کرسکے گا۔ ہاں اگر اس نے کرلیا تو ہم مشکل میں پڑسکتے تھے۔ پھر بھی اس کا امکان بہت کم تھا۔ میں نے وقت گزاری کے لیے سنکاری سے پوچھا۔ "تمہاری فیملی ہے؟"

اس نے سر ہلایا اور اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھادی۔ ایک تقریباً سیاہ فام عورت ایک بچے کو گود میں اٹھائے مسکرا رہی تھی۔ اس کی اصل خوب صورتی اس کی ممتا تھی۔ بچے میں ماں باپ کی خصوصیات جھلک رہی تھیں مگر اس کے چہرے پر دلفریب معصومیت تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ "اچھی ہے۔"

"مجھ کو ریتا دیر سے ملا پر اب میں خوش ہے۔"

"تم خوش ہو اور دیسی ٹھرا پی کر اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو۔" میں نے ملامت کی تو وہ کھسیا گیا۔

"کیا کرے بارہ سال کی عمر سے منہ کو لگا ہوا ہے۔ فادر مر گیا تو ہم آزاد ہوگیا۔"

"اگر تم اسی طرح پیتے رہے تو تمہارا بیٹا تم سے بھی پہلے آزاد ہوجائے گا۔" میں نے اسے خبردار کیا تو وہ چپ ہوگیا۔ میرے خیال میں اتنی نصیحت کافی تھی۔ اس مشکل وقت میں میرا اسماج سدھار مہم چلانے کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔ اپنی بیوی بچے کی تصویر واپس جیب میں رکھ لی۔ میں نے گھڑی دیکھی پانچ بجنے میں دس منٹ تھے۔ سورج مغرب کی طرف آگیا تھا اور اس کی کرنیں اب سامنے سے پڑ رہی تھیں۔ ہیلی کاپٹر کا کیبن پریشرائز نہیں تھا اس لیے بلندی کی وجہ سے سردی لگ رہی تھی۔ لیکن میدانی علاقوں میں یقیناً شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ خاص طور سے پنجاب یقیناً دہک رہا ہوگا۔ میں نے اسلحے کی وجہ سے ہلکی جیکٹ لی ہوئی تھی کیونکہ صرف شرٹ تلے اتنا اسلحہ چھپانا ممکن نہیں تھا۔ سنکاری سے پردہ نہیں رہا تھا لیکن ہوشیار پور میں ایئر فیلڈ پر کسی کی نظر پڑ جاتی تو ہم مشکل میں پڑسکتے تھے۔ میں جیکٹ نہیں اتار سکتا تھا اور اس گرمی میں جیکٹ سے مشکوک ہوجاتا۔ بہرحال ضروری نہیں تھا کہ ایسا ہی ہوتا۔ میں ہیلی کاپٹر کے اندر رہتا اور بانو سنکاری کے ساتھ باہر جاتی یہ بات میں نے اسے بتا دی۔ اس نے اعتماد سے کہا۔ "آپ فکر نہ کریں میں ہینڈل کرلوں گی۔"

"ہم پہنچنے والے ہیں۔" سنکاری نے پانچ بجے اعلان کیا۔ "بس پانچ منٹ کا راستہ اور ہے اب ریڈیو آن کرکے اجازت لینا ہوگا۔"

"کیا فلائٹ پلان بتانا ہوگا؟"

"نہیں بس فیول کے لیے اترنا ہے اس کے لیے فلائٹ پلان بتانا ضروری نہیں ہوتا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"دوبارہ پرواز کے لیے بھی ضروری نہیں ہے؟"

"نہیں۔" سنکاری نے نفی میں سر ہلایا۔ اس دوران میں وہ ہیلی کاپٹر نیچے لارہا تھا۔ "صرف ٹیک آف کا بولنا ہوگا۔"

زمین اب واضح ہورہی تھی، پہاڑ تو شملے کے فوراً بعد ختم ہوگئے تھے۔ پھر کہیں جنگل کہیں کھیت اور کہیں آبادیاں نظر آنے لگی تھیں۔ شملہ اور ہوشیار پور ایک ہی عرض البلد پر ہیں لیکن بلندی اور پہاڑوں کی قربت سے دونوں کے موسم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس کا اندازہ مجھے ہیلی کاپٹر اترنے کے بعد ہوا تھا۔ وہاں شام کے وقت بھی خاصی گرمی تھی۔ کچھ دیر بعد ایئر فیلڈ نمایاں ہونے لگی تھی۔ سنکاری ریڈیو آن کرکے اترنے کی اجازت طلب کررہا تھا۔ اسے اجازت مل گئی اور کچھ دیر بعد ایک سرخ ریکٹ تھامے شخص ہیلی کاپٹر کو اشارہ کرنے لگا۔ وہ جگہ بتا رہا تھا جہاں ہیلی کاپٹر کو اترنا تھا۔ سنکاری مخصوص پوزیشن میں لانے لگا۔ چند لمحے بعد ہیلی کاپٹر نیچے اترنے لگا۔ میں نے راج کنور کو خبردار کیا۔ "کوئی احمقانہ حرکت مت کرنا تم پہلے ہی برے حالوں میں ہو۔ اگر مزید فریکچر زسے محفوظ رہنا ہے تو زبان بند کرکے بیٹھنا۔"

سنکاری سچ مچ بہت اچھا پائلٹ تھا۔ اس نے ہیلی کاپٹر یوں اتارا کہ پتا ہی نہیں چلا۔ جب انجن کی آواز مدہم ہوئی تو پتا چلا کہ ہم لینڈ کرگئے ہیں۔ انجن بند ہوتے ہی پنکھوں کی گردش کم ہوگئی تھی۔ سنکاری اپنی سیٹ بیلٹ کھولنے لگا۔ "ابھی فیول کے لیے جانا پڑے گا۔"

میں نے پوچھا۔ "فیول لینے میں کتنی دیر لگے گی؟"

"آدھا سے پون گھنٹا۔" اس نے جواب دیا۔ "مجھے اترنا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے تم بانو کے ساتھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ "یاد رکھنا یہ ہمارے لیے زندگی وموت کا مسئلہ ہے اگر کوئی ہمارے راستے میں آیا تو مارا جائے گا۔"

اس نے سر ہلایا اور نیچے اتر گیا۔ بانو بھی اتر گئی تھی۔ میں نے پلٹ کر راج کنور کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور تکلیف زدہ لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "شہباز تم بہت خطرناک کام کرنے جارہے ہو۔"

"اگر تم میرے بارے میں جانتے ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے میں نے اکثر کام بہت خطرناک کیے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ خطرناک جسے تم خطرناک سمجھ رہے ہو۔"

"شہباز پلیز میں بہت بڑی مشکل میں پھنس جاؤں گا۔" اس نے لجاہت سے کہا۔ "مجھ پر غداری کا کیس بن جائے گا۔"

"پھر تو تم معتبر ہوجاؤ گے۔" میں ہنسا۔ "غداری کا الزام تو اس خطے کی روایات میں شامل ہے۔ ویسے تمہارے پاس گن پوائنٹ کا جینوین عذر ہوگا۔"

"میری کوئی نہیں سنے گا اب مجھے بڑے کنور کی سپورٹ بھی حاصل نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"ممکن ہے اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ تم آتے جاتے رہتے تھے اور سمجھ لو ایک بار پھر جارہے ہو۔ اسی طرح واپس بھی آجاؤ گے۔"

"تم نہیں سمجھ رہے ہو، رامن اس کھیل کا ایک اہم مہرہ ہے اس کے بغیر میں سرحد پار نہیں کرسکتا ہوں اگر میں نے ایسا کیا تو فوراً گرفت میں آجاؤں گا۔"

"اگر تم گرفت میں آگئے تب بھی تمہارے پاس بچاؤ کے راستے ہوں گے۔ پاکستان انڈیا میں اوپری طبقے کو سزا دینے کی روایت نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے بڑا کنور ہی تمہیں بچالے گا۔"

میں صرف اسے قائل کرنے کے لیے اتنی بحث کررہا تھا اور اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس کے خدشات سرحد کے اس پار نہیں تھے بلکہ اس پار تھے یعنی اسے خطرہ تھا کہ میں ایک بار اسے پاکستان لے گیا تو واپس نہیں جانے دوں گا اور سچی بات ہے میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ میں اسے وہاں اتار لیتا اور پھر فیصلہ کرتا کہ اس کا کیا کرنا ہے۔ وہ مکاری سے یہاں کی بات کررہا تھا اور جانے سے بچنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں ٹھیک کہہ رہا تھا اگر وہ واپس آجاتا تو سزا سے بچ سکتا تھا۔ بڑا کنور بھی اپنا اثرورسوخ استعمال کرتا کیونکہ راج کنور کو سزا ہونے کی صورت میں ان کے خاندان کی بدنامی ہوتی۔ راج کنور کی مکاری کے جواب میں میں بھی مکاری سے کام لے رہا تھا اور اسے بہلا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "میری وجہ سے تمہیں ایک چانس ملے گا۔ رامن تمہیں تقریباً اغوا کرکے لے جارہا تھا اور اس کا بھی امکان تھا کہ وہ تمہیں شملہ کے پہاڑوں میں کہیں دفن کرکے بڑے کنور سے کہہ دیتا کہ شہباز تمہیں اغوا کرکے لے گیا ہے۔ بڑا کنور اس کی بات ماننے سے انکار کرسکتا تھا؟"

"نہیں۔" راج کنور نے اعتراف کیا۔ "وہ ایک طرح سے بڑے کنور کا کام کرتا کیونکہ بڑا کنور کھل کر میرے

خاتمے کا حکم نہیں دے سکتا ہے البتہ میں مرجاؤں تو اسے بہت خوشی ہوگی ایک مستقل بوجھ سے اس کی جان چھوٹ جائے گی۔"

"اس صورت میں واپسی کے بعد تم اپنی مرضی سے کہیں جانے کے لیے آزاد ہوگے۔"

"ہاں اگر میں واپس آسکا۔" راج کنور نے سرد آہ بھری۔ "اگر رامن نے اوپر والوں سے رابطہ کرلیا تو اس کے بعد سرحد پار کرنا تمہارا خواب بن جائے گا۔ اس سے پہلے ہی کوئی میزائل فضا میں اس ہیلی کاپٹر کے ٹکڑے کردے گا۔"

"میرا نہیں خیال کہ ائر ڈیفنس سسٹم اتنی تیزی سے حرکت میں آئے گا۔" میں نے تردید کی۔

"یہ تمہارا خیال ہے، انڈیا نے اپنا ڈیفنس بجٹ بہت بڑھا دیا ہے اور اس نے اپنا ایئر ڈیفنس سسٹم سب سے زیادہ اپ گریڈ کیا ہے کیونکہ ہمیں سب سے زیادہ خطرہ پاکستان کی فضائیہ اور اس کے میزائلوں سے ہے۔"

"حالانکہ انڈیا کی فضائیہ بھی ہم سے دوگنی بڑی ہے۔"

"ہاں لیکن ہمارے پاس زیادہ تر روسی ساختہ طیارے ہیں جب کہ پاکستان کے پاس مغربی طیارے بھی ہیں جو روس سے بہتر ٹیکنالوجی رکھتے ہیں۔"

ایک انڈین کے منہ سے یہ اعتراف سن کر مجھے خوشی ہوئی کہ ہماری فضائیہ انڈیا سے بہتر ہے اور انڈیا اس سے خوف کھاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ اپنی فضائی قوت میں تیزی سے اضافہ کررہا ہے جیسا کہ وہ بحری قوت میں پہلے ہی بہت زیادہ اضافہ کرچکا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "سرحد پار کرنے کا طریقۂ کار کیا ہے؟"

وہ ہچکچایا پھر اس نے کہا۔ "ہوشیار پور سے تو مجھے نہیں معلوم لیکن امرتسر سے پرواز کے بعد ہم سرحد سے پانچ کلومیٹرز پہلے صرف سو فٹ کی بلندی پر آجاتے ہیں۔ اس وقت پاکستانی ریڈار ہمیں ٹریک نہیں کرسکتا ہے۔ صرف انڈین ہماری موومنٹ سے واقف ہوں گے۔ سرحد پار کرنے سے پہلے فوجی حکام ریڈیو پر رابطہ کرتے ہیں اور انہیں مخصوص پاس ورڈ بتانا پڑتا ہے۔ تب گزرنے کی اجازت ملتی ہے۔"

"کیا یہ نشریات کہیں اور نہیں سنی جارہی ہوتی ہے؟"

"نہیں... فوجی ریڈیو مخصوص فریکوئنسی پر کام کرتا ہے۔"

"لیکن یہ عام ہیلی کاپٹر ہے۔ اس کا ریڈیو اس فریکوئنسی کو کیچ کرلے گا؟"

"ہاں جب میں پائلٹ کو مخصوص فریکوئنسی بتاؤں گا تو وہ رابطہ کرسکے گا بلکہ وہ صرف ٹیون کرے گا رابطہ حکام خود کریں گے۔"

"فرض کرو انہوں نے رابطہ نہ کیا تو اور تم نے پھر بھی سرحد پار کرنے کی کوشش کی تو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"کسی خفیہ میزائل بیٹری سے ایک میزائل نکلے گا اور اس ہیلی کاپٹر کے پرزے اڑجائیں گے۔"

میں دنگ رہ گیا۔ "بغیر کسی وارننگ کے؟"

اس نے سر ہلایا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "یہ ہائی سیکیورٹی زون ہے گزشتہ پانچ سال میں کم سے کم ایک درجن طیاروں اور ہیلی کاپٹرز کو اسی سسٹم نے ہٹ کیا ہے ان میں سے ایک یا دو پاکستانی بھی تھے جو غلطی سے سرحد پار کرگئے تھے۔ یہ آٹومیٹک سسٹم ہے جو پہلے سے دی ہوئی ہدایات کے مطابق کام کرتا ہے۔"

"یہ درندگی ہے.... کسی مہذب ملک میں ایسا نہیں کیا جاتا ہے۔ اگر کبھی اس سسٹم کو کوئی مسافر بردار طیارہ مشکوک لگا تو کیا اسے بھی ہٹ کردیا جائے گا؟"

راج کنور نے سر ہلایا۔ "ایک چھوٹا مسافر بردار طیارہ امرتسر ایئر پورٹ سے پرواز کے بعد نشانہ بنا تھا۔ وہ غلطی سے اوپر جاتے ہوئے ریڈ زون میں آگیا تھا۔ بعد میں اسے حادثہ قرار دے دیا گیا تھا۔"

"تم لوگ اتنی ڈھٹائی سے اپنی فاش غلطیوں پر پردے ڈالتے ہو۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "انسانی جانوں کی تم لوگوں کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں ہے؟"

"صرف ہم نہیں ساری دنیا میں ایسا ہوتا ہے۔ امریکا نے ایران کا طیارہ گرادیا۔ روس نے جنوبی کوریا کا طیارہ مار گرایا۔ کس نے اپنی غلطی تسلیم کی؟"

وہ درست کہہ رہا تھا ایسے ہی کئی پراسرار فضائی حادثے میرے ملک میں ہوچکے تھے اور ان کا کچھ نہیں پتا چلا تھا کہ ان کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ ایک مسافر بردار طیارہ تو سرے سے غائب تھا اور اس کا آج تک کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ راج کنور سے باتوں میں مجھے خیال آیا کہ وقت خاصا ہوگیا تھا اور ابھی تک نہ تو سنکاری اور بانو واپس آئے تھے اور نہ ہی ہیلی کاپٹر میں فیول بھرنے کے آثار دکھائی دیئے تھے۔ میں نے وقت دیکھا۔ پانچ بج کر پچیس منٹ ہورہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے یعنی سنکاری اور بانو کو گئے ہوئے بیس منٹ ہونے کو آئے تھے اور اتنی دیر میں انہیں واپس آجانا چاہیے تھا۔ اگر فیولنگ میں کچھ دیر تھی تب بھی وہ واپس تو آسکتے تھے۔ یہ کوئی بہت بڑا ایئر کلب نہیں تھا جہاں کہیں آنے جانے میں زیادہ وقت لگے جب کہ ایئر کلب کی عمارت بھی مشکل سے سو گز کے فاصلے پر تھی۔ راج کنور نے میرے چہرے سے بھانپ لیا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کوئی گڑبڑ ہے؟“

”ہاں لیکن تم اس گڑبڑ کا حصہ مت بننا۔“ میں نے اسے خبردار کیا اور نیچے اتر آیا۔ دروازے کے شیشے کے پیچھے سے راج کنور مجھے دیکھ رہا تھا وہ بھاگ نہیں سکتا تھا مگر کیا کہا جاسکتا ہے کہ جب انسان کی جان پر بنی ہو تو وہ کیا حرکت کر گزرے۔ کم سے کم وہ چیخ چلا کر مدد تو طلب کر سکتا تھا۔ یہاں قطار میں کئی ہیلی کاپٹر کھڑے تھے۔ چھوٹے طیارے ذرا فاصلے پر تھے۔ یہ چھوٹا ہی نجی یا سرکاری ایئر پورٹ تھا۔ خاموشی اور نہ ہونے کے برابر چہل پہل تھی۔ ایئر پورٹ کی عمارت اور دوسری تنصیبات ذرا فاصلے پر تھیں۔ جہاں تک نظر جاتی تھی سنکاری اور بانو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یہاں دھوپ تیز تھی اور شام کے وقت بھی اچھی خاصی تیز روشنی تھی۔ اس میں سب صاف نظر آرہا تھا ایک کونے میں دو افراد ایک چھوٹے طیارے کے انجن کے ساتھ لگے تھے۔ ایک سوئیپر جگہ جگہ اڑ کر آنے والے کاغذ کے ٹکڑے اور شاپرز جمع کر رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے خود جا کر دیکھنا ہوگا مگر سوال یہ تھا کہ میں راج کنور کو کس پر چھوڑ کر جاتا۔ وہ لازماً اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ اسے ساتھ لے جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ اسی لمحے مرکزی عمارت کے پیچھے سے بانو اور سنکاری دو افراد کے ساتھ نکلتے نظر آئے میں فوری طور پر ہیلی کاپٹر کی آڑ میں ہو گیا۔ بانو اور سنکاری آگے تھے اور وہ دونوں افراد پیچھے چل رہے تھے۔ نقوش اور رنگت سے مقامی نظر آنے والے یہ دو افراد چہرے سے جرائم پیشہ اور سفاک دکھائی دے رہے تھے اور ساتھ ہی بہت چوکنا تھے۔ ان کی نظریں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں اور وہ یوں بانو اور سنکاری کو آگے رکھے ہوئے تھے جیسے انہیں گن پوائنٹ پر لیا ہوا ہو۔ سنکاری کی حالت تو خراب تھی ہی بانو بھی بادل ناخواستہ چل رہی تھی۔

میں تشویش زدہ ہو گیا۔ یہ کیا چکر تھا؟ میرا ذہن رامن کی طرف گیا کہ کیا اس نے کوئی حرکت کی تھی؟ لیکن اس صورت میں یہاں فورس ہوتی۔ صرف دو افراد نہ ہوتے۔ وہ بھی اپنے انداز سے کسی فورس سے متعلق نہیں لگ رہے تھے۔ سنکاری خوفزدہ تھا۔ بانو کے ہاتھ خالی تھے شاید اس کا پستول چھین لیا گیا تھا۔ دونوں افراد نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی اور ان کے ہاتھ پتلونوں کی جیبوں میں تھے۔ جیبوں کے ابھار بتا رہے تھے کہ انہوں نے ہتھیار تھام رکھے تھے۔ جیسے جیسے وہ ہیلی کاپٹر کی طرف آرہے تھے میں نیم دائرے میں گھومتا ہوا ہیلی کاپٹر کے دوسری طرف جا رہا تھا پھر مجھے نہ صرف آڑ میں ہونا پڑا بلکہ برابر میں کھڑے ہیلی کاپٹر تک جانا پڑا۔ کیونکہ وہ ذرا اور آگے آتے تو لازمی مجھے دیکھ لیتے اور اس کے بعد مجھے کارروائی کرنا پڑتی تو یہاں ایک کھلی جنگ چھڑ جاتی اور فی الحال میں کسی جنگ کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس ہیلی کاپٹر کے شیشے سیاہ تھے۔ میں نے دروازہ چیک کیا اتفاق سے وہ کھلا تھا اور میں اندر گھس گیا۔ فوراً ہی وہ لوگ آپہنچے۔ اب انہوں نے اپنے ہتھیار نکال لیے تھے۔ ایک آدمی نے چھوٹے سائز کا بریف کیس اٹھا رکھا تھا۔ دونوں چالیس کے آس پاس تھے۔ رنگ سیاہی مائل اور چہرے پر جرم کی چھاپ تھی جسمانی طور پر مضبوط تھے اور ان کا پستول پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ انہیں استعمال کرنے میں ماہر تھے۔ انہوں نے آتے ہی ہیلی کاپٹر میں جھانکا اور دوسرے کو اطلاع دی۔ ”ادھر ایک ہی آدمی ہے۔“

دوسرے نے سنکاری کی گردن پکڑ لی۔ ”بول کہاں ہے تیری ماں کا یار؟“

یقیناً وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میری تشویش ایک بار پھر بڑھ گئی اگر وہ خاص طور سے میرے لیے آئے تھے تو یقیناً ان کے پیچھے اور لوگ بھی تھے۔ میں نے ہیلی کاپٹر کا دروازہ ذرا سا کھلا رکھا تھا اس لیے مجھے ساری آوازیں آرہی تھیں۔ سیاہ شیشوں کے پیچھے دیکھنا ان کے لیے ممکن نہیں رہا تھا البتہ مجھے وہ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ سنکاری نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ”میرے کو کیا معلوم وہ کدھر ہے۔ لڑکی سے پوچھو یہ اسی کا ساتھی ہے۔ میں تو گن کے آگے مجبور ہے۔“

”لڑکی وہ کہاں ہے؟“ دوسرے نے بانو کا ہاتھ پکڑا تو اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور بپھر کر بولی۔

”مجھے دوبارہ ہاتھ مت لگانا۔“

”اچھا بڑا جور ہے دیکھیں گے تیرا جور بھی۔“ اس کے انداز میں خباثت نمایاں تھی۔

”رگھو یہاں سے نکلو پولیس نہ آجائے۔ اس پر لعنت بھیجو۔“ دوسرے نے کہا۔ ”وہ لوگ پیچھے ہیں۔ ادھر آگئے تو ہم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“

”اس چھوکری کو بھی لے جانا ہے۔“ رگھو نے للچائے لہجے میں کہا۔ ”کیا چیز ہے یہ....؟“

جواباً چیز نے اس کے ساتھ جو کیا وہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ بانو نے اچانک گھوم کر اسے راؤنڈ کک ماری۔ اس کا نشانہ پستول والا ہاتھ تھا اور ضرب نے پستول اڑا دیا۔ وہ کمزور نہیں تھا مگر اچانک کیے جانے والے وار کے آگے مدافعت نہ کر سکا۔ دوسرا سنکاری کو چھوڑ کر مضطرب لہجے میں بولا۔ ”اے.... اسے گولی مار دوں گا۔“

”نہیں گرج۔“ رگھو بولا۔ ”اسے میں ٹھیک کروں گا اسے ساتھ....“

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ بانو کی کک اس بار اس کے منہ پر پڑی تھی اور اس لات نے اسے دن میں تارے دکھا دیے تھے۔ وہ پلٹ کر نیچے گرا۔ اس بار گرج نے فیصلہ کن انداز میں بانو کی طرف پستول سیدھا کیا لیکن اس سے پہلے وہ گولی چلاتا میرے سائلنسر لگے پستول سے شعلہ نکلا اور اس کی کھوپڑی میں اتر گیا۔ وہ اوندھے منہ گرا۔ میں نے کھوپڑی کا نشانہ ہی لیا تھا اسے ایک لمحے کی مہلت دینا بانو کی زندگی سے کھیلنے کے مترادف تھا۔ وہ سب ہیلی کاپٹر کی اس والی طرف تھے۔ گرج کے گرتے ہی رگھو بہت تیزی سے حرکت میں آیا تھا اس نے جھپٹ کر اپنا پستول اٹھایا اور اسے مہلت دینا کسی زہریلے سانپ کو مہلت دینے کے برابر تھا۔ میں نے اسے شوٹ کر دیا ایک گولی اس کی گردن پر لگی وہ نیچے گرا اور غرغراتا ہوا اٹھا تھا کہ دوسری گولی نے اسے ہمیشہ کے لیے لٹا دیا۔ یہ اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر لگی تھی۔ سنکاری یہ سب دہشت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور بانو مجھے تلاش کر رہی تھی۔ پہلے وہ نہیں دیکھ سکی تھی کہ میں کہاں تھا۔ پھر وہ ہیلی کاپٹر کی طرف دوڑی میں دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

”مجھے یقین تھا آپ کچھ کریں گے۔“ بانو نے میرا بازو تھام لیا۔ وہ بہت پرجوش ہو رہی تھی۔

”ہوش کرو ان کا کچھ کرنا ہے اس سے پہلے کہ کوئی یہاں آجائے اور ہم پکڑے جائیں۔“

سنکاری سکتے میں کھڑا تھا۔ مجھے فوری طور پر یہی خیال سوجھا کہ لاشوں کو سیاہ شیشے والے ہیلی کاپٹر میں ڈال دیا جائے۔ میں نے رگھو کو ٹانگوں سے پکڑ کر کھینچا اس کے سر سے زیادہ خون نہیں نکلا تھا اور اسے ہیلی کاپٹر میں ڈال دیا۔ البتہ منحوس گرج نے زمین خون خون کر دی تھی۔ اسے بھی اندر ڈال کر میں نے کسی ایسی چیز کی تلاش کی جس سے زمین کا خون صاف کیا جاسکے۔ اسی ہیلی کاپٹر سے ایک تولیہ نما کپڑا مل گیا اور اس نے خون خاصی حد تک صاف کر دیا تھا مگر فرش پر اب بھی سرخی موجود تھی۔ میں نے کچھ دور ایک واش روم سے تولیہ دوبارہ دھو کر باقی خون صاف کیا اب وہاں پر گہرے رنگ کا دھبا تھا جسے آئل بھی سمجھا جاسکتا تھا۔ شکر ہے اس دوران میں کوئی اس طرف نہیں آیا ویسے بھی شام کا وقت تھا اور رات کے وقت یہاں سے پرواز نہیں ہوتی تھی۔ پانچ بجے اکثر عملہ چھٹی کر کے چلا جاتا تھا۔ یہ سب سنکاری نے بتایا۔ بانو آس پاس اور ان دونوں کی نگرانی کر رہی تھی۔ میں نے خون صاف کر کے بانو سے پوچھا۔ ”یہ کیا چکر تھا تم لوگ فیول لینے گئے تھے اور ان کو لے آئے؟“

”یہ خود ہمارے سر ہو گئے تھے۔ ابھی سنکاری فیول کی بات کر رہا تھا کہ یہ دونوں آگئے اور غیر محسوس انداز میں ہمیں ہینڈز اپ کرا کے ایک طرف لے گئے۔ پھر وہ اس سے پوچھتے رہے۔“ بانو نے سنکاری کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے سب پھوٹ دیا۔“

”ہم کیا کرتا؟“ وہ بلبلا کر بولا۔ ”ادھر بھی ویپن ادھر بھی ویپن درمیان میں ہم۔“

”یہ لوگ کون ہو سکتے ہیں؟“ میں نے بریف کیس کا معائنہ کیا۔ رگھو کے ہاتھ سے گرنے کے بعد وہ فرش پر پڑا تھا اور کسی نے اس پر توجہ نہیں دی تھی میں نے اسے اٹھایا۔ یہ خاصا وزنی تھا۔ جیسے اس میں کوئی بھاری چیز ہو۔

”انداز سے تو مجرم لگ رہے تھے جو پولیس سے بھاگ رہے ہوں۔“ بانو نے کہا اور دلچسپی سے بریف کیس دیکھا۔

”اسے کھولیں؟“

میں نے کھولا اور حیران ہوا تھا۔ اس میں سلیقے سے تہ لگائی ہوئی پلاٹینیم کی اینٹیں رکھی تھیں۔ چند انچ سائز کی ان اینٹوں کا وزن ایک کے جی تھا اور بریف کیس میں ان کی تعداد سولہ تھی یعنی اس بریف کیس میں سولہ کلو گرام پلاٹینیم تھی۔ اس کی مالیت سونے سے دوگنی ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

فارس

پارس کی معرب شکل، جس کی اصل پرسا (Persa) ہے۔ اس کے شمال مغرب میں خوزستان، شمال مشرق میں اصفہان، مشرق میں کرمان، مغرب میں خلیج فارس ہے۔ یہ صوبہ آٹھ اضلاع میں منقسم ہے۔ شیراز، بوشہر، لار، فسا، کازرون جہرم، فیروز آباد اور آبادہ۔ موجودہ آبادی تقریباً سولہ لاکھ اور مجموعی رقبہ تقریباً دو لاکھ کلومیٹر ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے، جہاں سے کوروش اعظم (559 تا۔530 ق م) نے اپنی ان عظیم الشان فتوحات کا آغاز کیا، جو قدیم دنیا کی عظیم ترین سلطنت کے قیام پر منتج ہوئیں۔ دو صدیوں کے بعد سکندر اعظم نے پارس کو بقیہ ایران کے ساتھ تاخت وتاراج کیا۔ کوروش اعظم کی طرح ساسان کا پوتا اور بابک کا بیٹا اردشیر پارس کا رہنے والا تھا اور 228ء میں وہاں سریر آرائے سلطنت ہوا۔ ساسانیوں کے عہد میں پارس پانچ اضلاع میں منقسم تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں مسلمانوں نے پہلی بار فارس کی تسخیر کی کوشش کی۔ رے شہر کے نزدیک عثمان ابن ابی العاص اور اس کے سپاہی ساسانی افواج کے خلاف بہت بے جگری سے لڑے۔ آخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ ساتھ ہی عربوں کی دوسری فوج حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی سپہ سالاری میں بصرے سے روانہ ہو کر مغرب کی طرف فارس پر حملہ آور ہوئی۔ دونوں سپہ سالاروں کے لشکر ایک جگہ آکر مل گئے اور انہوں نے فارس کے اندرونی علاقے میں پیش قدمی کر کے شیراز پر قبضہ کرلیا۔ بعد میں داراب گرد، فسا، شاہ پور اور فیروز آباد پر بھی تسلط ہوگیا اور اس طرح اس کی تسخیر مکمل ہوئی۔ شروع میں خراج تین کروڑ تیس لاکھ درہم مقرر ہوا۔ بعدازاں المتوکل کے زمانے میں اسے بڑھا کر تین کروڑ پچاس لاکھ کردیا گیا۔ جزیے سے سرکاری خزانے کو ایک کروڑ اسی لاکھ درہم کی آمدنی ہوتی تھی۔ نویں صدی عیسوی میں خلافت کے دینوی اقتدار میں ضعف آیا تو فارس صفاری خاندان کے بانی یعقوب بن لیث کے قبضے میں آگیا، اس نے شیراز کو اپنا دارالحکومت قرار دیا، جہاں اس کے بھائی عمرو بن لیث نے جامع مسجد تعمیر کرائی۔ بعدازاں آل بویہ نے فارس پر قبضہ کرلیا۔ بنو بویہ کے بعد سلجوقی فارس کے حکمران ہوئے۔ مظفری خاندان کے بانی مبارز الدین محمد نے 1353ھ میں فارس کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ صفوی خاندان کے اولین حکمران شاہ اسماعیل اول نے 1503ء میں فارس کو اپنے دائرہ اختیار میں شامل کرلیا۔ شاہ عباس اول کے عہد میں فارس کے حاکم اعلیٰ امام قلی خان نے تقریباً شاہانہ شان وشوکت سے شیراز میں حکومت کی۔ شیراز کو فارس کے دوسرے شہروں کی طرح نادر شاہ کی سرکردگی میں ایرانی افواج اور غلزئی افغانوں کی جنگ میں بڑے مصائب برداشت کرنا پڑے۔ غلزئی افغانوں کی کمان اشرف کررہا تھا۔ جنگ کا خاتمہ 1730ء میں غلزئیوں کی شکست فاش کی صورت میں ہوا۔ 1747ء میں نادر شاہ کے قتل کے بعد شورشوں کے نتیجے میں فارس کو دوبارہ تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن نیک خصلت کریم خاں رند کے اقتدار سنبھالنے پر جس نے شیراز کو اپنا صدر مقام قرار دیا تھا ملک میں جلد ہی امن وامان اور خوشحالی کا دور بحال ہوگیا۔

مرسلہ: نیاز احمد ساہیوال

یہ کم سے کم بیس لاکھ ڈالرز مالیت کی تھی۔ میں نے بانو کو بتایا تو وہ حیران ہوئی۔ یہ قیمتی دھات اس کے لیے اجنبی نہیں تھی۔ وہ ممتاز ہاؤس میں پلی بڑھی تھی جہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ یہ جرائم پیشہ نہ جانے کہاں سے یہ بریف کیس لے کر آئے تھے اور پولیس سے بچنے کے لیے فضائی راستے سے نکل جانا چاہتے تھے۔ بانو اور سنکاری کو یرغمال بنانے کا مقصد بھی یہی ہو سکتا تھا۔ میں نے صفائی کی زحمت اسی لیے کی تھی کہ ابھی یہاں فیول ٹینکر آنا تھا اور ممکن ہے اس دوران میں کوئی اور بھی آجاتا مگر اب میں محسوس کر رہا تھا کہ یہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ ”ہمیں کہیں اور سے فیول لینا ہوگا۔ آس پاس کوئی اور جگہ ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”دوسرا ایئر کلب یہاں سے کچھ ہی دور ہے۔“

”تو بس وہاں چلو..... یہاں ان کے اور ساتھی ہوئے تو ہم مصیبت میں پڑ جائیں گے۔“

سنکاری کی حالت خراب تھی وہ خود بھی یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس نے پہلے قتل وخون کہاں دیکھا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش شروع کی تو میں نے اسے ٹوک دیا۔ ”پہلے کنٹرول والوں سے اجازت لو۔“

اس نے سر ہلایا اور خود پر قابو پاتے ہوئے کنٹرول سے رابطہ کرنے لگا۔ اس نے پرواز کی اطلاع دی اور اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک بوتل نکال کر منہ سے لگانے لگا تھا کہ میں نے اس سے بوتل چھین لی۔ ”یہ کیا حرکت ہے تم پی کر ہیلی کاپٹر اڑاؤ گے۔“

”اپنے کو اس کی ضرورت ہے۔“ وہ کانپتی آواز میں بولا۔ ”اس کے بغیر فلائٹ نہیں کر سکے گا۔“

خلاف توقع بانو نے اس کی تائید کی۔ ”شوبی اسے دے دیں، یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسے ضرورت ہے۔“

بادل ناخواستہ میں نے بوتل اسے واپس کر دی۔ یہ ذرا بہتر قسم کی شراب تھی۔ تیز والا دیسی ٹھرا نہیں تھا جو اسے ٹن کر دیتا ویسے ٹن وہ دیسی ٹھرا پیتے ہوئے بھی نظر نہیں آیا تھا جب میں نے اسے ہائر کرنے کے لیے اس سے بات کی تھی۔ چند گھونٹ لے کر وہ پُرسکون نظر آنے لگا اس نے بوتل بند کر کے واپس سیٹ کے نیچے خانے میں رکھی اور پھر انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اسی لمحے چند افراد اسی طرف آتے دکھائی دیے۔ وہ ذرا پھیلے ہوئے اور یوں آس پاس دیکھ رہے تھے جیسے انہیں کسی کی تلاش ہو۔ ان کے ہاتھ اپنی جیبوں میں تھے۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا۔ ”سنکاری جلدی کرو..... میرا خیال ہے ان کے ساتھی آگئے ہیں۔“

سنکاری نے انجن کو اسپیڈ دی اور یک لخت پنکھوں کی رفتار میں تیزی آئی لیکن یہ ابھی اتنے تیز نہیں ہوئے تھے کہ ہیلی کاپٹر اڑ سکتا۔ آنے والے تین افراد تھے۔ ہیلی

کاپٹر کے انجن کی آواز نے انہیں چونکایا اور اب وہ دوڑتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے۔ انہوں نے ہتھیار نکال لیے تھے اگر وہ پاس آجاتے تو خطرہ بن سکتے تھے۔ میں نے پستول نکالا اور دروازہ کھولتے ہوئے سنکاری سے کہا۔ ”جلدی کرو.....“

میں نے اچانک فائرنگ کی تو وہ بھڑک کر منتشر ہو گئے اور دوسرے ہیلی کاپٹرز کی آڑ میں چھپنے لگے۔ اسی لمحے ہیلی کاپٹر ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ اگر میں نے سیٹ تلے پاؤں نہ پھنسا رکھا ہوتا تو میں باہر گرتا۔ پھر بھی میرا جسم جھٹکے سے باہر گیا۔ بانو نے چیخ ماری اور آگے ہو کر میرا بازو پکڑ کر اندر کھینچنے لگی۔ اس کی مدد سے میں اندر آگیا۔ اس وقت تک ہیلی کاپٹر زمین سے کوئی دس بارہ فٹ اوپر آچکا تھا۔ وہ لوگ دوبارہ آرہے تھے اور اب ہیلی کاپٹر کا نشانہ لے کر فائرنگ کر رہے تھے۔ یہ بہت خطرناک تھا۔ ہیلی کاپٹر کوئی پرندہ نہیں ہوتا ہے اس کا سائز کسی درمیانے ٹرک کے برابر تھا اور کسی حساس حصے پر گولی لگنے کی صورت میں وہ تباہ ہو سکتا تھا۔ دس بارہ فٹ کے فاصلے سے اسے نشانہ بنانا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ میں اوپر سے اکیلا فائرنگ کر کے انہیں نہیں روک سکتا تھا۔ وہ پھیلے ہوئے تھے۔ اسی لمحے ایک خیال الہام کی طرح نازل ہوا اور میں نے بریف کیس اٹھا کر کھولتے ہوئے اسے ہیلی کاپٹر کے باہر اچھال دیا۔ وہ ہوا میں گیا اور اس میں موجود پلاٹینم کی اینٹیں بکھر کر تارمک پر گریں۔ نتیجہ حسب منشا نکلا وہ لوگ فائرنگ بھول گئے اور اینٹوں کی طرف جھپٹے اور جلدی جلدی انہیں سمیٹنے لگے۔

”تھینک گاڈ۔“ سنکاری کانپتے لہجے میں بولا۔ ”ابھی کوئی گولی فیول ٹینک پر لگتا اور ہم سب مارا جاتا۔ چوپر کا فیول بہت تیزی سے برن کرتا ہے۔“

جب تک وہ لوگ دوبارہ ہیلی کاپٹر کی طرف متوجہ ہوتے ہم فائرنگ کی حد سے نکل آئے تھے۔ عقب سے بانو نے داد دی۔ ”واہ کیا ترکیب کی آپ نے..... اگر ان کتوں کے آگے ہڈی نہ ڈالتے تو کاٹ ہی لیتے۔“

”بالکل درست فرمایا تم نے۔“ میں نے پستول کا میگزین بدلتے ہوئے کہا۔

سنکاری نے تائید کی۔ ”آپ نے ہم سب کو بچالیا۔“

”نہیں بچانے والی اللہ کی ذات ہے۔ اسی نے عقل دی اور میں نے اسے استعمال کیا۔“ میں نے جواب دیا اور نیچے دیکھا۔ ہم زمین سے خاصا اوپر آگئے تھے۔ سنکاری نے ہیلی کاپٹر کو اب ایک طرف موڑ دیا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ جو شوٹ آؤٹ ہوا ہے اس کی اطلاع پر پولیس ہمیں تلاش نہیں کرے گی۔“

”ہمارا اس سے کیا تعلق ہے۔“ سنکاری نے جواب دیا۔ ”ہم کچھ دیر اترا دوبارہ فلائی کر گیا۔“

”مطلب یہ کہ اگر تلاش کیا تو دوسرے ائر کلب تک تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں آجائے گی؟"

"اسے کیا پتا ہم کدھر گیا ہے۔" سنکاری نے کہا اور دوبارہ ہیلی کاپٹر نیچے کرنے لگا۔ جب ہم اس دوسری ائر فیلڈ پر اترے تو پونے چھ بج رہے تھے۔ اس بار بھی بانو سنکاری کے ساتھ گئی۔ راج کنور خاموش بیٹھا تھا اس نے پہلی بار زبان کھولی۔

"اگر وہ لاشیں دریافت ہوگئیں تو تم مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"جب تک پولیس جائے وقوع پر آئے گی میں سرحد پار کر چکا ہوں گا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "یہ امریکا یا یورپ نہیں ہے جہاں پولیس دس منٹ میں پہنچ جائے۔ دس منٹ تو اسے کرسی سے اٹھنے میں لگتے ہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ ائیرپورٹ کا معاملہ ہے۔"

"تم فکر مت کرو تمہاری دلی آرزو پوری نہیں ہو گی۔" میں نے کہا اور بیگ سے لیپ ٹاپ اور یو ایس بی نکالی۔ میں ہیلی کاپٹر سے باہر نکل آیا تھا تاکہ راج کنور میری گفتگو نہ سن سکے۔ توقع کے عین مطابق یہاں سگنل تھے۔ یہ یو ایس بی انڈیا کی حد میں کہیں بھی استعمال کی جاسکتی تھی۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔

"تم لوگ کہاں ہو؟"

"اپنی جگہ پہنچ گئے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "پلان کے مطابق سب نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی ہے۔"

"میں آرہا ہوں۔ شاید سات کے آس پاس میں وہاں پہنچ جاؤں۔ جی پی ایس لوکیشن بتاؤ۔"

عبداللہ نے جی پی ایس کی ریڈنگ بتائی جو میں نے موبائل میں محفوظ کرلی۔ عبداللہ نے ڈھکے چھپے انداز میں پوچھا۔ "مسئلہ حل ہوگیا؟"

"ہاں ایک شاندار ایڈونچر کے بعد عزت مآب راج کنور صاحب دوبارہ میری کشتی میں ہیں۔"

"ہم ان کے استقبال کے لیے بیتاب ہیں نادر کے ساتھ والا کمرا ان کے لیے مخصوص ہوگا۔"

"بس میں نے یہی اطلاع دینی تھی۔" میں نے کہا اور کال کاٹ کر واپس ہیلی کاپٹر میں آگیا کیونکہ یہاں رن وے پر خاصی چہل پہل تھی۔ میں غیر ضروری طور پر کسی کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ اس بار میں نے سویرا کا نمبر ملایا۔ وہ موبائل ہر وقت ساتھ رکھنے لگی تھی کہ نہ جانے کب میری کال آجائے۔ مگر اس نے ذرا تاخیر سے کال وصول کی۔ وہ پھولی سانسوں کے درمیان بولی۔

"آپ.... آپ ہیں نا؟"

"ہاں میری جان میں ہوں۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"آپ کہاں ہیں میرا دل بہت گھبرا رہا ہے آپ کب واپس آئیں گے؟" سویرا کی آواز بھرا گئی۔

"بس میں آرہا ہوں کچھ دیر بعد اپنے ملک میں ہوں گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن سویرا میں دشمنوں کے درمیان میں ہوں۔ پتا نہیں اللہ نے میرے لیے کیا لکھا ہے۔"

"ایسا نہ کہیں۔" وہ رو دی۔ "میں آپ کے لیے بہت دعا کررہی ہوں آپ ضرور آئیں گے۔"

"مجھے بھی یہی امید ہے لیکن سویرا بعض اوقات انسان جیسا سوچتا ہے ویسا نہیں ہوتا ہے اس لیے میں نے سوچا تم سے بات کرلوں۔"

اس بار وہ جذباتی نہیں ہوئی اور اس نے خود کو سنبھال لیا۔ "شہباز میرا دل کہتا ہے آپ کو کچھ نہیں ہوگا آپ کامیاب واپس آئیں گے۔ پھر آپ میرے ہوں گے۔"

"ہاں میری زندگی۔" میں نے گہری سانس لی۔ "سویرا میرے لیے دعا کرنا میرے لیے آنے والی مشکل آسان ہو۔"

راج کنور پیچھے بیٹھا میری بات سن رہا تھا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی اس وقت تو میں ہجوم میں بھی اکیلا ہوتا۔ سویرا حوصلہ کرتے کرتے بکھر جاتی اور میں اسے پیار سے سمیٹتا پھر وہ مجتمع ہو جاتی تو میں بکھرنے لگتا۔ وہ مجھے سمیٹتی۔ اس نے بتایا کہ وہ موبائل کو سائلنس پر کر کے اپنے وجود سے لگا کر رکھتی ہے کیونکہ اس نمبر پر صرف میں کال کرتا ہوں اس لیے وہ ایک لمحے کو بھی موبائل خود سے جدا نہیں کرتی ہے۔ اس نے بتایا نہیں کہ موبائل کہاں رکھتی ہے لیکن میں سمجھ گیا تھا۔ ابھی موبائل وائبریٹ ہوا تو وہ ماں جی اور آپا صغراں کے ساتھ بیٹھی تھی جلدی سے بہانہ کر کے وہاں سے اٹھ گئی۔ میں نے شمی، سعدیہ اور مونا کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ حویلی سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ بابا نے جو نیا باغ بنایا تھا وہاں تھیں۔ جب سے موسم گرم ہوا تھا وہ اکثر شام کے وقت حویلی کے صحن یا باغ میں چلی جاتی تھیں۔

جس وقت میں بات کر رہا تھا ایک فیول ٹینکر ہیلی کاپٹر تک آیا اور اس میں فیول بھرنے لگا۔ سنکاری اور بانو کچھ دیر بعد آئے لیکن وہ باہر ہی رہے۔ سنکاری معائنہ کرتا رہا کہ فیول کتنا جارہا ہے۔ بانو اس کی نگرانی کرتی رہی۔ اگرچہ سنکاری نے اب تک کوئی غلط حرکت نہیں کی تھی مگر بانو اس کی نگرانی میں ذرا بھی غفلت نہیں برت رہی تھی شاید اس وجہ سے بھی وہ اب تک راہ راست پر تھا۔ تقریباً بیس منٹ فیول بھرتا رہا اور میں نے ان بیس منٹوں کے ایک ایک سیکنڈ سے فائدہ اٹھایا۔ سویرا کی آواز اور اس کے جذبات اپنی سماعتوں میں محفوظ کرتا رہا۔ بالآخر مجھے کال ختم کرنا پڑی کیونکہ فیول بھر گیا تھا اور سنکاری ادائیگی کر کے ہیلی کاپٹر میں آگیا۔ میں نے اسے بیس ہزار دیے تھے اس کے بعد اسے کوئی رقم نہیں دی تھی۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا معاوضہ اسے دے دوں۔ میں نے ایک لاکھ بھارتی روپیا اسے دینا چاہا تو اس نے بے پروائی سے کہا۔

"ابھی نہیں، بچ گیا تو لوں گا ورنہ ابھی کیا فائدہ؟"

"سنکاری مجھے اپنا پتا بتاؤ، اگر ہم نہ بچ سکے تو بھی تمہارے گھر اتنی رقم پہنچ جائے گی کہ تمہاری بیوی کچھ عرصے آرام سے گزارا کرسکے اس میں یہ رقم بھی شامل ہوگی۔"

وہ ہچکچایا لیکن پھر اپنا پتا بتا دیا۔ میں نے عبداللہ کو کال کی۔ اسے پتا نوٹ کرایا اور کہا کہ اگر ہم سرحد پار نہ آسکیں اور مارے جائیں تو وہ پائلٹ کے گھر پانچ لاکھ بھارتی روپے کی رقم پہنچائے گا۔ عبداللہ پریشان ہوگیا۔

"خدا نہ کرے کہ ایسی کوئی بات ہو۔ لیکن میں نے سب نوٹ کرلیا ہے۔"

"بس یہی کہنا تھا کہ ہم یہاں سے نکلنے والے ہیں۔"

"اللہ آپ کو حفظ و امان میں رکھے۔" عبداللہ نے دعا کی۔

"آمین۔" میں نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی اور سنکاری کو ہیلی کاپٹر بلند کرنے کو کہا۔ وہ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جوابی نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے ہچکچا کر کہا۔

"میں اب تک نہیں سمجھ سکا آپ کیسا آدمی ہے۔ ہم کو کڈنیپ کر کے لایا۔ ادھر دو بندہ کتے کی طرح مار دیا اور اب میرا بیوی بچہ کا خیال کر رہا ہے۔"

"تم اس چکر میں مت پڑو روانہ ہو جاؤ کیونکہ وقت کم ہے۔ سمجھ لو آج تمہاری صلاحیتوں کا امتحان ہے، یہ بتاؤ ہیلی کاپٹر میں جی پی ایس ہے؟"

"بالکل ہے اس کے بغیر اب کوئی مشین فلائی نہیں کر سکتی ہے۔" اس نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے موبائل پر جی پی ایس لوکیشن دکھائی۔

"ہمیں یہاں جانا ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "آپ کو بالکل اسی جگہ لے جائے گا۔"

ہیلی کاپٹر ایک دھچکے سے اوپر اٹھا تو میں خاص قسم کی سنسنی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ اس سارے منصوبے کا اہم ترین مرحلہ آگیا تھا۔ ایک گھنٹے سے بھی پہلے ہم سرحد پار ہو جاتے یا زندگی کی سرحد پار کر جاتے۔ "کتنا وقت لگے گا؟"

"تقریباً پون سے ایک گھنٹا۔" سنکاری نے جواب دیا۔ وہ انسٹرومینٹل پینل کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے ایک ایک چیز چیک کر رہا ہو۔ ظاہر ہے اس کے لیے بھی یہ اہم ترین پرواز تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ امرتسر کے بعد بلندی پانچ سو فٹ سے کم کرنی ہے اور سرحد کے پاس سو فٹ سے کم۔ وہ چونکا۔ "اتنی کم بلندی کیوں؟"

"اس بلندی پر مین پورٹیبل میزائل بیکار ہو جاتے ہیں۔" میرے بجائے راج کنور نے جواب دیا۔ "وہ حدت پر لپکتے ہیں اور کم بلندی کی وجہ سے زمین کی حدت ان کے سینسر کو ناکارہ کر دیتی ہے۔ صرف بہت جدید میزائل دھوکا نہیں کھاتے ہیں لیکن وہ پاکستان کے پاس نہیں ہیں۔"

میں نے اسے یاد دلایا۔ "ابھی پچھلی جنگ میں پاکستان نے ایسے ہی میزائلوں سے دو بھارتی جنگی طیارے مار گرائے تھے۔"

"وہ طیارے تھے، اتنی کم بلندی پر پرواز نہیں کر سکتے ہیں اور پھر وہ مقام بھی پہاڑی تھا۔ یہ میدان ہے اور ہم ہیلی

فاطمہؓ بنت اسد

نام فاطمہؓ، اسد بن ہاشم کی دختر اور رسول اکرمؐ کے جدِ امجد جناب عبدالمطلب کی بھتیجی۔ آپ کا نکاح عبدالمطلب کے فرزند ابوطالب سے ہوا، جن سے حضرت علیؓ پیدا ہوئے۔ اس نسبت سے حضرت فاطمہ الزہرا کی خوشدامن تھیں۔ مسلمانوں نے مکہ سے مدینے کی طرف ہجرت کی تو آپ بھی ان کے ہمراہ تشریف لے گئیں۔ ان کی وفات رسول اللہؐ کی زندگی ہی میں ہوگئی تھی۔

مرسلہ: نعمان قادری، لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

کاپٹر میں ہیں۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" سنکاری نے راج کنور کی تائید کی۔ "میں پچاس فٹ کی بلندی پر بھی اڑا سکتا ہوں۔"

"انڈیا کے پاس ایسے میزائل ہیں وہ دس فٹ کی بلندی پر اڑتے ہیلی کاپٹر کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں۔" راج کنور نے انکشاف کیا تو سنکاری گھبرا گیا۔

"پھر تو ہم مارا جائے گا۔"

"تم فکر مت کرو یہ انڈین حکام سے اجازت لے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"ممکن ہے اجازت نہ ملے۔" راج کنور نے کہا۔

"اس صورت میں تم بھی ہمارے ساتھ مرو گے۔" میں نے اسے گھورا۔

"یہ ہر صورت مرے گا۔" بانو نے نفرت سے کہا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" راج کنور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "میں تم سے تعاون کروں یا نہ کروں موت میرا مقدر ہے۔"

"ایسا نہیں ہے ممکن ہے تم بچ جاؤ۔" میں نے بانو کو گھورا۔ "یہ جذباتی ہو رہی ہے۔"

"میں اسی معمولی سی اُمید پر چانس لے رہا ہوں میں تم سے تعاون کروں گا تو شاید میں بچ جاؤں۔" راج کنور نے ہیلی کاپٹر کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ "ورنہ مجھے امید نہیں ہے کہ میں بچ سکوں گا۔"

ہیلی کاپٹر چھ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گیا تھا اور اب دوبارہ سردی لگنے لگی تھی جب کہ نیچے گرمی سے برا حال تھا۔ جب تک ہیلی کاپٹر رکا رہا ہم پسینے میں نہائے رہے تھے۔ مگر حالات کی گرمی نے ماحول کی گرمی کو محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ رفتار ایک سو اسّی کلومیٹرز فی گھنٹا تھی۔ میں نے کہا۔ "رفتار تیز نہیں ہو سکتی ہے؟"

"فیول فل ہے اور میدانی جگہ پر ہوا بھی تھک ہوتی ہے اس لیے رفتار کم ہے۔ ابھی فیول کم ہو جائے گا چوپر ہلکا ہوئے گا تو رفتار بڑھے گا پر تب تک تو ہم امرتسر پہنچ جائے گا۔"

سویرا سے بات کر کے دل کچھ بوجھل سا تھا۔ میں بغیر کسی جذبے کے میکانکی انداز میں حرکت میں تھا۔ سیٹ سے پشت ٹکا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر پہلے ہونے والا واقعہ اہم تھا اور ہم بچ گئے تھے لیکن اس کی اہمیت آنے والے وقت کی اہمیت کے سامنے دب گئی تھی۔ نہ جانے کیا قسمت تھی جہاں جاتا ہوں وہاں کوئی نہ کوئی چکر شروع ہو جاتا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ جب کچھ نہ ہو اور وقت خیر خیریت کے ساتھ گزر جائے۔ بریف کیس میں موجود دو ملین ڈالرز کا پلاٹینیم بتا رہا تھا کہ وہ لوگ کوئی بڑا ہاتھ مار کر آ رہے تھے۔ شاید پولیس نے ناکا بندی کی ہوئی تھی اس لیے انہوں نے اس نجی ایئر کلب سے ہیلی کاپٹر یا طیارہ ہائی جیک کر کے نکلنے کا سوچا تھا۔ بدقسمتی سے وہ سنکاری کا انتخاب کر بیٹھے جو پہلے ہی ہمارے ہاتھوں یرغمال بنا ہوا تھا۔ شاید بانو کو دیکھ کر بھی ان کی نیت خراب ہوئی تھی۔ وہ فرار کے ساتھ ساتھ اس کے چکر میں بھی پڑ گئے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ آنے والے دونوں افراد فرار کے لیے بے چین تھے تو پھر وہ کون تھے؟ جو ان کے پیچھے آئے تھے۔ اگر وہ ان کے ساتھی تھے تو ان کو بھی لے کر جانا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں تھا اس کا امکان تھا کہ وہ دوست کے بجائے وہی لوگ ہوں جن سے وہ یہ خزانہ حاصل کر کے فرار ہوئے تھے اور وہ پیچھا کرتے عین اس وقت ایئر فیلڈ پہنچ گئے جب ہم روانہ ہو رہے تھے اور وہ سمجھے کہ ہیلی کاپٹر میں رکھو اور گرج ہیں۔ شکر ہے ان کی کوشش کے باوجود ہیلی کاپٹر کو کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اگر کوئی گولی لگی بھی تھی تو اس نے نقصان نہیں کیا تھا۔ اب امکان یہ تھا کہ انہوں نے ایئر کلب پر جو شوٹنگ کی تھی اس کے بعد ہیلی کاپٹر سے ملنے والی لاشیں بھی ان کے سر ماری جائیں گی اگر پکڑے گئے تو کیس پکا ہو گا ورنہ پولیس تلاش کرے گی۔ میں نے راج کنور سے پوچھا۔

"رابطہ کب کرنا ہے؟"

"امرتسر کے بعد۔" اس نے جواب دیا۔ "بلندی لازمی کم کر لیتا ورنہ نارمل فوجی ریڈار ہیلی کاپٹر کو ٹریک کر لے گا اور وارننگ مل جائے گی کہ ریڈ زون سے دور رہا جائے۔"

میں نے سنکاری سے کہا۔ "اب اس معاملے میں تم خود اس سے بات کرو یہ تمہیں مخصوص ریڈیو فریکوئنسی بھی بتائے گا جس سے رابطہ کیا جائے گا۔"

سنکاری اس سے بات کرنے لگا۔ راج کنور اسے بتا رہا تھا کہ سرحد پار کرنے کا طریقہ کار کیا ہے۔ سنکاری سن رہا تھا اور اپنی تسکی کے لیے اس سے سوال بھی کر رہا تھا۔ ہیڈ فون کی وجہ سے ہم بہ آسانی ایک دوسرے سے بات کر رہے تھے ورنہ ہیلی کاپٹر کے شور میں گلا پھاڑ کر بات کرنا پڑتی اور دوسرے کو شاید پھر بھی سنائی نہ دیتا۔ چلاتا تو اب بھی پڑ رہا تھا

لیکن بہر حال بات کی جا سکتی تھی۔ اس کا مائک خاص نوعیت کا ہوتا ہے صرف پاس کی آواز کیچ کرتا ہے۔ اس کے باوجود بے پناہ شور آ رہا تھا۔ سنکاری سمجھ رہا تھا پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "میں سمجھ گیا ہے۔ تو ڈینجرس اینڈ رسکی.... ذرا سا ادھر ادھر ہوا.... میزائل آ کر لگا۔"

"ادھر ادھر ہونے کی کیا ضرورت ہے صحیح جگہ رہو گے تو کوئی میزائل نہیں نکلے گا۔" میں نے کہا اور راج کنور سے پوچھا۔ "ریڈ زون کتنا بڑا ہے؟"

"مجھے صحیح سے نہیں معلوم لیکن شاید سرحد سے پانچ کلومیٹرز پہلے ریڈ زون شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں داخل ہونے والے کسی بھی طیارے کو خبردار کیا جاتا ہے اگر وہ پانچ سو فٹ کی بلندی سے اوپر ہو اور اگر وہ اس سے نیچے ہو تو اسے شوٹ ڈاؤن کر دیا جاتا ہے۔"

"بغیر وارننگ کے؟" سنکاری دہشت زدہ ہو گیا۔

"ہاں.... اس لیے ریڈ زون سے دور رہ کر کال کا انتظار کرنا ہو گا۔" راج کنور نے کہا۔ "کم سے کم بلندی سو فٹ رکھنی ہو گی ورنہ ہیلی کاپٹر مشکوک ہو جائے گا اور بلا وارننگ شوٹ کیا جا سکتا ہے۔"

جیسے جیسے راج کنور تفصیلات بتا رہا تھا خطرات اور خدشات بڑھ رہے تھے۔ وہ اتنا شریف نہیں تھا کہ رضاکارانہ بتاتا مگر اس کی جان پر بنی ہوئی تھی، اسے معلوم تھا کہ اگر ہیلی کاپٹر کو نشانہ بنایا گیا تو وہ بھی مارا جائے گا اس لیے وہ سب کھل کر بتا رہا تھا۔ اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کے پاس مجھ سے تعاون کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر وہ کوئی بات چھپاتا تو اس کا نقصان اسے بھی ہوتا۔ دوسری صورت میں اسے اُمید تھی کہ شاید اس کی جان بچ جائے۔ میں اسے چھوڑ دوں یا اسے قسمت کوئی موقع دے۔ اسی امید پر وہ فرمانبرداری سے تعاون کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد سنکاری نے اعلان کیا۔ "ہم امرتسر کے پاس ہیں اس کے اوپر سے آگے نکلیں گے۔"

ہم سب سنبھل کر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے اور بانو نے بھی سیٹ بیلٹ باندھ لی۔ ہیلی کاپٹر کا رخ بتدریج بدل رہا تھا اور اب یہ شمال مغرب کی طرف جا رہا تھا۔ پکھیالا کا علاقہ لاہور سے اوپر پڑتا تھا۔ سنکاری نے کہا۔ "اب ہم سرحد سے بیس کلومیٹرز دور ہے۔"

راج کنور نے کہا۔ "بلندی کم کرو۔ ہزار فٹ پر آ جاؤ لیکن خیال رکھنا امرتسر سے اڑنے والی فلائٹ بھی اسی علاقے سے گزرتی ہیں۔"

اس وقت بلندی چار ہزار فٹ تھی۔ سنکاری نے رفتار اور بلندی دونوں کم کرنا شروع کر دی تھی۔ چھ بج کر پچاس منٹ پر سورج مغربی افق پر جا ٹکا تھا۔ اس کا آتشیں گولہ ذرا بائیں طرف تھا۔ مشکل سے پندرہ منٹ بعد سورج غروب ہو جاتا اور ہمیں اسی دوران میں اپنی منزل تک پہنچ جانا تھا۔ سنکاری اتنی مہارت سے ہیلی کاپٹر کو نیچے لا رہا تھا کہ ہمیں احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اعلان کر رہا تھا کہ اب کتنے کلومیٹرز دور ہے سرحد۔ آخر جب اس نے دس کلومیٹرز کا اعلان کیا تو راج کنور نے کہا۔ "ریڈیو آن کر کے فریکوئنسی سیٹ کر لو کوئی غلطی نہ ہو۔ ایک بار پکارنے پر جواب نہ ملے تو دوبارہ نہیں پکارا جاتا ہے۔ دوسری بار میزائل فائر ہوتا ہے۔"

"بار بار کیوں بتاتا ہے۔" سنکاری نے خفگی سے کہا اور کنفرم کر کے ریڈیو فریکوئنسی سیٹ کر لی۔ اب ہم تیار ہو گئے تھے۔ اس دوران میں ہیلی کاپٹر ہزار فٹ سے نیچے آ گیا تھا اور اس کی بلندی میں مزید کمی واقع ہو رہی تھی۔ مزید دو کلومیٹرز آگے نکلنے کے بعد سنکاری نے رفتار بہت کم کر دی تھی اور اب ہیلی کاپٹر ٹہل رہا تھا۔ میرا دل تیز دھڑک رہا تھا۔ میرا وطن میرے پیاروں کی سرزمین یہاں سے صرف آٹھ کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی۔ اگر ہیلی کاپٹر پوری رفتار سے چلتا تو یہ فاصلہ صرف پانچ منٹ میں طے ہو سکتا تھا۔ مگر یہ آٹھ کلومیٹرز اور پانچ منٹ دنیا کے مشکل ترین فاصلے اور وقت تھا۔ ایک آگ و خون کا دریا پار کرنا تھا۔ اب ہیلی کاپٹر پانچ سو فٹ سے بھی نیچے آ گیا تھا۔ نیچے سبز جھاڑیوں سے بھرا میدان اور کہیں کہیں کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ اب زمین پر سورج کی روشنی تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ سائے پھیل رہے تھے۔ سنکاری نے بتایا کہ سرحد اب سات کلومیٹرز دور تھی۔ اس نے کہا۔

"اس سے آگے جانے میں خطرہ ہو سکتا ہے۔"

راج کنور نے بلندی پوچھی اور کہا۔ "اسے ڈیڑھ سو فٹ پر لے آؤ۔ اگر ریڈیو سے پکارا گیا تو میں جواب دے سکوں گا؟"

"ریڈیو کا ہیڈ تم کو دے دیا ہے۔" سنکاری نے جواب دیا۔ "اپنے ہیڈ فون پر رائٹ پر لگا بٹن دبائے گا تو تمہارا مائک آن ہو جائے گا۔"

کیونکہ یہاں سے آگے بڑھنے میں خطرہ تھا اس لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

سنکاری نے ہیلی کاپٹر کو ایک چھوٹے دائرے میں گھمانا شروع کر دیا تھا۔ ایک ہی جگہ رکے رہنے سے ایندھن کا استعمال بڑھ جاتا۔ ہم سب ٹینشن کے عالم میں انتظار کر رہے تھے کہ کب انڈین سائیڈ سے پکارا جاتا ہے مگر ابھی تک کوئی آواز نہیں آئی تھی۔ وقت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ میری نظر گھڑی پر مرکوز تھی۔ مجھے خیال آیا کہ اگر ہمیں انڈین سائیڈ سے نہ پکارا گیا تو کیا میں اپنی اور مزید تین افراد کی جان کی بازی لگا کر سرحد پار کرنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ اسی لمحے گھڑی میں سات بجے اور اس کے ساتھ ہی ریڈیو جاگ اٹھا۔ اس سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز آئی اور پھر کسی نے کہا۔ ''پی ایس کے..... فائیو تھری ٹو..... ہوازدیئر۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا اور راج کنور کی طرف پستول سیدھا کر لیا تھا اس نے ہیڈ فون پر لگا مائک کا بٹن دبایا اور بولا۔ ''آئی ایس کے..... نائن ٹو فائیو..... ڈو یو ریڈمی؟''

''راجر..... یور آئیڈینٹی پلیز؟'' بولنے والا نرا خشک اور فوجی لگ رہا تھا۔ اس کی آواز میں کرختگی تھی۔ جواب میں راج کنور نے سنبھل کر ایک طویل نمبر بتایا جس میں انگریزی کے الفابیٹ بھی آرہے تھے۔ جب وہ خاموش ہو گیا تو دوسری طرف سے کہا گیا۔

''راجر..... پرمیشن اپروو..... فارنیکسٹ ٹو آورز۔''

راج کنور کے اشارے پر سنکاری نے ریڈیو بند کر دیا اور ہم سب نے سکون کا طویل سانس لیا۔ سنکاری نے ریڈیو آف کیا تو راج کنور نے کہا۔ ''مجھے دو گھنٹے کے لیے ریڈ زون استعمال کرنے کی اجازت ملی ہے۔''

''یعنی تم دو گھنٹے میں واپس آجاؤ۔''

''بالکل اگر اس سے دیر لگے گی تو دوبارہ پرمیشن لینا پڑے گی۔'' راج کنور بولا۔ ''لیکن یہ بہت رسکی ہوگا کیونکہ پاکستان کی طرف سے آنے کی صورت میں بعض اوقات وارننگ نہیں ملتی ہے۔ سسٹم آٹو میٹک شوٹ کرتا ہے اسے روکنے کے لیے آپریٹر کے پاس صرف چند سیکنڈ کی مہلت ہوتی ہے۔''

سنکاری نے اس سے پوچھا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟''

''ہیلی کاپٹر نیچے لاتے ہوئے سرحد کراس کرو۔ سرحد پار کرتے ہوئے بلندی سو فٹ سے کم رکھنا۔''

میرے لیے یہ تسلیم کرنا مشکل تھا کہ اتنی اہم سرحد پر ہماری طرف سے کوئی پہرا نہیں ہوگا۔ اگر زمینی ساخت کی وجہ سے ریڈار کی نگرانی ممکن نہیں تھی تو دوسرے کئی طریقے تھے جن سے نگرانی کی جاسکتی تھی اور کچھ نہیں تو زمینی فورسز کی موجودگی لازمی تھی جو سر سے گزرنے والے ہیلی کاپٹر کو دیکھ سکتی تھی۔ راج کنور اب سنکاری کو گائیڈ کر رہا تھا کہ اسے کہاں سے گزرنا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی راج کنور وہ مخصوص اصطلاحات استعمال کر رہا تھا جو ہیلی کاپٹر اور طیاروں کی نیوی گیٹر استعمال کرتے ہیں۔ سنکاری اس زبان کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ ہیلی کاپٹر کو اسی لحاظ سے بڑھا رہا تھا۔ نیچے منظر تاریک ہو رہا تھا کیونکہ سورج ڈوبنے کے قریب تھا۔ ہم ایک متروک ہو جانے والی سڑک پر اڑ رہے تھے۔ راج کنور نے کہا۔ ''جب تقسیم نہیں ہوئی تھی تو یہ سڑک راوی کے پار جاتی تھی۔ پھر تقسیم نے اسے ختم کر دیا۔ اس کا پل بھی متروک ہو گیا۔''

''سرحدیں بہت سے راستوں کو ختم کر دیتی ہیں اور نئے راستوں کو جنم دیتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

مشکل سے پچاس فٹ کی بلندی پر اڑتے ہوئے ہیلی کاپٹر سرحد کے پاس ہوتا جا رہا تھا۔ سنکاری نے کہا۔ ''ہم چار کلومیٹرز دور ہے۔''

ہیلی کاپٹر کی رفتار نوے کلومیٹرز فی گھنٹا تھی۔ یعنی پونے تین منٹ میں سرحد عبور کر جاتے۔ میں نے جھک کر نیچے دیکھا۔ دور ایک نشیب دکھائی دیا جس میں پانی چمک رہا تھا۔ یہی دریا راوی تھا اس کے پار میرا ملک میرا وطن تھا۔ سنکاری نے پوری قوت سے فلائنگ اسٹک تھام رکھی تھی اور اس کے چہرے پر کشیدگی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ شاید ہم سب کے چہرے کشیدہ تھے۔ ہر گزرتے لمحے دلوں کی دھڑکنیں بھی بڑھ رہی تھیں۔ بانو نے سیٹ پر ہتھیلیاں جمار کھی تھیں جیسے کسی متوقع دھچکے سے بچنا چاہ رہی ہو۔ سنکاری نے کہا۔ ''دو کلومیٹرز۔''

''ہم ریڈ زون سے گزرنے والے ہیں۔'' راج کنور نے کہا۔

''لیکن گزرے نہیں ہیں۔'' میں نے زیر لب کہا۔ اب تقریباً ڈوب جانے والے سورج کی آخری کرنیں دریا کے پانی پر مچل رہی تھیں۔ ہیلی کاپٹر دریا کی وادی میں داخل ہوا اور پانی کے اوپر سے ہوتا ہوا دوسری طرف جانے لگا۔ سنکاری نے کہا۔

''ہم نے بارڈر کراس کر لیا ہے۔''

یہ سن کر میرا دل ایک لمحے کو تھم گیا۔ راج کنور بولا۔ ''ہم بارڈر پہلے ہی کراس کر چکے تھے۔ دریا پاکستان کی حد میں ہے۔''

دریا کراس کر کے ہیلی کاپٹر آگے آیا تو سڑک کا آغاز ہو گیا۔ سنکاری اب جی پی ایس کی مدد سے بتائی ہوئی لوکیشن کی طرف جا رہا تھا۔ عبداللہ اور وسیم اسی مقام پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ نارنگ منڈی روڈ کی طرف سے کراسنگ کر کے آنے والی سڑک مشکل سے چار کلومیٹرز لمبی تھی۔ میں نے عبداللہ سے بات کی تھی تو اس نے کہا تھا کہ وہ خاصی دیر سے یہاں تھا۔ مگر پچاس فٹ کی بلندی سے جہاں تک سڑک نظر آتی تھی اس پر کوئی گاڑی موجود نہیں تھی۔ جب کہ وسیم نے کہا تھا کہ وہ آخری حد تک آجائے گا۔ دونوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا سنکاری نے مجھ سے کہا۔ ''ہم پہنچ گیا ہے جی پی ایس لوکیشن پر۔''

میں نے بے یقینی سے نیچے دیکھا مگر سڑک اور آس پاس زمین دور تک خالی تھی۔ شمال کی طرف دور ایک آبادی کے آثار تھے مگر اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ جنوب میں کسی قدر اونچی جھاڑیاں تھیں اور ویرانہ تھا۔ عبداللہ اور وسیم کو بالکل اسی جگہ موجود ہونا چاہیے تھا اور اگر وہ کسی وجہ سے سڑک پر موجود نہیں تھے تب بھی آس پاس حد نظر میں ہونا چاہیے تھا مگر وہ بالکل غائب تھے۔ بانو بھی دوسری طرف سے نیچے دیکھ رہی تھی اس نے کہا۔ ''شوبی یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''

''انہیں یہیں ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے فکر مندی سے کہا۔ ''کوئی وجہ ہوئی ہے جو وہ یہاں نہیں ہیں ہمیں دیکھنا ہوگا۔''

سنکاری نے کہا۔ ''جلدی بولو اب کیا کرنا ہے؟ ابھی واپس جانے کا بھی ہے۔''

''ہیلی کاپٹر نیچے اتارو۔'' میں نے حکم دیا تو سنکاری نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

''ابھی اتارنے کا نہیں ہے۔'' سنکاری بولا۔ ''میں نیچے کرتا ہوں تم کود جاؤ۔''

''بکو مت۔'' میں نے پستول دوبارہ اس کی گردن سے لگا دیا اور گرج کر کہا۔ ''نیچے اتارو..... جلدی۔''

مجبوراً اس نے ہیلی کاپٹر نیچے کرنا شروع کیا اور میری طرف دیکھا۔ ''یہ اچھا نہیں ہے ابھی کوئی آگیا تو ہم پکڑا جائے گا جاسوسی کے الزام میں بند ہوگا موت کا سزا ہوگا۔''

''یہاں نہیں۔'' میں نے منع کیا وہ سڑک پر اتار رہا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کے درمیان ایک صاف جگہ اشارہ کیا۔ ''وہاں اتارو۔''

''ادھر جھاڑی ہے۔'' وہ فکر مندی سے بولا۔ ''چوپر کا بلیڈ ٹکرائے گا۔''

''کچھ نہیں ہوگا یہ نرم جھاڑیاں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر بلیڈ لگے بھی تو ان کو نقصان نہیں ہوگا۔''

بادل ناخواستہ سنکاری ہیلی کاپٹر کو اس جگہ لایا اور آہستگی سے نیچے اتارنے لگا۔ ہوا کے زور سے جھاڑیاں خود جھک کر ہیلی کاپٹر کے بلیڈ سے دور ہو رہی تھیں۔ زمین ناہموار تھی لیکن ہیلی کاپٹر کے اسکیز ٹک گئے۔

''اب ہم مارا جائے گا۔'' سنکاری نے فریاد کی۔ ''بائی گاڈ ہم کبھی ایسا کام کرنے کا سوچا بھی نہیں۔''

''کچھ نہیں ہوگا انجن بند کرو۔'' میں نے اگلا حکم دیا تو وہ اچھل پڑا۔

''ابھی انجن بند کر دیا تو دوبارہ اسٹارٹ ہو کر فلائنگ میں ایک منٹ لگے گا۔ ابھی پاکستانی اپنی تلاش شروع کر چکا ہوگا۔ ریڈار نہ سہی آنکھ سے دیکھا ہوگا۔''

وہ درست کہہ رہا تھا اس کا تقریباً سو فیصد امکان تھا کہ یہاں زمین سے نگرانی کی جارہی ہوگی اور ہیلی کاپٹر کی تلاش شروع کی جاچکی ہوگی اسی لیے میں نے اسے یہاں جھاڑیوں کے درمیان اتروایا تھا۔

''انجن بند کرو۔'' میں نے پہلے والے لہجے میں کہا تو حکم کی تعمیل کرتے بنی۔ ہیلی کاپٹر کا انجن بند ہوا اور پنکھے رکنے لگے۔ اس کا شور زمین پر یقیناً بہت دور سے سنا جاسکتا تھا۔ راج کنور بھی مضطرب ہو گیا اس نے کہا۔

''شہباز تمہارا کام ہو گیا ہے اب ہمیں جانے دو۔ جتنا وقت گزرے گا ہمارے لیے خطرہ اتنا بڑھتا جائے گا۔''

''فی الحال یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور بانو کی طرف دیکھا۔ ''بانو ان دونوں پر نظر رکھنا اگر کوئی غلط حرکت کرے تو اسے بلا جھجک شوٹ کر دینا۔''

میں کہتے ہوئے نیچے اتر آیا۔ ہم پاکستانی سرحد میں چار کلومیٹرز اندر آگئے تھے اور ابھی نارنگ منڈی روڈ کراسنگ سے دو کلومیٹرز دور تھے۔ میں فکر مند تھا میرے ساتھیوں کو یہیں ہونا چاہیے تھا اور وہ غائب تھے۔ مصیبت یہ تھی کہ میں ان سے رابطہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انٹرنیٹ ڈیوائس انڈیا میں کام کرتی تھی یہاں اس کے سگنل مشکل سے ہی ملتے پھر بھی میں نے اسے لیپ ٹاپ سے لگا کر دیکھا۔ مگر کنکشن

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں ہوا تھا۔ انٹرنیٹ کنکشن پر کراس آ رہا تھا۔ پھر میں نے موبائل چیک کیا اور حسبِ توقع اس پر بھی سگنل غائب تھے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ہیلی کاپٹر کا انجن بند ہونے کے بعد یہاں ناقابلِ بیان قسم کا سکون چھا گیا تھا۔ میں نے جھک کر مٹی اٹھائی اور اسے سونگھا۔ اس کی مہک نے مجھے یقین دلایا کہ میں اپنے وطن میں ہوں۔ وہ تینوں ہیلی کاپٹر میں بیٹھے تھے۔ اصولاً تو مجھے یہ کرنا چاہیے تھا کہ بانو اور راج کنور کو اتار کر سنکاری کو واپس جانے دیتا۔

لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے اور سنکاری کو یہاں روکنا ضروری تھا۔ ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ میرے ساتھی یہاں موجود نہ ہوں جب تک اس کی کوئی بہت سنگین وجہ نہ ہو۔ اس کا امکان تھا کہ پولیس یا رینجرز ان لوگوں کو لے گئی ہو۔ بہرحال یہ سرحد کے پاس حساس علاقہ تھا اگرچہ اسے سیکیورٹی زون قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ کچھ ہی دور ایک گاؤں آباد تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ گاؤں کی طرف جانا چاہیے یا پھر اسی سڑک پر آگے جا کر دیکھنا چاہیے تھا کہ میرے ساتھی کہیں آگے تو نہیں تھے؟ میں سوچتے ہوئے سڑک تک آ گیا تھا۔ دوبارہ واپس ہیلی کاپٹر کی طرف آیا اور بانو کو نیچے آنے کا اشارہ کیا وہ بھی مضطرب تھی اس نے نیچے آتے ہی کہا۔ ”ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے لیکن میرے ساتھی غائب ہیں اور ایسا کسی بہت بڑی وجہ کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔“

”اگر وہ کسی وجہ سے یہاں نہیں ہیں تب بھی ہمیں رکنا نہیں چاہیے۔ راج کو اتار لیتے ہیں اور اسے جانے دیں۔ اس کی وجہ سے ہم دوسرے خطرے میں پڑ سکتے ہیں۔ اگر ہمارے سیکیورٹی والے آ گئے تو سوچ سکتے ہیں کیا ہوگا؟ کون مانے گا کہ ہم انڈیا کے جاسوس نہیں ہیں۔ شوبی مشکل میں پڑ جائیں گے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے اس معاملے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ہیلی کاپٹر یہاں محفوظ ہے۔ جب تک کوئی اوپر سے نہیں دیکھے گا یہ نظر نہیں آئے گا۔ میں سوچ رہا ہوں سڑک پر آگے جا کر دیکھوں ہو سکتا ہے وہ مل جائیں۔“

”تب تک یہ ہیلی کاپٹر یہیں کھڑا رہے گا؟“

”ہاں.... ویسے بھی تاریکی چھا رہی ہے اور چند منٹ میں مکمل تاریکی ہو جائے گی تب یہ فضا سے بھی نظر نہیں آئے گا۔ زمین سے بھی پاس آنے پر دکھائی دے گا۔ تم یہیں رہو اور اگر کوئی خطرہ دیکھو تو خود کو بچانے کی کوشش کرنا ان کی پرواہ مت کرنا۔“ میرا اشارہ سنکاری اور راج کنور کی طرف تھا۔ ”اگر الگ ہو جاؤ تو اسی سڑک کے ساتھ آگے پہنچنا۔ تمہارے پاس پستول بھی ہے اور رقم بھی ہے ان سے کام لینا۔“

ہم دونوں ہیلی کاپٹر سے دور تھے اور دھیمی آواز میں گفتگو کر رہے تھے اس لیے امکان نہیں تھا کہ وہ دونوں ہماری گفتگو سن سکیں۔ بانو نے سر ہلایا اور پوچھا۔ ”اس صورت میں راج کنور کا کیا کرنا ہے؟“

”اسے بھی چھوڑ دینا جو اس کی قسمت میں ہوگا بھگتے گا۔“

بانو ذرا مایوس ہوئی تھی اس کا خیال تھا کہ میں راج کنور کو شوٹ کرنے کا حکم دوں گا۔ مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ”میں بیس منٹ میں آنے کی کوشش کروں گا اگر آدھے گھنٹے زیادہ دیر ہو جائے تو تم اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے آپ جائیں۔“

میں وقت ضائع کیے بغیر سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔ چند لمحے بعد میں پوری رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ جس زمانے میں جاگنگ کا شوق تھا تو میرا اسٹیمنا اتنا اچھا ہو گیا تھا کہ میں ایک کلومیٹر کا فاصلہ چار منٹ میں طے کر لیتا تھا۔ اس لحاظ سے مجھے آٹھ منٹ میں کراسنگ تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ چند منٹ بعد تاریکی چھا گئی۔ آسمان پر بادل تھے اس لیے ستارے اور اگر چاند تھا تو اس کی روشنی بھی غائب تھی۔ مجھے یاد تھا کہ آسمان پر چاند تھا یہ شاید آدھا یا اس سے کچھ بڑا تھا۔ مگر بادلوں نے سب چھپا لیا تھا اور ایک طرح سے یہ اچھی پردہ پوشی تھی لیکن میں جس رفتار سے دوڑ رہا تھا اگر کوئی گڑھا یا رکاوٹ آ جاتی تو ٹھیک ٹھاک چوٹ لگتی۔ میں خطرہ مول لے کر دوڑ رہا تھا پھر مجھے یاد آیا کہ موبائل میں ٹارچ بھی تھی میں نے وہ آن کر لی لیپ ٹاپ والا بیگ بانو کو دے آیا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں کام آسان ہو گیا تھا۔ اس کا فائدہ بھی ہوا آگے سڑک بہت خراب تھی اور اس میں گڑھے تھے۔ اگر میں اندھا دھند بھاگتا تو امکان تھا کہ کسی گڑھے میں میرا اپیر آ جاتا۔ اب میں ان سے بچ کر بھاگ رہا تھا۔

آٹھ تو نہیں دس منٹ بعد میں کراسنگ پر پہنچ گیا۔ میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ یہ نارنگ منڈی روڈ تھی اور اس پر دور تک کوئی گاڑی نہیں تھی۔ اب میں صحیح معنوں میں فکرمند ہو گیا تھا میرے سارے ساتھی محاورے کے مطابق سینگوں کی طرح غائب تھے۔ یہاں تین گاڑیاں معہ چھ افراد کے ہونی چاہیے تھیں۔ مگر نہ کوئی گاڑی تھی اور نہ ہی کوئی فرد۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں واپس جاؤں یا پھر دائیں بائیں میں سے کسی طرف کا رخ کروں۔ یہ خیال کچھ اچھا نہیں لگا میرے ساتھیوں کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ پیچھے بانو تھی میں اسے کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اگر ایک فیصد بھی امکان ہوتا تو ان میں سے کوئی نہ کوئی یہاں موجود ہوتا۔ اگر میں دیر کرتا اور بانو بھی چل پڑتی تو اس کو بھی تلاش کرنا پڑتا۔

اس لیے میں واپس چل پڑا میرا سانس کسی قدر بے ترتیب تھا لیکن مجھے امید تھی کہ میں اسی رفتار سے دوڑتا ہوا بروقت ہیلی کاپٹر تک پہنچ جاؤں گا اس سے پہلے کہ بانو اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر سکے۔ مگر ابھی میں نے نصف راستہ طے کیا تھا کہ عقب سے روشنی محسوس ہوئی جو چند لمحے بعد ہی تیز ہو گئی تھی یہ کوئی گاڑی تھی جو تیزی سے قریب آ رہی تھی لیکن میں نے پلٹ کر دیکھے بغیر دوڑنا جاری رکھا۔ مجھے خطرہ صرف سیکیورٹی ادارے کے افراد سے تھا اور اگر میں مڑ کر دیکھتا تب بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ آنے والے کون ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ گاڑی میں کون تھا؟ شاید وہ کوئی عام فرد ہو یا پھر میرا کوئی ساتھی ہو سکتا تھا مگر میں رک کر وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ گاڑی بالآخر مجھ تک آ ہی جاتی میں اس سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ اس طرح ہیلی کاپٹر سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جاتا۔

گاڑی آ کر میرے پاس سے گزری پھر زوردار انداز میں بریکیں گونجیں۔ گاڑی رک گئی۔ یہ چھوٹے ماڈل کی مگر طاقتور جیپ تھی۔ جیپ رکتے ہی اس سے عبداللہ چھلانگ مار کر برآمد ہوا۔ بیتو اس کے پیچھے تھا۔ عبداللہ نے حفظ مراتب کا خیال رکھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔ ”شکر ہے آپ آ گئے.... یہاں....“

ابھی عبداللہ کا جملہ منہ میں تھا کہ بیتو بلاتکلف مجھ سے چمٹ گیا۔ ”شوبی آپ آ گیا.... لیکن یہاں بڑا گھوٹالا ہو گیا ہے۔“

”تم لوگ کو غائب دیکھ کر مجھے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا۔“ میں نے عبداللہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور بیتو کو ایسے ہی کھینچ کر گاڑی کی طرف لے جانے لگا۔ ”لیکن تفصیل میں جانے کا وقت نہیں ہے۔ فوراً آگے چلو دیر سے نقصان ہو سکتا ہے۔“

عبداللہ نے سمجھداری کا ثبوت دیا اور بغیر کوئی سوال کیے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور میں اس کے برابر میں آ گیا۔ بیتو اس چھوٹی جیپ کے پچھلے حصے میں گھس گیا۔ میں نے بیٹھتے ہی کہا۔ ”عبداللہ تیز چلاؤ اور مجھے مختصر الفاظ میں بتاؤ مسئلہ کیا ہوا ہے؟“

عبداللہ نے جیپ دوڑائی اور ساتھ ہی بولنے لگا۔ ”مسئلہ حویلی میں ہوا ہے۔ کچھ افراد سعدیہ کو اغوا کر کے لے گئے ہیں۔“

میں اچھل پڑا۔ ”سعدیہ کو.... کیسے اور کہاں سے؟“

”وہ، مونا اور شمی باہر باغ میں تھے۔ شمی اور مونا کا کہنا ہے کہ کچھ افراد اچانک وہاں آ گئے۔ انہوں نے شمی اور مونا کو بے ہوش کیا۔ شمی کا کہنا ہے انہوں نے کوئی گیس سی اسپرے کی اور وہ تینوں ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ سعدیہ سب سے پہلے بے ہوش ہوئی تھی۔ اس کے کچھ دیر بعد گارڈ نے شمی اور مونا کو باغ میں بے ہوش پڑے دیکھ لیا تھا۔ مگر سعدیہ غائب تھی۔“

عبداللہ بہت خوفناک خبر سنا رہا تھا۔ میں صحیح معنوں میں دہل گیا تھا۔ سعدیہ امید سے تھی۔ ”میرا خدا وسیم کا کیا ردعمل ہوا؟“

”اسی نے تو ساری گڑبڑ کی تھی۔“ عبداللہ بولا اس گفتگو کے دوران ہم ہیلی کاپٹر کے پاس پہنچ گئے تھے۔ جیپ رکتے ہی میں نیچے اتر آیا۔ عبداللہ اور بیتو بھی نیچے آ گئے۔ میں جھاڑیوں میں آیا اور وہاں ہیلی کاپٹر بانو سمیت تینوں کو موجود پا کر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرے جانے کے بعد بانو ہیلی کاپٹر میں آ گئی تھی۔ یہاں وہ راج کنور اور سنکاری کی نگرانی بھی کر سکتی تھی۔ میں نے تعارف کرایا اگرچہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اسکائپ پر سب ایک دوسرے کو دیکھ چکے تھے اور تعارف بھی ہو گیا تھا مگر ہم پاکستانیوں کو بہت سے کام غیر ضروری کرنے کی عادت ہے۔ ان میں سے ایک بلاوجہ تعارف کرانا بھی ہے۔ بانو سے سلام دعا کے بعد عبداللہ نے آگے بات شروع کی۔ ”وسیم پاگل ہو گیا۔ وہ گاڑی لے کر بھاگا، میں اس کے پیچھے گیا۔ پھر ایاز بھی ہمارے پیچھے آ گیا۔ ہم نے ایمن آباد تک جانے والی سڑک تک اس کا تعاقب کیا اس کے بعد وہ کھو گیا۔ ہمیں آپ کا خیال بھی پریشان کر رہا تھا۔ وہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

معاملات دیکھنے والا کوئی نہیں تھا جب وسیم کھو گیا اور اس نے کال بھی ریسیو نہیں کی تو ہم واپس آ گئے۔ میں ایاز اور سفیر کے ذمے لگا کر آیا ہوں کہ وہ وسیم سے رابطے کی کوشش کرتا رہے۔ یہاں سگنل نہیں ہیں وہیں میں نے سفیر کو کال کر کے صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے وہ بھی وسیم سے رابطے کی کوشش کر رہا ہوگا۔"

"سفیر بھی آیا ہے۔"

"ہاں میں اسے اسلام آباد چھوڑ رہا تھا مگر وہ ضد کر کے آ گیا۔ یہاں ہم پانچ اور وسیم کے دو آدمی آئے ہیں۔ وہ وسیم والی گاڑی میں تھے۔ ایاز اور سفیر الگ گاڑی میں ہیں اور بیتو میرے ساتھ ہے۔"

میں عبداللہ سے بات کر رہا تھا اور میرے ذہن میں بڑے کنور کی آواز گونج رہی تھی۔ "بے شک شہباز سرحد پار بھی چلا جائے تب بھی وہ واپس آئے گا۔"

اس وقت میں نہیں سمجھا تھا کہ بڑا کنور کیوں اتنا بڑا دعویٰ کر رہا تھا لیکن اب میں کسی حد تک سمجھ گیا تھا کہ اس نے یہ دعویٰ کیوں کیا تھا۔ اگر سعدیہ کے ساتھ نمی اور مونا بھی غائب ہوتے تو میرا ذہن اس طرف نہ جاتا مگر صرف سعدیہ کے غائب ہونے سے واضح تھا کہ یہ کام کس کا ہے۔ بڑا کنور یقیناً اتنی قدرت رکھتا تھا کہ پاکستان سے کسی کو اٹھوا سکتا تھا۔ اس کے پاس بے حساب دولت تھی اور دولت ہر مشکل کام کو آسان بنا دیتی ہے۔ ممتاز جیسے طاقتور سیاست دان سے اس کے روابط سامنے کی بات تھی مزید نہ جانے کہاں کہاں اس کی ڈوریں موجود تھیں۔ جس انداز میں سعدیہ کو اغوا کیا گیا تھا اس سے ظاہر تھا یہ بہت منظم اور تربیت یافتہ لوگوں کا کام تھا۔ عبداللہ نے زور سے آواز دی تو میں چونکا۔ "شہباز صاحب آپ کہاں گم ہیں فوراً چلیں ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

"ہاں وقت نہیں ہے تم بانو اور بیتو کو لے جاؤ۔ راج کنور بھی تمہارے ساتھ جائے گا۔"

عبداللہ حیران ہوا تھا۔ "راج کنور آپ کے ساتھ ہے؟"

"ہاں وہ ہیلی کاپٹر میں موجود ہے اسی کی مدد سے ہم نے اتنی آسانی سے سرحد پار کی ہے۔"

بیتو نے بیقرار ہو کر کہا۔ "شوبی آپ کیوں نہیں چلے گا؟"

"مجھے واپس جانا ہوگا۔" میں نے کہا تو بیتو اور بانو ایک ساتھ چلائے تھے۔

"کیوں....؟"

"شہباز صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں؟" عبداللہ مضطرب لہجے میں بولا۔ "آپ ٹھیک ہیں نا؟" بصد احترام اس نے میری دماغی حالت پر مہذب پیرائے میں سوال کیا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں اور میرا دماغ نہیں چلا ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے سعدیہ کہاں ہے؟"

"کہاں ہے؟" بانو بولی پھر وہ چونک گئی۔ "میرے خدا کہیں بڑے کنور نے....."

"مجھے یقین ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "اسے کسی طرح معلوم ہو گیا کہ سعدیہ ہمارے پاس ہے اور وہ خاموشی سے اسے واپس حاصل کرنے کی پلاننگ کرتا رہا۔ جب میں اس کے ہاتھ سے نکلا تو اس نے اپنے مہرے ہلائے اور سعدیہ کو حاصل کر لیا۔"

"شہباز صاحب یہ صرف ایک مفروضہ ہے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے ممکن ہے یہ مرشد....."

میں نے نفی نے سر ہلایا۔ "اس صورت میں وہ تینوں کو لے جاتا۔ صرف سعدیہ کو لے جانا بیوقوفی ہوتی۔ یہ کام صرف بڑے کنور کا ہے مجھے یقین ہے اگر مجھ سے اس کا مقصد پورا ہو جاتا تو وہ کبھی سعدیہ کو نہ چھیڑتا وہ اس سے محبت کرتا ہے۔"

"یہ محبت ہے؟" بانو نے تلخی سے کہا۔

"تم اسے اپنے پیمانے پر مت ناپو ہر شخص مختلف انداز میں محبت کرتا ہے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "مجھے واپس جانا ہوگا۔"

"نہیں آپ نہیں جائے گا۔" بیتو بولا۔

"بیتو مجھے جانا ہے۔" میں نے کہا تو وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

"اگر آپ جائے گا تو ہم بھی جائے گا۔"

"تم نہیں جاؤ گے۔"

"کیوں نہیں جائے گا سادی دیدی ہمارا دیدی ہے ہم بھی جائے گا۔" وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ "اگر آپ سعدیہ دیدی کے لیے نہ جاتا تب بھی ہم آپ کے ساتھ جاتا۔ آپ کو اکیلا جانے نہ دیتا۔"

سنکاری ہیلی کاپٹر سے اتر کر ہمارے پاس چلا آیا۔ "شہباز صاحب جو کرنا ہے جلدی کرو اگر ادھر رکنا ہے تو ہم کو اجازت دو ہم بھاگ جائے۔"

"میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

"ہم بھی....." بیتو بولا۔

"بیتو....." میں نے کہنا چاہا تو وہ پاؤں پٹخ کر بولا۔ "ہم نہیں سنے گا آپ کے ساتھ جائے گا ضرور جائے گا اگر آپ ایسے نہیں لے گیا تو ہم پیدل آ جائے گا۔"

بیتو میری کہانی کا ایسا کردار ہے جو میرے سائے کی طرح ہے۔ وہ میرا ہم وطن نہیں ہے ہم مذہب ہی نہیں ہے۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی احسان نہیں کیا۔ میں نے جو اس کے لوگوں کے لیے کیا تھا وہ اپنی جان بچانے کے لیے بھی کیا تھا اس میں خالص مدد کا عنصر کم تھا۔ لیکن جب بیتو میرے ساتھ ہوا تو بس میرے لیے ہو گیا۔ میرے ہر ساتھی کی اپنی زندگی تھی اپنی ذمے داریاں تھیں۔ مجھ سے ہٹ کر بھی ان کی مکمل لائف تھی بلکہ میرے ساتھ وہ خطرات میں پڑے ہوئے تھے۔ اگر مجھ سے الگ ہوتے تو سکون سے زندگی گزارتے۔ لیکن بیتو بس مجھ سے متعلق تھا میری ہر ذمے داری اس کی تھی۔ وہ خود کو میرے ساتھ محفوظ سمجھتا تھا اور مجھ سے الگ ہونے کے خیال سے ہراساں ہو جاتا تھا۔ ایسی محبت اور اتنا خلوص تو آج کل بھائیوں سے نہیں ملتا ہے جو بیتو میرے لیے رکھتا تھا۔ میں کچھ دیر تاریکی میں اسے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر سمجھانے کی کوشش کی یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں سمجھے گا۔ "بیتو وہاں خطرہ ہی خطرہ ہے اور میرے کسی ساتھی پر آنچ آئے مجھے بالکل گوارہ نہیں ہے۔"

جواب میں بیتو گاڑی کی طرف گیا اس نے عقبی نشست سے دو خودکار رائفلیں اور ان کے میگزین نکالے اور سنکاری سے بولا۔ "ہیلی کاپٹر اڑاؤ۔"

"یہ نہیں مانے گا۔" عبداللہ نے دبے لہجے میں کہا۔ "آپ پر گیا ہے۔"

"یعنی میری طرح ضدی ہے۔" میں نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "عبداللہ میں واپس جا رہا ہوں لیکن دشمن کی قید میں نہیں جا رہا ہوں اللہ نے چاہا تو سعدیہ کو لے کر واپس آؤں گا۔"

عبداللہ سمجھ گیا تھا کہ میں نہیں رکوں گا۔ اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے میں بانو بی بی اور راج کنور کو لے کر واپس جاتا ہوں۔"

اچانک بانو بولی۔ "شوبی پلیز اتنی عجلت میں ایسا فیصلہ نہ کریں۔ آپ پہلے تصدیق تو کر لیں۔"

"تصدیق؟" میں نے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔ "وہ کیسے کروں؟"

"آپ بڑے کنور سے خود بات کریں۔"

بانو اس سے پہلے بھی کئی مواقع پر بہترین مشیر کا کردار ادا کر چکی تھی اور اس نے مجھے بروقت عقل کی بات سجائی تھی اس بار بھی ایسا ہی ہوا۔ جو بات میرے جذباتی ہوتے ذہن میں نہیں آ رہی تھی وہ اس نے سوچ لی۔ سرحد پار واپس جانا بہت بڑا فیصلہ تھا اور یہ فیصلہ مجھے کسی مفروضے کی بنیاد پر نہیں کرنا چاہیے تھا، چاہے وہ مفروضہ حقیقت سے کتنا ہی قریب کیوں نہ محسوس ہو بلکہ ٹھوس حقیقت کی بنیاد پر کرنا چاہیے تھا۔ اب تک میں نے سوچا نہیں تھا مگر بانو نے سوچ دی تو باقی سب خود میرے ذہن میں آنے لگا۔ میں بڑے کنور سے رابطہ سکتا تھا اور رابطے کا نمبر مجھے راج کنور دیتا۔ میں ہیلی کاپٹر کی طرف آیا۔ راج کنور فکر مند سا بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "راج مجھے کوئی ایسا فون نمبر دو جس پر میں بڑے کنور سے براہ راست بات کر سکوں۔"

وہ خوفزدہ ہوا۔ "بڑے کنور سے.....کیوں؟"

"راج کنور دیر مت کرو ورنہ ہم پھنسے تو تم بھی پھنسو گے۔ مجھے نمبر دو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا تو راج نے مجھے دو نمبرز بتائے۔ ایک سیل کا تھا اور دوسرا کنور پیلس کا لینڈ لائن فون تھا۔ اس کے دو نمبرز اور بھی تھے وہ میں نے موبائل میں محفوظ کر لیے۔ پھر میں عبداللہ کے پاس آیا۔ "موبائل سگنل کہاں ملیں گے؟"

"ہمیں نارنگ منڈی روڈ کراس کر کے آگے جانا ہو گا۔" اس نے جواب دیا اور مضطرب لہجے میں بولا۔ "لیکن شہباز صاحب اس وقت یہاں رکنا نہایت خطرناک ہے کسی وقت بھی سیکیورٹی ادارے کے اہلکار یہاں آ سکتے ہیں اور ہم سب پکڑے جائیں گے۔ ہم ان سے مقابلہ بھی نہیں کر سکتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے انہوں نے آنا ہوتا تو اب تک آ چکے ہوتے لیکن شاید وہ دفاعی نظام میں اس رخنے سے بے خبر ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن احتیاطاً سب چلیں گے۔"

"راج کنور کو بھی لے جانا ہے؟" بانو نے پوچھا۔

"نہیں اسے ہیلی کاپٹر میں باندھ دو۔" میں نے کہا۔ "سنکاری ہمارے ساتھ جائے گا۔"

جب سنکاری کو بتایا گیا تو وہ بدک گیا۔ "ہم کیوں جائے گا؟"

"اگر تم یہاں رہے تو بھاگ جاؤ گے یار کے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

سیکیورٹی والے آگئے تو ان کے ہتھے چڑھ جاؤ گے میں یہ دونوں باتیں نہیں چاہتا تھا۔"

"اس لیے ہمارا ساتھ چلو۔" بیتو نے اسے گردن سے پکڑ کر دھکا دیا۔ عبداللہ نے جیب سے ایک رسی برآمد کی اور ماہرانہ انداز میں راج کنور کے دونوں ہاتھ جکڑ کر اسے چھت پر لگے ہینڈل سے بھی باندھ دیا اور پھر اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اب وہ چیخ چلا کر کسی کو متوجہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ مزاحمت نہیں کر رہا تھا غالباً اس نے سمجھ لیا تھا کہ مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اسے باندھ کر ہم نے ہیلی کاپٹر کے اندر جلنے والی ہلکی سی سرخ روشنی بھی بند کروا دی۔ اوّل تو منی جیپ میں راج کنور کی جگہ نہیں تھی اور اگر وہ پکڑا جاتا تو میری بلا سے۔ اس لیے اسے چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ سنکاری بادل ناخواستہ ہمارے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ میں آگے آیا۔ بانو، بیتو اور سنکاری پیچھے بیٹھ گئے تھے۔ بیتو بانو سے پوچھ رہا تھا۔

"دیدی تم اسکائپ میں تو اتنا صحت مند نہیں دکھتا تھا پر تمہارا صحت تو ہم سے بھی اچھا ہے۔ ہم کو یاد ہے پہلے تم دبلا سا تھا۔ اب تم کیا کرتا ہے؟"

یہ بیتو کا کمزور پہلو تھا وہ کھانے میں کسی پہلوان سے کم نہیں تھا لیکن اس کا جسم چھریرا سا تھا وہ چاہتا تھا کہ اس کا وزن بڑھے اور اس کے لیے وہ کوشش بھی کرتا تھا مگر تا حال وزن میں بہتری کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ اسی لیے جب اس نے صحت مند بانو کو دیکھا تو اس سے تفتیش کرنے لگا۔ بانو اسے بتانے لگی کہ وزن بڑھانے کے لیے اس نے کیا کیا تھا اور کس طرح میں نے اسے عام لڑکی سے ایک خاص لڑکی میں بدل دیا تھا۔ وہ سیلف ڈیفنس کرسکتی تھی اور ہتھیار چلانا بھی جانتی تھی۔ بیتو ہنسا۔ "دیدی یہ شوبی ایسا ہی آدمی ہے، دوسرے آدمی کو خاص بنا دیتا ہے۔ پہلے ہم بھی عام لڑکا تھا کسی کو تھپڑ بھی نہیں مارتا تھا۔"

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک مہینے میں میرا وزن اتنا بڑھ جائے گا۔ میرے ہاتھ پاؤں مضبوط ہو جائیں گے۔"

بیتو نے حسرت سے سنا۔ "کاش ہم بھی لڑکی ہوتا تو وزن تو بڑھا لیتا۔"

عبداللہ زور سے ہنسا تو بیتو کو اپنی بات کا احساس ہوا اور اس نے جلدی سے کھسیا کر کہا۔ "یہ تو ہم ایسے ہی بول رہا ہے۔"

"بانو نے صرف خود کو بہتر ہی نہیں کیا ہے، یہ بہت ذہین بھی ہے ابھی تم لوگوں نے دیکھ لیا اس جذباتی موقع پر جب ہم تجربے کار اپنی عقلیں بالائے طاق رکھ کر سوچ رہے تھے اس نے درست گائیڈ لائن دی۔"

"ماشاءاللہ۔" عبداللہ نے حلق سے آواز نکالی۔

"ایاز اور سفیر کہاں ہوں گے؟"

"وہ گوجرانوالہ سے پہلے کھالیہ کے پاس جی ٹی روڈ لنک پوائنٹ پر موجود ہیں۔ یہاں سے کوئی بیس میل دور ہے۔ میں نے کہا ہے جب تک میں نہ کہوں وہ وہاں سے نہ ہلیں وہاں سے وہ دونوں سمتوں میں کسی طرف بھی بہت تیزی سے حرکت کرسکتے ہیں۔"

"یہ تم نے ٹھیک کیا۔" میں نے کہا۔ جیپ اتنی دیر میں نارنگ منڈی روڈ تک پہنچ گئی تھی۔ اسے کراس کرکے ہم آگے بڑھے۔ عبداللہ نے اپنا موبائل فون نکال کر دیکھنا شروع کردیا۔ مجھے رہ رہ کر وسیم کا خیال آ رہا تھا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کا سہی لیکن سعدیہ اور پھر اپنے ہونے والے بچے کے لیے وہ عام آدمی تھا۔ اس کا ردِعمل عام آدمی جیسا تھا۔ مجھے سعدیہ کی بھی فکر تھی اور مجھے حیرت ہوئی جب میں نے خود کو خواہش کرتے پایا کہ اسے بڑے کنور کے آدمی لے گئے ہوں۔ مرشد اور اس کے آدمی عورت کے معاملے میں شیطان سے بھی بدتر تھے۔ اگر سعدیہ ان کے قبضے میں تھی تو ہم اس کے لیے کسی اچھائی کی امید مشکل سے رکھ سکتے تھے۔ بڑا کنور سعدیہ کا بھائی تھا اور اس سے محبت کرتا تھا بے شک ایسے نہیں کرتا تھا جیسے عام بھائی اپنی بہنوں سے کرتے ہیں لیکن وہ کرتا ضرور تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ سعدیہ کہاں ہے اور اس نے صرف ہمیں قبول کرلیا ہے بلکہ مسلمان بھی ہوگئی ہے۔ اس کے باوجود اس نے کوئی تعرض نہیں کیا بلکہ مجھے اشارہ تک نہیں دیا کہ وہ سعدیہ کے بارے میں جان چکا ہے۔ جب اس کی قید میں اس کے ساتھ کھینچا تانی چل رہی تھی اور بعض اوقات میں نے اس کی بات ماننے اور خون دینے سے انکار کیا تھا۔ خاص طور سے جب آخر میں کھانا پینا ترک کردیا تھا تب بھی اس نے مجھے سعدیہ کے حوالے سے دھمکی نہیں دی تھی۔ مگر ساتھ ہی اس نے ایسا بندوبست بھی کر لیا تھا کہ اگر میں اس کے ہاتھ سے نکل جاؤں تو وہ سعدیہ کو اپنے قبضے میں کرسکے۔ اس نے اس پتے کو آخر کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ جب بازی اس کے ہاتھ سے نکلنے لگے تو وہ اسے پھینک کر بازی ایک بار پھر اپنے حق میں کرلیتا

اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

"سگنل آگئے ہیں۔" عبداللہ نے کہا تو میں نے چونک کر دیکھا۔

موبائل پر دو سگنل آ رہے تھے۔ میرے حساب سے یہ ناکافی تھے میں نے عبداللہ سے مزید آگے چلنے کو کہا اس نے سر ہلایا۔ "بہتر سگنل مجھے ذرا آگے ملے تھے۔ شاید ایک کلو میٹر اور آگے جانا پڑے۔"

سڑک کی حالت بہتر نہیں تھی اس کے باوجود عبداللہ ممکن تیزی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ جیسے ہی سگنلز کی تعداد چار ہوئی میں نے عبداللہ کو رکنے کو کہا اور نیچے اتر آیا۔ میں نے سب سے پہلے وسیم سے رابطہ کیا۔ اس کے موبائل پر کال جا رہی تھی۔ بیل بجتی رہی اور اس نے ریسیو نہیں کیا۔ میں نے غصے میں دوبارہ ملایا۔ عبداللہ بھی اتر آیا بلکہ بانو بھی اتر آئی تھی البتہ بیتو اندر تھا۔ وہ یقیناً سنکاری کی نگرانی کر رہا تھا۔ بیتو کی ایک بہترین خوبی یہ تھی کہ وہ ہنگامی حالات میں خود اپنی ذمے داری کا تعین کرکے مذکورہ کام میں لگ جاتا۔ اسے کہنا نہیں پڑتا تھا۔ اس کا نیچے آنا اور ہماری بات سننا ضروری نہیں تھا اس کے بجائے اس نے سنکاری کی نگرانی ضروری سمجھا۔ جیپ میں اسلحہ بھی تھا اس لیے سنکاری کو اکیلے چھوڑنا بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ دوسری بار بھی بیل بج بج کر بند ہوگئی اور میرا غصے سے برا حال ہوگیا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔

"یہ نہایت غیر ذمے دارانہ حرکت ہے۔ مجھے وسیم سے ایسی توقع نہیں تھی اس کے خیال میں بس اسے ہی سعدیہ کی فکر ہے ہمیں اس کا کوئی خیال نہیں ہے وہ کال تک ریسیو نہیں کر رہا ہے۔"

"اسے ہم دیکھ لیں گے۔" عبداللہ نے مجھے ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔ "آپ راج کنور سے بات کریں۔"

"جی شوبی وقت کم ہے۔" بانو نے بھی احساس دلایا۔

میں نے راج کنور کا بتایا ہوا موبائل نمبر ملایا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ بڑے کنور کا اپنا موبائل تھا اور یہ نمبر بس چند مخصوص لوگوں کے علم میں تھا۔ نمبر سے پہلے انڈیا کا کوڈ ملایا تھا۔ بیل جانے لگی تو میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ تیسری بیل پر بڑے کنور نے کال ریسیو کی اور اپنے مخصوص ٹھہرے انداز میں بولا۔ "شہباز ملک...؟"

"تم جانتے تھے کہ میں کال کروں گا؟"

"ہاں مجھے یقین تھا کہ چند گھنٹوں کے اندر تمہاری کال آئے گی۔"

میں نے اس سے براہ راست سعدیہ کے بارے میں پوچھنے سے گریز کیا۔ "تمہیں یہ یقین کیوں ہے؟"

اس بار وہ ہلکے سے ہنسا۔ "تم بہت محتاط ہو شاید میرے منہ سے سننا چاہ رہے ہو؟"

"چلو ایسا ہی سمجھ لو۔"

"او کے میں بتاتا ہوں سادھنا جلد میرے پاس آنے

ثمامہ بن اشرس

ایک متکلم جو معتزلہ شیوخ میں سے تھا اور مامون معتصم اور واثق کے عہد میں دربار سے وابستہ رہا۔ نہایت عالم و فاضل شخص تھا۔ ہارون اور اس کے بعد مامون نے اس کی ذہنی قابلیت کے باعث دربار میں حاضری کی دعوت دی۔ ثمامہ نے اپنے زمانے کے اہم حل طلب مسائل پر نہایت مدلل طریق سے آزادانہ رائے قائم کی ہے۔ اس کی یہ رائے بسا اوقات منفرد ہوتی ہے۔ ثمامہ کی رائے میں "علم انسانی وہ چیز ہے جس کی ابتدا وقت میں ہوتی ہے لیکن جس کی کوئی علت اولی نہیں ہے جو وقت میں کام کر رہی ہو۔ نفسِ انسانی خود اسے پیدا نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اس صورت میں وہ گویا ایک ایسا فعل سرانجام دے گا جو خدا کا فعل ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ ہے اور ہمیں جس چیز پر اختیار حاصل ہے وہ صرف ہماری قوتِ ارادی کا باطنی فعل ہے۔ اس فعل کے نتائج اس میں شامل نہیں۔ ہماری فطری عقل ہمارے افعال کی اخلاقی اقدار طے کرتی ہے اور ان اقدار کا تعین اللہ کی طرف سے آمرانہ رنگ میں نہیں ہوتا۔ ہمارے تمام معارف (عقلی مدرکات) ضروری ہیں، اتفاقی نہیں۔ جس شخص کو خدا کی وہ معرفت حاصل نہیں جس پر منطق اسے مجبور کرتی ہے تو وہ احکامِ الٰہی کی تعمیل پر مامور نہیں۔ لیکن عدم تعمیل کی صورت میں وہ شرف انسانی سے محروم ہو کر حیوانوں کی سطح پر آجائے گا۔"

مرسلہ ظہیر الدین لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

والی ہے۔" اس نے تصدیق کی تو میرے اندر ایک رہی سہی امید تھی وہ بھی دم توڑ گئی۔ حقیقت پوری طرح عریاں ہو کر سامنے آگئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو؟"

"نمبر بتا رہا ہے تم پاکستان جا چکے ہو۔" اس نے کہا۔ "خیر یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے تم تقریباً بارہ گھنٹے بعد کال کرو تو میں سادھنا سے تمہاری بات کرا سکتا ہوں۔"

"اوکے میں نے مان لیا لیکن جب تم سعدیہ کے بارے میں جانتے تھے تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میں اسی وقت جان گیا تھا جب ایک شخص نے سادھنا کو....."

"وہ اب سعدیہ ہے۔" میں نے ٹوکا۔

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ میرے لیے وہ سادھنا رہے گی۔"

"جب تم جان گئے تھے تو تم نے اسے واپس حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔"

"اس کی چند وجوہات تھیں۔ اوّل میں اسے راج سے بچانا چاہتا تھا۔ دوسرے وہ اپنی زندگی بنا چکی تھی اور اس سے مطمئن تھی۔ مجھے مناسب نہیں لگا کہ اسے چھیڑوں۔ وہ بہر حال میری بہن ہے اور مجھے اس کی خوشی عزیز ہے۔"

"ابھی تم نے اسے اغوا کرایا ہے۔"

"تم کہہ سکتے ہو میں نے اپنی بہن کو واپس حاصل کر لیا ہے۔ لیکن وہ واپس اپنے شوہر کے پاس جا سکتی ہے بہ شرط کہ....."

"میں تمہیں اپنا خون پیش کر دوں۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "تم جانتے ہو وہ پریگنینٹ ہے اگر اسے یا اس کے بچے کو کچھ ہوا....."

"انہیں کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "اسے لانے والے مکمل پروفیشنل ہیں اور جانتے ہیں کون سا کام کس طرح کرنا ہے اسے خراش بھی نہیں آئے گی۔"

"اسے گیس سے بے ہوش کیا گیا ہے اور تم جانتے ہو بے ہوشی کی کوئی گیس غیر مہلک نہیں ہوتی ہے۔"

"بے ہوشی کی گیس بے ضرر ہے اور اسے بھی بہت احتیاط سے استعمال کیا گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں ضمانت دے رہا ہوں سادھنا کو ذرا بھی نقصان نہیں ہوگا۔"

"میں....." میں نے کہنا چاہا اسی لمحے لائن کٹ گئی

میں نے موبائل دیکھا وہ آن تھا اور بیٹری بھی چارج تھی۔ "یہ کیا ہوا؟"

"میرا خیال ہے بیلنس ختم ہو گیا۔" عبداللہ نے معذرت سے کہا۔ اس نے پرس سے اسکریچ کارڈ نکالا اور اسے اسکریچ کر رہا تھا کہ موبائل پر کال آنے لگی۔ بڑے کنور کا نمبر تھا میں نے کال ریسیو کی۔

"شہباز اب کیا کہتے ہو؟"

"میں کیا کہوں تم نے میرے لیے اور راستہ ہی کہاں چھوڑا ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "لیکن تم جانتے ہو واپس آنا اتنا آسان نہیں ہے۔ مجھے اپنے ساتھیوں سے بھی پوچھنا پڑے گا۔"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے جو لوگ سادھنا کو لا رہے ہیں وہ تمہیں بھی آرام سے انڈیا پہنچا دیں گے۔"

میرا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا۔ راج کنور نے خود بتا دیا تھا کہ سعدیہ کو اس کے پاس پہنچنے میں بارہ گھنٹے لگ سکتے ہیں۔ وہ یہ جان گیا تھا کہ میں پاکستان پہنچ گیا ہوں لیکن اسے یقیناً یہ علم نہیں تھا کہ میں کن حالات میں اور کس وقت یہاں پہنچا ہوں۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اب مجھے واپس آنے کے لیے کوشش کرنا پڑے گی جب کہ اس وقت واپس جانا میرے اختیار میں تھا۔ میں نے سوچ کر بڑے کنور سے کہا۔ "مجھے دو دن کی مہلت چاہیے اس وقت تک سعدیہ بھی تمہارے پاس ہوگی اور میں تصدیق کر سکوں گا کہ وہ ٹھیک اور خیریت سے ہے۔"

"مجھے منظور ہے تم دو دن سوچ سکتے ہو اس کے بعد ہاں کر دو گے تو اٹھارہ سے چوبیس گھنٹے میں تم میرے پاس آ سکتے ہو۔" خلاف توقع وہ فوراً مان گیا۔ "تم نے اچھا کیا جو مجھے سادھنا کی پریگنینسی کے بارے میں بتا دیا۔ میں ان لوگوں کو بریف کر دوں گا اور کنور پیلس میں تو تمام سہولتیں ہیں تم دیکھ چکے ہو۔"

"ہوں" میں نے ہنکارا ابھرا۔

"ٹھیک ہے میں تم سے دو دن بعد رابطہ کروں گا۔" اس نے کہا۔ "اسی نمبر پر۔"

"نہیں یہ کسی اور کا نمبر ہے میں خود کر لوں گا۔" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ عبداللہ اور بانو سن رہے تھے۔ بانو نے فوراً کہا۔

"آپ واپس نہیں جائیں گے۔"

عبداللہ نے اس کی تائید کی۔ "بالکل اور اکیلے جا...

کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کسی کو نہیں لے جا سکتا۔"

"ہم جائے گا۔" گاڑی کی طرف سے بیتو کی آواز آئی۔

"ہاں صرف بیتو جائے گا۔ اس لیے کہ یہ وہاں سے واقف ہے اگر پکڑا بھی گیا تو اس پر کم سے کم پاکستانی ہونے کا الزام نہیں لگے گا جو انڈیا میں سب سے سنگین جرم ہے۔"

اس دوران میں عبداللہ نے موبائل میں کارڈ لوڈ کر لیا تھا اس نے سفیر کو کال کی۔ "تم لوگ کہاں ہو؟"

"ہم جی ٹی روڈ کے قریب اسی جگہ ہیں۔" سفیر نے کہا۔ "شہباز آ گیا؟"

"ہاں میرے ساتھ موجود ہیں۔" عبداللہ نے کہا اور موبائل میری طرف بڑھا دیا۔ اس نے اسپیکر فون آن کر لیا تھا۔

"سفیر مجھے واپس جانا ہے۔" میں نے بلا تمہید کہا۔ "سعدیہ کو بڑے کنور نے اغوا کرایا ہے وہ اگلے بارہ گھنٹے میں اس کے پاس پہنچ جائے گی۔"

"ہم آ رہے ہیں۔" سفیر نے کہا۔ "بات کرتا رہ۔"

میں نے مختصر الفاظ میں سفیر کو بڑے کنور سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ "اس کی واحد شرط یہ ہے کہ میں واپس جاؤں۔"

"نہیں۔" سفیر نے مخالفت کی۔ "یہ سخت ناقابلِ اعتبار لوگ ہیں، مجھے یقین ہے وہ شرافت سے سعدیہ کو واپس نہیں کرے گا۔"

"میں جانتا ہوں یار، میں بھی مکاری کے جواب میں چالاکی سے کام لے رہا ہوں۔ میں نے اس سے دو دن کی مہلت حاصل کی ہے لیکن میں ابھی واپس جا رہا ہوں اور اس سے پہلے کہ سادھنا کنور پیلس تک پہنچے اسے چھڑانے کی کوشش کروں گا۔"

"شہباز یہ سب خطرناک ہے، یار اتنی مشکل سے تو تو واپس آیا ہے اور پھر اسی دلدل میں اترنا چاہتا ہے۔"

"سفیر مجبوری ہے میں سعدیہ کو واپس لانا چاہتا ہوں۔ وہ صرف وسیم کی بیوی نہیں ہے ہماری بھی بہت کچھ ہے۔"

"میں جانتا ہوں یار وہ مونا اور سویرا جیسی ہے۔" سفیر نے کہا۔ "پر ہمیں سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔"

"میں نے سوچ لیا ہے اور اس سے زیادہ کا وقت نہیں ہے ہیلی کاپٹر تیار ہے اور اس سے پہلے کوئی مسئلہ ہو مجھے واپس جانا ہے۔"

"رک جا یار ہم پہنچنے والے ہیں۔ یہ ایاز میری جان ہتھیلی پر رکھ کر ڈرائیونگ کر رہا ہے بس دعا کر خیریت سے پہنچ جائیں۔"

"کتنی دیر لگے گی؟"

سفیر نے ایاز سے پوچھا اور پھر مجھے بتایا۔ "یہ کہہ رہا ہے دس منٹ لگ سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں۔"

میں نے موبائل عبداللہ کو واپس کیا تو اس نے پھر کہا۔ "شہباز صاحب آپ سوچ لیں۔ جہاں تک سعدیہ کا تعلق ہے ہم اسے نہیں چھوڑ سکتے بعد میں ہم کسی اور طریقے سے اسے واپس حاصل کر سکتے ہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارا کیا خیال ہے بڑے کنور نے یہ انتہائی قدم اس لیے اٹھایا ہے کہ میں واپس نہ جاؤں۔ نہیں اگر میں نے انکار کیا تو سعدیہ وہاں آرام سے نہیں رہ سکے گی۔"

بانو کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ "آپ کا مطلب ہے وہ اپنی سگی بہن کو تشدد کا نشانہ بنا سکتا ہے؟"

"وہ ایسا ہی کرے گا، یہ اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جہاں آدمی سوائے اپنی ذات کے اور کسی سے پیار نہیں کرتا ہے۔ بڑا کنور بہر صورت اپنی بیماری سے چھٹکارا چاہتا ہے اور اس کے لیے اسے میرا خون درکار ہے۔ اس کے لیے وہ ہر حربہ استعمال کرے گا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" عبداللہ نے سر ہلایا۔ "مجھے فکر آپ کی واپسی کے طریقے کی ہے اس میں خطرہ بہت زیادہ ہے۔"

"ہم جیسے آئے ہیں ایسے ہی واپس جائیں گے۔ انڈیا میں خطرہ نہیں ہے کیونکہ وہاں کے حکام کی باقاعدہ اجازت سے آئے ہیں۔ یہاں خطرہ نہیں ہے کیونکہ ہم بلا روک ٹوک اندر تک پہنچ گئے اسی طرح واپس بھی پہنچ جائیں گے۔"

عبداللہ نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ اسی لمحے سڑک پر روشنی نمودار ہوئی، آنے والی گاڑی بہت تیزی سے آ رہی تھی مگر قریب آتے ہوئے اس کی رفتار کم ہوئی تھی۔ گاڑی آ کر پاس رکی۔ اس سے سفیر اور ایاز نکل کر مجھ سے گلے ملے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سفیر یہ جان کر بے چین ہوگیا کہ میں واپس انڈیا جارہا ہوں اس نے خفگی سے کہا۔ ’’تیرا دماغ خراب ہے۔‘‘

’’میں سعدیہ کو لینے جارہا ہوں۔ میں اسے بڑے کنور کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔‘‘

’’تو اس کی توقع پوری کررہا ہے۔‘‘

’’یار مجبور ہوں، تو جانتا ہے سادی ہمارے لیے کیا ہے۔ وسیم نے آج تک میرے لیے ہی کیا ہے مجھ سے کچھ لیا نہیں ہے یار آج اس کی بیوی اور ہونے والا بچہ مشکل میں ہیں تو میں کیسے پیچھے ہٹ جاؤں۔‘‘

’’میں بھی تیرے ساتھ چل رہا ہوں۔‘‘ سفیر نے کہا۔

’’تم لوگوں کا دماغ خراب ہے۔‘‘ اس بار میں برہم ہوگیا۔ ’’کوئی نہیں جائے گا۔‘‘

’’بس ہم جارہا ہے شوبی کے ساتھ۔‘‘ بیتو نے یوں فخر سے کہا جیسے کوئی ٹرافی جیت لی ہو۔

’’تم تو جاؤ گے انڈیا کے چمچے۔‘‘ سفیر بولا۔

’’ہاں ہم انڈیا کا چمچہ ہے اپنے ملک کا ہے۔‘‘ بیتو نے کہا۔ ’’آپ پاکستان کا چمچہ نہیں ہے۔‘‘

’’خدا کے لیے۔‘‘ میں نے پریشان ہوکر کہا۔ ’’یہ تم لوگوں نے کیا چمچوں کی جنگ شروع کردی ہے۔‘‘

عبداللہ ہنسا۔ ’’پچھلے دنوں انڈیا پاکستان کا کرکٹ میچ تھا ویسے تو ان دونوں کو کرکٹ سے خاص دل چسپی نہیں ہے مگر ایک دوسرے کی مخالفت میں پورا میچ دیکھا اور پورے میچ میں لڑتے رہے۔‘‘

بات مسکرانے والی تھی لیکن اس وقت میرا موڈ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ’’سفیر.... ایاز تم لوگ واپس جاؤ اور وسیم کو سنبھالو۔ اسے کہنا یہ میرا حکم ہے وہ کوئی حرکت نہیں کرے گا اور انڈیا آنے کی کوشش نہیں کرے گا۔‘‘

’’وہ نہیں مانے گا۔‘‘ سفیر بولا۔

’’او کے میں رابطہ کرکے خود اس سے بات کروں گا۔ بانو لیپ ٹاپ والا بیگ دو۔‘‘

بانو نے صرف بیگ ہی نہیں بلکہ اپنے پاس موجود ساری رقم نکال کر دے دی۔ ’’یہ آپ کے کام آئے گی۔‘‘

’’تھینک یو مجھے واقعی اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔‘‘ میں نے نوٹوں کی گڈیاں بھی لیپ ٹاپ والے بیگ میں ڈال لیں اور اسے اسٹرپ سے شانوں پر پہن لیا۔ بانو جذباتی ہوکر میرے بازو سے لگ گئی۔

’’ایسا کیوں کہتے ہیں میں تو خود آپ کی احسان مند ہوں۔‘‘ وہ کہتے ہوئے رو پڑی تھی۔

’’احسان کیسا تم بھول رہی ہو اب تم اس فیملی کا ممبر ہو۔‘‘ میں نے اس کا سر تھپکا پھر سب سے کہا۔ ’’عبداللہ، سفیر، ایاز اب بانو ہماری ذمے داری ہے۔ اس کا ہر ممکن خیال رکھنا ہے۔‘‘

’’انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔‘‘ عبداللہ نے یقین سے کہا۔

میں نے بانو سے کہا۔ ’’بس اب جاؤ اور دعا کرنا اللہ مجھے کامیاب واپس لائے۔‘‘

’’میں بہت دعا کروں گی۔‘‘ وہ آنسو پونچھتے ہوئے پیچھے ہوئی۔ ایاز، سفیر اور عبداللہ باری باری میرے گلے لگے تھے۔ یک لخت میرا دل بوجھل ہوگیا تھا۔ اپنے ملک اور اپنی سرزمین آنے کی جو خوشی ملی تھی وہ کافور ہوگئی تھی اور اب مجھے دوبارہ اسی سرزمین پر جانا تھا جہاں سوائے دشمنوں کے اور کوئی نہیں تھا۔ پتا نہیں میرے نصیب میں کیا تھا۔ عبداللہ نے کہا۔

’’جب آپ سعدیہ کو واپس حاصل کرلیں تو اس بار یہاں سے آپ کی واپسی کا بندوبست کریں گے۔‘‘

’’کوئی سورس ہے؟‘‘

اس نے سر ہلایا۔ ’’تبھی تو کہہ رہا ہوں، آپ رابطے میں رہیے گا۔‘‘

ان کو بھی جلد جانا تھا اور مجھے تو یہاں سے جلد نکلنا تھا۔ ابھی ہمیں ہیلی کاپٹر تک جانا تھا۔ وہ سب جانا چاہتے تھے لیکن میں نے منع کردیا۔ ’’ہمیں ایاز چھوڑنے جائے گا۔‘‘

ایاز خوش ہوگیا۔ وہ ایک طاقتور فور وہیل ڈرائیو لے کر آیا۔ ایک بار پھر عبداللہ اور سفیر سے گلے مل کر اور بانو کا سر تھپک کر میں گاڑی میں آگیا۔ بیتو بھی سنکاری کو لے آیا تھا۔ ہم روانہ ہوئے عقب میں وہ لوگ کچھ دیر نظر آتے رہے اور پھر تاریکی غالب آگئی۔ ایاز ہر ممکن تیزی سے ڈرائیو کررہا تھا۔ اسے ساتھ لانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ اگر ہمیں غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا تو ایاز ماہر ڈرائیور تھا اور یہ گاڑی بھی بہت شاندار تھی۔ مجھے خیال آیا۔ ’’شاہین کیسی ہے؟‘‘

’’بہت اچھی ہے اور خوش ہے۔ آپ کو دعائیں دیتی ہے کہ آپ مل گئے۔‘‘

’’شاید شاہین جیسے پُرخلوص لوگوں کی دعائیں ایسے وقت میں کام آتی ہیں جب میں بھی بے بس ہوجاتا ہوں۔‘‘

’’میں نہیں سمجھتا کہ آپ کبھی بے بس ہوتے ہوں گے۔‘‘

’’نہیں یار میں بھی انسان ہوں بہت بار بے بس ہوا۔ ہاں اتنا ہے کبھی ہار نہیں مانی۔‘‘

’’یہی چیز آپ کو دوسروں سے منفرد کرتی ہے۔‘‘

چند منٹ بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ میں نے ایاز سے پہلے ہی گاڑی کی لائٹس بند کروا دی تھیں۔ ہیلی کاپٹر کے پاس پہنچ کر گاڑی رکوا دی۔ ہم نیچے اتر آئے۔ آس پاس تاریکی تھی۔ مجھے لگا کہ وہاں سب ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں نے سب کو گاڑی کے پاس رکنے کو کہا اور خود دبے قدموں جھاڑیوں کی آڑ لیتے ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھا۔ دیو ہیکل پرندہ ساکت کھڑا تھا میں نے پاس جاکر دیکھا راج کنور بدستور بندھا بیٹھا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور ہلکی سی سیٹی بجائی۔ چند لمحے بعد وہ سب جھاڑیوں سے برآمد ہوئے۔ میں نے ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھولا اور راج کنور کو آزاد کیا۔ منہ سے کپڑا ہٹتے ہی اس نے کہا۔ ’’شہباز تم بہت دیر کررہے ہو مجھے صرف دو گھنٹے کی اجازت ملی ہے۔‘‘

’’فکر مت کرو اس میں سے صرف ڈیڑھ گھنٹا گزرا ہے ابھی مہلت ہے اور خبر یہ ہے کہ سنکاری کے ساتھ صرف ... میرا ساتھی جائے گا۔ تم یہیں رہوگے۔‘‘

اس نے جلدی سے کہا۔ ’’شہباز تمہیں مجھے واپس لے جانا ہوگا۔‘‘

’’فی الحال تو میں نے ایسا نہیں سوچا ہے۔‘‘ میرا لہجہ سرد ہوگیا۔

’’تمہیں معلوم ہے واپسی کے لیے بھی ایک پاس ورڈ ہے۔ اگر پوچھنے پر وہ پاس ورڈ نہیں دیا تو ہیلی کاپٹر مار گرایا جائے گا۔‘‘

’’تم جھوٹ بولتا ہے۔‘‘ بیتو آگے آیا اور اس نے راج کنور کے منہ پر ہاتھ مارا۔ وہ طیش میں آگیا تھا۔ راج کنور وہ شخص تھا جس کی ہوس اقتدار و دولت پر بیتو کا خاندان اور قبیلہ مارا گیا تھا۔ جب تک میں نے بیتو کو پیچھے کھینچا وہ اسے کئی ہاتھ رسید کرچکا تھا۔ راج کنور چلانے لگا۔

’’شہباز اسے روکو میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں اپنی ماں کی قسم کھاتا ہوں میں سچ کہہ رہا ہوں۔‘‘

’’ایک منٹ شہباز صاحب۔‘‘ ایاز نے مداخلت کی۔ ’’وقت نہیں ہے کسی وقت بھی کوئی آسکتا ہے۔ آپ اسے ساتھ لے جائیں اور اگر اس نے غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ واپسی میں کسی نے پاس ورڈ نہیں مانگا تو اسے ہیلی کاپٹر سے نیچے پھینک دیجیے گا۔‘‘

’’تم نے سن لیا راج کنور۔‘‘ میں نے اس سے کہا۔ ’’یہاں تمہارے پاس زندہ رہنے کا ایک چانس ہوگا لیکن اگر ایسا نہیں ہوا جیسا تم کہہ رہے ہو تو میں یہی کروں گا۔‘‘

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ’’میں نے جھوٹ نہیں کہا ہے تم دیکھ لوگے۔‘‘

میں نے سر ہلایا۔ ’’ٹھیک ہے تم ساتھ چلوگے۔‘‘

سنکاری پائلٹ سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ہیلی کاپٹر کے پرزوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کردی تھی۔ میرے اشارے پر سنکاری نے انجن اسٹارٹ کیا اور ایاز آخری بار گلے مل کر پیچھے ہوا تو بیتو نے خفگی سے کہا۔ ’’ہم آپ کا کچھ نہیں لگتا ہے بس شوبی سے ملنے جارہا ہے۔‘‘

’’لگتا کیوں نہیں دشمن جان۔‘‘ ایاز نے اسے گلے سے لگایا۔ اتنی دیر میں ہیلی کاپٹر کے پنکھے حرکت میں آگئے تھے۔ ذرا سی دیر میں ان کی رفتار اتنی تیز ہوئی کہ شور اور ہوا ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی۔ ایاز پیچھے ہٹ گیا اور بیتو اندر آگیا۔ دروازہ بند کیا تو ہوا سے نجات ملی لیکن شور کانوں میں گھسا جارہا تھا۔ ہیڈ فون پہن کر ذرا سکون ملا تھا۔ سنکاری چلا چلا کر بیتو سے ہیڈ فون پہننے کو کہہ رہا تھا۔ بالآخر بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ ہوا کے ساتھ مٹی اڑ رہی تھی اور اب ایاز نظر نہیں آرہا تھا وہ یقیناً پیچھے ہٹ گیا تھا۔ میں نے اپنے پاس ایک پستول رکھا تھا اور باقی اسلحہ بیتو والے بیگ میں ڈال دیا تھا جس میں خودکار رائفلیں بھی تھیں۔ سنکاری نے اسٹک کھینچی تو ہیلی کاپٹر ڈولتا ہوا ہوا میں بلند ہوا تھا۔ ذرا بلند ہوا تو ان لوگوں کے ہیولے دکھائی دیے تھے۔ میں جانتا تھا وہ مجھے نہیں دیکھ پارہے تھے لیکن پھر بھی میں نے ہاتھ ہلایا تھا۔ سنکاری نے ریڈیو آف کیا ہوا تھا اس لیے اگر ہمیں پاکستان کے دفاعی حکام کی طرف سے وارننگ دی جارہی تھی تو ہمیں علم نہیں تھا۔ سنکاری نے پچاس فٹ کی بلندی رکھتے ہوئے انڈین سرحد کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ایک منٹ بعد سنکاری نے خبردار کیا۔

’’ہم بارڈر کے پاس ہے۔‘‘

میں نے نیچے دیکھا۔ نیم تاریکی میں دریا کی وادی نظر

WWW.PAKSOCIETY.COM

آنے لگی تھی اچانک کہیں عقب سے شعلہ چمکا۔ میں نے چلا کر سنکاری سے کہا۔ ”میزائل.....بچو۔“

سنکاری نے بے ساختہ انجن کو پاور دی اور ہیلی کاپٹر بہت کم بلندی پر بہت تیزی سے آگے بڑھا تھا۔ اس نے زمین کی طرف جانے کے بجائے دریا کی وادی کو ترجیح دی تھی کیونکہ یہاں کسی چیز کے اچانک سامنے آنے کا امکان نہیں تھا۔ اتفاق کی بات تھی کہ میری نظر پڑ گئی ورنہ اس ہیلی کاپٹر میں میزائل وارننگ سسٹم نہیں تھا۔ چند لمحوں میں ہیلی کاپٹر کی رفتار دو سو کلو میٹرز فی گھنٹا تک پہنچ گئی تھی مگر پیچھے لپکنے والا میزائل اس سے کہیں تیز رفتار تھا۔ راج کنور کی بات بکواس ثابت ہوئی تھی کہ پاکستان کے پاس نیچے اڑنے والے ہیلی کاپٹرز کے خلاف کارروائی کے لیے میزائل نہیں ہیں۔ اگرچہ یہ خوشی کی بات تھی کہ میرے وطن کے محافظ غافل نہیں تھے مگران کی مستعدی سے ہماری جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ یقیناً اس ہیلی کاپٹر کو مارک کر لیا گیا تھا اور جیسے ہی یہ دوبارہ فضا میں بلند ہوا اسے نشانہ بنا لیا گیا تھا۔ میں جھک جھک کر دیکھ رہا تھا کہ میزائل کس طرف سے آرہا تھا اس وقت رات کی تاریکی کام آرہی تھی ورنہ دن کی روشنی میں اسے دیکھنا ممکن نہیں تھا جب تک وہ بالکل پاس نہ آجاتا اور جب وہ پاس آجاتا تو اس کے بعد صرف اجل کی آمد باقی رہ جاتی۔ میزائل تقریباً ایک کلومیٹر پیچھے بائیں طرف سے آرہا تھا۔ یہ لازماً پاکستانی سرزمین سے فائر کیا گیا تھا۔

”میزائل بائیں طرف تقریباً ایک کلو میٹر پیچھے ہے۔“

سنکاری فی الحال ہیلی کاپٹر کو سیدھا اڑا رہا تھا تاکہ رفتار میں کمی نہ آنے پائے۔ میزائل کہیں تیز رفتار اور کہیں پھرتیلا ہوتا ہے۔ ہم ننانوے فیصد خطرے میں تھے اور بچنے کا امکان صرف ایک فیصد تھا۔ میزائل بہت تیزی سے پاس آرہا تھا۔ جب وہ چند سو گز دور رہ گیا تو میں نے سنکاری کو خبردار کیا اور اس نے ہیلی کاپٹر لہرانا شروع کر دیا۔ باقیوں کا مجھے نہیں معلوم لیکن میرا برا حال تھا۔ ابھی اپنے پیاروں سے مل کر رخصت بھی نہیں ہوا تھا کہ موت پیچھے لگ گئی تھی اور موت بھی اپنوں کی طرف سے بھیجی گئی تھی۔ نیچے دریا کا پانی چمک رہا تھا۔ جب میں نے سنکاری کو خبردار کیا اس کے مشکل سے آدھے منٹ بعد میزائل ہیلی کاپٹر کے بہت پاس آگیا تھا اور ہیلی کاپٹر کے ساتھ ساتھ وہ بھی لہرا رہا تھا جیسے بین کی لے پر سانپ لہراتا ہے۔ اب سنکاری عقبی طرف خود دیکھ کر میزائل سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بیتو سے کہا۔

”سیٹ بیلٹ باندھ لو۔“

”ہم نے باندھ لیا ہے۔“ اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ ”شوبی آپ نیچے کود جاؤ ادھر پانی ہے۔“

میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ اس پر عمل کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ہیلی کاپٹر جس طرح لہرا رہا تھا درست انداز میں کودنا ممکن نہیں تھا اور پانی کے بجائے کہیں اور گرتے تو ہڈی پسلی لازمی ایک ہو جاتی۔ لاش کا بھی کچومر نکل جاتا۔ سنکاری نے بالکل پاس آنے والے میزائل سے بچنے کے لیے ہیلی کاپٹر لہرایا تھا کہ ایک دھماکا ہوا۔ فضا شعلے سے روشن ہو گئی۔ ایک لمحے کو ایک ایسا لگا کہ دھماکے سے ہیلی کاپٹر کے ساتھ ہمارے بھی پرزے اڑ گئے تھے۔ مگر جب حواس بحال ہوئے تو ہیلی کاپٹر ٹھیک تھا اور پرواز کر رہا تھا۔ مگر اسی لمحے سنکاری چلایا۔ ”ہم ہٹ ہو گیا ہے۔“

میں نے مڑ کر دیکھا تو ہیلی کاپٹر کے عقبی حصے سے شعلے نکل رہے تھے اور اس کی دم کا ایک حصہ اڑ گیا تھا اب ہیلی کاپٹر از خود لہرا رہا تھا۔ کیبن میں جیسے زلزلہ آیا ہوا تھا۔ اگر کوئی اور میزائل پیچھے ہوتا تو اس کے لیے درست نشانہ لینا ممکن نہیں تھا۔ میں نے نشست کو سختی سے تھام رکھا تھا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی سیٹ بیلٹ نے مجھے جکڑا ہوا تھا۔ ہیلی کاپٹر جس طرح لہرا رہا تھا صاف لگ رہا تھا کہ وہ جلد کریش ہونے والا ہے۔ میں نے چلا کر سنکاری سے کہا۔ ”اسے پانی میں اتارنے کی کوشش کرو۔“

”نہیں کر سکتا۔“ وہ اسٹک سے کشتی لڑتے ہوئے بولا۔ ”یہ میرے قابو میں نہیں ہے۔“

زمین تیزی سے نزدیک آرہی تھی ہم دریا کی وادی میں تھے۔ گرم موسم کے باوجود دریا میں پوری طرح پانی نہیں تھا کہیں یہ چوڑا تھا اور کہیں بس برائے نام پانی تھا۔ سو کلو میٹرز سے اوپر رفتار سے پانی میں گرنے سے بھی بس اتنا فائدہ ہوتا کہ ہیلی کاپٹر میں آگ نہیں لگتی۔ زمین اتنی قریب آگئی کہ ہیلی کاپٹر بس اب تب میں گرنے والا تھا۔ وہ دائیں طرف کٹ رہا تھا اور پانی بائیں طرف تھا۔ میں نے جھپٹ کر سنکاری کا اسٹک والا ہاتھ پکڑا اور اسے پوری قوت سے بائیں طرف کھینچا۔ ہیلی کاپٹر جھوم کر مڑا اور اگلے لمحے پانی کی سطح سے جا ٹکرایا تھا۔ ایک دھماکا ہوا اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا تھا۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(ناصر حسن ابدال کا جواب)

عشا نور بلوچ.........نواب شاہ

یہ ہنسی ہنسی نہیں ہے، یہ فریب ہے ہنسی کا
نہ اسے سمجھ سکے تم نہ سمجھ سکا زمانہ

زاہد حسین محسود.........لاہور

یہ ذوقِ بے دلی تو اب ملی ہے ورنہ جب دیکھو
درِ دل پر تمناؤں کے سو سائل نکلتے ہیں

(عقیل تبسم لاہور کا جواب)

محمد عقیل چٹھہ.........حافظ آباد

رستہ بھول جاؤ گے پھر وقت کے جزیرے میں
تو بھولی بسری دعا ہوگا یہ کبھی سوچا نہ تھا

حسیب ملتانی.........میرپور

رنج سہتے رہے مسکراتے رہے
اپنی مجبوریاں ہم چھپاتے رہے

(یاور حیات بہاولپور کا جواب)

نوازش کریم.........پشاور

یہی تو درد ہے دل کو جو دھڑکاتا ہے سینے میں
یہی تو ایک دولت ہے جو انسانوں کے ہاتھ آئی

احباب کرم پوری.........شادی پور

یہ آئی ہے کس محفل ناز سے
خراماں خراماں صبا جائے ہے

نوشین اکرام.........کلر سیداں

یہ زمیں یہ خلا کی رقاصہ
آدمِ نو کے انتظار میں ہے

نسیم احمد.........جہلم

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

(آصفہ آصف کراچی کا جواب)

نسرین عادل.........کراچی

میری نگاہِ شوق کی افتادگی نہ پوچھ
تو دیکھ تیرے چہرے میں کیا رنگ بھر گئی

طالب حسین طلحہ.........سینٹرل جیل ملتان

مجھے تقدیر سے کوئی گلہ تو نہیں ہے مگر
رو پڑے گا تو بھی جو اگر میرا مقدر دیکھے

مسرور احسن.........اسلام آباد

میں نے سوچا تھا اب تیرے آنچل تلے
عمر کٹ جائے گی نیند آجائے گی

نیاز احمد ملکانی.........کراچی

ماحول نے ہنسنے کی ترغیب تو دی ہوگی
رسما بھی مرا چہرہ یوں بن نہ سکا ہوگا

انور احسن رمزی.........کوئٹہ

مجھ سے کہتی ہے دم سجدہ زمیں اے پرفریب
دل تیرا جھکتا نہیں کیوں تیری پیشانی کے ساتھ

(اختر حسین وہاڑی کا جواب)

محمد عزیز میئے.........لندن

اسے گمان تھا کہ چاہا اسے زمانے نے
عزیز سب کو تھا لیکن ضرورتوں کی طرح

ممتاز حسن.........شیخوپورہ

اب کہیں تو کہیں میں، یہ ویرانیاں
تیری میری ملاقات ممکن نہیں

واصف اقبال.........راولپنڈی

آئے بھی عیادت کو احباب تو کیا ہوگا
اک زہر بھرا خنجر دامن میں چھپا ہوگا

نیاز اقبال.........ملتان

اس ہجوم ہوا و ہوس میں
عشق خلوت نشیں بن گیا

(نائلہ فرحت ملتان کا جواب)

سلیم کامریڈ.........کھاتاں

یزداں و اہرمن کی حکایات کے بدلے
انساں کی روایات کو دہرا کے گزر جا

فرزانہ امام.........کراچی

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندہ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

ملک سرفراز.........حیدرآباد

یہ دنیا جہاں سانس لیتے ہیں ہم تم
سزا کا چلن جرم سے پیشتر ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

منظر احسن.........شادی پور
یہ اور بات کہ میری نظر میں جچ نہ سکے
وگرنہ تم سے حسیں تو نگر نگر میں ہیں
صنم لاشاری.........ڈی آئی خان

یہی ہیں راہ بر کیا آج کل کے
ٹھہر جاتے ہیں جو دو گام چل کے
(عارف خان سکھر کا جواب)
شاکر عطر خان.........ڈیرہ مراد جمالی

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
واقف کریم واقف.........رحیم یار خان

انسان تذبذب کے عالم میں بھٹکتا ہے
سوچوں کے سمندر میں گم صم ہے سلگتا ہے
فرزانہ ممتاز.........اسلام آباد

آئین معیشت ہی جب حرص فزا ہوگا
نفرت میں اضافہ بھی دنیا میں سوا ہوگا
بشیر فاروقی.........چنیوٹ

اگرچہ لالہ و گل میں لطافتیں ہیں مگر
کسی کا حسن شریک نگاہ ہوتا ہے
(ناہید وقار کا جواب)
شرف معروف حمیدی.........کراچی

آتشِ عشق بھری ہے تیرے رخساروں میں
کون منہ ڈالے دہکتے ہوئے انگاروں میں
فرحین مصطفیٰ.........جھنگ

آسمان زندگی پہ عمر بھر
روز سورج کی طرح ڈھلتا رہا
صفی حسن.........کرم پور

اس کے ہر خط سے ٹپکتا تھا محبت کا چلن
کتنے ناشائستہ جملے میری تحریروں میں تھے
(احمد جاوید سکھر کا جواب)
احمد چوہان، رانا حبیب الرحمٰن.........سینٹرل جیل لاہور

نیند تو درد کے بستر پہ بھی آجاتی ہے
تیری آغوش میں سر ہو یہ ضروری تو نہیں
منظر علی خان.........لاہور

نہیں جانا مجھے دیر و حرم میں
یہاں دونوں جگہ پتھر پڑے ہیں
حسن خان.........پشاور

نرم سانسوں میں ڈھل گئی تھی فضا
شب کی شب ہم نفس رہا ہے جسم
اکبر الطاف شیرازی.........لاہور

نرم جھونکے شاخ پر جھولا جھلاتے تھے
گدگدانے چھیڑنے منہ چوم جانے کے لیے
نزہت فاروق.........کراچی

نہ جانے کون سا آنسو کسی سے کیا کہہ دے
ہم اس خیال سے نظریں جھکائے بیٹھے ہیں
(عظمت سرسٹہ کا جواب)
محمد عقیل چٹھہ.........حافظ آباد

دن کو ہم ان سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے
رسم پابندی اوقات چلی جاتی ہے
اکبر خان.........کوئٹہ

وسعتِ گیہ تراش تو ہے خشک ہو چکا
افضل رہیں گے گھاس کے میدان ہرے بھرے
سعید ملک.........لاہور

دل کے نگر تک کرنیں کب آنے دیتے ہیں
جس کے بس میں چاند ستاروں کا خرمن ہے
(رضوان تنولی کریزوی کراچی کا جواب)
آصف جاوید.........کراچی

یہ محبت ایسا منفرد کھیل ہے غالب
جو سیکھ جاتا ہے، وہ ہار جاتا ہے

وہ جس کے دم سے ہے روشن ہماری بزم خیال
نادرہ رخ ہے کوئی کہکشاں جبیں ہے کوئی
(کریم بخش جتوئی لاڑکانہ کا جواب)
ناہید فاطمہ.........وینہ جہلم

وہ اس کی گفتگو کلیاں چٹکنے کی صدا جیسے
یہ نرمی اس کے لہجے میں ہمارے پیار سے آگئی
نادرہ خورشید.........کراچی
(عظمت سرسٹہ کا جواب)
محمد عقیل چٹھہ.........حافظ آباد

وہ بھی کیا شخص تھا کہ جس کی ذات پر محسن
جب اعتبار بڑھ گیا تو اختیار نہ رہا

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش 98
30 جنوری 2014ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام.................................ہے۔

نام:.................................

پتا:.................................

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات، مورخہ 30 جنوری 2014ء تک علمی آزمائش 98 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ.........کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں
(شعر الگ کاغذ پر ہے)
59

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

اگر آپ کو
ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو
شکایت فیکس کریں
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
ثمر عباس 0301-2454188
بدر الدین سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200
فیکس نمبر 35802551
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

علمی آزمائش۔ 98

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کرکے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کرکے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 جنوری 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1833 میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ جنوری 1910ء میں بمقام لاہور انتقال کیا۔ اردو کے بڑے انشا پردازوں میں شمار ہوتا ہے۔ اردو کی پہلی کتاب تا اردو کی چوتھی کتاب آپ ہی نے تصنیف کی۔ تصنیفات کی تعداد 41 سے زائد ہے۔

علمی آزمائش 96 کا جواب

اردو زبان کے مشہور شاعر تلوک چند محروم، عیسیٰ خیل' میانوالی میں 1887ء میں پیدا ہوئے۔ 1908 میں سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے جے اے وی کا امتحان پاس کرکے مشن ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان میں ملازم ہو گئے۔ 1932ء میں راولپنڈی آکر کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ 1966ء میں فوت ہوئے۔

انعام یافتگان

1- کوکب عثمانی، لاہور 2- آفتاب خان، کوئٹہ 3- زرین آفاق، کراچی
4- احمد مجاہد، سکھر 5- نعیم آفاق، شادی پور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے سید عزیز الدین (2 کوپن) سید عباس رضا رضوی تنویر (کھوکھراپار) ناعمہ تحریم، امیر السلام، جمیل عثمانی، اختر بلقیس کوکب، ثنا بخاری، آفتاب منصور، اقبال احمد چشتی، اختر حسین، نوشین ملک، احسن خان اچکزئی، اقبال احمد چشتی، انوار علی شاہ، اختر عباس، طارق حبیب، نعیم اختر، اقبال قریشی، فرقان حمیدی، نعمت مرزا، جاوید اقبال، منظر خان، فیضان انصاری، فیض مسیح، ڈھوڈا مل، بھیکومل، ثنا یوتکی، جمنا اختر۔ لاہور سے رانا حبیب الرحمن، کمال حسن، مسز نادر شاہ، سلمان زیدی، سلیم درانی، شاہینہ بتول، چوہدری نیاز مسلم خان، زینت انصاری، نذیر مرزا، ماسٹر فیض محمد، انور کلیم شاہ، فلک شیر، ثنا بخاری، کوکب گردیزی، فیض ملک، بہادر خان، شہباز خان، ثاقب خان، انوار شاہ، یوسف خان، ابراہیم شاہ، محمد پہلوان اختر، نگار ملک، بیگم زوار شاہ، نوشین ملک، فیض الحسن، مرزا یوسف بیگ۔ ملتان سے طالب حسین طلحہ، محمد منیب چشتی، (نشیمن ولاز) عقیل احسن، حبیب الرحمن، شمروز، اصغر خان۔ پشاور سے شیر خان، مولانا ریاض محسن، بشیر فاروقی، قاسم جان، احمد مجاہد، مرتضیٰ زیدی، فہیم عباس، مصیب بٹ۔ شیخوپورہ سے ندا ممتاز، ثریا فاطمہ، ممتاز خان عقیل فیضان۔ ڈیرا غازی خان سے ارشاد حسین، ناصر حسن، محمود نیاز، خان محمد خان، فہیم الدین۔ ڈیرا اسماعیل خان سے زوریز عالم خان، ارشد آفاق۔ ملتان سے زینت خان، عتیق الرحمن، فیض الحسن، قیام خان، شیریں عدنان، زہیب سلطان، نور خان ترمذی، شہباز خان، ملک فیروز، پروین سلطان، نعمان الحسن، عبادت حسن، قیام الدین خان۔ جہلم سے نعمت اللہ، ابرار شیخ، جاوید محمد حسن، تقی عثمان، نیاز حسن، حلیم اللہ خان، یاسمین، محمد ندیم، کاظم بیگم، فرحت اللہ، ارتضیٰ حسین، فہیم حسن، عباس۔ حیدرآباد سے ماہ رخ (لطیف آباد) بہاولنگر سے نوشین خٹک۔ بہاولپور سے وقار احمد، فراز احسن فاروقی۔ میانوالی سے سہاب خان، ملک انور۔ لیہ سے خاقان الحسن۔ مظفر گڑھ سے منیب الرحمن، فیضان عثمانی، عقیل سید، عبادت حسن، قیصر خان، عطا خان، فیروز حسن، اصر محمود، امجد ملکانی، شبیر خان، فہیم وٹو، ماہم حسن۔ بھکر سے فقیر غلام حسین ضیائی، ہشام بنگیال (دریا خان)۔ اسلام آباد سے جاوید محسن ملک، ذیشان شاہ، سنجیدہ شاہ، انعم بٹ، شاہنواز، جاوید قیصر، ذوالقرنین، فصاحت مرزا، بلال مصطفیٰ، سلام خان، شریف الحسن، نادر خان، صلاح الدین، مرید علی خاکوانی، اسلم خان، بیگم امتیاز علی دستوری، مہر خان، اصغر عباس۔ راولپنڈی سے ملک نوریز، فتح الدین، قیصر خان، عدنان سعیدی، غضنفر عباس، ابرار الحسن، شریف شاہ، حق نواز، امام الدین، بشیر کمال، فیض خان، صالح الرحمن، سید عباس زیدی، عباس مہکری، قاسم جان۔ میرپور خاص سے مرزا طاہر الدین بیگ۔ کوئٹہ سے تقی چنگیزی، نور الحسن زیدی نور، فرید خان، ارباب خان، محمد فیضیاب، مستقیم اللہ، متقی کاظمی، عائشہ بختاور، نور فاطمہ، ارباب چنگیزی، فرحت بابر، خاقان عباس، عنایت، اچکزئی، فیاض ناصری، شہید حسین، انعام اللہ، مغنی فیض۔ منڈی بہاؤالدین سے زاہد علی، تاثیر حسین، فرحت خان، ندا علی، ناصر کیانی، احمد جاوید، سعید مصطفیٰ۔ سیالکوٹ سے منظر خان، حسن عالم، ارشد حسین، ندا آفاق، جاوید مظفر۔ درویش خان، محمد مظہر، سید محمد میثم رضوی، فرحت حسین باقری، فیاض محمد، اکبر خان۔ سرگودھا سے اطہر یونس، ثنا اللہ، فتح باری، آفتاب خان، نوید ہاشمی، آفتاب محمد خان، رانا ظفر اقبال، نوشین فاطمہ، کلیم خان، عباس اختر، منظر حسین، نصیر عباس، عظمت اللہ، نصیر عباس، نصرت افروز، امجد خان، نعیم خان، حکیم اللہ، ارباز خان۔ کوہاٹ سے فدا حسین۔ رحیم یار خان سے افضال میو، امجد اقبال، فصاحت خان، نیاز حسن، نسیم احمد، ملک فیروز الدین، ارشد محمود، ثنا بتول، فہیم شاہ، محمد سراج الدین، اختر عباس، عمر مقصود، ایم اے شاہد، علی عباس، خادم حسین، فیض شاہ، فیض بلوچ۔

ممالک غیر سے اشفاق کیانی (جرمنی) انعام اللہ، فصاحت خان (العین)۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سلطانہ بیگم

مکرمی مدیر اعلیٰ
سلام مسنون!
میں رائٹر تو نہیں لیکن سرگزشت پڑھتی ضرور ہوں۔ آج پہلی بار اپنی مکمل آپ بیتی لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ اگر زبان وبیان کی غلطی نظر آئے تو اسے درست کرلیجئے گا نو آموز سمجھ کر۔

رخسانہ
(کراچی)

میں نے سلطانہ بیگم کے گھر کی کال بیل بجائی تو ان کی نوکرانی گل نے دروازہ کھولا۔ میں اندر آئی۔ سلطانہ بیگم برآمدے میں تخت پر براجمان تھیں۔ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا شاید ڈیڑھ سو گز پر تھا لیکن اپنی صفائی ستھرائی اور طریقے سلیقے کی وجہ سے بڑا لگتا تھا۔ جو چیز بھی تھی بہت صاف ستھری اور اعلیٰ درجے کی تھی۔ سلطانہ بیگم کا طنطنہ بھی ایسا تھا جیسے ہزار گز کی کوٹھی کی مالکن ہوں۔ یہ اوسط درجے کا علاقہ تھا۔ متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ اپنے مسائل میں گھرے ہوئے اور ان کو حل کرنے کی جدوجہد میں لگے رہنے والے لوگ تھے۔ میرا کام اسی علاقے میں چلتا تھا۔ شوہر کے مرنے بعد اور چار بچوں کی پرورش کرنے کے لیے میں نے روزگار کا بوجھ بھی اپنے شانوں پر اٹھالیا اور رشتے کرانے لگی۔ جب تک میاں حیات تھے بے فکری کی زندگی تھی، آسائشیں نہیں تھیں مگر بہت تنگی بھی نہیں تھی۔ میں اپنے گھر میں رہتی اور جب فرصت ہوتی تو آس پاس محلے والیوں سے ملتی۔ میری شروع سے فطرت تھی کہ جس سے ایک بار تعلق بنا لیتی اس سے تعلق قائم رکھتی چاہے مجھے اس میں مشکل ہی کیوں نہ ہو۔

یہ چیز بعد میں کام آئی۔ پندرہ سالوں میں بے شمار لوگ آئے اور پھر محلے سے چلے گئے۔ میرے ان سے تعلقات برقرار رہے۔ یوں میری جان پہچان کا حلقہ وسیع ہوتا گیا۔ جب میں نے رشتے کرانے کا کام شروع کیا تو اسی چیز نے سب سے زیادہ مدد کی۔ لوگ مجھ پر اعتبار کرتے تھے اور جانتے تھے کہ میں پُرخلوص ہوں اس لیے کام چل نکلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ میں نے پانچ سو روپے رجسٹریشن فیس رکھی تھی اور رشتہ کرانے پر حسب توفیق پانچ سے دس ہزار لیتی تھی لیکن کوئی میرے حصے میں ڈنڈی مارنا چاہتا تو اس سے زیادہ بحث نہیں کرتی تھی۔ جھگڑا کرنے سے کام خراب ہوتا تھا اور اس سے آگے کام نہیں ملتا تھا اس لیے میں صبر سے کام لیتی تھی کہ دینے والی اللہ کی ذات تھی جو میرے مقدر میں تھا مجھے کہیں اور سے مل جاتا لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ زیادہ تر اپنی خوشی سے زیادہ ہی دیتے تھے۔ دس سال کے عرصے میں بے شمار رشتے کرائے۔ اچھا کمایا، اپنے بیٹوں کو پڑھایا، بیٹیوں کو تعلیم دلا کر ان کی شادی کی۔ بیٹیوں کی رخصتی کے ساتھ ساتھ بہوئیں بھی لے آئی۔

کیونکہ میرا کام ہی رشتے کرانا اور گھروں میں جانا تھا اس لیے میں نے ان معاملات کو بہت پاس سے دیکھا۔ ہمارے ہاں لوگوں میں قانونی رشتوں کے حوالے سے بڑی عجیب سوچ اور خیالات ہیں۔ جو چیز لوگ اپنی بیٹیوں کے لیے چاہتے ہیں بہو کے حوالے سے اس کے برعکس خواہش رکھتے ہیں۔ اس تضاد سے گھروں میں ناچاقیاں اور مسائل جنم لیتے ہیں، جو بالآخر گھر ٹوٹنے کا سبب بنتے ہیں۔ میں نے ان سب باتوں کو نوٹ کیا اور اپنے گھر میں اس تضاد کو آنے نہیں دیا تھا۔ میرے دو بیٹے ہیں۔ ان کی شادی کرکے ان کو گھر میں ان کا حصہ دے دیا۔ بڑا بیٹا عادل اوپر والے پورشن میں رہتا ہے اور چھوٹا کامل اس سے اوپر رہتا ہے نیچے والا پورشن میرے پاس ہے۔ یہ گھر میرے شوہر نے بنایا تھا پھر عادل کمانے لگا تو میں نے اس کا پورشن بنایا۔ اور جب پورشن بن گیا تو اس کی شادی کر دی۔ اسی طرح کامل کی کمائی سے اس کا پورشن بنایا اور اب وہ اپنے گھر میں خوش تھا۔ بہوئیں اپنے گھر میں خوش ہیں۔ میں نے ان سے اچھا سلوک کیا تو جواب میں وہ میرا خیال رکھتی ہیں۔ ناشتا میں خود بناتی ہوں۔ دوپہر کا کھانا عادل کے گھر سے آتا ہے اور رات کا کامل کے گھر سے۔ ہاں بیٹیاں ملنے کے لیے آئیں تو میں بہوؤں پر بوجھ نہیں ڈالتی خود بنالیتی ہوں۔ کبھی کبھی وہ اصرار کرکے بنالیتی ہیں ورنہ میرا ہاتھ بٹانے آجاتی ہیں۔

جب عادل اور کامل کمانے لگے تو انہوں نے اصرار کیا کہ میں کام چھوڑ دوں اب وہ کمارہے ہیں۔ لیکن میں نے کچھ وجوہات کی بنا پر انکار کر دیا۔ اول میرا کام محنت مشقت والا نہیں تھا۔ چلنا پھرنا پڑتا تھا تو یہ بھی صحت کے لیے اچھا تھا۔ دوسرے وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی جب چاہتی اور جتنا چاہتی کام کرسکتی تھی۔ تیسرے لوگوں سے ملنا جلنا رہتا تھا۔ میرا وقت اچھا گزر جاتا اور سب سے بڑھ کر اللہ نے اپنی روزی دی ہوئی تھی، میں اولاد پر کیوں انحصار کرتی؟ ویسے بھی آج کل مہنگائی کے دور میں جب تک گھر کا ہر فرد نہ کمائے گزارہ نہیں ہوتا ہے۔ مجھے کام کی عادت بھی ہوگئی تھی اب گھر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس لیے میں نے کام چھوڑا نہیں تھا۔ اب زیادہ تر علاقے میں رشتے کرتی تھی دور نہیں جاتی تھی۔ سلطانہ بیگم میرے گھر سے چند گلی چھوڑ کر رہتی تھیں۔

وہ چند سال پہلے اس مکان میں آئی تھیں۔ میاں اسٹیٹ ایجنسی چلاتے تھے اور انہوں نے یہ گھر خرید لیا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ جس بیوہ کا یہ مکان تھا اسے ڈرا دھمکا کر اور جعلی کاغذات بنوا کر مجبور کر کے یہ گھر اونے پونے خرید لیا تھا۔ لیکن یہ سب سنی سنائی تھی حقیقت کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔ سلطانہ بیگم کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ دونوں بیٹے باپ کے ساتھ ہی اسٹیٹ کا کام کرتے تھے۔ میں نے بتایا نا کہ ایک خاص طبقے میں رہتی تھیں اس لیے آس پاس کی عورتوں سے ملنا جلنا نہ ہونے کے برابر تھا۔ ظاہر ہے جب اپنے محلے والیوں سے نہیں ملتی تھیں تو مجھ سے تعلق کہاں سے ہوتا۔ ان کی نوکرانی گل میری جانے والی تھی، کچھ عرصے پہلے گل نے مجھ سے کہا۔ ”رخسانہ باجی..... میں نے بیگم صاحبہ کو بتایا کہ آپ رشتے کراتی ہو وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

گل مجھے جانتی تھی اس کی شادی بھی میں نے کرائی تھی۔ "مل تو لوں پر سنا ہے بڑے نخرے والی ہیں، کسی کو کچھ نہیں سمجھتی ہیں اور میں نے ہمیشہ عزت سے کام کیا ہے۔ جس گھر میں جاتی ہوں وہاں لوگ برابر کا سلوک کرتے ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں باجی۔" گل نے مجھے تسلی دی۔ "میں نے بیگم صاحبہ کو بتا دیا ہے آپ کے بارے میں۔"

"ویسے ہیں کیسی اب تک ان کے بارے میں سنا ہی سنا ہے۔"

"ان لوگوں میں سے ہیں باجی جن کے لیے کہتے ہیں کہ زبان کے کڑوے اور دل کے میٹھے ہوتے ہیں۔ مجھے ڈانٹتی ہیں پر خیال بھی بہت رکھتی ہیں۔"

"شوہر اور بچیاں کیسی ہیں؟"

"شوہر تو اللہ کی گائے ہیں جیسے بیگم صاحبہ کہیں گی ویسا ہی کریں گے۔ بیٹے بھی باپ کی طرح ہیں، ماں کی آنکھ کے اشارے پر چلتے ہیں۔ بہوؤں کو دبا کر رکھتی ہیں مگر ان سے برا سلوک نہیں ہے اچھا کھانا پینا اور پہننا اوڑھنا ہے پر ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوتا ہے۔ بچیاں بھی اچھی اور سلجھی ہوئی ہیں پر ماں کے زیر اثر ہیں یوں سمجھ لیں کہ بیگم صاحبہ کی مرضی کے بغیر گھر میں پتا بھی نہیں ہلتا ہے۔"

"ٹھیک ہے ان کو بتا دینا میں موقع نکال کر چکر لگاؤں گی۔" میں نے گل سے کہا تو وہ خوش ہوگئی۔

"باجی! میں نے بیگم صاحبہ سے آپ کی بہت تعریف کی ہے۔"

میں ہنسی۔ "مروا نہ دینا وہ پتا نہیں مجھ سے کیا کیا توقعات لگالیں اور پوری نہ ہوں تو تیری بات خراب ہوگی۔"

"نہیں ہوگی رخسانہ باجی! میں آپ کو جانتی ہوں۔"

دو دن بعد میں سلطانہ بیگم کے گھر پہنچی تو وہ بہت تپاک اور رکھ رکھاؤ سے ملیں۔ پڑھی لکھی تھیں اور ان کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی بہت اچھا تھا۔ دہلی کے ایک نواب خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو تقسیم کے وقت لٹ پٹ کر پاکستان آیا اور اپنی وضع داری کی وجہ سے اپنا حق بھی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ سلطانہ بیگم یہیں پیدا ہوئی تھیں لیکن ان میں نوابی طنطنہ برقرار تھا۔ البتہ ان کی بچیاں سادہ تھیں یعنی جیسی آج کل کی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ سلطانہ بیگم بہت خوب صورت تھیں اور اگر ان کے حسن کو شاہانہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ سرخ و سفید رنگت، نہایت گھنے اخروٹی رنگ کے بال، غلافی آنکھیں اور کھڑا ناک نقشہ، بے داغ جلد، پچاس سال کی عمر میں بھی جھریوں سے پاک کسا ہوا بدن تھا۔ ان کے میاں عام سی صورت والے مرد تھے۔ اتفاق سے بچیاں باپ پر گئی تھیں۔ خوب صورت تھیں لیکن ماں کی خوبصورتی کا دسواں حصہ بھی حاصل نہیں کیا تھا۔

بڑی والی ریحانہ بیس سال کی تھی اور گریجویشن کے آخری سال میں تھی۔ اس کے نین نقش اچھے تھے مگر رنگ سانولا تھا۔ اگرچہ اس میں بھی کشش تھی مگر وہ گوری نہیں تھی۔ اس سے چھوٹی آئینہ اٹھارہ سال کی تھی رنگ وروپ اس کا بھی تقریباً ایسا تھا۔ سب سے چھوٹی پندرہ سال کی امینہ تھی۔ اس کا رنگ صاف تھا مگر نقش بہت اچھے نہیں تھے اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تینوں بہنیں بس قبول صورت تھیں۔ البتہ تعلیم، سلیقے اور خاندان کے لحاظ سے ممتاز تھیں۔ مالی لحاظ سے بھی ٹھیک تھے۔ گھر میں اعلیٰ درجے کا فرنیچر اور سامان تھا۔ اپنی گاڑی بھی تھی۔ میں ایک گھنٹا سلطانہ بیگم کے پاس رکی اور اس دوران میں انہوں نے بہت کچھ بتایا اور میں نے بہت کچھ نوٹ کیا۔ ان کی دونوں بہویں موجود تھیں اور اپنے اپنے کاموں میں لگی تھیں مگر وقفے وقفے سے سلطانہ بیگم سے ہدایات لے رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گھر اور اس کے کاموں پر ان کا مکمل قابو تھا۔ انہوں نے کہا۔ "رخسانہ باجی ہماری بچیاں ہم پر بھاری نہیں ہیں لیکن انہیں اپنے گھر کا کرنا ہے۔ ہم چاہتے ہیں ابھی سے رشتے کی تلاش شروع کر دیں۔ مناسب رشتہ بھی جلدی کہاں ملتا ہے۔"

"یہ تو نصیب کی بات ہے، میرے تجربے میں ایسے بھی رشتے ہوئے کہ بس چند دنوں میں بات سے لے کر رخصتی تک سب ہوگئی مگر آپ نے اچھا کیا جو ابھی سے تلاش شروع کر رہی ہیں۔ میرا اصول ہے کہ میں اس وقت تک دونوں پارٹیوں کو نہیں ملواتی ہوں جب تک وہ رشتے میں اچھی طرح دل چسپی نہ لینے لگیں۔ جو لوگ بس منہ اٹھا کر لڑکی دیکھنے کی بات کرتے ہیں ان کا تو رشتہ بھی نہیں کراتی۔ اس کے لیے میں پوری ذمے داری لیتی ہوں اور مجھے معلومات اور شرائط کا پورا علم ہونا چاہیے۔ اسی صورت میں رشتے کی ذمے داری لیتی ہوں۔"

"ہمیں آپ کی ہر شرط منظور ہے اور آپ جو پوچھیں گی ہم بتائیں گے۔"

"ٹھیک ہے میں کل اپنا رجسٹر لے کر آؤں گی۔ آپ بچی کی کم سے کم تین اچھی تصویریں تیار رکھیے گا۔"

سلطانہ بیگم نے مجھے پانچ سو فیس دینا چاہی لیکن میں نے منع کیا۔ "جلدی کیا ہے فیس بھی کل لے لوں گی۔"

اگلے دن میں اپنا رجسٹر لے کر گئی۔ میں نے فولڈر بنایا ہوا تھا اور رجسٹریشن فارم چھپوا رکھا تھا اس پر مخصوص شرائط جن پر رشتے کا انحصار ہوتا تھا وہ لکھی جاتی تھیں اور متعلقہ فرد اس پر سائن کرتا تھا تحریر میں ہونے کی وجہ سے کوئی بعد میں مکر نہیں سکتا تھا۔ سلطانہ بیگم کو یہ طریقہ بہت پسند آیا۔ "ہم خود بھی لکھا پڑھی کے قائل ہیں تاکہ معاملات صاف رہیں۔"

وہ شرائط لکھوانے لگیں، باقی سب تو ٹھیک تھیں لیکن جب انہوں نے کہا۔ "ہماری شرط ہے کہ جہاں رشتہ ہو وہاں لڑکے والوں کا اپنا گھر ہو۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا یہ لازمی شرط ہے؟"

"ہاں اسے لازمی سمجھیں۔"

"لیکن اس کی وجہ سے میں محدود ہو جاؤں گی۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ رشتہ باقی ہر لحاظ سے بہت اچھا ہو اور صرف اپنا گھر نہ ہو تو....."

"نہیں اپنا گھر لازمی ہے۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولیں۔ "باقی باتوں پر ہم سمجھوتا کر سکتے ہیں اس پر نہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن میں آپ کو بتا دوں اس صورت میں مناسب رشتہ مشکل سے ملے گا۔"

"رخسانہ باجی ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں ہے، ہم چاہتے ہیں کہ رشتہ ہماری مرضی کے مطابق ہو ورنہ میری بچیاں باپ کے گھر میں بیٹھی ہیں۔"

"جیسی آپ کی خواہش، میری پوری کوشش ہوگی۔" میں نے کہا۔ ان سے فارم پر سائن لیے۔ فی الحال وہ ریحانہ کا رشتہ چاہ رہی تھیں اس لیے اس کی تین تصاویر دیں۔ تصویریں اچھی تھیں۔ گھر آکر میں نے چھان بین کی تو بڑی مشکل سے ایک رشتہ سلطانہ بیگم کی مرضی کا نکلا۔ لڑکا تیس سال کا تھا اور گورنمنٹ اسکول ٹیچر تھا ساتھ ہی اپنا ٹیوشن سینٹر بھی چلا رہا تھا۔ گھر ذاتی تھا مگر اس کے باپ کا تھا۔ شکل صورت کا مناسب تھا۔ البتہ خاندان اچھا تھا یہ رام پوری پٹھان تھے۔ خاندان بڑا تھا لڑکے کے چار بھائی اور چار بہنیں تھیں اس کا نمبر درمیان میں آتا تھا۔ احمر زیادہ خوش شکل نہیں تھا اس لیے شاید اس کے رشتے میں مسئلہ تھا اور اس کی ماں کوثر نے مجھ سے کہا تھا۔ میں نے چند رشتے بتائے مگر ان کو پسند نہیں آئے۔ وہ شکل صورت کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھیں ان کی واحد شرط اچھا خاندان تھا۔ چند دن بعد میں نے کوثر کے گھر چکر لگایا تو ریحانہ کی تصویریں ساتھ لیتی گئی۔

گلڈ Guild

ہم پیشہ لوگوں کی انجمن، ایسی انجمنیں، ازمنۂ وسطیٰ میں یورپ میں قائم ہوئی تھیں۔ ان میں تاجروں اور کاریگروں کی انجمنیں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا مقصد ہم پیشہ ارکان کی مدد، ان کے حقوق کی حفاظت اور مشترکہ مفاد کا حصول تھا۔ تاجروں کی سب سے پہلی انجمن بارہویں صدی میں انگلستان میں قائم ہوئی۔ تاجروں نے کاریگروں کو اپنی انجمنوں سے دور رکھنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں تیرہویں صدی میں کاریگروں نے بھی اپنی انجمنیں بنالیں۔

مرسلہ: فراز یاسین، چنوٹ

"بھئی تم اچھے خاندان کی بات کر رہی تھیں تو ایک اچھے خاندان سے رشتہ آیا۔ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ لڑکی کی ماں نواب خاندان سے ہے، بہت رکھ رکھاؤ والا گھرانا ہے۔"

کوثر خوش ہوگئی۔ "لڑکی کیسی ہے؟"

"مناسب ہے، یوں سمجھ لو کہ احمر کے ساتھ اس کی جوڑی سجے گی۔" میں نے کہا اور کچھ دیر لفظوں سے نقشہ کھینچتی رہی جب کوثر کے ذہن میں ایک تصویر بن گئی تو میں نے ریحانہ کی تصویریں ان کے سامنے رکھ دیں۔ کیونکہ تاثر پہلے ہی بن گیا تھا اس لیے کوثر کو دھچکا نہیں لگا۔ اگر میں براہِ راست تصاویر سامنے رکھ دیتی تو شاید اس سے تاثر خراب ہوتا لیکن اب اس نے میری تائید کی۔

"ہاں لڑکی مناسب ہے احمر کے ساتھ سجے گی۔ اس کا باپ کیا کرتا ہے۔"

"اپنا کاروبار ہے۔ اسٹیٹ ایجنسی کا کام ہے، گھر بھی اپنا ہے۔" اس موقع پر میں نے شرط بتانے سے گریز کیا۔ بتائے بغیر وہ شرط پوری کر رہے تھے تو کہہ کر دل میں بات ڈالنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں سلطانہ بیگم خود کہہ دیتیں تو ان کی مرضی ہوتی۔ "طریقے سلیقے والے لوگ ہیں۔ لڑکی بھی اچھی ہے اس سال گریجویشن کر لے گی۔ باقی سب بھی پڑھے لکھے ہیں۔"

"میں احمر سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔" اس نے کہا۔ "تم جانتی ہو آج کل لڑکے اپنی مرضی بھی چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اس سے پوچھ لینا۔" میں نے

کہا۔ ”جلدی نہیں ہے...... ان لوگوں کو بھی جلدی نہیں، آرام سے دیکھ بھال کر فیصلہ کرنا ہے۔“

”تصویریں مجھے دے دو۔“ کوثر نے کہا تو میں کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ مان گئی کیونکہ وہ میری جاننے والی تھی اور خاندان بھی اچھا تھا۔

”لیکن تصویریں بس تمہارے پاس رہیں، دکھا کر مجھے واپس کر دینا۔ تم جانتی ہو میرے پاس یہ لڑکی والوں کی امانت ہوتی ہے۔“

”مجھے پتا ہے تم مجھے جانتی ہو۔ اس لیے بے فکر رہو۔“

چند دن بعد کوثر نے مجھے بلایا۔ ”لڑکی پسند آ گئی ہے۔ اب ہم ان سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”بہتر ہوگا تم لوگ اپنے طور پر خاندان والوں کی تحقیق بھی کرلو اس کے بعد ملنے کو کہو گی تو میں ان سے بات کروں گی۔ ابھی تو تم لوگوں کے بارے میں نہیں بتایا ہے ریحانہ کے گھر والوں کو۔“

”ٹھیک ہے میں احمر کے باپ سے کہتی ہوں وہ معلوم کرلیں گے۔“

”تب مجھے بتانا میں آگے بات کروں گی۔“

کوثر نے ایک ہفتے بعد خاندان کو بھی اوکے کر دیا۔ لہٰذا میں سلطانہ بیگم سے بات کرنے پہنچی تھی۔ سلطانہ بیگم مجھے دیکھ کر خوش ہوئی تھیں۔ ”ہم سوچ رہے تھے کہ آپ سے بات کریں لیکن آپ سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔“

”گل سے کہہ دیتیں یہ جانتی ہے اسی نے تو آپ کے بارے میں بتایا تھا۔“

”ہاں لیکن اسے کاموں سے فرصت نہیں مل رہی تھی جو آپ کے پاس بھیجتی۔“

میں نے سلطانہ بیگم کو احمر علی خان کے رشتے کے بارے میں بتایا تو وہ خوش نظر آنے لگیں میں احمر کی تصویریں لائی تھی۔ تصویریں دیکھ کر وہ کسی قدر مایوس ہوئی تھیں۔ پھر عمر میں بھی ریحانہ سے دس سال بڑا تھا۔ لیکن جب میں نے بتایا ان کا اپنا گھر ہے اور لڑکا بھی مالی لحاظ سے مضبوط ہے تو وہ مطمئن ہوگئیں فیملی بیک گراؤنڈ بھی اچھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سلطانہ بیگم اپنے گھر والوں سے بات کر کے بتانے کو کہیں گی لیکن مجھے حیرت ہوئی جب انہوں نے فوری کہہ دیا۔ ”ٹھیک ہے آپ کہہ دیں کہ رشتہ لے کر آسکتے ہیں۔“

”میرا تو خیال ہے پہلے آپ لڑکے اور اس کے گھر والوں کے بارے میں انکوائری کروالیں پھر ان کو بلانے کی بات کرتے ہیں۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ تیوروں کے ساتھ بولیں۔ ”اس گھر میں فیصلے ہم کرتے ہیں۔“

”بات فیصلے کی نہیں اطمینان کی ہے۔“

”ہم نے یہ آپ پر چھوڑا ہے اگر آپ مطمئن ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ کوئی اور رشتہ دیکھ لیں۔“

”میں مطمئن ہوں کہ یہ خاندان برسوں سے میرا جاننے والا ہے۔“

”بس تو ہم بھی مطمئن ہیں۔“ سلطانہ بیگم نے بات ختم کردی۔ ”آپ ان کو آنے کا کہہ دیں۔“

میں نے اگلے دن کہہ دیا۔ احمر کے گھر والے سلطانہ بیگم کے ہاں گئے۔ میں اس موقع پر پیچھے رہتی تھی تاکہ میری مداخلت کے بغیر دونوں خاندان ایک دوسرے کو جان سکیں۔ دونوں گھرانوں میں میل ملاقات شروع ہوئی اور جلد رشتہ طے ہوگیا۔ سلطانہ بیگم نے خاص طور سے مجھے بلا کر بتایا تو میں خوش ہوگئی۔ ”اللہ کا شکر ہے آپ دونوں خاندان ہم پلہ ہیں اور امید ہے کہ یہ رشتہ دونوں کے لیے خوشیاں لائے گا۔“

”ہم نے طے کیا ہے کہ ریحانہ کے پیپرز کے بعد کی تاریخ دیں گے۔ اللہ نے چاہا تو مارچ تک بچی کو اس کے گھر کا کردوں گی۔“

”انشااللہ!“

سلطانہ بیگم ان عورتوں میں سے تھیں جو بہر صورت اپنی بات کو آگے رکھتی تھیں۔ کسی اور کو آگے آتے دیکھنا ان کی برداشت سے باہر تھا۔ اس رشتے میں بھی وہ اپنی چلا رہی تھیں۔ اس کا اندازہ مجھے ان کی بعض باتوں سے ہوا تھا۔ اگرچہ میں رشتے کی فیس شادی کے موقع پر لیتی تھی لیکن سلطانہ بیگم نے رشتہ طے کرنے کے بعد مجھے دس ہزار دے دیئے تھے۔ البتہ کوثر نے فیس بعد میں دی تھی۔ مگر یہ خاص بات نہیں تھی۔ اکثر لوگ مجھے شادی کے موقع پر ہی ادائیگی کرتے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ سلطانہ بیگم لین دین میں بھی اپنی ناک اور ہاتھ اونچا رکھنے کی قائل تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے اپنے مکان والی شرط کیوں لگائی تھی تو انہوں نے جواب دیا۔ ”بھئی ہم بھی بہویں بیاہ کر لائے اور یہ اپنے مکان میں مزے کر رہی ہیں۔ ہم خود ساری عمر کرائے کے مکانوں میں رہے یہ مکان اب جا کر کہیں ملا ہے۔ اپنی بیٹیوں کو کرائے کے مکانوں میں دھکے کھاتے نہیں دیکھ سکتے۔“

میں نے دبی زبان میں کہا۔ ”کرائے کے مکان میں رہنا کوئی برائی نہیں ہے۔ آدھا کراچی کرائے کے مکانوں میں رہتا ہے۔“

”ہاں لیکن ہمیں نفرت ہے کرائے کے مکانوں سے۔“ سلطانہ بیگم نے نخوت سے کہا۔ ”ساری عمر عذاب سہا ہے، اپنا مکان بھلے جھونپڑی ہو لیکن کرائے کے محل سے بہتر ہے۔“

مارچ آیا اور ریحانہ رخصت ہو کر سسرال چلی گئی۔ اس وقت آئینہ گریجویشن میں آئی تھی اور سلطانہ بیگم کا ارادہ اس کی شادی بھی بیس کے آس پاس میں کرنے کا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ لڑکی کی شادی بیس کے آس پاس میں کر دینی چاہیے، یہی عمر ہوتی ہے شادی کی۔ اس سے پہلے یا اس کے بعد شادی ٹھیک نہیں ہوتی ہے۔ یہ بھی ان کا خیال تھا ورنہ میں نے سولہ سال اور چالیس سال کی عمر کی لڑکیوں کی شادی کرائی تھی اور وہ سب اپنے گھر میں سیٹ اور خوش تھیں جب کہ کچھ لڑکیاں جن کی شادی بیس بائیس سال کی عمر میں ہوئی وہ اتنی خوش اور مطمئن زندگی نہیں گزار رہی تھیں۔ خوش اور کامیاب ازدواجی زندگی کا کوئی لگا بندھا فارمولا نہیں ہے۔ حد یہ کہ عمروں کے فرق سے بھی کچھ نہیں ہوتا ہے۔ پچیس سال کی لڑکی پینتالیس پچاس برس کے مرد کے ساتھ بھی خوش رہتی ہے اسی طرح تیس برس کا جوان چالیس سال کی عورت کے ساتھ خوش رہ سکتا ہے جب کہ ہم عمر میاں بیوی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔

ایک بار جس سے تعلق ہو جائے میں اسے اپنے طور پر برقرار رکھتی ہوں۔ عرصے بعد صحیح لیکن چکر ضرور لگاتی ہوں۔ سلطانہ بیگم کے ہاں بھی دوسرے تیسرے مہینے چکر لگا لیتی تھی۔ ان کا مکان بڑا نہیں تھا مطلب اس کے کل چار ہی کمرے تھے۔ ایک ایک کمرا بہوؤں کے پاس تھا ایک کمرا سلطانہ بیگم اور شوہر کا تھا جب کہ ایک کمرا لڑکیوں کا تھا، اس میں نشست گاہ بھی تھی جب کوئی مہمان آتا تو لڑکیوں کو نکلنا پڑتا تھا۔ عام ملنے جلنے والوں کو برآمدے میں تخت پر بٹھایا جاتا تھا۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ تین تین کمانے والے تھے تو اوپر کی منزل کیوں نہیں بنا لیتے تھے۔ ایک بار میں گئی تو باتوں باتوں میں اس کا ذکر نکل آیا کہ میں نے شادی کے بعد بیٹوں کو اوپر پورشن بنا کر دے دیا تھا۔ میں اپنے پورشن میں رہتی تھی۔ سلطانہ بیگم نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ”آپ الگ رہتی ہیں؟“

”نہیں گھر تو ایک ہی ہے لیکن اوپر کے پورشن میں بیٹے رہتے ہیں۔ نیچے میں رہتی ہوں۔“

”آپ کا حوصلہ ہے۔“ سلطانہ بیگم نے یوں کہا جیسے یہ کوئی ناقابلِ یقین بات ہو۔ ”آج کل ایسا کہاں ہوتا ہے۔ ہم تو اپنے بیٹوں کو الگ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”الگ کہاں رہتے ہیں گھر تو ایک ہی ہے بس پورشن الگ الگ ہیں بلکہ اس طرح آسانی ہوتی ہے سب کے میٹرز الگ ہیں اور سب اپنا کھانا پکانا خود کرتے ہیں۔ کوئی کسی پر بوجھ نہیں ہے اور ساتھ بھی رہتے ہیں۔ بیٹے میرا خیال رکھتے ہیں۔ وہ میرے پاس آجاتے ہیں، بہویں آجاتی ہیں ورنہ میں اوپر چلی جاتی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آج کل ایک ہی پورشن میں ایک سے زیادہ فیملیز کا رہنا بہت مشکل کام ہے۔ آپ اوپر مزید پورشن کیوں نہیں بنوالیتیں؟“

انہوں نے عجیب کڑوے لہجے میں جواب دیا۔ ”ہمیں ضرورت نہیں ہے اور پورشن بنوانے کی۔“

مجھے احساس ہوا کہ میں نے سلطانہ بیگم کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی مداخلت کردی تھی اور انہیں برا لگا تھا اس لیے میں نے موضوع بدل دیا اور وہ بھی کچھ دیر بعد نارمل ہو گئیں۔ لیکن اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ رشتوں کے حوالے سے ان کی سوچ عام عورتوں سے زیادہ شدید تھی۔ عموماً خواتین جب بہو سے ساس بنتی ہیں تو ان کا طرزِ عمل بدل جاتا ہے۔ وہ جو اپنی ساس سے توقع کررہی ہوتی تھیں اپنی بہو کے لیے ایسا نہیں سوچتی ہیں۔ اسی طرح بیٹی اور بہو میں فرق رکھا جاتا ہے لیکن یہ عام بات ہے۔ سلطانہ بیگم نے جس طرح اپنے بچوں اور اپنے گھر پر ہولڈ رکھا ہوا تھا یہ الگ بات تھی۔ ایک بار میں سلطانہ بیگم سے ملنے گئی تو وہ گھر پر نہیں تھیں ان کی بڑی بہو ملی۔ اس سے بات ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ دونوں بہویں سلطانہ بیگم سے خوش نہیں تھیں۔ وہ ان کے ہر معاملے میں دخیل تھیں۔ وہ اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔ حد یہ کہ ان کا اوڑھنا پہننا، آنا جانا اور اٹھنا سونا بھی سلطانہ بیگم کی مرضی سے ہوتا تھا۔ شادی کو کئی سال گزر گئے تھے۔ بچے ہوگئے مگر وہ ایک ہی کمرے میں گزارہ کرنے پر مجبور تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ تنگ آ رہی تھیں۔ بیٹوں نے کئی بار ماں سے کہا کہ اوپر پورشن بنوا لیتے ہیں تاکہ وہ ذرا کھل کر رہ سکیں مگر سلطانہ بیگم کی اجازت نہیں تھی۔ وہ الگ پورشن میں جانے کو بیٹا الگ ہونے کے برابر سمجھتی تھیں۔

کچھ عرصے بعد آئینہ کے لیے بھی ایک اچھا رشتہ مل گیا۔ خاندان اور لڑکا اچھا تھا اور سب سے بڑھ کر ان کا اپنا گھر تھا جو سلطانہ بیگم کی اولین شرط تھی۔ ایک دو بار اور سلطانہ بیگم نے اپنے گھر کے موضوع پر بات کی تو یہ بھی سامنے آیا کہ ان کی بہویں اپنے گھر میں تھیں اس لیے انہیں گوارا نہیں تھا کہ بیٹیاں کرائے کے گھروں میں رہیں۔ اس لیے انہوں نے لڑکے کے اپنے گھر کی شرط لگائی تھی مگر آئینہ بھی بیاہ کر سسر کے گھر میں گئی تھی۔ دیکھا جائے تو تقریباً سلطانہ بیگم کے گھر والی پوزیشن تھی۔ اب صرف امینہ رہ گئی تھی اور اس کے بارے میں سلطانہ بیگم کا ارادہ تھا کہ شادی اکیس کے آس پاس میں کریں گی۔ آئینہ کے رشتے کے سلسلے میں میرا جلدی آنا جانا ہوتا تھا مگر اس کے بعد پھر دوسرے تیسرے مہینے آنا جانا ہونے لگا۔

یہ شاید آئینہ کی شادی کے سال بھر بعد کی بات ہے میں سلطانہ بیگم کے گھر گئی۔ گل نے بتایا تھا کہ وہ بیمار تھیں۔ میں نے سوچا مزاج پرسی کر آؤں۔ وہ اپنے تخت پر نڈھال سی پڑی تھیں خیر خیریت پوچھی۔ مرض کچھ نہیں تھا بس بلڈ پریشر ہائی ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بات ہوئی تو وجہ بھی سامنے آ گئی۔ وہ بڑی بہو کے خلاف پھٹ پڑیں جو بیٹے کو لے کر الگ ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ عرصے پہلے یہ تو پتا چلا تھا کہ وہ تیسرے بچے کی ماں بنی ہے اور میں مبارک باد دینے بھی آئی تھی مگر یہ انکشاف تھا کہ وہ الگ ہو گئی تھی۔ میں نے وجہ پوچھی تو سلطانہ بیگم نے لمبی چوڑی وجوہات گنوا دیں مگر جو اصل بات تھی اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا کہ وہ بے چاری تین بچوں کے ساتھ ایک کمرے میں کب تک رہتی۔ آخر میں وہ نفرت بھرے لہجے میں بولیں۔ ”اب رہے گی نا کرائے کے مکان میں تو پتا چلے گا۔“

بڑا بیٹا باپ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ سلطانہ بیگم نے چاہا کہ اسے میاں کے کام سے بھی الگ کروا دیں لیکن زندگی میں پہلی بار میاں نے ان کی کسی بات سے انکار کیا۔ انہوں نے کہا۔ ”سلطانہ بیگم میں اپنے بچے کو کاروبار سے الگ کر دوں، اس سے بہتر ہے میں دکان بند کر کے اپنے گھر بیٹھ جاؤں۔“

یہ بات مجھے گل نے بتائی تھی اور اصل کہانی بھی اسی نے سنائی۔ بیٹے نے بہت تنگ آ کر الگ ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ صرف ایک کمرے میں رہنا ہی مسئلہ نہیں تھا۔ ہر گزرتے دن سلطانہ بیگم کا رویہ اس بہو کے ساتھ خراب ہوتا جا رہا تھا جس نے کبھی ان کے سامنے زبان نہیں کھولی تھی۔ اس کے تین چھوٹے بچے تھے انہیں دیکھنا ہی صبح سے لے کر شام تک کا کام تھا لیکن وہ چاہتی تھیں کہ بہو گھر کے سارے فرائض بھی پہلے کی طرح انجام دیتی رہے۔ بیٹی کو چھوٹی ہونے کے نام پر انہوں نے گھر کے تمام کاموں سے بری الذمہ قرار دے دیا تھا۔ جب کہ بڑی بیٹیاں بھی گھر کے کاموں میں حصہ لیتی تھیں۔ یوں بہوؤں پر ذمے داریاں بڑھتی چلی گئیں۔ بڑی بہو الگ ہوئی تو اس کی ذمے داری بھی چھوٹی بہو پر ڈال دی گئی۔ امینہ اب بھی کچھ نہیں کرتی تھی۔ بڑی بہو کا خالی ہونے والا کمرا انہوں نے امینہ کو دے دیا تھا اور لڑکیوں والا کمرا باقاعدہ نشست گاہ بنا لیا تھا۔ چھوٹی بہو کے بھی دو بچے تھے اور وہ بھی تنگ تھی۔ اگر یہ کمرا اسے دے دیتیں تو اسے ذرا سکون مل جاتا۔ مگر سلطانہ بیگم نے اپنی سوچ کے مطابق فیصلہ کیا۔ اسی وقت مجھے لگا کہ کچھ عرصے بعد چھوٹی بہو بھی الگ ہو جائے گی۔

میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ چند مہینے بعد گل نے بتایا کہ چھوٹی بہو بھی اسی طرح کرائے کا مکان لے کر چلی گئی ہے۔ اس بار بھی سلطانہ بیگم نے بہت ہنگامہ کیا۔ انہوں نے بیٹے کو بہت سنائیں۔ مگر وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ خود سلطانہ بیگم میں کوئی لچک نہیں آئی تھی۔ وہ دونوں بیٹوں سے ناراض ہو گئی تھیں۔ وہ گھر آتے تو وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تھیں۔ ان سے بات چیت اور ملنا جلنا سب بند کیا ہوا تھا۔ بہوؤں کے آنے پر سرے سے پابندی تھی۔ ملنا اور بات کرنا تو دور کی بات تھی۔ انہوں نے بیٹیوں پر بھی پابندی لگا دی تھی کہ وہ بھائیوں اور بھابیوں سے نہیں ملیں گی۔ بیٹیاں ماں کے زیر اثر تھیں انہوں نے حکم کی تعمیل کی۔ یوں اچھا بھلا گھر سلطانہ بیگم کی ضد سے بکھر گیا۔ بیوی کے تیور دیکھتے ہوئے میاں نے مجبوراً بیٹوں کو کاروبار سے الگ کیا کیونکہ وہ اس میں بھی مداخلت کرنے لگی تھیں۔ انہوں نے بیٹوں کو الگ دکانیں سیٹ کرا دیں۔

بیٹے کام کرتے آئے تھے اس لیے اپنا کاروبار جمانے میں دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ بڑے بیٹے نے کچھ عرصے میں کاروبار اتنا اچھا جما لیا کہ اس نے پلاٹ لے کر اپنا گھر بنا لیا۔ چھوٹے بھائی نے کرائے کے مکان سے پیچھا چھڑانے کے لیے بھائی سے بات کی اور اس نے اسے اوپر پورشن بنانے کی اجازت دے دی۔ یوں دونوں بہویں جو تنگ آ کر کرائے پر رہنے لگی تھیں کچھ عرصے بعد ہی دوبارہ

اپنے گھروں میں آباد ہو گئیں۔ دوسری طرف خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ سلطانہ بیگم کے میاں اچانک بیمار پڑ گئے۔ بیماری طول پکڑتی چلی گئی۔ چند دن ٹھیک رہتے اور پھر پلنگ پکڑ لیتے۔ جو کمایا تھا اور جمع جتھا تھا وہ علاج پر خرچ ہونے لگا۔ دوسری طرف سلطانہ بیگم بھی کھلے ہاتھ سے خرچ کرتی تھیں۔ آمدنی نہیں رہی اور خرچ وہی رہا۔ اب امینہ اکیس کی ہونے والی تھی۔ سلطانہ بیگم نے مجھ سے اس کا رشتہ تلاش کرنے کو کہا اور شرط وہی تھی کہ لڑکے والوں کا اپنا مکان ہو۔

خوش قسمتی سے امینہ کے لیے بہت اچھا رشتہ ملا۔ لڑکا انجینئر تھا اور شکل صورت کا بھی اچھا تھا۔ امینہ اس کے مقابلے میں کم تھی۔ خاندان بھی اچھا تھا۔ حیدرآباد دکن سے تعلق تھا۔ اگرچہ خاندان نواب نہیں تھا مگر شریف لوگ تھے۔ سلطانہ بیگم خوش ہو گئیں۔ بہت عرصے بعد وہ مجھ سے سچ مچ خوش ہو کر ملیں ورنہ جب سے میں نے ایک دو بار ان کے سامنے انصاف کی بات کی تو وہ مجھ سے کھنچ گئی تھیں بس اوپری اوپری ملتی تھیں۔ اب تک ان کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ ملنے جلنے والے اندازہ نہیں کر پاتے تھے کہ وہ مالی مشکلات کا شکار ہیں۔ رشتہ طے ہونے کے بعد ان کے میاں نے مکان کا سودا کر دیا۔ مگر خریدار سے شرط منوا لی کہ جب وہ بیٹی کی شادی کریں گے تب مکان خالی کریں گے۔ یہ بات اتفاق سے گل کے علم میں آ گئی اور اس نے مجھے بتا دیا۔ تیسری بیٹی کی شادی بھی انہوں نے اسی طرح دھوم دھام سے کی۔ اس کے بعد وہ مکان خالی کر کے کہیں چلی گئیں۔ جاتے ہوئے انہوں نے کسی کو نہیں بتایا تھا اس لیے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں گئیں۔ یوں ان سے رابطہ نہیں رہا۔

چند مہینے بعد گل ملنے آئی تو اس نے بتایا۔ ”سلطانہ بیگم دوبارہ بیٹوں کے ساتھ رہنے لگی ہیں۔“

میں حیران ہوئی تھی۔ ”یہ انہونی کیسے ہوئی۔“

”باجی وقت بڑے بڑوں کو جھکا دیتا ہے۔ وہ کرائے پر چلی گئی تھیں مگر ان کے بیٹوں سے برداشت نہیں ہوا اور وہ انہیں گھر لے گئے۔ سب سے اوپر ان کے لیے پورشن بنوایا ہے وہیں رہتی ہیں کیونکہ بہوؤں نے ان کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا۔ بڑی بہو نے تو میاں سے کہا کہ اگر وہ چاہے تو اپنی ماں کو لا کر یہاں رکھے اور اسے کرائے کا مکان دلوا دے۔ چھوٹی بہو بھی تیار نہیں تھی اس لیے بیٹوں کو اوپر پورشن بنوانا پڑا۔“

”اگر وہ پہلے مان جاتیں تو بیٹے دربدر نہ ہوتے ان کے پاس رہتے اور ان کا ہاتھ اونچا رہتا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”بہرحال اب ان کا رویہ کیسا ہے؟“

گل، سلطانہ بیگم کے ہاں ہی کام کر رہی تھی اس نے دبی زبان میں کہا۔ ”باجی وہ کہتے ہیں نا رسی جل گئی پر بل نہیں گیا تو ایسا ہی سلطانہ بیگم کے ساتھ ہے۔ ان کے تیور نہیں بدلے ہیں۔“

یہ مکان بھی پاس تھا گل نے پتا سمجھا دیا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ کسی دن چکر لگاؤں گی اور سلطانہ بیگم سے علیک سلیک کروں گی۔ مگر میں نے گل کو منع کر دیا کہ وہ انہیں یہ نہ بتائے کہ میں ان سے ملنے آ سکتی ہوں۔ پتا نہیں ان کا کیا ردِعمل ہو اور وہ منع کروا دیں۔ اتنے عرصے میں مجھے ان کے مزاج کا اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ ٹوٹی تھیں لیکن اپنا ٹوٹنا کسی کے سامنے ظاہر نہیں کریں گی جو اُن کو پہلے بھی دیکھ چکے ہوں گے۔ کچھ دن بعد میں اور میری بہویں آنے والے موسم کے کپڑے لینے نزدیکی مارکیٹ گئیں۔ وہ دونوں جوان تھیں اور میں بوڑھی ہو گئی تھی۔ کچھ دیر میں تھک گئی مگر انہیں جلدی چلنے کو نہیں کہا کہ انہوں نے مزید خریداری کرنی تھی اور دیکھ بھال کر لینا تھا۔ میں تھک بھی گئی تھی۔ مارکیٹ میں کہاں بیٹھتی۔ مجھے یاد آیا کہ سلطانہ بیگم یہاں پاس ہی رہتی تھیں۔ میں نے بہوؤں سے کہا۔

”تم لوگ آرام سے شاپنگ کرو، میری ٹانگیں جواب دے گئی ہیں۔ پاس ہی ایک جاننے والی ہیں میں ان کے ہاں جا رہی ہوں۔“

”امی ایشا کو بھی لے جائیں۔“ چھوٹی بہو نے اپنی دو سالہ بیٹی میرے حوالے کی۔ ”یہ کچھ دیر بعد تنگ کرنا شروع کر دے گی۔“

میں نے پوتی کو لیا اور دو گلی پیچھے سلطانہ بیگم کے گھر پہنچ گئی۔ یہ خوب صورت تین منزلہ مکان تھا۔ بیٹوں نے جیسے اپنے پورشن بنوائے تھے ایسا ہی پورشن ماں باپ کو بنوا کر دیا۔ اس میں دو کمرے اور بڑا سا لاؤنج تھا۔ سلطانہ بیگم مجھے دیکھ کر کچھ حیران ہوئیں اور شاید انہوں نے محسوس بھی کیا لیکن فطرت کے مطابق بہت اچھے طریقے سے ملیں۔ میں نے غیر ضروری سوالات کر کے انہیں شرمندہ کرنے کی بجائے ان کے بارے میں پوچھا۔ ان کے میاں کی صحت ٹھیک ہو گئی تھی اور اب وہ کام کر رہے تھے۔ گھر اچھی طرح سجا سنورا اور صاف ستھرا تھا۔ سلطانہ بیگم نے گل سے چائے بنوائی اور نزدیک سے ریفریشمنٹ کا سامان

WWW.PAKSOCIETY.COM

منگوایا۔ ایشا کو دل چسپی سے دیکھا اور اس کے بارے میں پوچھا۔ میں بتانے لگی کہ میری پوتی ہے۔ وہ حیرت سے بولیں۔ ”اتنی چھوٹی بچی آگئی آپ کے ساتھ؟“

”ہاں میری پوتی ہے گھر میں بھی بہت سا وقت میرے پاس رہتی ہے۔“

”ایک ہماری پوتیاں ہیں مجال ہے جو دادی کے پاس پھٹک جائیں۔“ وہ منہ بگاڑ کر بولیں۔

”یہ تو خون کا رشتہ ہے۔“

”ان کی رگوں میں بس ماں کا خون ہے۔“ وہ اسی لہجے میں بولیں تو میں نے محسوس کیا کہ کل کی بات ٹھیک تھی۔ رسی جل گئی تھی پر بل نہیں گیا تھا۔ بیٹوں کی محبت... بھی انہیں تبدیل نہیں کر سکی تھی۔ وہ خود بتا رہی تھیں کہ بیٹے پہلے ان کے پاس آتے تھے پھر اپنے گھر جاتے تھے جو چیز اپنے گھر کے لیے لاتے وہ لازمی ان کے لیے بھی لاتے تھے۔ ماہانہ خرچ الگ دیتے تھے۔ اس کے باوجود بیٹوں اور بہوؤں کے لیے سلطانہ بیگم کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بہوؤں کے حوالے سے پوتے پوتیوں کے لیے بھی ان کا رویّہ الگ سے تھا۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد بیٹیوں کی بات آئی تو سلطانہ بیگم کا رویّہ ہی بدل گیا۔ لہجے میں ایسی محبت اور نرمی آئی جو پچھلے آدھے گھنٹے میں ایک بار بھی نہیں آئی تھی۔

وہ بڑی محبت سے نواسے نواسیوں کا ذکر کر رہی تھیں اور یہ بری بات نہیں ہے۔ مجھے بھی اپنے نواسے نواسیوں سے بہت محبت ہے۔ میں بے تابی سے ان کا انتظار کرتی ہوں لیکن میں نے کبھی پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں میں فرق نہیں کیا۔ دونوں مجھے ایک سے پیارے ہیں۔

”ہم دن گن گن کر گزارتے ہیں، ان کے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔“

”یہ رشتہ ہی ایسا ہے۔“ میں نے تائید کی۔

”کل ریحانہ آئی تھی۔ دو دن پہلے آئینہ اور امینہ آئی تھیں۔“

”اپنے گھر میں خوش ہیں نا؟“

”اللہ کا شکر ہے۔“ وہ فخر سے بولیں۔ ”داماد بھی ایسے ہیں بیویوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ ان کے آگے ماں باپ، بہن بھائی کو کچھ نہیں سمجھتے۔“

میں ایک بار پھر سلطانہ بیگم کے دوہرے معیار پر حیران رہ گئی۔ بیٹے فرمانبرداری کر رہے تھے تب بھی معتوب تھے اور داماد اپنے گھر والوں کو کچھ نہیں سمجھ رہے تھے تو بہت اچھے تھے۔ اگر یہی کام بیٹے کرتے تو یقیناً سلطانہ بیگم کے خیالات بالکل مختلف ہوتے۔ ان کے اس کھلے دوغلے پن سے میرا دل خراب ہوا تھا اور یقیناً دل کا عکس میرے چہرے پر بھی آیا تھا مگر وہ میرے تاثرات سے بے خبر جوش و خروش سے بتا رہی تھیں کہ ان کے دامادوں نے ان کی بیٹیوں کو کیسے خوش رکھا ہوا ہے۔ آخر میں انہوں نے کہا۔ ”پاؤں دھو دھو کر پیتے ہیں ہماری بیٹیوں کے۔“

”اچھی بات ہے اللہ خوش رکھے۔“ میں نے کہا۔

اس دوران میں گل چائے اور ریفریشمنٹ کا سامان لے آئی اور ہم اس میں لگ گئے۔ میں ایشا کو کھلا رہی تھی۔ میں نے صرف چائے اور کچھ نمکولی تھی کیونکہ باہر کی چیزیں کھانے سے میرا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا تھا اس لیے میں گریز کرتی تھی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا تھا اور ایشا اب کچھ بے چین تھی۔ بار بار میرا دوپٹا کھینچ کر کہتی۔ ”دادو چلیں ناں۔“

میں نے پہلے بہو کو فون کیا اس نے بتایا کہ کچھ شاپنگ باقی تھی تو میں نے کہا کہ میں ایشا کو لے کر گھر جا رہی ہوں وہ تنگ ہو رہی ہے شاید بچی گندی کر دی تھی۔ کال کر کے میں کھڑی ہو گئی اور عبایا پہننے لگی۔ سلطانہ بیگم سے الوداعی کلمات کہتے ہوئے مجھے ایسے ہی خیال آیا اور میں نے کہا۔ ”آپ کی اپنے گھر والی شرط اچھی رہی، ماشاءاللہ تینوں بیٹیاں اپنے گھر میں خوش ہیں۔“

”اپنے گھر؟“ سلطانہ بیگم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ”سسرال والے خوش رہنے دیتے ہیں۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی میری بیٹیوں کی زندگیاں حرام کر دی تھیں۔ جب تک الگ نہیں ہوئیں سکون نہیں ملا۔ اللہ کا شکر ہے کرائے پر ہیں لیکن خوش ہیں۔“

میں کچھ دیر کے لیے دم بخود ہی رہی تھی پھر میں نے خود کو سنبھالا اور سلام دعا کر کے سیڑھیاں اتر آئی۔ باہر آ کر میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ سلطانہ بیگم کی باتوں نے میرا دماغ گھما دیا تھا۔ میں نے پلٹ کر ان کے مکان کو دیکھا تو ایک ہی مکان کا حصہ ہونے کے باوجود تینوں پورشن الگ الگ نظر آئے تھے۔ ساتھ ہی مجھے خوشی بھی ہوئی کہ اللہ نے مجھے اور میرے بچوں کو ایسی دوغلی سوچ سے محفوظ رکھا تھا۔ کاش کہ میرے ملک کی عورتیں سلطانہ بیگم کی طرح سوچنا اور عمل کرنا بند کر دیں تو لاتعداد گھرانے بے سکونی اور بکھرنے سے بچ جائیں گے۔

روشنی

محترم ایڈیٹر سرگزشت

سلام تہنیت!

میں نہ تو مصنف ہوں اور نہ کہانیاں پڑھنے کا شوقین، میرے دوستوں میں سے کئی ایک دوست سرگزشت کے قاری ہیں۔ ان کے کہنے پر میں اپنی سرگزشت لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ اگر پسند آجائے تو شائع کردیں۔ بہت سے لوگوں کو سبق حاصل ہوگا۔

اکرام

(کراچی)

ایک نظر میں اندازہ ہو گیا کہ اس لڑکی کے پاس جو موبائل ہے وہ اچھا خاصا قیمتی ہے۔

میں اسے بہت دیر سے واچ کر رہا تھا۔ وہ ایک کٹیلی سی سانولی لڑکی تھی جس کے خوبصورت چہرے پر موجود بڑی بڑی آنکھیں اسے اور بھی خوبصورت بنا رہی تھیں۔

وہ اس وقت ایک مارکیٹ سے باہر آئی تھی۔ اس کے شانے سے ایک بڑا سا بیگ لٹکا ہوا تھا۔ باہر آ کر ایک طرف کھڑے ہو کر اس نے اپنا موبائل نکالا اور کسی سے باتیں کرنے لگی۔

موبائل بہت قیمتی تھا۔ کم سے کم دس ہزار تو مل ہی جاتے۔ میں اپنی بائیک لیے کچھ فاصلے پر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ بات کر لینے کے بعد اس نے ایک جاتا ہوا رکشا رکوایا اور اس سے کچھ کہہ کر اس میں بیٹھ گئی۔ اب میرا کام کچھ آسان ہو گیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مارکیٹ سے آگے جو روڈ جاتی تھی، وہ عام طور پر ویران رہا کرتی تھی، یہ مین روڈ نہیں تھی۔ رکشا اس روڈ پر جارہا تھا۔ میں نے اپنی بائیک اس کے پیچھے دوڑادی اور ایک جگہ رکشے کو کراس کرتے ہوئے رک جانے کا اشارہ کیا۔

رکشے والے نے چونک کر رکشا روک لیا تھا۔ میں نے بھی اپنی بائیک کھڑی کی اور جیب سے ٹی ٹی نکال کر رکشے کے پاس آگیا۔ لڑکی خوفزدہ نگاہوں سے دیکھے جارہی تھی۔

"لاؤ موبائل دو، جلدی!" میں نے لڑکی سے کہا۔

"کون سا موبائل۔"

"وہی، جس سے تم ابھی باتیں کررہی تھیں۔ جلدی کرو میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

"میرے پاس کوئی موبائل نہیں ہے۔"

"جھوٹ مت بول۔" میں غصے سے بولا۔ "جلدی نکال۔"

"بدتمیزی مت کرو۔" لڑکی غرائی۔ "نہیں دیتی موبائل، تمہارے باپ کا مال نہیں ہے۔"

"دیکھو، میرا دماغ مت خراب کرو۔ جلدی کرو۔ ورنہ گولی ماردوں گا۔ اپاہج کردوں گا تمہیں۔"

"کردو اپاہج۔" اس نے کہا۔ "موبائل تو نہیں دوں گی، چاہے کچھ کرلو۔"

عجب لڑکی تھی۔ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ کم بخت کو گولی مار کر اس کہانی کو نمٹادوں۔ لیکن اسی دوران ایک کار کچھ پیچھے آکر رک گئی۔ وہ لوگ شاید صورتحال کا اندازہ کرنے رکے تھے۔ اب وہاں رک کر اس سرپھری لڑکی سے بحث کرنا حماقت تھی۔ اسی لیے میں تیزی سے اپنی بائیک کی طرف آیا۔ بائیک اسٹارٹ کی اور روانہ ہوگیا۔

میں اپنے دوستوں کے پاس واپس آگیا تھا۔ میں نے جب انہیں یہ واقعہ سنایا تو وہ سب میرا مذاق اڑانے لگے۔ "ابے جا، ایک لڑکی سے موبائل بھی نہیں لے سکا۔"

"یار، وہ عجب سرپھری لڑکی تھی۔" میں نے بتایا۔ "کم بخت کو مجھ سے خوف ہی نہیں محسوس ہورہا تھا۔ باقاعدہ بحث کررہی تھی۔"

"ابے تو ایک آدھ گولی لگا ہی دیتا۔"

"نہیں یار، اس کا دل نہیں چاہا۔ پیاری سی تھی۔"

"تو یہ کہو نا پیارے کہ اسے لوٹنے گئے تھے اور خود لٹ کر آگئے۔"

"ہاں یار، شاید کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "کم بخت سیدھی دل میں اتر گئی ہے۔"

"جو دل میں اتر گئی ہے، وہ کسی اور راستے سے نکل بھی گئی ہے۔" خاور نے کہا۔

"نہیں، میں اسے جانے نہیں دوں گا۔ کہیں نہ کہیں تلاش کرہی لوں گا۔" میں نے کہا۔ "جذبۂ عشق سلامت ہے تو انشاء اللہ کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے۔"

"بس اس قسم کی شاعری سنا کر اس کو قابو کرلینا۔"

"میں تو خود اس کے قابو میں چلا گیا ہوں یار۔" میں نے پھر ایک گہری سانس لی۔

یہ میں ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں خود اس کے قابو میں چلا گیا تھا۔ اس کی بے باکی میرے دل کو بھا گئی تھی۔ ورنہ لڑکیاں تو پستول دیکھتے ہی ہاتھ پاؤں ڈال دیتی ہیں۔ لڑکیاں تو لڑکیاں خود مرد بھی کانپنے لگ جاتے ہیں لیکن وہ کیسی لڑکی تھی۔ وہ جس مارکیٹ میں نظر آئی تھی شاید اس کے آس پاس ہی رہتی ہو۔ لیکن نہیں، وہ تو رکشے میں بیٹھ کر کہیں اور جارہی تھی۔

کاش میں اس رکشے کا تعاقب کرپاتا۔

لیکن یہ بات ٹھیک ہی تھی کہ اگر خواہش ہو تو راستے نکل ہی آتے ہیں۔ یا پھر وہ مل ہی جاتا ہے جس کے لیے سوچا گیا ہے۔ وہ ایک بار پھر دکھائی دے گئی۔ اسی مارکیٹ میں لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک شاندار نوجوان بھی تھا جسے دیکھ کر میں سلگ اٹھا تھا۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ایک طرف چلے جارہے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ نوجوان اس کا دوست ہی ہوسکتا تھا۔

میں اس وقت بھی کچھ فاصلے پر کھڑا ہوکر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انہیں شاید احساس بھی نہیں ہوگا کہ کسی کی حاسد نگاہیں ان کا تعاقب کررہی ہیں۔

وہ دونوں بہت دیر تک مارکیٹ میں بھٹکتے رہے۔ لڑکے نے تھوڑی شاپنگ کی۔ پھر دونوں پارکنگ لاٹ کی طرف آگئے۔ میں یہ دیکھ کر اور بھی جیلس ہوگیا تھا کہ لڑکے کے پاس گاڑی بھی بہت خوبصورت تھی، نئے ماڈل کی۔

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اور ایک طرف چل دی۔ میں نے اپنی بائیک گاڑی کے پیچھے لگادی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے تاؤ آنے لگا تھا۔

اس لڑکی کو میں نے کئی دنوں تک سوچا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ جب وہ کبھی ملی تو اس دن کے کیے کی معافی مانگ لوں گا۔

لیکن ہوا کیا۔ وہ دکھائی دی لیکن کسی اور کے ساتھ جو مجھ سے زیادہ خوبصورت اور شاندار تھا۔ جس کے پاس ایک نئی گاڑی تھی اور جس کو کسی سے موبائل چھیننے کی ضرورت نہیں تھی۔ محرومیاں اور ایسی حرکتیں تو ہماری قسمت میں لکھ دی گئی تھیں۔

میں بھنّاتا رہا اور گاڑی کا پیچھا کرتا چلا گیا۔ یہ سوچے بغیر کہ یہ بے تکی حرکت نقصان بھی پہنچاسکتی ہے۔ وہ لڑکی مجھے پہچان کر پولیس کو بھی خبر کرسکتی ہے۔

میں چلتا رہا اور وہ گاڑی ایک پوش علاقے کے ایک بڑے سے گیٹ میں داخل ہوگئی۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ مکان کس کا تھا۔

اگر اس لڑکے کا تھا تو پھر وہ دولت مند لڑکا تھا۔ اس کا اظہار تو اس کے رکھ رکھاؤ اور اس کی شاندار گاڑی ہی سے ہوگیا تھا۔

میں نے اپنی بائیک اس مکان کے سامنے والی فٹ پاتھ کے ایک درخت کے پاس کھڑی کردی۔ میری نگاہیں کوٹھی کے گیٹ پر مرکوز تھیں۔ اگر وہ لڑکا جو اس کو اپنے ساتھ لے گیا تھا مکان سے باہر آجاتا تو شاید میں اس کو گولی ماردیتا۔ نہ جانے کیوں اس سے اتنی حسد محسوس ہورہی تھی۔

حالانکہ ان لوگوں سے میرا تعلق ہی کیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ لڑکی مارکیٹ میں دکھائی دی۔ میں نے اس کے موبائل کے لیے اس کا تعاقب کیا۔ وہ الٹا مجھے مرعوب کرکے نکل گئی۔ بس اتنی سی بات ہوئی تھی اور اتنی سی بات کی خاطر میں دیوانہ ہونے لگا تھا۔

حالانکہ اب معلوم ہوگیا تھا کہ میرے اور اس لڑکی کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ وہ ایک بڑے مکان میں رہنے والی ایک دولت مند گھرانے کی لڑکی تھی اور میں کیا تھا۔ موبائل اسنیچر، چاہے میں جیسا بھی سہی۔ مجھے چور ہی کہا جائے گا۔ میں ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک کچھ ہوا۔

وہ تین لڑکے تھے، جنہوں نے اتنی خاموشی سے آکر مجھے گھیر لیا تھا کہ مجھے ان کی آمد کا احساس ہی نہیں ہوسکا۔ ان میں سے ایک نے میری کمر پر ٹی ٹی رکھ دی تھی۔

"بس پیارے، بالکل خاموش رہنا، ورنہ میں دوسرے مزاج کا بندہ ہوں۔ تم شاید آسرا کر بھی جاؤ، لیکن میں آسرا نہیں کرتا۔"

میں گڑبڑا کر رہ گیا۔ وہ تینوں پروفیشنل معلوم ہورہے

سید صادق حسین کاظمی

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

یہ شعر عام طور پر علامہ اقبال سے منسوب کیا جاتا ہے مگر یہ شعر علامہ اقبال کا نہیں بلکہ شکرگڑھ ضلع نارووال سے تعلق رکھنے والے ایک شاعر سید صادق حسین کاظمی کا ہے۔ سید صادق حسین کاظمی یکم اکتوبر 1898ء کو کشمیر کے ایک موضع کھاداپاڑا میں پیدا ہوئے تھے۔ 1910ء میں ان کا خاندان ہجرت کرکے ظفروال سیالکوٹ میں آباد ہوگیا۔

سید صادق حسین کاظمی شاعری میں علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان سے بہت متاثر تھے اور انہی کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ 1918ء کے لگ بھگ انہوں نے غزل کہی جس کا مطلع تھا:

تو سمجھتا ہے حوادث ہیں ستانے کے لیے
یہ ہوا کرتے ہیں ظاہر آزمانے کے لیے

جبکہ دوسرا شعر یہ تھا

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

یہ غزل 1918ء میں لاہور کے روزنامہ "آفتاب" میں چھپی تھی۔ سید صادق حسین کا مجموعہ کلام 1977ء میں "برگ سبز" کے نام سے چھپا جس میں مذکورہ بالا غزل بھی شامل تھی۔ انہوں نے 4 مئی 1989ء کو وفات پائی اور اسلام آباد کے مرکزی قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے۔

عقیل عباس جعفری کی کتاب
"ہے حقیقت کچھ" سے اقتباس
سید شکیل حسین کاظمی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ ان میں سے ایک ایسا تھا جو پختہ عمر کا تھا۔ باقی دو ابھی نوجوان تھے۔

''کیا چاہتے ہو تم لوگ۔'' میں نے پوچھا۔ ''موبائل چاہیے۔''

''نہیں پیارے۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''ہماری لائف کچھ اور ہے۔ ہم موبائل وغیرہ نہیں چھینتے۔''

''تو پھر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

اس بار اس پختہ عمر والے نے کہا۔ ''اب یہ تو تم ہی بتاؤ گے کہ تم اس لڑکی کا پیچھا کیوں کررہے تھے۔''

''کس لڑکی کا۔''

''ہوشیار مت بن۔ ورنہ چھٹانک بھر سیسا اندر کردوں گا۔'' پختہ عمر والے نے کہا۔ ''پہلی بار، جب تو نے اس لڑکی کا رکشا روکا تو ایک گاڑی آکر رکی تھی۔ اس میں ہم ہی لوگ تھے۔ ہم اسے اکیلے نہیں ہونے دیتے۔ سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوتے ہیں سمجھے۔ اب تم کو بتانا ہوگا کہ یہ کہانی کیا ہے۔''

اتنی دیر میں وہی لڑکی اس مکان سے اکیلی نکلتی دکھائی دی۔ اس نے ایک نظر ہم سبھوں کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئی۔

''اب اس کا کیا کریں بھائی۔'' میری کمر پر ٹی ٹی رکھنے والے نے پختہ عمر والے سے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے۔ اس کو بھی ساتھ لے چلو۔''

''یہیں نا ٹھوک دیں اس کو۔''

''نہیں، خوامخواہ کا خون خرابا نہیں چاہیے اور کم از کم یہ تو پتا چلے کہ یہ چاہتا کیا ہے۔''

''کہیں یہ پولیس کا بندہ نہ ہو۔''

''نہیں، لگتا تو نہیں ہے۔'' پختہ عمر والے نے پیچھے دیکھا پھر اپنے ایک ساتھی سے بولا۔ ''اس کی بائیک تم لے چلو۔ ہم اسے ٹھکانے پر جارہے ہیں۔''

ان لوگوں کی ایک ہائی روف کچھ فاصلے ہی پر کھڑی تھی۔ اگر وہ ایک دو ہوتے تو شاید میں ان سے لڑ بھڑ لیتا۔ لیکن وہ تین تھے اور تینوں مسلح۔ انہوں نے میری تلاشی لے کر میرا پستول بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اب میں بالکل نہتا اور بے بس ہوچکا تھا۔

''چلو گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔

دوسرا پہلے ہی بیٹھ چکا تھا۔ میں بیٹھا، میرے برابر پختہ عمر والا، جبکہ تیسرے نے گاڑی کی ڈرائیونگ سنبھال لی تھی۔

''تم لوگ مجھے کہاں لے جارہے ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''پیارے۔ تمہیں ہم اپنے گھر لے جارہے ہیں۔'' پختہ عمر والے نے کہا۔ ''وہاں تمہاری تھوڑی سی خاطر ہوگی۔ اس کے بعد تمہیں چھوڑ دیں گے۔ کبھی کبھی تو ہم کسی کو مہمان بنایا کرتے ہیں۔ اس کو اپنی خوش قسمتی سمجھ لینا۔''

سب ہنسنے لگے۔ میں تلملا کر رہ گیا۔ پہلی دفعہ میرے ساتھ ایسا ہورہا تھا۔ اس وقت میں قدرت کی ستم ظریفی پر دل ہی دل میں ہنس بھی رہا تھا۔ چور پہ مور شاید اسی کو کہتے ہیں۔

کچھ دیر سفر کے بعد گاڑی ایک اوسط طبقے کی آبادی کے ایک کچے سے مکان کے پاس آکر رک گئی۔ پہلے پختہ عمر والا اترا پھر مجھے اتارا گیا۔ اس کے بعد وہ دونوں اتر آئے۔ اپنے انداز سے وہ یہ ظاہر کرچکے تھے کہ وہ باقاعدہ مجرم ہیں۔ اناڑی نہیں ہیں۔

مجھے وہ لوگ ایک بڑے سے کمرے میں لے آئے، اور جہاں پہنچتے ہی مجھے ایک ایسا جھٹکا لگا جس نے میرے ہوش اڑا دیے۔ وہ لڑکی اسی کمرے میں موجود تھی۔

وہ صوفے پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہوگئی۔

''یہ لو مریم۔'' پختہ عمر والے نے اس لڑکی کو مخاطب کیا۔ ''ہم لے ہی آئے ہیں اس کو۔''

''کچھ بتایا اس نے۔''

''ابھی نہیں۔ ابھی تمہارے سامنے پوچھا جائے گا۔''

میرے خدا۔ میں تو بھک سا ہوکر رہ گیا تھا۔ میں نے اس لڑکی کو کیا سمجھا تھا اور وہ کیا نکلی تھی۔ وہ تو ان کی ساتھی تھی۔ یہ مجرم لوگ تھے اور وہ مجرموں کی ساتھی تھی۔

اسی لیے اس دن میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر بھی وہ خوفزدہ نہیں ہوئی تھی۔ اس قسم کے کھیل اس کے لیے نئے نہیں ہوں گے۔ اس کی جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو شاید بے ہوش ہی ہوجاتی۔

''ہاں جی، اب بتاؤ۔'' وہ میرے سامنے آکر اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔ ''اس دن تو بہت شیر ہورہے تھے۔ گولی مارنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ اکیلی دیکھ کر پستول دکھا رہے تھے۔ اب بتاؤ، اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔''

''مریم اس سے یہ تو پوچھو کہ یہ تمہارا پیچھا کیوں کرتا ہے۔'' ایک نے کہا۔

''اس کا بھی جواب لوں گی۔ ہاں شہزادے۔'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''جلدی جلدی بتاتے جاؤ۔''

''سچ بتادوں میں۔''

''ہاں بتاؤ۔ سچ ہی سننا چاہتی ہوں۔''

''تم مجھے اچھی لگی تھیں۔ اس لیے تمہارا پیچھا کررہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک عام سی لڑکی سمجھا تھا۔''

''اور عام سی لڑکی سمجھ کر مجھ پر عاشق ہوگئے تھے۔''

''ہاں پہلے ہی دن۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ایسا نہیں ہوتا تو موبائل چھینتے وقت تم سے بحث نہیں کرتا۔ بار بار موقع نہیں دیتا۔ تم یہ اچھی طرح جانتی ہو کہ ایسے کاموں میں دیر نہیں لگائی جاتی۔''

''واہ مجنوں واہ۔'' پختہ عمر والے نے تالی بجائی۔ ''کیا بات ہے تیری؟ ذرا سی دیر میں عشق کرنے لگا۔''

سب بے ڈھنگے انداز سے ہنس پڑے۔ صرف وہ لڑکی خاموش رہی تھی۔

''اب یہ بتاؤ کہ میرا کیا کروگے تم لوگ۔'' میں نے اکتا کر پوچھا۔

''تیرا تو اچار ڈالیں گے۔'' ایک شخص نے کہا۔

''نہیں، میرا خیال ہے کہ اسے جانے دو۔'' پختہ عمر والے نے کہا۔ ''کیونکہ اس نے مریم کا پیچھا کسی اور نیت سے نہیں کیا تھا۔ بلکہ دل کے ہاتھوں مجبور ہوگیا تھا۔''

''ہاں چاچا۔'' وہ لڑکی بھی بول پڑی۔ ''چھوڑ دو اس کو۔ اس نے بے وقوفی کی ہے اور بے وقوفی کی سخت سزا نہیں ملنی چاہیے۔''

''دیکھ بھائی۔'' پختہ عمر والے نے مجھے مخاطب کیا۔ ''اس بار تو ہم تجھے چھوڑ رہے ہیں۔ کیونکہ بے بی نے تیری سفارش کردی ہے۔ لیکن آیندہ سے اگر اس کے راستے میں آیا نا تو ٹانگیں چیر دوں گا۔''

''بہت مہربانی ہے تم لوگوں کی۔ لیکن کم از کم یہ تو بتادو کہ تم لوگوں کی لائن کیا ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''کیوں، یہ تمہیں کیوں بتائیں۔''

''اس لیے کہ میں بہت دنوں سے اکیلے ہی کام کررہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم لوگ مجھے اپنے ساتھ رکھ لو تو ہوسکتا ہے کہ تمہارے کام ہی آجاؤں۔''

''ابے جا۔ ہم لوگ تیری طرح موبائل وغیرہ چھیننے کا کام نہیں کرتے۔'' پختہ عمر والے نے بتایا۔ ''ہماری لائن کچھ اور ہے۔''

مسلم لیگ میں شمولیت

ضیاالحسن موسوی نے بتایا کہ ''راجا صاحب 1936ء میں تخت نشین ہوئے۔ اور پھر مسلم لیگ کی سیاست میں بھرپور حصہ لینے لگے۔ ریاست کے تمام مالی ذرائع مسلم لیگ اور تحریکِ پاکستان کے لیے وقف کردیے۔ بعض اوقات اتنا خرچ کردیتے تھے کہ ریاست زیر بار ہوجاتی تھی۔ 1937ء میں دھیان دان پارک لکھنو میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس کے تمام تر انتظامات راجا صاحب نے کیے اور اخراجات خود برداشت کیے۔ اجلاس کے دوران قائداعظم نے راجا صاحب کی کوٹھی قیصر باغ میں قیام کیا، اسی اجلاس کے بعد راجا صاحب کو مسلم لیگ کا خازن بنادیا گیا۔ قائداعظم مسلمان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں سے چندہ نہیں لینا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ان لوگوں سے چندہ لیا گیا تو یہ مسلم لیگ کی پالیسی پر اثر انداز ہوں گے اور اس جماعت کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کریں گے۔ البتہ وہ مسلمان عوام سے چندہ لینے کے حق میں تھے، اس زمانے میں مسلم لیگ کا چندہ صرف 2 آنے تھا۔ لیکن مسلم لیگ کے اخراجات اس چندے سے پورے نہیں ہوتے تھے۔ راجا صاحب کو اس لیے خازن بنایا گیا کہ جب بھی چندہ کی رقم کم پڑجاتی تھی تو وہ اپنی جیب سے پورا کردیا کرتے تھے۔ تحریکِ پاکستان کے لیے راجا صاحب نے اپنا سب کچھ وقف کردیا، شہروں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی جاتے، مسلمانوں کو منظم کرتے اور انہیں مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کرتے۔''

راجا صاحب محمود آباد۔

اقتباس: نقش، نومبر 1973ء

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تمہاری مرضی، نہ بتاؤ۔"

"بس اب نکل لو یہاں سے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہم اتنی آسانی سے کسی کو جانے نہیں دیتے۔ لیکن تیری سفارش آگئی ہے اسی لیے چھوڑ رہے ہیں۔"

بہت عجب لوگ تھے۔ انہوں نے جس طرح مجھے قابو میں کیا تھا نہ جانے وہ اور کیا کیا نہیں کرتے ہوں گے۔

ان خطرناک لوگوں کے درمیان اس لڑکی کا کیا کردار ہوسکتا تھا۔ وہ کیا کرتی ہوگی۔ ایسے بے شمار سوالات تھے جو مجھے پریشان کررہے تھے۔ میں ان ہی سوالات کو لیے واپس آگیا تھا۔

وہ ایسے لوگ تھے کہ انہوں نے یہ احتیاط بھی نہیں کی تھی کہ میری آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے۔ تاکہ مجھے ان کے اڈے کا پتا نہ چل سکے۔ اس کے علاوہ انہوں نے میرا پستول مجھے واپس کردیا تھا۔

ویسے میں نے اچھی طرح یہ سوچ لیا تھا کہ میں اپنے طور پر کا کھوج ضرور لگاؤں گا۔ چاہے اس میں کتنا ہی خطرہ کیوں نہ ہو۔

ویسے ایک بات یہ ظاہر ہوگئی تھی کہ وہ لوگ اسے اکیلا نہیں چھوڑتے۔ اس دن بھی جب وہ رکشے میں تھی اور میں بائیک پر اس کا پیچھا کررہا تھا تو ان لوگوں کی گاڑی پیچھا کررہی تھی اور آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بلکہ آج تو انہوں نے مجھ پر ہی ہاتھ ڈال دیا تھا۔

میں نے واپس آکر جب اپنے دوستوں کو یہ کہانی سنائی تو سب ہی حیران رہ گئے۔ "یار، یہ تو کمال ہوگیا۔ تیری وہ محبوبہ تو بہت خطرناک نکلی۔"

"ہاں یار، ہم تو خود کو پھنے خان سمجھ رہے تھے۔ لیکن وہ لوگ تو چار ہاتھ آگے کی چیز ہیں۔"

"اب سوال یہ ہے کہ اس گروہ کا ایکٹ کیا ہے۔"

"ایک بات تو طے ہے کہ وہ لوگ اس لڑکی کو سامنے رکھ کر کام کررہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ لڑکی مجبوراً ہی ان کے ساتھ ہو۔"

"واہ میرے مجنوں! عشق ہو تو ایسا ہو کہ محبوبہ کو مجرم سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں ہو۔"

"تم لوگ بکواس مت کرو۔ اس لڑکی سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے اور تم لوگ اسے میری محبوبہ بنائے جارہے ہو۔"

"اچھا یار، ناراض نہ ہو۔ ایسا کرو ہمارے ساتھ اس مکان پر چلو۔ تمہیں یاد تو ہوگا۔ دیکھیں تو سہی، کتنے جیالے لوگ ہیں۔"

"یار وہ لوگ عام مجرم نہیں دکھائی دیتے ہمارے جیسے۔ ان کی کہانی کچھ اور ہے۔"

"تو کیا ہوا۔ ہم نے بھی کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔" میرے ایک ساتھی اشرف نے کہا۔ "ابھی چلتے ہیں۔ ہم آٹھ آدمی ہیں۔ اور سب کے پاس اس وقت سامان بھی ہے۔"

ان لوگوں نے اتنا جوش دلایا کہ میں ان کے ساتھ ہولیا۔ وہ گھر تو اچھی طرح یاد ہی تھا۔ ہم سب تین گاڑیوں میں پہنچے تھے۔ یہ گاڑیاں اشرف، صفدر اور حامد کی تھیں۔

گاڑیاں کچھ فاصلے پر روک دی گئیں۔ ہم بڑی ہوشیاری سے اس مکان کے گیٹ پر پہنچ گئے۔ لیکن اس گیٹ پر تالا پڑا ہوا تھا۔

"یہ لو۔ یہ لوگ تو نکل لیے۔" حامد نے کہا۔

"چلو آس پاس والوں سے معلوم کرتے ہیں۔"

آس پاس والوں نے بتایا کہ یہ مکان پندرہ دنوں پہلے ایک میاں بیوی کو کرائے پر دیا گیا تھا۔ لیکن وہ لوگ آج دوپہر مکان خالی کرکے چلے گئے۔

کوئی نہیں بتا سکا تھا کہ وہ لوگ کون تھے۔ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے۔ البتہ اتنا معلوم ہوا کہ وہ مکان ایک اسٹیٹ ایجنٹ نے کرائے پر اٹھایا تھا۔

ہم نے ایجنٹ کے دفتر پر چھاپا مارا۔ اس نے بتایا کہ دو میاں بیوی تھے۔ میاں کا نام ریاضت تھا۔ وہ شاید کسی دفتر میں کام کرتا تھا۔ اس کے پاس شناختی کارڈ وغیرہ سب کچھ موجود تھا۔ انہوں نے کرایہ ایڈوانس دے دیا تھا۔ اس کے علاوہ چھ مہینوں کا ڈپازٹ بھی دیا تھا۔

"پھر وہ چلے کیوں گئے۔" میں نے پوچھا۔

"میں بھی نہیں جانتا صاحب۔" اس نے کہا۔ "اصولاً ایک مہینے کا نوٹس دینا پڑتا ہے۔ تاکہ جو ڈپازٹ جمع ہے اس کی واپسی کا بندوبست ہوسکے۔ لیکن انہوں نے ابھی تک ڈپازٹ واپس بھی نہیں لیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے آجائیں۔"

ہم ناکام ہوکر واپس آگئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ ان لوگوں نے کسی بڑی واردات کے لیے اتنے پیسے خرچ کیے ہوں گے اور واردات کرلینے کے بعد رخصت ہوگئے۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ اس دوران میں نے ایک

واردات بھی نہیں کی۔ موقع ہی نہیں ملا تھا۔ لیکن وہ لڑکی یاد ضرور آتی رہی تھی۔

ایک رات میں اپنے فلیٹ میں تھا کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے بری طرح خوفزدہ کردیا۔ چور کا دل ہی کتنا ہوتا ہے۔ سر پر ہر وقت خطرے کی تلوار لٹکتی رہتی ہے کہ نہ جانے کس وقت کیا ہوجائے۔

بہرحال جب میں نے دروازہ کھولا تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ دروازے پر وہی لڑکی کھڑی تھی۔ وہی مریم جس کو میں لوٹنا چاہتا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ جبکہ میں حیرت سے بے ہوش ہوا جارہا تھا۔ یہ ایک ناممکن سی بات تھی کہ وہ لڑکی خود میرے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

"گھبراؤ نہیں۔" اس نے کہا۔ "میں اکیلی آئی ہوں تمہارے پاس۔"

"لیکن کیوں؟"

"کم از کم اندر تو آنے دو، پھر بتادوں گی۔"

"اندر... میرے گھر والے ہیں۔" میں نے بہانہ بنانے کی کوشش کی۔

"جھوٹ مت بولو۔ میں جانتی ہوں کہ تم اپنے فلیٹ میں اکیلے رہتے ہو۔" اس نے کہا۔

میں ایک طرف ہٹ گیا۔ ویسے میں اپنی جگہ پوری طرح چونکا تھا۔ اس کا اس طرح آنا یوں ہی تو نہیں تھا۔ اسے کیسے معلوم کہ میں یہاں رہتا ہوں۔

تمہاری حیرانی دور کرنے کے لیے یہ بتادوں کہ جس دن تم نے مجھے روکا تھا، اس دن میرے ساتھی ایک گاڑی میں میرے ساتھ ساتھ تھے۔ تم انہیں میرا اسکواڈ کہہ سکتے ہو۔ لیکن گاڑی والوں کو بھی یہ نہیں اندازہ ہوگا کہ ایک بائیک سب کے تعاقب میں تھی۔"

"اور وہ بائیک کس کی تھی۔"

"میرے بھائی کی۔" اس نے بتایا۔

"تمہارا بھائی بھی اس کھیل میں تمہارے ساتھ ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں، وہ بے چارہ تو خود مجبور ہے۔" اس نے کہا۔ "تم تو اپنی بائیک لے کر روانہ ہوگئے لیکن میں نے اپنے بھائی کو ایک خاص قسم کا اشارہ کردیا تھا۔ وہ اشارہ یہ تھا کہ تمہارا پیچھا کرکے تمہارا ٹھکانا معلوم کرلے۔"

"لیکن کیوں، مجھ سے ایسی کون سی دلچسپی ہوگئی۔

مینار بابل

تہذیب بابل کی قدیم ترین یادگار، آج تباہ شدہ تہذیب کے طور پر آثار قدیمہ کے لیے باعث تقویت ہے، توریت کی کتاب پیدائش کے مطابق اس کی تعمیر "شینار" موجودہ عراق کے میدانی علاقے میں ہوئی تھی۔ مخروطی شکل کی یہ عمارت 300 فٹ اونچی تھی۔ اس میں پتھر کے بجائے پختہ اینٹیں استعمال کی گئی تھیں جس کی حفاظت کے لیے ایک راہب مقرر تھی۔ بعض روایات کے مطابق یہ حضرت نوحؑ کی بعد کی نسلوں نے بنوایا تھا اور اس زمانے کا بادشاہ اس کے ذریعے خدا تک پہنچنا چاہتا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق یہ بادشاہ نمرود تھا اور اس کی تعمیر اسی کے عہد میں ہوئی۔ بعض کے خیال میں اس کی تعمیر سمری تہذیب کے دوران ہوئی۔ جس کا زمانہ 5000 ہزار سال قبل از مسیح کا ہے۔ اور بعض کے تصور میں حضرت موسیٰؑ کے عہد میں جس کا زمانہ 2200 ق م کا ہے۔ اس مینار کی بنیادیں سب سے پہلے 1914ء میں ایک انگریز نے دریافت کی تھیں۔

مرسلہ: فتح خان سرہندی، جھنگ

میں تو ایک لٹیرا بن کر تمہارے سامنے آیا تھا۔"

"ہاں اکرم! اس کے باوجود میں نے تمہارے انداز میں ایک شریفانہ جھلک دیکھ لی تھی۔ تم نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔ کوئی گالی نہیں دی۔ تم میری باتوں سے چڑ کر بری طرح جھلا گئے تھے۔ اس کے باوجود تم نے گولی نہیں چلائی۔ اس لائن میں رہ کر اتنا تجربہ تو ہوگیا ہے تاکہ میں آدمی کو پہچان سکوں۔"

"خدا کے لیے میری ساری الجھن دور کرو۔" میں نے کہا۔ "یہ کیسا ڈراما ہے، کیا کہانی ہے تمہاری۔"

"بہت عام سی کہانی ہے۔" وہ دھیرے سے بولی۔ "میں ایک اوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ باپ کہیں کام کرتا تھا۔ پھر ایک حادثے میں وہ معذور ہوگیا۔ گھر میں فاقے ہونے لگے۔ مجھ سے چھوٹا صرف ایک بھائی ہے۔ میں نے انٹر تک تعلیم بھی حاصل کررکھی ہے۔"

"تم اگر چاہتیں تو کہیں جاب کرسکتی تھیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں، میں جاب ہی کے لیے گئی تھی۔" اس نے بتایا۔ "ان لوگوں نے اسٹیٹ ایجنسی کا ایک دفتر کھول رکھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ بہت شاندار آفس تھا۔ وہ لوگوں کو پلاٹس اور مکانات وغیرہ بھی دلوادیا کرتے۔ لیکن ان کا اصل کام تو کچھ اور تھا۔"

"وہی کام تو میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"شادی، ایک لڑکی کی مختلف لوگوں سے شادی۔" اس نے کہا۔ "ایک رات' دو رات، اس کے بعد پورے گھر کا صفایا۔ میں اب تک تین شادیاں کرچکی ہوں۔ میرا اصل نام مریم ہے۔ لیکن میں بلقیس ہوچکی ہوں' صبا ہوچکی ہوں، ریحانہ ہوچکی ہوں۔"

"یہ، یہ کیسے ممکن ہے۔"

"ان لوگوں کے لیے بہت آسان ہے۔" اس نے بتایا۔ "یہ میرے جعلی شناختی کارڈز وغیرہ بہت آسانی سے بنوادیتے ہیں۔ وہ جو بڑی عمر کا بندہ ہے وہ کبھی میرا باپ بن جاتا ہے' کبھی ماموں کبھی چاچا، یہ لوگ دولت مند گھرانوں کے بے وقوف لیکن تنہا نوجوانوں کو گھیرتے ہیں۔ مجھے چارے کے طور پر استعمال کرکے زبردستی میری شادی کروادی جاتی ہے۔ اور میں دوسرے دن پورے گھر کا صفایا کرواکے فرار ہوجاتی ہوں۔"

"یہ تو بہت ہی خطرناک ریکٹ ہے۔"

"ہاں، بہت خطرناک۔" اس نے کہا۔ "میری وجہ سے اب تک تین نوجوان لاکھوں سے محروم ہوچکے ہیں۔"

"لیکن تم اس گھٹیا کام میں ان کے ساتھ کیسے شامل ہوگئیں۔"

"مجبوری! انہوں نے مجھے اپنے دفتر میں ملازم رکھ لیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "ایک دن انہوں نے دھوکے سے کوک میں نشیلی دوا پلاکر میری بے حرمتی کی اور میری غلط تصاویر اتارلیں۔ بس اس کے بعد سے میں ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن کررہ گئی ہوں۔" اس نے رونا شروع کردیا۔

میں دکھ اور افسوس کے انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اتنی اچھی اور پیاری لڑکی کے ساتھ ایسا سلوک ہورہا تھا۔

"کیا تمہارے گھر والوں کو تمہارے دھندے کے بارے میں نہیں معلوم۔" میں نے پوچھا۔

"صرف میرا بھائی جانتا ہے۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ وہ میرے حال پر تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میری زندگی میں کوئی ایسا آئے جو مجھے اس جنجال سے نکال کرلے جائے۔ جب میں نے تم کو دیکھا تو پہلا خیال یہی آیا کہ شاید تم ہی وہ ہو جس کا میں نے اور میرے بھائی نے انتظار کیا ہے۔"

اب میں نے اس کی ساری کہانی سمجھ لی تھی۔ وہ ایک مظلوم اور بے بس لڑکی تھی۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ ایک میں ہی ہوں جو موبائل اسنیچ کرکے اپنے آپ کو ظالم سمجھتا رہا ہوں۔ یہاں پتا چلا کہ ظلم تو ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ کیسے کیسے کام ہورہے ہیں۔ کیسی کیسی داستانیں ہیں۔

"مریم میں تمہارا ساتھ دوں گا۔" میں نے کہا۔ "دیکھتا ہوں یہ لوگ اب تمہارا کیا بگاڑتے ہیں۔"

"بہت شکریہ میرے دوست۔" اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔ "تمہارا شکریہ۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے مجھے یہ احساس دلایا ہے کہ کوئی میرا ہے جو پریشانی میں میرا ساتھ دے سکتا ہے۔ مجھے اس احساس کے ساتھ زندہ رہنے دو۔ کیونکہ میں اب کسی کام کی نہیں رہی۔ گندی ہوچکی ہوں میں۔"

"نہیں مریم! کم ازکم میری نگاہوں میں تم پاکیزہ ہو۔" میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "ہم دونوں یہاں سے جاکر ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ تم آئندہ ایسے کام نہیں کروگی۔"

"میں اپنے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن تم ایک وعدہ کرو کہ تم ایسے کام نہیں کروگے۔" اس نے کہا۔ "وعدہ کرو مجھ سے۔"

"ہاں' میں وعدہ کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور اب تم ان لوگوں کے پاس واپس نہیں جاؤ گی۔"

"ایک بار تو جانا ہوگا۔ تاکہ میں اپنا شناختی کارڈ اور اپنی تصویریں وہاں سے حاصل کرلوں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ چیزیں کہاں ہوتی ہیں۔ اب انہیں مجھ پر اتنا بھروسا تو ہو ہی چکا ہے۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا۔"

"پھر میں تمہارے پاس آجاؤں گی۔" اس نے کہا۔

لیکن وہ اس کے بعد میرے پاس نہیں آسکی۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں نے اسے ماردیا ہو۔ کسی کے ہاتھ فروخت کردیا ہو یا کچھ بھی ہوسکتا ہے، وہ نہیں آئی۔ میں پاگلوں کی طرح اس کو تلاش کرتا رہا ہوں۔ لیکن میں نے اس سے کیا وعدہ نباہ دیا ہے۔ میں نے ایک عرصہ ہوا اپنا دھندا چھوڑ دیا اور ایک صاف ستھری زندگی گزار رہا ہوں۔

انسان کو روشنی جہاں سے ملے اس سے فائدہ اٹھالینا چاہیے۔

ΔΔΔ

جناب مدیر اعلیٰ

سلام مسنون!

میں اپنی شادی کا احوال رقم کررہی ہوں۔ امید ہے کہ یہ تذکرہ ایسا نہیں ہے جسے قارئین دلچسپی سے پڑھیں۔ امید ہے یہ میری آپ بیتی آپ سرگزشت میں ضرور لگائیں گے۔

شازیہ

(ساہیوال)

اچانک

میں کہاں سے اپنی کہانی کا آغاز کروں۔ آج سے جب سب کچھ بدل گیا ہے یا اس دن سے جب میں نے فیصل کو پہلی بار اپنے دفتر میں دیکھا تھا۔

ایک خوبصورت، ہنستا مسکراتا، خوش مزاج انسان جس کی نگاہیں ذرا سی دیر کے لیے مجھ پر مرکوز ہوئیں پھر دوسری طرف چلی گئیں اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس

ایک لمحے نے میری جان نکال لی ہو۔

پتا نہیں میرے ساتھ یہ کیا مصیبت تھی حالانکہ میں جس دفتر میں کام کیا کرتی وہاں ہر طرف مرد تھے۔ لڑکیاں صرف تین تھیں۔ میں یعنی شازیہ عافیہ اور نورین۔ ان دونوں کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ مجھے ایسے موقعوں پر اپنے اعصاب کشیدہ محسوس ہوتے اور مجھے گھبراہٹ سے پسینے آنے لگتے تھے۔ میں کسی مرد سے مخاطب ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ پہلی بار جب فرم کے باس کے سامنے انٹرویو کے لیے کھڑی ہوئی تو میری یہی حالت تھی۔

میں ان کے سامنے کھڑی ہوئی کانپ رہی تھی۔ باس ایک ادھیڑ عمر انتہائی مہربان اور سمجھدار شخص تھے۔ انہوں نے میرے اس مسئلے کو بھانپ لیا۔ اسی لیے مسکرا کر دھیمے لہجے میں بولے۔ ”تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو، بیٹھ جاؤ۔“

میں جلدی سے بیٹھ گئی۔ اس وقت میں پسینے میں بھیگ گئی تھی۔ باس نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلا کر پانی لانے کے لیے کہا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”میں نے تمہاری سی وی پڑھ لی ہے۔ تمہاری قابلیت بہت اچھی ہے۔“

”جی...... ش...... شکریہ۔“

”ہوسکتا ہے کہ ہم تمہیں جاب پر رکھ لیں لیکن تمہارے ساتھ ایسی پرابلم دکھائی دے رہی ہے جس کی طرف تم نے کبھی دھیان نہیں دیا ہے۔“

”جی، جی ہاں۔“

”کتنے بھائی بہن ہیں تمہارے؟“ باس نے پوچھا۔

”میرے علاوہ دو بہنیں اور دو بھائی ہیں۔“ میں نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

”شادی شدہ؟“

”جی، جی جناب دونوں چھوٹی بہنیں اپنے اپنے گھروں کی ہوچکی ہیں۔“

شاید یہی ایک ایسی بات تھی جس نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ گھر میں دونوں بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں لیکن میں اب تک شادی کے بغیر بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ اسی لیے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہوگئی ہوں یا میرا مزاج ہی ایسا ہو۔ بہرحال اب میں اپنے آپ کو ناکارہ سمجھنے لگی تھی۔ شاید میری قسمت میں خوشیاں نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

میری دونوں شادی شدہ بہنیں جب مجھ سے ملتیں تو ان کے گالوں پر کھلے ہوئے گلاب مجھے اندر ہی اندر جھلسا کر رکھ دیتے۔ میں ایک طرف تو ان کی ازدواجی زندگی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی اور دوسری طرف اپنے حالات پر رونا آتا۔

مجھے حسد تو نہیں ہوتا تھا یا شاید ہوتا بھی ہو لیکن اتنا ضرور تھا کہ میں اپنے کمرے میں بند ہوکر اپنے آپ پر رویا کرتی۔

یہ میرا بیک گراؤنڈ ہے اور اسی بیک گراؤنڈ کی وجہ سے میں کہیں ایڈجسٹ بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اپنی زندگی اور خوشیوں کی طرف سے مایوس ہوکر میں نے اپنے آپ کو تعلیم کے لیے وقف کردیا۔ ایم اے تک میرا ریکارڈ بہت شاندار رہا۔ میں نے اضافی کورسز بھی کر رکھے تھے۔

بہرحال اس فرم میں میری جاب ہوگئی اور میں یہ بتا چکی ہوں کہ باس ایک مہربان انسان تھے۔ انسانی نفسیات کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی باتوں سے مجھے اتنا حوصلہ دلا دیا کہ میں ان کے دفتر میں کام کرنے لگی اور میں بھی اس معاشرے کی تیز رفتار زندگی کا حصہ بن گئی۔

دفتر کے لوگوں سے کافی عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میری بے تکلفی نہیں ہوسکی تھی۔ جان پہچان تو ہر ایک سے تھی لیکن میرا وہی مزاج، شرم اور جھجک میرے آڑے آجاتی اور میں اپنے آپ کو خود اپنے خول میں سمیٹ لیتی۔

وہ سب ایک دوسرے سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہتے اور میں ایک طرف بیٹھی کتاب پڑھتی رہتی۔ کبھی کبھی مسکرا کر ان کی طرف دیکھ بھی لیا کرتی۔ بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔

پھر اس دوران میں فیصل آگیا۔ ایک خوش مزاج، خوب صورت اور زندہ دل نوجوان جس نے تھوڑے ہی عرصے میں پورے دفتر والوں سے بے تکلفی پیدا کرلی۔ ہر ایک سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا، مذاق کرتا رہتا۔

ایک دو بار اس نے مجھے بھی اپنی محفل میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے زیادہ لفٹ نہیں دی۔ ایسا بھی نہیں ہوا تھا کہ میں نے اس کے ساتھ کسی قسم کی بے رخی اختیار کی ہو لیکن زیادہ حوصلہ

افزائی بھی نہیں کی تھی۔

ایک بار میں دفتر میں تھی کہ کسی لڑکی کا فون آیا۔ وہ فیصل کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ میں اس وقت وہیں تھی۔ اسی لیے فون مجھے ریسیو کرنا پڑا۔ میں نے چپراسی سے کہا کہ وہ فیصل کو بلا کر لے آئے۔ فیصل نے ریسیور اٹھا لیا۔ اتفاق سے میں اس وقت اس کی میز کے پاس ہی موجود تھی۔ میں نے فیصل کی آواز سنی۔ وہ بہت لہک لہک کر باتیں کر رہا تھا۔

”تمہارے ساتھ یہی تو مسئلہ ہے کہ تم فون پر تو لہک لہک کر باتیں کرتی ہو لیکن......“ پھر اس نے اپنی آواز دھیمی کرلی...۔ میں اپنی میز کی طرف واپس آگئی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ اب اتنا ہوتا تھا کہ فیصل سے اچھی خاصی باتیں ہونے لگی تھیں۔

وہ کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ اسے پیار سے رانی کہا کرتا اور مجھ سے اس کی باتیں کیا کرتا۔ ایک دن اس نے بتایا۔ ”رانی کے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ بہت شرمیلی سی ہے اور کسی سے ملتی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں آہستہ آہستہ ٹھیک ہوجائے گی۔“ میں اس سے کہتی لیکن اندر ہی اندر بکھر جاتی تھی۔ کاش کوئی میرے لیے بھی ہوتا۔ جسے میری فکر ہوتی اور مجھ سے پیار کرتا جو میری باتیں اپنے دوستوں سے کیا کرتا۔

ایک دن فیصل نے مجھ سے کہا۔ ”شازیہ کیا تم میرا ایک کام کردوگی؟“

”کیا کام ہے بتاؤ؟“

”کیا تم اس بے وقوف رانی کو سمجھا سکتی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں......؟“

”ہاں تم۔“ اس نے کہا۔ ”تم ایک سمجھدار لڑکی ہو۔ تم اسے سمجھاؤ کہ زندگی اس طرح نہیں گزرا کرتی۔ جس طرح وہ گزارتی ہے۔ انسان کو تھوڑا بولڈ بھی ہونا پڑتا ہے تاکہ زمانے کا سامنا کرسکے۔ تم اپنی مثال دینا کہ تم دفتر میں کام کرتی ہو اور ایک باوقار عہدے پر ہو۔ تمہیں زندگی گزارنے کا سلیقہ آتا ہے۔“

”فیصل یہ تم مجھے کس امتحان میں ڈال رہے ہو۔“

”پلیز میری خاطر، ورنہ یہ ہوگا کہ مجھے رانی پر سختی کرنی پڑے گی۔“ اس نے کہا۔ ”اسے اپنانا تو ہے چاہے کچھ بھی ہوجائے تو یہ بہتر نہیں ہوگا کہ وہ میرے گھر

فقیر محمد چشتی نظامی

1866-1952ء

نامور طبیب اور صوفی۔ فخرالاطباء لقب تھا۔ وہ امرتسر میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور پھر طبی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے حکیم مولوی محمد ابراہیم جالندھری، مولانا حکیم حیدر علی بجنوری اور علامہ محمد عالم آسی سے استفادہ کیا۔ ہندی زبان بھی سیکھی۔ 1900ء میں اپنا مطب شروع کیا۔ میاں غلام محمد چشتی نظامی ہوشیار پوری کے دستِ حق پرست پر بیعت کی۔ فاضل درس نظامی بھی تھے۔ طبی موضوعات پر متعدد کتب لکھیں جن میں تجرباتِ فخرالاطباء قابلِ ذکر ہیں۔ لاہور میں انتقال کیا اور حضرت میاں میر صاحب کے جوار میں دفن ہوئے۔

مرسلہ: ذیشان انصاری، لاہور

بھرپور اعتماد والی لڑکی بن کر آئے۔“

اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوسکتی تھی یہ میں بتا نہیں سکتی۔ قدرت میرا امتحان لینا چاہتی تھی۔ بہرحال جب وہ میری قسمت میں نہیں تھا تو پھر ساتھ دینے یا نہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے اسی لیے میں نے رضامندی ظاہر کردی۔

”ٹھیک ہے میں چلوں گی تمہارے ساتھ۔“ وہ اتنا خوش ہوا کہ اس نے اسی وقت فون کرکے رانی سے وقت لے لیا اور ریسیور رکھ کر اس نے مجھ سے کہا۔ ”شازیہ بس کل شام رانی کے گھر چلنا ہے۔“

دوسرے دن مجھے دیکھ کر اس کا منہ بن گیا۔ ”خدا کی بندی، یہ تم کون سا ڈریس پہن کر آئی ہو۔“

”کیوں، اس میں کیا برائی ہے؟“

”بابا میں تمہیں آئیڈیل بنا کر اس کے سامنے لے جانا چاہتا ہوں کہ دیکھو لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں۔ بنی سنوری ہوئی......اور تم اس طرح اجاڑ اجاڑ سی جا رہی ہو۔“

”فیصل تم تو جانتے ہو کہ میں اسی طرح رہتی ہوں۔“

”جانتا ہوں لیکن کم از کم آج تو اپنے آپ کو تھوڑا سا بدل لو۔“ اس نے کہا۔ ”یہ دنیا دکھاوے کی ہے اور تمہیں اس لڑکی کو مرعوب کرنا ہے اپنی شخصیت سے۔“

اس نے اتنی ضد کی کہ میں نے اس سے وعدہ کرلیا کہ میں اس کی بات مان کر دوسرے ڈریس میں اس کے ساتھ چلوں گی۔ فیصل کے پاس گاڑی بھی تھی۔

وہ مجھے لے کر گھر آ گیا۔ میں نے گھر والوں کو اس صورتِ حال کے بارے میں بتا رکھا تھا۔ اس لیے کسی کو اعتراض بھی نہیں تھا۔

میں نے یہ شاید نہیں بتایا تھا کہ میں اپنے احساسِ کمتری کی وجہ سے میک اپ ...... سے بھی گریز کرتی تھی۔ وہ کہتے ہیں نا کہ نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لیے اور یہ کیسی ستم ظریفی تھی کہ آج نئے کپڑے بھی بدل رہی تھی اور بال بھی بنا رہی تھی لیکن کسی اور کے لیے۔

کچھ دیر بعد تیار ہو کر فیصل کے پاس آئی تو مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ مجھے خفت سی محسوس ہوئی .... شاید اس طرح وہ میرا مذاق اڑا رہا تھا لیکن اس نے کہا کچھ نہیں اور ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔

وہ مجھے ایک خوبصورت سے ایک منزلہ مکان میں لے آیا۔ اس مکان کا لان چھوٹا سا تھا لیکن بہت خوبصورتی سے سجا اور تراشا ہوا تھا۔

”باغبانی محترمہ کا شوق ہے۔“ فیصل نے رانی کے بارے میں بتایا۔ ”خیر سے بہت ہی فنکارانہ مزاج کی واقع ہوئی ہیں۔“

اس گھر میں ادھیڑ عمر کا باوقار سا مرد اور ایک عورت بھی تھی۔ دونوں رانی کے ماں باپ تھے۔ فیصل نے ہم سب کا تعارف کروایا۔ ہم ڈرائنگ روم میں.... بیٹھ گئے۔

اس کے والدین بہت زندہ دل اور دلچسپ تھے۔ اپنی بیٹی کے بارے میں بتایا کہ وہ ویسے تو بہت ذہین ہے لیکن اس کی یہی جھجک اس کے آڑے آرہی ہے اور وہ خوامخواہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہی ہے۔“

”آنٹی آپ اسے بلا لیں۔“ کچھ دیر بعد فیصل نے کہا۔ ”اس سے کہیں کہ مہمان آگئے ہیں۔“

”بیٹا وہ اپنے کمرے میں ہے۔“ اس کی ماں نے بتایا۔ ”ایسا کرو تم خود چلے جاؤ۔“

”جی اچھا۔“ فیصل اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ جھلایا ہوا واپس آ گیا۔ ”نہیں جی وہ پاگل اپنے کمرے سے نکلنے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔“

”یہی تو مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔“ اس کی ماں نے کہا۔

”شازیہ۔“ فیصل نے میری طرف دیکھا۔ ”اب صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ تم خود اس کے پاس چلی جاؤ۔“

”ہاں بیٹا یہی بہتر ہوگا۔“ اس کے باپ نے بھی تائید کی۔ ”تم ہی چلی جاؤ۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“ فیصل نے کہا۔

میں فیصل کے ساتھ رانی کے کمرے تک آ گئی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ”جاؤ اندر چلی جاؤ۔“

میں کمرے میں آ گئی لیکن اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا شاید رانی ملحقہ واش روم میں ہو لیکن کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد میں نے واش روم کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ وہ دروازہ بھی کھلا ہوا تھا اور واش روم میں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں مڑی تو سامنے دیوار کے پاس ایک بڑا سا آئینہ تھا۔ اس آئینے میں میرا ہی سراپا دکھائی دے رہا تھا۔

میں پہلی بار جیسے اپنے آپ کو دیکھ رہی تھی۔ کتنی تبدیلی آ گئی تھی مجھ میں۔ بالکل ہی نیا روپ لیکن وہ لڑکی کہاں تھی۔ اس وقت فیصل بھی کمرے میں آ گیا۔

”فیصل تمہاری رانی یہاں تو نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”کس نے کہا کہ رانی یہاں نہیں ہے۔“ وہ مسکرا دیا، پھر اس نے آئینے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہی تو ہے میری رانی۔“

”فیصل۔“ میں کانپ کر رہ گئی۔

”ہاں شازیہ تم ہی میری رانی ہو اور تم جن سے ملی ہو وہ میرے ماں باپ ہیں۔ ہم سب نے مل کر تمہیں اس خول سے باہر نکالنے کے لیے یہ ڈراما کیا ہے۔ اب بتاؤ، کیا میری رانی بننا چاہو گی؟“

میں نے شدتِ جذبات سے آنکھیں بند کرلیں۔ میرے خدا ذرا سی دیر میں مجھے سب کچھ مل گیا تھا۔

فیصل میرے شوہر ہیں۔ ہم خوبصورت پیار بھری زندگی گزار رہے ہیں۔ فیصل نے جس انداز سے اپنے عشق کا اظہار کیا اور جس طرح مجھے اپنایا تھا، ایسی دلکش مثال کم ہی ہوتی ہے۔

لاحاصل

محترم معراج رسول
سلامِ تہنیت!

آپ میرے دوست کو پاگل کہیں گے، ہیں ناں؟ لیکن وہ مریضِ عشق تھا۔ ہم نے ایک ہی لڑکی سے عشق کیا تھا مگر دونوں کے عشق کا انداز جدا تھا۔ اس کے اور میرے عشق میں فرق کیا تھا یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ڈاکٹر عدنان
(کراچی)

ہم دونوں دوست تھے اور دوست بھی ایسے کہ دوستی کے بارے میں جتنے محاورے مشہور ہیں سب پورے اترتے تھے۔ دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھے بغیر روٹی ہضم نہیں ہوتی تھی۔ یک جان دو قالب تھے۔ ایک دوسرے کی آنکھ سے خواب دیکھتے تھے۔ اگر نیند کی مجبوری نہ ہوتی تو سونے کے لیے اپنے اپنے گھروں کو بھی نہ جاتے۔ پرائمری سے میڈیکل کالج تک ساتھ بڑھتے چلے آرہے تھے۔ یہ بھی طے کرلیا تھا کہ اگر شادی کرنی پڑی تو ایک ہی

خاندان میں کریں گے۔

ہماری دوستی جام بلوریں تھی جو نیتوں کے فتور سے پاک اور خود غرضی کے میل کچیل سے صاف تھی اور پھر ایک دن یہ ہوا کہ یہ جام لائبریری کے فرش پر گرا اور کرچی کرچی ہوگیا۔ فرش تو کہیں کا بھی ہوسکتا تھا لیکن لائبریری کا فرش اس لیے گناہ گار ٹھہرا کہ وہ ہم سے لائبریری میں آکر ہی مخاطب ہوئی تھی۔ ہم دونوں کی آنکھوں نے ایک ساتھ اس کا طواف کیا تھا۔ جب ہماری آنکھیں اس کارِ خیر کی انجام دہی کے بعد پلٹیں تو ہم دونوں دوست ایک دوسرے سے دور جاچکے تھے۔ اس نے جو پوچھنا تھا پوچھ لیا تھا۔ میں تو خاموش رہا تھا لیکن میرے دوست شاہد نے اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کی تھیں۔ وہ نظر کی صورت آئی تھی بجلی کی صورت چلی گئی تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے چور کو چھپانے کے لیے کتابوں پر جھک گئے تھے۔ میں اس وقت یہی سمجھا تھا کہ قیامت صرف مجھ پر گزری ہے لیکن شدید زخمی شاہد ہوا ہے اس کا مجھے احساس نہیں تھا۔ یہ احساس مجھے اس وقت ہوا جب ایک دو روز بعد شاہد نے میرے سامنے تفتیشی رپورٹ پیش کی۔

”جانتے ہو وہ کون تھی؟“

”کون، کون تھی یار مجھے پڑھنے دے۔“

”وہی جو اس دن لائبریری میں آئی تھی۔“

”اچھا وہ...... جس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کتابیں ایشو کروانے کا طریقہ کار کیا ہے۔“

”تجھ سے کہاں اس نے تو مجھ سے پوچھا تھا۔“

”وہ مجھ سے مخاطب تھی۔ یہ الگ بات کہ مجھ سے پہلے تو بول پڑا تھا۔“

”جس سے پوچھا تھا اسی کو تو جواب دینا تھا۔“

”لیکن مسکرائی تو مجھے دیکھ کر تھی۔“

”ایک مرتبہ غلطی کرلی ہوگی آیندہ شاید نہ کرے۔“ شاہد نے کہا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر لائبریری سے چلا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب وہ مجھے یوں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

میں اس کے جانے کے بعد یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ شاہد اس لڑکی کے بارے میں جاننے کے لیے اتنا فکرمند کیوں ہوا کہ باقاعدہ سراغ رسانی کرنے لگا۔ کالج میں ایک دو نہیں بہت سی لڑکیاں تھیں۔ آج تک اس نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کون ہیں۔ لڑکیوں پر ریمارکس ضرور پاس کرتے تھے لیکن اس میں سنجیدگی سے زیادہ مزاح کا پہلو ہوتا تھا۔

اس نے مجھے ہوشیار کردیا تھا۔ میں اس کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھنے لگا تھا۔ غالباً وہ بھی یہی کررہا ہوگا۔ ہم دونوں کے درمیان شک کی دیوار تعمیر ہونے لگی۔ یہ دونوں کی مصلحت تھی کہ دوستی کو برقرار رکھا جائے۔

جب چند روز خاموشی سے گزر گئے اور اس نے اس لڑکی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تو میرا شک یقین میں بدلنے لگا۔ ہم دونوں اپنے ہر جذبے میں ایک دوسرے کو شریک کرتے تھے لیکن اب ایسا نہیں ہورہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی بات ایسی ہے جو وہ مجھ سے چھپا رہا ہے۔ میں اس سے خود بھی تو پوچھ سکتا تھا لیکن میں کیوں پوچھتا۔ میں وہ سب کچھ جاننا نہیں چاہتا تھا جو وہ بتاتا۔ میں اس قصے میں دلچسپی لینا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ میرے دل کا چور نہ پکڑلے۔

اس کی آواز کی کھنک ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ لڑکی نہیں موم کی گڑیا تھی۔ دھوپ لگی اور پگھلی۔ سوال یہ تھا کہ اس سے پہلے وہ نظر کیوں نہیں آئی۔ یہی وہ تجسس تھا جو مجھے اس کے قریب جانے پر مجبور کررہا تھا لیکن میری فطری شرم آڑے آرہی تھی۔ وہ مجھے کئی مرتبہ نظر آئی لیکن میری نگاہیں احتراماً جھک گئیں۔ صرف اس کی مسکراہٹ تھی جو مجھے اپنے قریب کھڑی نظر آئی۔

چند ہفتوں میں مجھے صرف یہ معلوم ہوسکا کہ وہ نواب شاہ کالج سے ٹرانسفر ہوکر یہاں آئی ہے۔ اس ٹرانسفر سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کسی بااثر باپ کی بیٹی ہے ورنہ ٹرانسفر ناممکن تھا۔ یہ معلوم ہوا کہ اس کا نام تانیہ ہے۔

میں اس سے اندر ہی اندر عشق کرنے لگا لیکن یہ احتیاط رکھی کہ یہ ماجرا شاہد پر عیاں نہ ہو۔ میں نے تو پوری احتیاط کی تھی لیکن شاہد نے اپنی کامیابی کے نشے میں یا پھر میری طرف سے بےفکر ہونے کے بعد اپنے چور کو آزاد کردیا تھا۔

اس وقت ہم دونوں کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کینٹین اس وقت تقریباً خالی تھی۔ ایک دو لڑکے ہم سے دور گپ شپ میں مشغول تھے کہ اچانک کالج کینٹین اسمبلی کا فلور بن گئی۔ شاہد نے ایک اطلاع دی اور ہمارے درمیان گرما گرم بحث کا آغاز ہوگیا۔

”وہ نئی لڑکی تانیہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔“ طیش میں آکر میں نے بھی دل کا چور آزاد کردیا۔

”تم بکواس کررہے ہو۔“

”بکواس تم کررہے ہو۔“ اسے اتنا غصہ آیا کہ اس نے میرے منہ پر گھونسا رسید کردیا۔ میں نے جوابی کارروائی کی لیکن وہ ہوشیار ہوچکا تھا۔ میرا وار خالی چلا گیا۔ اتنی دیر میں لڑکے بھاگتے ہوئے آئے اور بیچ بچاؤ کروادیا۔

لڑکوں کے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم دونوں کی دوستی پورے کالج میں مثال بنی ہوئی تھی۔ وہ حیران تھے کہ اس شیشے میں بال کیسے آگیا۔

یہ حیرت اس وقت مزید گہری ہوگئی جب آخری پیریڈ ختم ہونے سے پہلے ہمیں ایک ساتھ کینٹین میں بیٹھے دیکھا گیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے سے معذرت بھی کررہے تھے اور اپنے اپنے موقف پر جمے ہوئے بھی تھے۔

”وہ مجھ میں دلچسپی لے رہی ہے اس لیے تم راستے سے ہٹ جاؤ۔“

”یہ دعویٰ تم کیسے کرسکتے ہو؟“

”وہ پہلے دن لائبریری میں آئی تھی تو مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔“

”اس وقت ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہم دونوں سے مخاطب ہوئی تھی۔“

”اس کا چہرہ میری طرف تھا۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ میری پسند ہے میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

”یہی دعویٰ میرا بھی ہے۔“

”تم اپنے دعوے کرتے پھرو۔“

”یہ ہم کس بحث میں الجھ گئے ہیں۔ وہ جسے پسند کرے گی حق تو اس کا ہوگا۔“

”اب ہم اس سے پوچھنے جائیں کہ وہ کس کو پسند کرتی ہے؟“

”پوچھنے کے اور بھی طریقے ہیں۔ ہم اپنی اپنی کوشش کرتے ہیں۔ جو اس کے دل میں اتر جائے گا وہی کامیاب ہوگا۔“

”یہ تو وہی بات ہوگئی جو اَب ہے۔ یہ کیسے ہوگا کہ ہم بہ یک وقت اس سے اظہارِ عشق کریں۔“

”پھر تو یہی ہوسکتا ہے کہ ایک پستول تمہارے ہاتھ میں ہو ایک میرے ہاتھ میں۔ دونوں گولی چلائیں جو زخمی ہوجائے وہ جیتنے والے کے حق میں دست بردار ہوجائے۔ اگر مرجائے تو فیصلہ خودبخود ہوجائے گا۔“

”ہم کسی وحشی قبیلے کے افراد نہیں جو اس قسم کے مقابلوں کا اہتمام کرتے پھریں۔“

”ایک تجویز اور ہے میرے ذہن میں۔ ہم آپس میں دن بانٹ لیتے ہیں۔ ایک دن تم اپنی قسمت آزماؤ گے ایک دن میں۔ جو اسے رام کرنے میں کامیاب ہوجائے گا اور ثبوت فراہم کردے گا دوسرا اس کے حق میں خودبخود دست بردار ہوجائے گا۔ ہماری دوستی بھی قائم رہ جائے گی اور محبت بھی۔ بولو کیا کہتے ہو؟“

”منظور ہے، کل میرا دن ہوگا۔“

”میں تمہارے سامنے تک نہیں آؤں گا تم اپنی قسمت آزمالینا۔“

میں اب تک تانیہ کو دیکھ کر کتراتا رہا تھا۔ جان بوجھ کر نہیں بس میری ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ویسے اکیلے میں اس کے تصور سے خوب باتیں کرتا تھا اور یہ دعویٰ کرنے لگا تھا کہ میں اس سے عشق کرنے لگا ہوں۔ اب جو مقابلے کی صورت سامنے آگئی تو مجھے اپنی باری کا فائدہ اٹھانا تھا۔ میں شاہد کو یہ موقع دینا نہیں چاہتا تھا کہ وہ پہل کرے۔

مجھے یاد ہے میں اس دن اسے بہت دیر تک ڈھونڈتا رہا تھا۔ ایک ایک کلاس دیکھ لی۔ لائبریری میں دیکھ لیا۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ اس کا مطلب ہے وہ کالج میں آئی ہی نہیں۔ مجھے اپنی قسمت پر غصہ آنے لگا تھا کہ وہ مجھے کاریڈور میں نظر آگئی۔ اتفاق یہ کہ وہ اکیلی تھی۔ کوئی لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی۔ یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ مجھ میں اس کے قریب جانے اور اس سے بات کرنے کی ہمت آگئی۔

”ہیلو۔“

”ہیلو۔“

”آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں؟“

”آپ یہاں کے اسٹوڈنٹ ہیں، کیا یہ پہچان کافی نہیں؟“

”اس کے علاوہ بھی میری ایک پہچان ہے۔ آپ جب پہلی مرتبہ لائبریری میں آئی تھیں تو مجھ سے ہی بات کی تھی۔“

”تو آپ یہ شکایت کرنے آئے ہیں کہ میں نے آپ سے بات کیوں کی تھی؟“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اسی وقت کچھ لڑکیاں ادھر سے گزریں۔ وہ اس طرح ہنستی ہوئی گئیں جیسے میرا مذاق اڑا رہی ہوں۔

”آپ نے بتایا نہیں میرا بات کرنا آپ کو برا کیوں لگا تھا۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

”مجھے برا نہیں لگا تھا۔ میں تو آپ کو یاد دلا رہا ہوں کہ آپ نے مجھ سے بات کی تھی۔“

”مجھے واقعی یاد نہیں ورنہ میں آپ کو کیوں جھٹلاتی۔“

”میرے کہنے کا یقین تو کر سکتی ہیں؟“

”مجھے یقین آ گیا۔“

”میرا نام عدنان ہے۔“

”میرا نام تانیہ ہے۔“

”ہم کاریڈور میں تماشا بن رہے ہیں چلیے لائبریری میں چلتے ہیں۔“

”تماشا تو وہاں بھی بن جائیں گے۔“ اس نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

میں چاہتا تھا ابھی اور باتیں ہوں لیکن پہلے دن یہی کامیابی بہت تھی۔ ایک دن بعد میری باری پھر آ جائے گی۔ باقی باتیں پھر ہو جائیں گی۔ میں نے سوچا اور جگہ چھوڑ دی۔

اگلے دن میرے دل کے صحرا میں دھول اُڑ رہی تھی۔ اس دن شاہد کو اپنی قسمت آزمانا تھی۔ میں اپنے اندر چھپا بیٹھا رہا۔

اس سے اگلے دن میری باری تھی۔ وہ مجھے نظر آ گئی تھی لیکن میں اس سے بات کیے بغیر اس کے سامنے سے گزر گیا اور لائبریری کی طرف مڑ گیا۔ میں ایک کتاب لے کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے دیکھ کر لائبریری میں ضرور آئے گی کیونکہ پچھلی ملاقات میں اسے میں نے لائبریری میں بیٹھنے کی پیشکش کی تھی۔

میں کتاب کھولے ضرور بیٹھا تھا لیکن میری آنکھیں کتاب سے زیادہ دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ خوشبو کا ایک جھونکا اندر داخل ہوا۔ یہ تانیہ تھی جو اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی پھر میرے قریب ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

”مجھے امید تھی تم ضرور آؤ گی۔“ میں آپ سے تم پر آ گیا تھا۔

”آپ کو یہ امید کیوں تھی؟“

”آپ جب کاریڈور میں کھڑی ہو کر مجھ سے بات کر سکتی ہیں تو یہاں کیوں نہیں۔“

”ہم سب ایک ساتھ پڑھتے ہیں، بات کرنے میں کیا حرج ہے۔“

”پڑھتے تو سب ہی ساتھ ہیں۔ بہت سی لڑکیاں ہیں لڑکے ہیں لیکن بعض لوگ بہت خاص ہوتے ہیں۔“

”جیسے آپ کے لیے آپ کا دوست شاہد بہت خاص ہے۔“

”یہ آپ کو اسی نے بتایا ہوگا؟“

”وہ مجھ سے ملتا تو ضرور بتاتا۔ مجھے تو دوسرے بہت سے لوگوں نے بتایا ہے۔“

”وہ کل آپ سے ملا نہیں تھا؟“

”یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔ میں کیا ہر ایک سے بات کرتی پھرتی ہوں۔ آپ سے بھی اس لیے بات کر لیتی ہوں کہ آپ کے چہرے پر میں نے شرافت دیکھی ہے۔ آپ دوسروں کی طرح نہیں ہیں۔“

”کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ہم ایک دوسرے کے بارے میں جان لیں۔“

”کیا یہ کافی نہیں ہے کہ مجھے آپ کا نام معلوم ہو گیا آپ میرا نام جانتے ہیں۔“

”نام تو ہم بہت سے لوگوں کا جانتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے پہلے کہا لوگوں کی بھیڑ میں کچھ لوگ وہ بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہم اس سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں۔“

”آپ شاید میری فیملی کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں؟“

”چلیے آپ یہیں سے شروع کر دیجیے۔“

اس نے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔

اس نے اس ملاقات میں جو کچھ بتایا اس سے عیاں ہو گیا کہ وہ کم نمبروں کے باوجود نواب شاہ سے کراچی اپنا ٹرانسفر کروانے میں کیسے کامیاب ہو گئی۔ وہ ایک بہت بڑی سیاسی شخصیت کی اکلوتی صاحب زادی تھی۔

اسے اکلوتی ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس جیسی دوسری کوئی اور ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر اس کی کوئی اور بہن ہوتی تو بھی وہ اکیلی ہوتی۔ وہ کالج میں بھی اکیلی تھی اپنی فیملی میں بھی اکیلی تھی۔ اس اطلاع کے بعد مجھے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی تھی کہ وہ کالج آتی ہے تو اس کی گاڑی میں گارڈ کیوں بیٹھا ہوتا ہے۔

اس کے بعد کئی ملاقاتوں میں بہت سی باتیں ہوئیں لیکن مجھ سے یہ نہیں کہا گیا کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔ اس نے خود اندازہ لگا لیا ہو تو دوسری بات ہے۔

شاہد کی کامیابی کہاں تک پہنچی اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا کیونکہ ہمارے درمیان یہ بھی طے ہوا تھا کہ کسی بڑی کامیابی سے پہلے ہم آپس میں تانیہ کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تمام معاملات بخیر و خوبی طے ہو رہے تھے لیکن دوستی مجھے اپنے ہاتھوں سے نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ دوستی میں ذاتی اغراض شامل ہو جائے تو پھر وہ دوستی نہیں رہ جاتی ایک بے جان سا تعلق رہ جاتا ہے۔ دوستی ایک ایسا مریض بن جاتا ہے جو آکسیجن پر زندہ ہوتا ہے۔ کسی بھی وقت سانس کی ڈوری ٹوٹ سکتی ہے۔

میرے دل میں یہ خیالات بھی آ رہے تھے کہ شاہد مجھ سے تیز دوڑ رہا ہے۔ میں نے ابھی تک تانیہ سے اظہارِ محبت نہیں کیا ہے۔ ہو سکتا ہے شاہد یہ کر گزرا ہو۔ مجھے تیز دوڑنا چاہیے اس سے پہلے کہ شاہد اپنی کامیابی کی کہانی مجھے سنائے میں اسے اپنی کامیابی کا ثبوت فراہم کر دوں گا۔ اس روز میری باری تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس سے مل کر مجھے کیا کہنا ہے۔

”تانیہ، یہاں کچھ لوگوں کو ہمارا ملنا پسند نہیں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کہیں باہر ملیں؟“

”ملنا ضروری ہے؟“ یہ بات اس نے اس انداز میں کہی تھی جیسے اس نے محسوس کر لیا ہو کہ ملنا ضروری ہے۔

”بہت ضروری ہے، مجھے تم سے کئی اہم باتیں کرنی ہیں۔“

”جو کچھ کہنا ہے یہیں کہہ لو۔ میں ڈرائیور کے ساتھ آتی جاتی ہوں۔ گارڈ میرے ساتھ ہوتا ہے۔ بالکل قیدیوں کی سی زندگی ہے ہماری۔“

”صرف ایک بار، تم کوئی انتظام کرو صرف ایک بار مجھ سے باہر مل لو۔“

”اچھا بابا، تمہاری ضد پوری کرنے کے لیے کوئی ترکیب نکالنی پڑے گی۔ یہ بتاؤ تم مجھ سے کہاں ملو گے؟“

”مقام خود تجویز کر لو میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”آپ نے صدر میں جبیس ہوٹل دیکھا ہے۔ شام چار بجے وہاں پہنچ جایئے گا۔“

”شام چار بجے؟“

”میں ابھی نہیں جا سکتی۔ گھر پہنچ کر گارڈ اور ڈرائیور کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آنا پڑے گا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ میں روز روز نہیں آ سکتی۔“

جس روز میری باری ہوتی اس روز شاہد یا تو کلاس روم میں پایا جاتا یا کامن روم میں بیٹھا رہتا تھا۔ باہر نکلنے سے گریز کرتا تھا۔ میری کلاس نہیں تھی اس لیے میں بھی کامن روم میں چلا گیا۔

میں نے تانیہ کو باہر ملنے کے لیے اس لیے کہا تھا کہ میں اسے اپنی بڑی کامیابی بنا کر شاہد کو سنانا چاہتا تھا لیکن شاہد نے اس سے پہلے ہی مجھے لاجواب کر دیا۔

”بیٹا اب تم میرے حق میں دست بردار ہو جاؤ۔“

”ابھی ہم دونوں میں سے کسی کو کامیابی نہیں ملی ہے۔“

”تمہیں نہ ملی ہو مجھے تو مل گئی۔ تم کالج کی دیواروں سے سر پھوڑ رہے ہو میں اس کے گھر بھی ہو آیا اور شاید عنقریب شادی بھی کر لوں۔ اگلے دو چار دن میں میرے والدین بھی اس کے گھر جانے والے ہیں۔ بہتر ہے تم اس سے ملنا چھوڑ دو۔“

”تم جھوٹ بھی تو بول سکتے ہو.... کیا ثبوت ہے کہ تم اس کے گھر گئے تھے؟“

”یہ تمہیں جلد معلوم ہو جائے گا جب میری اور اس کی شادی ہوگی۔ اب وہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ خبردار جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔“

”میں تمہارا غلام نہیں ہوں جو تمہارے حکم پر چلوں۔ تمہیں جو کرنا ہے کر لو مجھے جب موقع ملے گا میں اس سے ملوں گا۔“ میں نے کہا اور کامن روم سے نکل آیا۔

ہماری بقیہ دوستی بھی ختم ہو گئی۔ بڑی زور کی آندھی آئی تھی۔ میں تانیہ کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اس سے کہوں کہ اب کہیں باہر ملنے کا کیا جواز رہ گیا ہے۔ میری آنکھوں نے دیکھنا چھوڑ دیا تھا یا کلاسوں میں اندھیرا تھا۔ یہ کیسا اندھیرا تھا سب نظر آ رہے تھے تانیہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ مجھے کہیں نہ ملی۔ میرا دھیان ٹوٹی ہوئی دوستی کی طرف چلا گیا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ شاہد نے مجھے مرعوب کرنے کے لیے داستان گھڑی ہو۔ وہ اس کے گھر گیا ہی نہ ہو۔ وہ اس کے گھر جا بھی سکتا ہے۔ میرے ذہن نے مجھ سے بغاوت کی۔ وہ بڑے باپ کا بیٹا ہے۔ وہ تانیہ کے معیار کا ہے۔ میری محبت اگر کامیاب بھی ہو جاتی تو تانیہ کے گھر والے اس سے میری شادی نہ کرتے۔ میں مایوس ہو کر کالج سے نکل آیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب شاہد اپنے راستے گیا تھا اور میں اپنی راہ چلا تھا۔ گھر پہنچ کر بھی میں انہی خیالات میں الجھا رہا تھا پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ یہ تو تانیہ ہی بتائے گی کہ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھ سے محبت کرتی ہے یا شاہد سے۔ مجھے ہوٹل جبیس ضرور جانا چاہیے۔

ہوٹل کے سامنے اس کی گاڑی مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ جب وہ شاہد سے محبت کرنے لگی ہے تو مجھ سے ملنے کیوں آئے گی۔ اس نے میرا دل رکھنے کے لیے وعدہ کرلیا ہوگا۔ سوچتی ہوگی میں انتظار کرکے خود ہی چلا جاؤں گا لیکن میں جانے والا نہیں۔ اس کا انتظار کروں گا جب تک وہ آ نہیں جاتی۔ وہ نہیں آئی تو میں اس کے گھر جاؤں گا۔ اس سے پوچھوں گا ضرور کہ اس نے یہ مذاق مجھ سے کیوں کیا۔

میں ہوٹل کے سامنے ٹہلتا رہا۔ صدہا چکر لگالیے اور پھر اس کی گاڑی نظر آئی۔ وہ خود ڈرائیور کرکے آئی تھی۔ اس نے گاڑی پارک کی اور ہوٹل میں داخل ہوگئی۔ میں بھی اس کے پیچھے داخل ہوا۔ میں اس کی میز کے قریب گیا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ ''لوگ جب ڈیٹ پر آتے ہیں تو ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے ہوتے ہیں۔ یہ تمہارے بارہ کیوں بج رہے ہیں۔ میرے دیر سے آنے پر خفا ہو یا کسی سے جھگڑا کرکے آئے ہو؟''

''ہاں، جھگڑا شاہد سے ہوا ہے۔''

''کون شاہد، اچھا وہ جو تمہارا بہترین دوست ہے۔ اس سے اور تمہارا جھگڑا مگر کیوں؟''

''یہ سب جاننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو تم یہ بتاؤ وہ تمہارے گھر آیا تھا؟''

''صرف یہ پوچھنے کے لیے تم نے مجھے یہاں بلایا ہے؟''

''یہ بتادو گی تو پھر میں وہ بات بتاؤں گا جس کے لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے میں اس بے تکے سوال کا کیا جواب دوں۔ وہ میرے گھر کیوں آنے لگا تھا؟''

''کیا تم اس کے سامنے یہی بات کہہ سکتی ہو۔ اس نے مجھ سے یہی کہا ہے کہ وہ تمہارے گھر گیا تھا۔''

''میں نے کہہ دیا وہ نہیں آیا تھا۔ تمہیں یقین کرلینا چاہیے۔''

''میں شاہد کا جھوٹ اس کے منہ پر کھولنا چاہتا ہوں۔''

''میں اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی۔ تم اپنی بات کرو تم نے مجھے کیوں بلایا تھا؟''

''کیا تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ مجھے شاہد کا تمہارے گھر آنا اتنا برا کیوں لگا۔ اس لیے تانیہ کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ میں کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ کوئی اور بھی تمہیں اسی نظر سے دیکھے۔''

''مجھے تمہاری پسند پر اعتراض نہیں۔''

''میں یہ سننا چاہتا ہوں کہ تم میرے بارے میں کیا رائے... رکھتی ہو؟''

''تمہاری آنکھوں میں ہوس نا کی نہیں خلوص ہے۔ اسی لیے تم مجھے اچھے لگتے ہو۔''

''بس میں یہی سننا چاہتا تھا۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس نے ہاتھ ہٹانے کی کوشش نہیں کی تو میری ہمت بڑھ گئی۔

''تانیہ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم کالج میں اجنبی بنے رہیں اور باہر مل لیا کریں جیسے آج مل رہے ہیں؟''

''میرے لیے یہ مشکل ضرور ہے لیکن تمہارے لیے یہ مشکل آسان تو کرنی پڑے گی۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ''ہمیں جب ملنا ہوگا یہیں ملا کریں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔''

میں اپنی بائیک پر آیا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھی اور چلی گئی۔ میں اس کے اقرارِ محبت پر اتنا خوش تھا کہ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ بائیک اسٹارٹ کرنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ بہت دیر اپنی بائیک کے پاس ہی کھڑا رہا پھر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ شاہد جھوٹ بول رہا ہے یا تانیہ کچھ چھپا رہی ہے۔ وہ اس کے گھر گیا تھا یا نہیں؟ یہ معما کبھی حل نہیں ہوسکتا تھا۔ شاہد یہ قبول نہیں کرسکتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، تانیہ سے میں سچ اگلوا نہیں سکتا تھا۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ میں اس معاملے میں چپ سادھ لوں۔ میں اپنی کامیابیوں سے غرض رکھوں۔ میں مطمئن ہوکر بائیک اسٹارٹ کرنے ہی والا تھا کہ مجھے شاہد کی گاڑی نظر آئی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر گاڑی پارک کررہا تھا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے وہ کہاں جاتا ہے میں گاڑیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ وہ اپنی گاڑی سے اترا اور ہوٹل جبیس میں داخل ہوگیا۔ میرے اندر رکی ہوئی سانس ایک دم باہر نکلی۔ اس کا مطلب ہے یہ گھٹیا آدمی میری جاسوسی کررہا ہے۔ اسے کہیں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ میں تانیہ سے ملنے یہاں آیا ہوں۔ وہ یہی دیکھنے آیا ہوگا۔ یہ معاہدے کی سراسر خلاف ورزی تھی۔

طے یہ ہوا تھا کہ جس دن ایک کی باری ہوگی دوسرا تانیہ سے ملنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ میں گاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر ہوٹل کے دروازے کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ وہ تو کیا دیکھے گا، اپنی فتح کی کہانی میں خود اسے سناؤں گا۔

کچھ ہی دیر میں وہ سیڑھیوں سے اترا اور ہوٹل سے باہر آگیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔

''کیا دیکھنے آئے تھے شاہد؟''

''دیکھنے نہیں تانیہ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے مجھے فون کرکے بلایا تھا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ وہ مجھ سے ملنے آئی تھی اور آج کی ملاقات میں اس نے مجھ سے اقرارِ محبت بھی کرلیا ہے۔ اب تمہیں میرے حق میں دستبردار ہونا پڑے گا۔ شاہد تم مجھے مرعوب کرنے کے لیے جھوٹی کہانیاں سناتے رہے ہو۔ آج اس نے یہ بھی بتادیا ہے کہ تم اس کے گھر نہیں گئے تھے اور یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ مجھے پسند اور تمہیں ناپسند کرتی ہے۔ اب تم اپنی شکست قبول کرو۔''

''تمہیں کہیں سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ وہ مجھ سے ملنے یہاں آرہی ہے، تم مجھ سے پہلے پہنچ گئے۔ وہ تمہیں دیکھ کر فوراً چلی گئی ہوگی۔ اب تم مجھے مرعوب کرنے کے لیے کہہ رہے ہو کہ اس نے تم سے اقرارِ محبت کیا ہے تم نے غداری کی ہے۔''

''آج معاہدے کے مطابق اس سے ملنے کی میری باری تھی۔''

''معاہدہ ختم ہوگیا میں اس کے گھر جاچکا۔ اس کے دل میں اتر چکا۔ اگر تم نے اس سے ملنے کی کوشش کی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

وہ اس وقت اتنے طیش میں تھا کہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے اس سے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مجھے تو اس وقت اپنی فتح کی سرشاری تھی۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور گھر چلا آیا۔

دوسرے دن ہم کالج میں ملے لیکن ہماری بول چال بند ہوچکی تھی۔ اب اس نے شاید معاہدہ بھی خود ہی توڑ دیا تھا۔ میں بھی اب اس کی پروا کیے بغیر تانیہ سے روزانہ مل رہا تھا۔ کالج میں بھی کالج سے باہر بھی۔ تانیہ نے میرا دل رکھنے کے لیے تمام دیواریں گرادی تھیں۔ ہم اس کے ڈرائیور اور گارڈ کے بغیر ہر جگہ گھوم رہے تھے۔ ہزار آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہوں گی لیکن تانیہ کو اب جیسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ ان ملاقاتوں میں، میں نے اسے شادی کی پیشکش بھی کی تھی۔ اسے بس ایک ڈر تھا کہ اس کے گھر والے انکار کردیں گے کیونکہ میں ڈاکٹر بننے والا ضرور تھا لیکن غریب گھر کا لڑکا تھا پھر ایک دن اس نے میرے اصرار پر وعدہ کرلیا کہ وہ اپنے ڈیڈی سے میرا ذکر کرکے دیکھے گی۔

اس کی اپنائیت سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے والد کو منالے گی۔ اس نے کہا بھی یہی تھا لیکن وہ دوسرے دن کالج آئی تو اس کا منہ اترا ہوا تھا۔ میری تو ہمت ہی نہیں تھی کہ اس سے کچھ پوچھتا اس نے خود ہی اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

''عدنان میں نے ڈیڈی سے تمہارا ذکر کیا تھا۔ وہ تمہارے فیملی بیک گراؤنڈ سے مطمئن نہیں ہیں لیکن تم فکر مت کرو۔ میں نے ممی کو اپنی سفارش کے لیے راضی کرلیا ہے۔ ڈیڈی مان جائیں گے۔''

''تمہارے ڈیڈی کے بیانات میں پڑھتا رہتا ہوں۔ بیانات سے تو ظاہر ہوتا ہے وہ بہت غریب پرور ہیں۔ اب ایک غریب کو جھڑک رہے ہیں جبکہ میرا مستقبل روشن ہے۔''

''سیاست دانوں کے دل میں کچھ... ہوتا ہے اور زبان پر کچھ اور ہوتا ہے۔ میرے ڈیڈی بھی ایک سیاست دان ہیں۔''

''میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔''

''میں کھانا پینا چھوڑ دوں گی لیکن اپنی ضد منوا کر رہوں گی۔ تم فکر کیوں کرتے ہو؟''

مجھے یقین تھا کہ اس کے والد کو گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔ وہ اپنے والد کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کی بات وہ زیادہ دن ٹال نہیں سکیں گے۔

دن پر دن گزرتے جارہے تھے۔ وہ مجھے روز بروز زیادہ سے زیادہ الجھتی نظر آرہی تھی لیکن مجھے مطمئن کرنے کے لیے امیدیں دلا رہی تھی پھر وہ اچانک غائب ہوگئی۔ اس نے کالج آنا چھوڑ دیا۔ ایک دن، دو دن، پورا ہفتہ گزر گیا اس کا غائب ہوجانا اب میری برداشت سے باہر تھا۔ کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہوتا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ شاہد بھی بہت پریشان رہنے لگا ہے۔ کالج کی چھٹیاں بھی کرنے لگا ہے۔ کالج آتا بھی تھا تو کلاس کے بجائے کینٹین میں وقت گزارتا تھا۔ مجھ سے اس کی بات چیت ختم ہوگئی تھی۔ اس لیے میں اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ تانیہ کے بغیر میری حالت دیوانوں جیسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوگئی۔ کالج جانا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ کبھی کبھی دیکھنے چلا جاتا تھا کہ وہ کالج آئی یا نہیں۔ شاہد پر بھی نظر پڑ جاتی تھی۔

ایک دن اسی دیوانگی کے عالم میں میں تانیہ کے گھر پہنچ گیا..... وہ کسی معمولی آدمی کا مکان نہیں تھا۔ کوٹھی کے باہر پولیس بھی تھی اور ان کے پرائیوٹ گارڈ بھی۔ دروازے پر کھڑے چوکیدار سے میں نے اپنے آنے کا مطلب بیان کیا۔

"مجھے تانیہ بی بی سے ملنا ہے۔"

"وہ آپ کو جانتی ہیں؟"

"ہاں ان سے کہنا عدنان آیا ہے۔"

چوکیدار نے نہایت ادب سے مجھے انتظار کرنے کو کہا اور خود اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔

"تم کیسا اس کا ملنے والا ہے۔ یہ تک معلوم نہیں کہ تانیہ بی بی امریکا چلا گیا ہے۔"

"یہ تو تمہیں پہلے بھی معلوم ہوگا پھر تم اندر کس سے پوچھنے گئے تھے؟"

"یہ پوچھنے گیا تھا کہ کسی کو بتاتا ہے یا نہیں کہ وہ امریکا چلا گیا ہے۔"

"تم مجھے اس کے ڈیڈی سے ملوا دو۔"

"وہ فالتو نہیں ہے کہ سب سے ملتا پھرے۔"

"تم انہیں جا کر بتاؤ تو سہی۔"

وہ پھر گیا اور واپس آ کر اس نے مجھے بتا دیا کہ وہ مجھ سے نہیں مل سکتے۔ اتنی دیر میں دو پولیس والے بھی میرے پاس آ کر کھڑے ہوگئے اور مجھے گھورنے لگے بلکہ ایک نے تو مجھ سے سختی سے کہا کہ میں وہاں سے چلا جاؤں۔ میں دیوانہ تھا مگر اتنا دیوانہ نہیں تھا کہ ان سے الجھتا۔ خاموشی سے چلا آیا۔

اب شاہد کے سوا میری دل داری کرنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ روٹھا ہوا تھا۔ یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ ممکن ہے اسے تانیہ کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔ بس اسی خیال سے میں نے اس کی طرف ایک مرتبہ پھر دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ وہ بھی تنہائی سے اکتا چکا تھا۔ میری دوستی کا خیال اس کے دل میں بھی کروٹیں لے رہا تھا۔ اس نے میری پہلی کوشش میں ہاتھ بڑھا دیا اور اس خلوص سے مجھے گلے لگایا کہ سارے شکوے پانی میں دھل گئے۔

"یار تانیہ کا معما حل نہیں ہو رہا ہے۔ وہ کہاں غائب ہوگئی؟"

"مجھے معلوم ہے مگر تمہیں سن کر دکھ ہوگا۔ اسے فراموش ہی کر دو تو بہتر ہے۔"

"اب یہ ناممکن ہے، میں اسے بھول نہیں سکتا۔"

"بھولنا تو پڑے گا۔ اس کی شادی ہو رہی ہے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں تقریباً چیخ پڑا۔ "اس نے تو کہا تھا وہ مجھ سے شادی کرے گی۔ اس نے اپنے والد سے بات بھی کر لی تھی۔"

"اس نے بات ہی نہیں کی ہوگی۔ تمہیں بے وقوف بنا رہی تھی۔ اس کے والد اپنے معیار کے گھرانے میں اس کی شادی کروا رہے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ اس میں تانیہ کی مرضی شامل ہے۔ یہ شادی کوئی زبردستی نہیں ہو رہی ہے۔"

"کس سے ہو رہی ہے اس کی شادی؟ مجھے بتاؤ تو سہی۔ یہ میرا عہد ہے وہ جس سے شادی کرے گی میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

"بہت جلد تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا اور تم مجھے قتل کر سکتے ہو تو قتل کر دینا۔"

"تو کیا اس کی شادی تم سے ہو رہی ہے؟"

"میں نے کہا ناں تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔"

"یہ بھی جان لو کہ جس نے اس سے شادی کی میں اسے قتل ضرور کروں گا چاہے وہ تم ہو۔"

مجھے شاہد کی باتوں کا اعتبار نہیں رہا تھا لیکن اس وقت اعتبار کرنے کے سوا کوئی راستہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بس یہ چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ وہ مجھے مل جائے۔ اس کی زبان سے سن لوں کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔

میں اس عرصے میں اسے برابر ڈھونڈتا رہا تھا لیکن اتنے بڑے شہر میں کوئی کسی کو کیسے ڈھونڈ سکتا ہے۔ میں نے اس کے گھر کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ ایک دن خدا نے میری سن لی۔ میں اس کے گھر سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا کہ مجھے اس کی گاڑی نظر آ گئی۔ فرنٹ سیٹ پر وہ سیاست داں بیٹھا تھا جو اس کا باپ تھا۔ پچھلی سیٹ پر کوئی عورت تھی جو یقیناً تانیہ کی ماں ہوں گی اور کھڑکی کی طرف تانیہ بیٹھی تھی۔ میں نے اسے اس لیے اچھی طرح دیکھ لیا تھا کہ اسپیڈ بریکر کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کچھ کم ہوئی تھی۔ میں بے اختیار اس کی طرف بھاگا لیکن یہ بھول گیا کہ پیچھے ایک اور گاڑی ہے جس میں اس کے گارڈ بیٹھے ہیں۔ انہوں نے جو مجھے گاڑی کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا تو ایک گارڈ گاڑی سے کودا اور مجھے دبوچ لیا۔

دوسرے دن اخباروں میں خبر آ گئی کہ فلاں سیاست

داں پر حملہ کرنے والا نوجوان گرفتار۔ میرا تعلق اس سیاست داں کی حریف پارٹی سے ثابت بھی کر دیا گیا۔

مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ میں وہاں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں تانیہ کو جانتا ہوں۔ اسے دیکھ کر گاڑی کی طرف لپکا تھا بلکہ میں نے یہ بیان دیا کہ میں جلدی میں تھا۔ تیزی سے سڑک پار کرنے لگا تھا کہ مجھے پکڑ لیا گیا۔ تفتیش ہوئی تو یہ بھی ثابت ہوگیا کہ میں طالب علم ہوں اور میرا کسی سیاسی جماعت سے تعلق نہیں۔

کوئی پندرہ دن بعد میرا اپنڈ چھوٹا۔ اس کے بعد بھی ہزار تدبیریں اختیار کرتا رہا کہ کسی طرح تانیہ سے میری ملاقات ہو جائے لیکن ہر کوشش رائگاں گئی۔ البتہ یہ ظاہر ہوگیا کہ وہ امریکا نہیں گئی ہے۔ اب مجھے شاہد سچا نظر آنے لگا تھا۔ تانیہ کی شادی ہو رہی تھی اسی لیے اسے قید کر دیا گیا ہے پھر تانیہ پر بھی غصہ آنے لگا تھا کہ کسی طرح بھی وہ مجھ سے صرف ایک مرتبہ مل سکتی تھی، فون کر سکتی تھی۔ وہ بھی بے وفا نظر آنے لگی تھی لیکن اپنے دل سے مجبور تھا۔ اسے بھلا نہیں سکتا تھا۔

شاہد نے بھی کالج آنا کم کر دیا تھا۔ اسے نہ جانے کیا دکھ تھا کہ اندر اندر گھلتا جا رہا تھا پھر ایک دن وہ کالج میں نشہ کر کے آ گیا۔ خوب ہنگامہ کیا۔ اس کا باپ بہت بااثر تھا اس لیے معاملہ رفع دفع ہوگیا ورنہ نکال دیا جاتا۔

امتحان قریب تھے، وہ امتحان میں بھی نہیں بیٹھا۔ تانیہ کی طرح وہ بھی منظر سے غائب ہوگیا۔ میں امتحان میں بیٹھا ضرور لیکن فیل ہوگیا۔ میں شاہد کے گھر گیا لیکن معلوم ہوا کہ وہ کبھی کبھی گھر آ جاتا ہے۔ نشے میں پڑ گیا ہے۔ اپنے ہوش میں نہیں رہتا۔ اس کے ماں باپ اس کی طرف سے بہت پریشان تھے۔

میرے گھر کا حال اس کے گھر سے بھی بدتر تھا۔ میرے والد اسکول ماسٹر تھے اور اب ہیڈ ماسٹر ہوگئے تھے۔ اس محدود آمدنی میں انہوں نے مجھے ڈاکٹر بنانے کی آرزو کی تھی۔ میری دو چھوٹی بہنیں تھیں جن کا بوجھ بھی آگے چل کر مجھے اٹھانا تھا۔ میرے فیل ہونے سے سب کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ میں خود کو ان سب کا مجرم سمجھتا تھا اور قصوروار تانیہ کو سمجھتا تھا۔ اسی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ ایک طرف تانیہ تھی دوسری طرف اتنی ساری محبتیں۔ یہ میری خود غرضی تھی کہ اپنی محبت پر سب کی محبتیں قربان کر رہا تھا۔ کیا محبت کی کامیابی یہی ہے کہ شادی ہو جائے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا اور لاجواب ہوگیا۔ شادی کے بغیر بھی تو محبت کی جا سکتی ہے۔ اپنا غصہ ہی اتارنا ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ میں زندگی بھر کسی سے شادی نہ کروں۔ جب تانیہ نہیں تو کوئی بھی نہیں۔ اب مجھے اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے زندہ رہنا ہے۔ مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر تانیہ کے خیال کو ترک کیا اور نئے سال کی تیاری میں مشغول ہوگیا۔ خود کو کتابوں میں اتنا غرق کیا کہ تانیہ کا خیال بھی نہ آیا۔ شروع شروع تانیہ کی یادوں نے شور مچایا اور پھر آہستہ آہستہ میں اسے بھول گیا۔

میری محنت رنگ لائی اور میں اعزازی نمبروں سے پاس ہوگیا۔ اس روز جو گھر میں خوشی کا رقص ہوا اس نے میرے ارادے کو مزید پختہ کر دیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اب میں تانیہ کو بھلا کر کچھ نہ کچھ بن کر دکھاؤں گا۔ میں نے ہاؤس جاب کی اور پھر ایک اسپتال میں نوکری کر لی۔

میں ڈاکٹر بن گیا تو بے اختیار تانیہ کی یاد آ گئی۔ کتنا اچھا ہوتا کہ وہ بھی ڈاکٹر بن گئی ہوتی اور میں بھی پھر ہم دونوں کی شادی ہوگئی ہوتی۔

میری والدہ نے میرا رزلٹ آتے ہی شادی کے لیے اصرار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب میں ان سے کیا کہتا۔ اب ایک ہی بہانہ کام آ سکتا تھا کہ پہلے بہنوں کی شادی ہو جائے اس کے بعد شادی کروں گا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ مجھے دونوں بہنوں کی شادی نہایت دھوم دھام سے کرنی تھی۔ میں نے ایک اور اسپتال میں دوسری نوکری کر لی۔ ارادہ یہی تھا کہ کچھ سرمایہ جمع کر کے کلینک کھول لوں گا۔ ایک چھوٹی سی گاڑی خرید لی تھی جسے لے کر ایک اسپتال سے دوسرے اسپتال کے چکر کاٹتا رہتا تھا۔ بہنوں کا جہیز جمع کرنے کے لیے یہ آمدنی بھی ناکافی ہوئی تو میں نے گھر میں دکان نکال کر کلینک کھول لیا۔ رات کو وہاں بیٹھنے لگا۔ دن سے لے کر رات تک مصروفیت نے مجھے ایسا شکنجے میں جکڑا کہ نہ تانیہ یاد رہی نہ شاہد۔ کبھی کبھی خیال آ بھی جاتا تو بس ایسے جیسے کہ اندھیری رات میں جگنو چمکتا ہے۔ کبھی آنکھوں کے گوشے بھیگ جاتے تھے کبھی پیاس بڑھ جاتی تھی۔ شکر بھیجتا تھا کہ اگر یہ مصروفیت نہ ہوتی تو یہ یادیں مجھے مار ڈالتیں۔

اس مصروفیت کے عالم میں ایک روز وقت نکال کر میں بازار گیا۔ اپنے لیے کچھ کپڑے خریدنے تھے۔ خریداری کرنے کے بعد میں مارکیٹ سے باہر آیا۔ ڈگی کھول کر کچھ پیکٹ تھے جو ڈگی میں رکھے۔ ڈگی بند کر کے میں ڈرائیونگ سیٹ کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ شاہد کی موجودگی نے مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

چونکا دیا۔ وہ ابھی ابھی اپنی گاڑی سے اترا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے اس طرح لپٹ گیا جیسے مجھ سے کبھی ناراض ہی نہیں ہوا تھا۔

"ابے تو ڈاکٹر کیا بن گیا اپنے پرانے دوست کو تو بھول ہی گیا۔ ایک مرتبہ بھی میری یاد نہیں آئی۔"

"تم بھی تو مجھ سے ملنے آسکتے تھے۔"

"سچ کہا تم نے، یار میں سمجھ رہا تھا تم مجھ سے ناراض ہو اب مل گئے ہیں تو ملتے رہیں گے۔"

"اور سناؤ کیا کررہے ہو؟"

"بزنس کررہا ہوں۔ کچھ عرصے کے لیے باہر بھی چلا گیا تھا۔"

"چل اچھا ہے سیٹ تو ہو گیا ناں؟"

"گاڑی نہیں دیکھ رہا ہے۔ باپ کی نہیں ہے میری اپنی ہے۔" اسے دیکھ کر مجھے دنوں بعد تانیہ کی یاد آئی۔

"تانیہ کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟"

"شادی ہو گئی اس کی، ٹھاٹ سے زندگی گزار رہی ہے۔"

"چل اچھا ہوا ہم سے نہ سہی کسی سے تو ہوئی۔"

"یہ نہیں پوچھے گا کس سے ہوئی؟"

"ہو گئی ہو گی کسی سے مجھے کیا۔"

"اس سے پہلے کہ تو اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات بتائے۔ میں تجھے بتا دوں کہ اس کی شادی مجھ سے ہوئی ہے۔ ایسی حسین لڑکی کو میری ہی بیوی ہونا چاہیے تھا۔ میری دولت اس کے ناز اٹھا سکتی ہے۔"

"اس سے تم نے شادی کی ہے؟"

"تجھے یقین کیوں نہیں آتا؟"

"یقین تو مجھے اچھی طرح آگیا اور یہ بھی یقین آگیا کہ تو نے دوست ہو کر مجھ سے غداری کی۔ تمہیں یاد ہے میں نے کہا تھا اس کی شادی جس سے بھی ہوئی میں اسے قتل کردوں گا۔"

"تیرا غصہ اب تک نہیں اترا۔"

"قیامت تک نہیں اترے گا۔"

میں نے کہا اور تھوڑی دیر کے لیے کالج کا وہ طالب علم بن گیا جو تانیہ کے لیے کسی کی جان لے سکتا تھا یا اپنی دے سکتا ہے۔ تانیہ کی شادی کسی اور سے ہو جاتی تو شاید مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ اس نے دوست ہو کر میرا حق مارا۔ اپنی مالی حیثیت کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس وقت میرا دوست نہیں میرا رقیب سامنے کھڑا تھا پھر مجھے اپنا ہوش نہیں رہا۔ ہوش تو اس وقت آیا جب میرے تابڑ توڑ گھونسوں نے اس کے چہرے پر نشان ڈال دیے۔ اس کی ناک سے خون جاری تھا اور وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔

"تو جنازہ سالے، تانیہ میری بیوی ہے۔"

یہ لڑائی کسی ویرانے میں تو ہو نہیں رہی تھی بھرا بازار تھا۔ آن کی آن میں لوگ جمع ہو گئے۔ کچھ نے مجھے پکڑا کچھ نے اسے۔ وہ بھی ایسا ڈر گیا تھا کہ گاڑی میں بیٹھ کر فوراً وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میری حسرت دل کی دل میں رہ گئی۔

گھر پہنچا تو بہن کی سسرال سے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے۔ بہن کی میں نے منگنی کردی تھی اور اب وہ لوگ شادی کے لیے جلدی کررہے تھے۔ میں ابھی طیش میں تھا لیکن خود پر قابو پا کر ان کے پاس بیٹھنا پڑا۔

ان کے چلے جانے کے بعد میں کمرے میں بند ہو کر پچھلے واقعات پر غور کرنے لگا۔ شاہد کا سراغ تو مل گیا ہے۔ یہ تکلیف دہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ اس نے تانیہ سے شادی کرلی ہے۔ اب مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا ہے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا لیکن پھر میرا کیا ہو گا۔ اگر میں جیل چلا گیا تو کیا میری بہن کی شادی ہو سکے گی؟ ابا پر کیا گزرے گی، اماں پر کیا گزرے گی۔ میں ہی تو ان کا واحد سہارا ہوں۔ میں اپنا بدلہ لینے کے لیے سب کو بے سہارا کردوں؟ مجھے کم از کم دونوں بہنوں کی شادی تک رکنا ہو گا۔ شاہد اسی شہر میں ہے۔ بہنوں کی شادی ہو جائے پھر میں شاہد کو دیکھ لوں گا۔ صبح تک میرا غصہ مصلحتوں کی نذر ہو چکا تھا۔

میں شاہد سے ملاقات تک تانیہ کو بھولا ہوا تھا لیکن شاہد سے ملاقات کے بعد میرا زخم ہرا ہو گیا تھا۔ یہ دکھ مجھے کھائے جا رہا تھا کہ تانیہ اسی شہر میں ہے اور میرے حریف کی بیوی ہے۔ وہ مجھ سے محبت کرتی تھی لیکن شاہد نے اس سے زبردستی شادی کرلی۔ اس نے میری محبت کا خون کیا ہے میں اس کا خون کروں گا۔ اب مجھے صرف اپنی محبت چھن جانے کا افسوس نہیں تھا اپنی شکست کا بھی احساس تھا جو مجھے شاہد کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی۔ یہ احساس ہر وقت میرے ساتھ لگا ہوا تھا لیکن مجبوری تھی۔

میں دن رات محنت کررہا تھا کہ کسی طرح دونوں بہنوں کو اپنے اپنے گھر کا کردوں۔ خدا نے میری سن لی اور ایک سال کے اندر اندر دونوں بہنوں کی شادی ہو گئی۔

میں تو وہ تھا کہ جسے شاید کوئی خوشی راس ہی نہیں آتی تھی۔ ان شادیوں کو کچھ عرصہ ہوا تھا کہ والد سخت بیمار

پڑ گئے۔ انہیں معدے کا کینسر ہوا تھا۔ بڑی سخت تکلیف میں تھے۔ میں نے انہیں اسپتال میں داخل کروادیا۔ میں خود ڈاکٹر تھا۔ ان کی دیکھ بھال میری بھی ذمے داری تھی۔ مجھے اپنی نوکری کے ساتھ ساتھ انہیں دیکھنے کے لیے بھی روزانہ اسپتال جانا پڑ رہا تھا۔ نہایت تکلیف اور مصروفیت کے دن تھے یہ۔

کئی مہینوں کی تگ و دو کے بعد انہیں گھر لانا پڑا۔ گویا اب صرف موت کا انتظار تھا۔ اللہ نے ان کی سن لی اور انہیں تکلیف سے نجات مل گئی۔

اب تو حالات اور بھی میرے خلاف ہو گئے۔ اماں کے لیے صرف میں ہی تھا جو گھر میں رہ گیا تھا۔ اب مجھے ایک اور محاذ پر بھی لڑنا پڑ رہا تھا۔ اماں اب پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ میری شادی پر اصرار کررہی تھیں۔ ان کا یہ مطالبہ بے جا بھی نہیں تھا۔ اس بڑھاپے میں اگر گھر میں بہو آجاتی تو یقیناً انہیں آرام مل جاتا۔ میں نے اس کا یہ انتظام کردیا کہ ایک ملازمہ رکھ لی لیکن اماں تو میرے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھیں۔ مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے میں ان کی یہ آخری خواہش پوری نہ کرسکا۔ مسلسل انکار کرتا رہا۔ وہ بھی اتنی جلدی میں تھیں کہ والد صاحب کے انتقال کے ایک سال بعد ہی ان کی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔

اب مجھ پر کوئی ذمے داری نہیں تھی۔ مجھے ایک مرتبہ پھر شاہد کا خیال آیا۔ میں اسے ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ وہ اپنی فیملی سمیت ملک سے باہر جا چکا تھا۔ اس کے والد بزنس مین تھے۔ ملک کے حالات ایسے ہورہے تھے کہ انہوں نے اپنا سرمایہ بیرونِ ملک منتقل کیا اور باہر چلے گئے۔ ظاہر ہے شاہد بھی ان کے ساتھ ہی باہر گیا تھا۔ میری تلاش نے دم توڑ دیا۔

شاہد میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ تانیہ کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات ایک ایک کرکے یاد آتے رہتے تھے لیکن اب ان لمحات کو یاد کرنا بھی برا لگتا تھا۔ وہ اب کسی کی بیوی تھی۔ کسی اور کی بیوی ہوتی تو میں صبر کرکے بیٹھ جاتا۔ جب یہ خیال آتا تھا کہ وہ شاہد کی بیوی ہے تو میری آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ یہ غصہ مجھے تانیہ پر بھی آنا چاہیے تھا لیکن اس کی مجبوری سمجھ میں آتی تھی۔ بس یہ خیال آتا تھا کہ وہ شاہد کے ساتھ بالکل خوش نہیں ہو گی وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اسے اب بھی مجھ سے محبت ہو گی۔

یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ وہ کس ملک میں ہے ورنہ شاید میں وہاں جا کر اسے قتل کر چکا ہوتا۔

اس کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد میں نے خود پر نظر ڈالی تو میں دھوپ میں اکیلا کھڑا تھا۔ میرا کوئی خواب آج تک پورا نہیں ہوا تھا۔ ایک خواب یہ بھی تھا کہ میرا اپنا اسپتال ہو۔ اس کے لیے جتنے بڑے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے وہ میرے پاس نہیں تھا۔ میں اپنی الجھنوں میں گرفتار تھا کسی سرمایہ دار سے ساز باز کرنے کی فرصت بھی نہیں تھی۔ اب موقع آگیا تھا۔ اتنا بڑا مکان میری ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ میں نے مکان بیچ دیا اور ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ یہ رقم اتنی نہیں تھی کہ کوئی شاندار اسپتال کھل سکے لیکن شاندار کلینک کھل سکتا تھا۔ میں نے یہ سوچ کر ناظم آباد میں چھ سو گز کا ایک پلاٹ خرید لیا کہ فی الحال یہاں کلینک کھول لوں گا اور تعمیر بھی جاری رکھوں گا۔ کبھی نہ کبھی یہ کلینک اسپتال کی شکل اختیار کرلے گا۔

اتنے پیسے ضرور مل گئے تھے کہ میں نے دو کمرے بنوا کر کلینک کھول لیا۔ نہایت شاندار تعمیر تھی۔ اسے ایک فیشن ایبل کلینک کہا جا سکتا تھا۔

میری قسمت کہ کلینک خوب چلنے لگا۔ میرے اخراجات تو کچھ تھے نہیں۔ جو کماتا رہا اسپتال کی تعمیر پر لگاتا رہا۔ دس سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ جہاں کلینک تھا وہاں اب شاندار تین منزلہ عمارت کھڑی تھی۔ یہ میرا اسپتال تھا۔

اب میں اپنی عمر کی پچاسویں منزل میں سفر کررہا تھا۔ مسلسل محنت نے میری صحت کو متاثر نہیں کیا تھا لیکن میرے بال سفید ہو گئے جو میری شخصیت کو پُرکشش بنا رہے تھے۔ اس علاقے میں مجھے کلینک چلاتے ہوئے ایک بڑا عرصہ ہو گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں شفا تھی۔ لوگ میرے نام سے واقف ہو چکے تھے۔ جب انہیں علاج کی زیادہ سہولتیں ملنے کی توقع ہوئی تو کلینک کی طرح میرے اسپتال میں بھی مریضوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ ایک بڑا عرصہ میں نے اس پیشے میں گزارا تھا لہٰذا ڈاکٹروں سے تعلقات تھے۔ انہیں میں نے اپنے اسپتال سے وابستہ کرلیا۔ یہ اسپتال اب بھی موجود ہے اور میں بھی جیسے تیسے زندہ ہوں۔

اکیلے آدمی کا دن تو کٹ جاتا ہے، رات گزارنی مشکل ہوتی ہے۔ میں نے یہ اہتمام کیا کہ رات کی ڈیوٹی پر میں موجود رہتا تھا۔ میرے علاوہ کوئی ڈاکٹر وہاں نہیں ہوتا تھا۔ کسی ایمرجنسی کی صورت میں کسی کو بلایا جا سکتا تھا۔ رات

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے وقت میں ہوتا تھا اور اسپتال کا عملہ، اسپتال کی چہل پہل میں میری رات گزر ہی جاتی تھی۔

ایک رات میں اپنے کمرے میں کچھ سویا کچھ جاگ رہا تھا کہ ایک نرس بھاگی ہوئی آئی اور اس نے بتایا کہ ایک مریض آیا ہے۔ اس کی حالت بے حد نازک ہے۔ اس کی سانس اکھڑ رہی ہے، میں نے آکسیجن لگادی ہے، آپ چل کر دیکھ لیں۔ میں نے اسے ڈانٹا کہ جب حالت اتنی نازک تھی تو اسے کسی بڑے اسپتال بھیجنا تھا یہاں اسے کچھ ہو گیا تو کون جواب دے گا۔

''سر، میں نے اس کے لواحقین کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اسے عباسی شہید یا جناح لے جائیں لیکن وہ کہہ رہے تھے کہ آپ اسے ابتدائی طبی امداد دے دیں پھر وہ اسے کسی بھی بڑے اسپتال میں لے جائیں گے۔ آپ اگر ان سے بات کرلیں تو شاید وہ تیار ہو جائیں۔''

''چلو میں چل کر دیکھتا ہوں۔''

اسے اتنی دیر میں پرائیوٹ کمرا دے دیا گیا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو کمرے کے باہر جن بزرگ پر نظر پڑی وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ شاہد کے والد تھے، مجھے وہ نہیں پہچان سکے تھے لیکن میں انہیں پہچان گیا۔

''انکل آپ نے مجھے پہچانا؟''

''میں عدنان ہوں، شاہد کا دوست۔''

''ارے بیٹا تم، اتنے دن بعد دیکھا تو پہچان ہی نہیں سکا۔ بس اب میری فکر دور ہو گئی۔ شاہد موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا ہے اسے سنبھالو۔''

''کیا ہوا اُسے؟''

''خود دیکھ لو۔''

شاہد کا نام سنتے ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر ورم دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ شراب نے اس کے جگر کو تباہ کر دیا ہے۔

میں اب عمر کی اس منزل میں آ گیا تھا جب بدلے کی آگ ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔ اتنے برسوں میں میرا غصہ پانی کے جھاگ کی طرح بیٹھ بھی گیا تھا لیکن شاہد کو دیکھتے ہی میں ڈاکٹر سے وحشی بن گیا۔ اس شخص کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ جی تو یہی چاہا کہ اس کا گلا اس کے باپ کے سامنے دبا دوں لیکن میرے پاس اور بھی طریقے تھے۔

''تمہاری نرس کہہ رہی تھی کہ میں اسے کسی بڑے اسپتال لے جاؤں۔ تم اسے اس قابل کر دو کہ یہ وہاں تک پہنچ جائے۔ گھر کے قریب یہی اسپتال تھا اس لیے میں اسے یہاں لے آیا۔''

''انکل، یہ میرا دوست ہے۔ اس کا علاج مجھ سے اچھا کون کر سکتا ہے۔ ایک انجکشن میں اسے لگاتا ہوں۔ اس کے بعد اس کی حالت دیکھوں گا اگر اسے کہیں اور لے جانا ہوا تو میں خود اسے لے کر جاؤں گا۔'' میں یہ باتیں کرتا ہوا انہیں کمرے سے باہر لے آیا اور اپنے کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔

مجھے معلوم تھا کہ اگر اسے یہ انجکشن آدھے گھنٹے کے اندر اندر نہیں دیا گیا تو اس کا بچنا مشکل ہو جائے گا۔ میں نے نرس سے کہا کہ وہ انجکشن تیار کرے۔ انجکشن تو نرس ہی لگاتی تھی لیکن میں نے اس سے بہانہ کیا کہ چونکہ مریض میرا دوست ہے اس لیے انجکشن میں خود لگاؤں گا۔ نرس کو میں نے کسی اور کام میں مشغول کر دیا اور کمرے میں جا کر انجکشن ضائع کر دیا۔ آکسیجن بھی کچھ دیر کے لیے ہٹا دی اور پھر دوبارہ آکسیجن لگا کر کمرے سے نکل آیا۔

''انکل، شاہد کے لیے یہ آدھا گھنٹا یا ایک گھنٹا بہت اہم ہے۔'' ایک گھنٹا گزرا تھا کہ نرس نے آکر شاہد کی موت کی اطلاع دے دی۔

''انکل، میں شرمندہ ہوں کہ شاہد کو نہ بچا سکا۔ آپ چاہیں تو مجھ پر کیس کر دیں، مجھ سے جو ہو سکتا تھا میں نے کیا۔''

''بیٹا تمہارا اس میں کیا قصور، اس نے اپنی حالت ہی ایسی بنالی تھی۔ شراب میں ڈوب گیا تھا، انجام یہی ہونا تھا۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اس کی اچانک موت سے اس کے بیوی بچوں پر کیا گزرے گی۔''

''بیوی بچے کیسے، وہ تو میری یہ خوشی بھی پوری نہیں کر سکا۔ اس نے شادی ہی نہیں کی تھی۔''

''شادی نہیں کی تھی۔ وہ بہت پہلے مجھے ملا تھا کہہ رہا تھا شادی کر لی ہے۔ اس کی بیوی کا نام تانیہ ہے۔''

''وہ ہر ایک سے یہی کہتا پھرتا تھا۔ کسی لڑکی سے محبت کرتا تھا اور خیالوں میں اس سے شادی کر لی تھی۔''

میں نے شاہد کو بے قصور مار دیا۔ میں نے تانیہ کو بھلا دیا، وہ نہیں بھلا سکا یا شاید ہم دونوں ہی نہیں بھلا سکے۔

بیتے دن

مکرمی مدیر اعلیٰ

سلام مسنون!

جوانی کی یادیں زندگی بھر تعاقب میں رہتی ہیں، میں نے بھی جوانی میں عشق کیا تھا اور اس کا اختتام اس کہن سالہ عمر میں ہوا مگر کس دلچسپ انداز میں، آپ بھی ملاحظہ کریں۔

انجم

(لاہور)

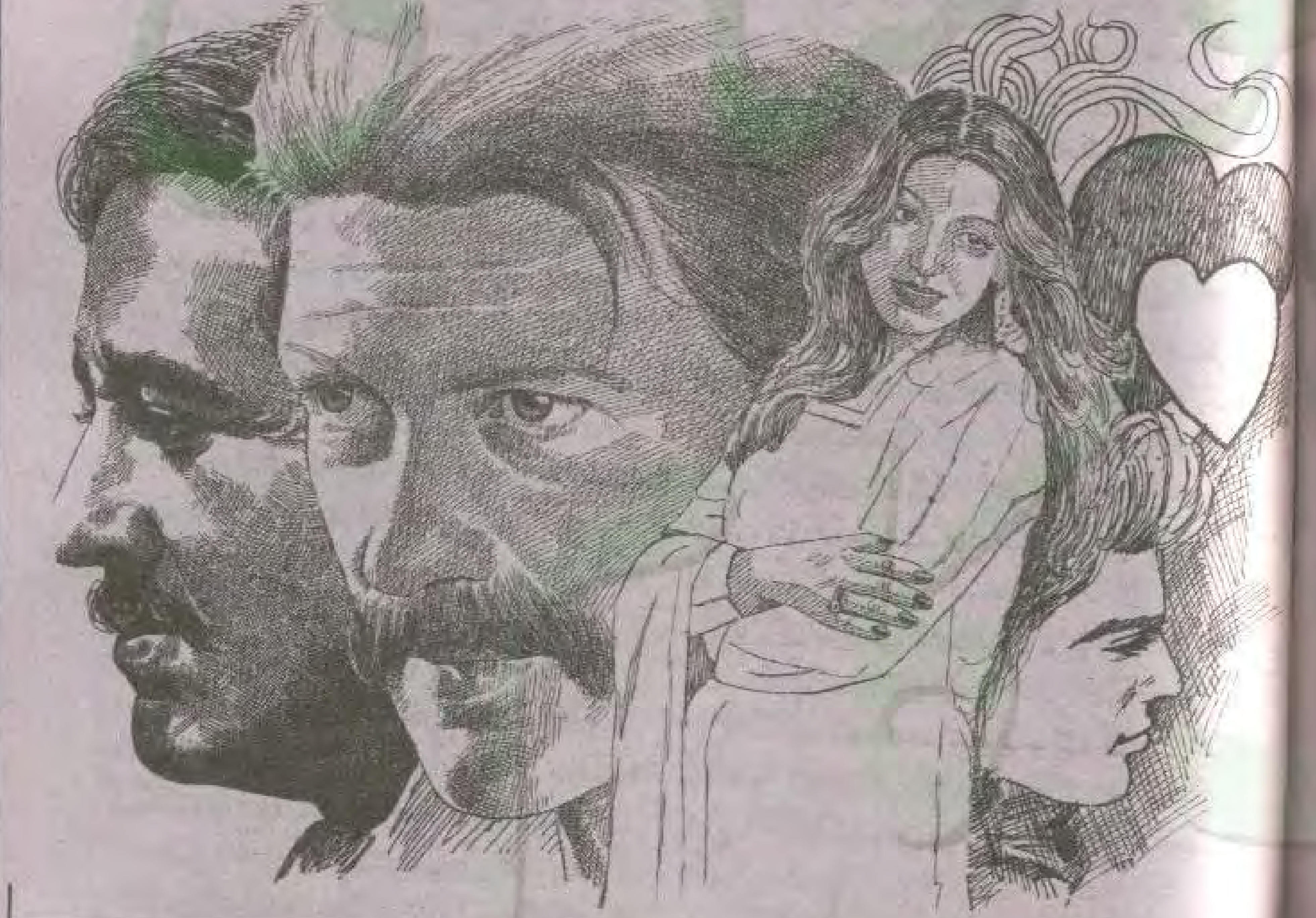

میرے تصور میں تو وہی تھی۔

سانولی سی دبلی پتلی لڑکی جس کے چہرے پر بلا کی ملاحت تھی۔ جس کی خوبصورت کاجل بھری آنکھیں جب دیکھنے لگتیں تو دل کی دنیا زیروزبر ہو جاتی تھی۔

رخسانہ میرے ساتھ اب سے تیس برس پہلے ایک فرم میں کام کرتی تھی۔ اسے میرا اسسٹنٹ بنایا گیا تھا۔ میں اس سے کام کیا لیتا۔ بس اس سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ دنیا جہان کی باتیں۔ وہ بھی خوش گفتار لڑکی تھی۔ اسے

بے شمار اشعار یاد تھے۔ حاضر جواب بھی تھی۔ اس پر سے اس کے چہرے کی ملاحت غضب برپا کر دیتی۔

اس فرم کے نہ جانے کتنے لوگ اسے دیکھ کر آہیں بھرا کرتے لیکن وہ مجھ سے بے تکلف تھی اور یہ بے تکلفی آہستہ آہستہ پسند اور پھر محبت میں تبدیل ہوگئی۔

ایک دو بار میں اسے اپنے ساتھ سیر کے لیے بھی لے گیا۔ ساحل پر یا ہوٹل میں۔ ایک بار میں نے اپنے فلیٹ میں اسے مدعو کیا۔ اس زمانے میں میری بیوی اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔

میں یہ بتا دوں کہ میں شادی شدہ تھا۔ گرچہ شادی کو صرف دو ہی سال ہوئے تھے۔ جبکہ رخسانہ کنواری لڑکی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ میں اپنی بیوی کی طرف سے غیر مطمئن تھا۔ نہیں، بلکہ رخسانہ کی کشش ایسی تھی کہ جس نے مجھے اپنی طرف اس طرح کھینچ لیا کہ میں اس کے سامنے بے بس ہو کر رہ گیا تھا۔

اس شام میں دفتر سے اسے اپنے ساتھ ہی اپنے فلیٹ لے آیا تھا۔ لڑکیاں اندر سے کتنی معصوم ہوا کرتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ان کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہیں۔ ساحل کی سیر کر کے، پانی میں اپنے پاؤں گیلے کر کے، آئس کریم کھا کر انہیں کتنی مسرت ملتی ہے اور جب تعریف کر دی جائے تو وہ موم کی طرح پگھل جاتی ہیں۔

رخسانہ اس شام موم ہی کی طرح پگھل کر میری بانہوں میں آگئی تھی۔ ذرا سی دیر بھی کبھی صدیوں تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔ ہم ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے رہے۔

اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے اور قریب آگئے تھے۔ ایک ساتھ لنچ کے لیے باہر جانا۔ ایک ساتھ کام کرنا۔ میں روز رکشے پر اسے اس کے گھر پہنچا دیا کرتا تھا۔

پھر یہ ہوا کہ وہ فرم اچانک ختم ہوگئی۔ مالکان کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا تھا۔ سب اِدھر اُدھر ہو گئے۔ رخسانہ کا بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے۔

میں ڈراما رائٹنگ میں مصروف ہو گیا تھا۔ یہ کام کسی اور طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک بار میں اس کے گھر گیا تو پتا چلا کہ وہ لوگ مکان چھوڑ کر کہیں جا چکے ہیں۔ کہاں، یہ کوئی نہیں بتا سکا تھا۔

پھر برسوں بیت گئے۔ میرے بچے جوان ہو گئے۔ ان کی شادیاں ہو گئیں۔ وقت تیز رفتار ہوتا چلا گیا تھا۔ پھر ایک دن اچانک میرے موبائل پر ایک فون آگیا۔ یہ اجنبی نمبر تھا۔ اسی لیے میں نے اس پر دھیان نہیں دیا۔ کچھ دیر بعد پھر جب اس نمبر سے فون آیا تو میں نے وصول کر لیا۔

دوسری طرف سے کسی عورت کی آواز تھی۔ ”ہیلو! انجم بول رہے ہیں۔“

”جی ہاں، انجم بول رہا ہوں۔ آپ کون؟“

”آواز بھول گئے میری۔“

”ہاں، اس وقت دھیان میں نہیں آ رہا ہے۔“

”انجم، میں رخسانہ ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”اب یہ مت کہنا کہ کون رخسانہ۔ ورنہ میں فون بند کر دوں گی۔“

اس نام نے ذہن میں گھنٹیاں تو بجا دی تھیں پھر بھی پوری طرح یاد نہیں آ رہا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ نے نہیں پہچانا۔“

”ہاں، میں شرمندہ ہوں کہ میں ری کال نہیں کر پا رہا۔“

”وہی رخسانہ جو آپ سے پچیس تیس برس پہلے آپ کے ساتھ دفتر میں کام کرتی تھی۔“ اس نے یاد دلایا۔

”اوہ!“ اور اس کے ساتھ ہی یادوں کے سارے دریچے کھلتے چلے گئے۔ رخسانہ! جس سے میں محبت کرنے لگا تھا۔ دبلی پتلی سانولی سی لڑکی۔ جس کی خوبصورت آنکھیں دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوتیں۔ جس کی آواز میں بے پناہ کھنک تھی اور وہ کھنک آج بھی اس کی آواز میں محفوظ تھی۔

”میرے خدا! لڑکی تم کہاں ہو۔“ میں چلا اٹھا۔ ”تم نے میرا نمبر کہاں سے لیا۔“

”یار، آپ اتنے گمنام تو نہیں ہیں کہ آپ کا نمبر حاصل نہ کر سکوں۔“ اس نے کہا۔ ”نمبر حاصل کرتے ہی پہلا کام یہی کیا کہ آپ کو فون کر رہی ہوں۔“

”تم یہ بتاؤ کہاں رہ رہی ہو۔“ میں نے پوچھا۔ ”تمہارے حالات کیسے جا رہے ہیں۔“

”ڈھیری باتیں ہیں جو فون پر نہیں ہو سکتیں۔ آپ میرے گھر آجائیں۔ میرے شوہر سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“

”شوہر!“ مجھے نہ جانے کیوں ایک دھچکا سا لگا تھا۔

”کیوں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”کیا میں شادی نہیں کر سکتی تھی؟“

”کیوں نہیں۔“ میں جلدی سے بولا۔ ”میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ نہ جانے تمہارے شوہر کیسے ہوں گے۔“

”وہ بہت اچھے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ آئیں تو سہی۔ میں آپ کو اپنے گھر کا ایڈریس بھیج رہی ہوں۔ بس آپ آجائیں۔“

اس نے موبائل پر اپنے گھر کا پورا ایڈریس لکھوا دیا تھا۔ اس کا مکان گلشن اقبال میں تھا۔ اس سے ملنے سے پہلے میں اپنے آپ کو ٹٹولتا رہا۔ کیوں جا رہا ہوں وہاں۔ کیا کروں گا اس سے مل کر۔ اب تو برسوں بیت گئے۔ اب تو وہ ایک ڈھلتی عمر کی عورت ہوگی۔ جس کے نقوش مرجھا چکے ہوں گے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ چکی ہوگی۔

اور میں بھی تو اس کے تصور سے بہت مختلف ہو گیا ہوں گا۔ پچیس تیس برس پہلے میں جوان ہوا کرتا تھا۔ میرے بال سیاہ اور چمکدار تھے اور آنکھوں میں زندگی بھری ہوئی تھی۔ لیکن اب تو سب کچھ بدل چکا ہے۔

بہرحال میں دوسری شام ایک بڑا سا کیک لیے اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ زیادہ نہیں بدلی تھی۔ بلکہ اس کے چہرے کی ملاحت اب اور بھی زیادہ پُرکشش ہو گئی تھی۔

اس کا دبلا پتلا جسم گداز ہو کر بھی خوش نما ہو گیا تھا۔ آنکھوں کی سحر انگیزی اسی طرح برقرار تھی۔ اس کا شوہر بھی گھر پر تھا۔ نعمان حارث، ایک پڑھا لکھا اور معقول انسان۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ دونوں جاب کر رہے تھے۔ سب نے کھلے دل سے میرا استقبال کیا تھا۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بالکل گھر جیسا ماحول تھا۔ وہی بے تکلفی، وہی اپنائیت۔ رخسانہ کو معلوم تھا کہ میں کھانے میں کیا کیا پسند کرتا ہوں۔ اس نے میری پسند کی بہت سی چیزیں بنا رکھی تھیں۔

وہ ایک ہنستا کھیلتا خوش باش گھرانا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ رخسانہ نے اپنے شوہر کو میرے بارے میں کیا بتایا ہوگا۔ اس سے کیا کہا ہوگا کہ میں کون ہوں اور ان کے گھر کیوں آ رہا ہوں۔

کھانے کے بعد جب چائے کا دور چلا تو اس وقت دونوں بیٹے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں، رخسانہ اور نعمان رہ گئے تھے۔ اس وقت نعمان نے مجھ سے کہا۔ ”انجم صاحب، میری وائف کو دیکھ کر آپ کا عشق ٹھنڈا تو نہیں ہوا۔“

رخسانہ ہنس پڑی۔ ”انجم صاحب، پریشان نہ ہوں۔ میں نعمان کو آپ کے بارے میں سب کچھ بتا چکی ہوں۔“

”جی انجم صاحب۔“ نعمان ہنس پڑا۔ ”میری بیوی مجھ سے کچھ نہیں چھپاتی۔ ویسے بھی یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں ہے۔ یہ تو انسان کے خون میں شامل ہے۔“

”جی ہاں۔“ اب میں بھی بول پڑا۔ ”وہ زمانہ ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”ویسے ایک بات تو ہے۔“ نعمان کے لہجے میں شوخی تھی۔ ”میری بیگم اس زمانے میں قیامت رہی ہوں گی۔“ رخسانہ شرما گئی تھی۔

وہ چائے بنانے اندر چلی گئی۔ میں نعمان سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بہت زندہ دل اور بے تکلف قسم کا آدمی ثابت ہوا تھا۔ ایسے لوگ عام طور پر بہت صاف دل کے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر کچھ نہیں ہوتا۔

رخسانہ چائے اور دیگر لوازمات لے کر آگئی۔ پھر ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بہت اپنائیت کا احساس ہونے لگا تھا۔ جیسے اپنے ہی لوگوں کے درمیان موجود ہوں۔

اس کے بعد میرا اس گھر میں آنا جانا ہو گیا۔ ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور چلا جاتا۔ بہت دنوں کے بعد میری زندگی میں ایک تبدیلی آئی تھی۔

بیوی کی موت کے بعد میں تنہا اور اداس ہو کر رہ گیا تھا۔ کوئی ترنگ نہیں۔ کوئی امنگ نہیں۔ بس دن رات کا ڈپریشن تھا جس نے مجھے گھیر رکھا تھا۔ اب اس ڈپریشن کی شدت کم ہونے لگی تھی۔

رخسانہ اور نعمان کے بیٹے کا نام کمال تھا۔ وہ ایک فرمانبردار قسم کی اولاد معلوم ہوتا تھا۔ ایک شام جب میں ان کے گھر پہنچا تو صرف کمال گھر پر تھا۔ باقی لوگ کہیں گئے ہوئے تھے۔

اس نے معمول کے مطابق بہت احترام سے کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ پھر میرے سامنے بیٹھ کر اس نے ایک عجیب بات کی۔ ”انکل اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے ایک بات کہوں۔“

”ضرور، کیوں نہیں۔“

”پلیز! آپ ہمارے گھر نہ آیا کریں۔“ اس نے کہا۔

”کیا؟“ میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے یہاں نہ آیا کروں، کیوں؟“

”اس لیے کہ آپ کے آنے سے پہلے ہم بہت پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔“ اس نے کہا۔ ”آپ کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

آنے کے بعد سب کچھ ڈسٹرب ہو کر رہ گیا ہے۔"

"بیٹے، میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔" میں نے کہا۔ "میرے آنے سے کیا ڈسٹربنس ہوئی ہے۔"

"امی اور ابو کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "امی ہر وقت آپ کی باتیں کیا کرتیں ہیں جو ظاہر ہے کہ ابو کو پسند نہیں ہیں۔"

"اوہ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "لیکن بیٹا جو کچھ بھی ہو رہا ہے... وہ سوائے غلط فہمی کے اور کچھ نہیں ہے۔ جبکہ میں بہت صاف دل سے اس گھر کو اپنا سمجھ کر آیا کرتا ہوں۔"

"ہاں انکل! یہ تو میں بھی جانتا ہوں لیکن کیا آپ یہ پسند کریں گے کہ اس گھر کا سکون غارت ہو جائے۔"

"نہیں، میں کبھی پسند نہیں کروں گا۔ اس لیے تم بے فکر رہو۔ آج کے بعد میں یہاں نہیں آؤں گا۔"

میں نے اپنا وعدہ نبھا دیا۔

اس شام کے بعد میں ان کے گھر کی طرف نہیں گیا۔ خود مجھے اپنی پوزیشن کا احساس ہونے لگا تھا۔ میری وجہ سے دونوں کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہو جاتی یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ خود رخسانہ کے شوہر نعمان کا فون آ گیا۔ مجھے چونکہ اس کے نمبر کا پتا نہیں تھا اس لیے میں نے وہ فون ریسیو کر لیا تھا۔ وہ بہت تپاک سے شکایت کر رہا تھا۔ "ارے بھائی، کہاں غائب ہیں آپ۔" اس نے کہا۔ "ہم دونوں تو آپ کو دیکھنے کے لیے ترس گئے ہیں۔"

"نعمان صاحب... وہ دیکھیں بات یہ ہے کہ آج کل میری کچھ مصروفیات بڑھ گئی ہیں...." میں نے بہانہ بنایا۔

"کوئی مصروفیات نہیں۔ آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ "رخسانہ آج آپ کی پسند کی چیزیں بنا رہی ہے۔"

"نعمان صاحب، میں شاید نہیں آسکوں گا۔"

"کیوں نہیں آسکیں گے۔ اگر آپ نہیں آئے تو ہم دونوں آپ کے یہاں آدھمکیں گے اور آپ کو ہماری دعوت کرنی پڑ جائے گی۔ اس لیے اس میں بہتری ہے کہ آپ خود تشریف لے آئیں۔"

یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو شخص اتنے خلوص اور پیار سے اپنے گھر بلا رہا ہو۔ اس کے دل میں میری طرف سے کوئی بات بھی ہو گی۔

اب دو ہی باتیں تھیں۔ یا تو کمال جھوٹ بول رہا تھا یا پھر نعمان منافقت سے کام لے رہا تھا۔ لیکن یہ منافقت کس قسم کی ہو سکتی تھی۔ بظاہر تو ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی تھی۔

بہر حال میں صورتِ حال کا صحیح اندازہ کرنے ان کے گھر پہنچ گیا۔ دونوں میاں بیوی اسی طرح ملے تھے جس طرح ملتے آئے تھے۔ مجھے کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی تھی۔

رخسانہ نے کھانا بھی بہت اچھا بنایا تھا۔ اسے یاد تھا کہ میری پسند کیا ہے۔ اس نے میری پسند ہی کا خیال رکھا تھا اور اس کا شوہر نعمان خوش ہو ہو کر مجھے کھلا رہا تھا۔

اس وقت وہ لڑکا کمال گھر پر موجود نہیں تھا۔ اسی لیے مجھے اس کے تاثرات کے بارے میں علم نہیں ہو سکا تھا۔

یہ سب اپنی جگہ سہی لیکن میں نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ان کے یہاں آنے جانے میں احتیاط کیا کروں گا۔

یہ سوچ کر میں کئی دنوں تک نہیں گیا اور نہ ہی میں نے کوئی فون کیا۔

ایک دن رخسانہ کا فون آ گیا۔ نمبر رخسانہ کا تھا۔ اسی لیے میں نے یہ سمجھا کہ دوسری طرف رخسانہ ہی ہو گی۔ میں نے اس کا فون سن لیا تھا۔ لیکن دوسری طرف رخسانہ کے بجائے اس کا بیٹا کمال تھا۔ "میں کمال بول رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔ "رخسانہ اور نعمان صاحب کا بیٹا۔"

"ہاں، میں نے تمہاری آواز پہچان لی ہے۔" میں نے کہا۔ "بتاؤ خیریت تو ہے نا۔"

"خیریت تو تمہاری خطرے میں ہے بڑے میاں۔" وہ بہت بدتمیزی سے بولا۔ "بتاؤ میری امی کہاں ہیں؟"

"کیا پاگل ہو گئے ہو۔ اور یہ تم کس لہجے میں بکواس کر رہے ہو۔ یہ تم اپنی امی کے بارے میں کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں جانتا ہوں کہ وہ گھر سے نکل کر تمہارے پاس آئی ہیں۔" اس نے کہا۔ "خیریت اسی میں ہے کہ تم ان کو واپس کر دو۔ ابھی معاملہ خراب نہیں ہوا ہے ورنہ تمہارے لیے بہت پرابلم ہو جائے گی۔"

وہ لڑکا تو مجھے باقاعدہ دھمکی دینے لگا تھا۔ میں بھی کس

WWW.PAKSOCIETY.COM

چکر میں پھنس گیا تھا۔ اس بار میں نے بہت سختی سے کہا۔ ”دیکھو، بہت ہوگئی تمہاری بکواس۔ اب تم مجھ سے الٹی سیدھی باتیں مت کرو ورنہ میں آرہا ہوں تمہارے گھر۔ کیا تماشا بنا رکھا ہے تم لوگوں نے۔“

اس بار اس کے لہجے میں نرمی آگئی تھی۔ ”دیکھیں، میں اپنی امی کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔ نہ جانے وہ کہاں چلی گئی ہیں۔“

”اور تم نے یہ سمجھ لیا کہ وہ میرے پاس ہیں۔“ میں غصے سے بولا۔ ”اس بار تو تمہاری پریشانی دیکھ کر میں خاموش ہوں لیکن آئندہ مجھ سے ایسی بکواس مت کرنا۔“

اس نے کچھ کہے بغیر فون بند کردیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سا ڈراما شروع ہوگیا ہے۔ رخسانہ کہاں چلی گئی تھی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اس کے گھر جاکر دیکھتا ہوں کہ یہ کیا قصہ ہے۔ اگر میں خاموش رہا تو وہ بدتمیز لڑکا نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے۔

میں دفتر سے سیدھے رخسانہ کے گھر پہنچ گیا اور خلافِ توقع رخسانہ گھر پر ہی موجود تھی۔ اس نے پہلے کی طرح مسکرا کر میرا استقبال کیا تھا۔ ”آئیں جناب، بہت دنوں کے بعد آرہے ہیں۔ کیا راستہ بھول گئے تھے۔“

”ہاں، راستہ تو بھول گیا تھا لیکن تمہارے بیٹے نے راستہ یاد دلادیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ حیران رہ گئی تھی۔

”یہ تم اپنے بیٹے کو بلا کر پوچھو کہ اس نے مجھ سے کیا بکواس کی تھی۔“ میں نے کہا۔

”پلیز! بتاؤ تو سہی کیا ہوا ہے۔“

میں نے اسے بتادیا کہ اسی کے موبائل فون سے اس کے بیٹے نے مجھ سے کیا کیا باتیں کی تھیں۔ وہ حیران ہوکر سنتی رہ گئی تھی۔

”میں ابھی اسے بلا کر پوچھتی ہوں۔“ وہ شرمندہ ہوکر بولی۔ ”یہ تو آپ نے عجب بات بتادی۔ اس نے پہلے تو ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔ پھر اب کیوں اس کا دماغ خراب ہورہا ہے۔“

”لیکن تم کہاں چلی گئی تھیں۔“ میں نے پوچھا۔

”میں تو اپنی ایک دوست کے پاس گئی ہوئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”نعمان کو بھی معلوم ہے۔ آپ ٹھہریں، آپ کے سامنے بات ہوگی۔ وہ کم بخت میرے کردار پر شک کررہا ہے۔“ پھر اس نے آواز دی۔ ”کمال۔ کمال!“

کمال نام کا اس کا وہی بیٹا اپنے کمرے سے نکل کر ہمارے پاس آگیا۔ اس وقت بھی وہ اکھڑا اکھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے آتے ہی رخسانہ اس پر برس پڑی۔ ”یہ تم نے انجم صاحب سے کیسی بے ہودہ باتیں کی ہیں۔ شرم نہیں آئی تمہیں ایسی بکواس کرتے ہوئے۔ کیا تم اپنی ماں کے کردار پر شک کررہے ہو۔“

”تو اور کیا کروں۔“ وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”آپ ان کے ساتھ اتنی فری ہیں۔ اسی لیے میں نے سمجھا کہ شاید......“

”بکواس مت کرو۔“ رخسانہ نے اس کو ایک تھپڑ رسید کردیا۔ ”دور ہوجا میری نگاہوں سے۔“ وہ رونے بھی لگی تھی۔ ”کیسی اولاد ہے جو اپنی ماں کے لیے ایسی باتیں سوچتی ہے۔ جب تو دیکھ رہا کہ خود تیرا باپ بھی انہیں پسند کرتا ہے۔ ان کو گھر کا آدمی سمجھتا ہے تو پھر تیری اتنی ہمت کہاں سے ہوگئی۔ جا دفع ہوجا۔“

وہ چپ چاپ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

رخسانہ اس وقت بے حد شرمندہ ہورہی تھی۔ وہ مجھ سے نگاہیں نہیں ملا پارہی تھی۔ ”انجم صاحب، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ کم بخت ایسا نکلے گا۔“

”بہرحال... میں آج آخری بار اس گھر میں آیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے اس گھر کا ماحول خراب ہوجائے۔“

”وہ کون ہوتا ہے جس کی وجہ سے آپ آنا جانا چھوڑیں گے۔ جب شوہر کو اعتراض نہیں ہے تو پھر اس کی کیا حیثیت ہے۔“

”رخسانہ، وہ تمہاری اولاد ہے۔ بیٹا ہے تمہارا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارا اور اس کا زندگی بھر کا ساتھ ہے اور میں ایک غیر ہوں۔ اس لیے اپنے گھر کو میری وجہ سے ڈسٹرب نہ کرو۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہارا یا اس کا برا نہیں چاہتا۔ اسی لیے یہ کہہ رہا ہوں۔“

بہرحال میں پھر اس دن کے بعد ان کے گھر نہیں گیا۔ ایک دو بار رخسانہ کا فون بھی آیا لیکن میں نے اٹینڈ نہیں کیا تھا۔ بات شاید ختم ہوگئی تھی۔ کیونکہ پھر بہت دنوں تک کچھ بھی نہیں ہوا۔

لیکن ایک دن اچانک رخسانہ میرے فلیٹ میں آگئی۔ میں نے شاید یہ نہیں بتایا ہو کہ جس وقت حالات

معمول پر تھے اس وقت دونوں میاں بیوی ایک دو بار میرے فلیٹ بھی آچکے تھے۔

میں رخسانہ کو اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ”ارے تم! اس طرح اچانک۔“

”میں خود اس لیے آگئی ہوں کہ آپ نے میرا نمبر کاٹنا جو شروع کردیا تھا۔“ اس نے کہا۔

”اس کی وجہ بھی تم کو معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک بار پھر یہ کہہ رہا ہوں کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی قسم کی بدمزگی ہوجائے۔“

”بدمزگی تو ہوچکی۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ ”میں نے تو اس کو چھوڑ دیا ہے۔“

”نہیں رخسانہ، ایسا مت کہو۔ وہ بیٹا ہے تمہارا۔ تم اسے کیسے چھوڑ سکتی ہو۔“

”میں بیٹے کی بات نہیں کررہی۔ شوہر کی بات کررہی ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”بیٹا تو اس معاملے میں بالکل بے قصور ہے۔“

”رخسانہ، یہ کیسے ممکن ہے۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ”سب کچھ تو تمہارے بیٹے نے کیا ہے۔“

”نہیں۔ اس بزدل شخص نے کیا ہے جس کا نام نعمان حارث ہے۔“ رخسانہ پھٹ پڑی۔ ”جو بظاہر بہت مہذب اور براڈ مائنڈڈ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اندر سے انتہائی تنگ نظر شخص ہے۔ اسے آپ کا میرے یہاں آنا جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن وہ خود کو بہت وسیع دل اور ذہن کا ظاہر کرچکا تھا۔ اسی لیے اس نے بیٹے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائی ہے۔“

”یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ ساری باتیں تمہارے شوہر نے کہلوائی تھیں۔“

”ہاں۔ کمال اسی کے کہنے پر آپ کو اس قسم کے فون کرتا رہا ہے۔“ رخسانہ نے بتایا۔

”یہ تو بہت حیرت کی بات ہے۔“

”جی انجم صاحب، ایسا ہی ہوا ہے۔ اس نے سب کچھ بتادیا ہے مجھے۔ آج میں نے اس پر ذرا سختی کی تو اس نے ساری کہانی سنادی۔“

”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے باپ کا نام لیا ہو۔“

”اس کی بھی تصدیق ہوچکی ہے۔ میں نے جب نعمان سے پوچھا تو اس نے بھی اعتراف کرلیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود آپ سے ایسی باتیں کرے۔ وہ شرمندگی بھی محسوس کررہا تھا۔ اسی لیے اس نے کمال کو راضی کیا اور کمال نے وہی کیا جو ایک فرمانبردار بیٹے کو کرنا چاہیے۔“

”یہ تو تم نے عجیب کہانی سنادی ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں تو تمہارے بیٹے ہی کو بدتمیز سمجھ رہا تھا۔“

”نہیں، وہ ایسا نہیں ہے۔ اس لیے تو میں حیران تھی کہ وہ ایسا کیوں کررہا ہے۔ اب جاکر پتا چلا ہے۔“

”خیر، یہ بتاؤ اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”دل تو چاہتا ہے کہ ایسے شخص کو چھوڑ دوں۔“

”نہیں، ایسا مت کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہاری ایک گھریلو زندگی ہے۔ شوہر ہے۔ بچے ہیں۔ تم میری خاطر یہ سب نہیں کروگی۔“

”صرف آپ کی خاطر نہیں، بلکہ ٹوٹے ہوئے اعتماد کی خاطر۔“

”نہیں، کچھ بھی ہو۔ تمہیں اس کے ساتھ گزارہ کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”عورت کے پاس آپشن بہت کم ہوتے ہیں۔ جو ہے اسے ضائع مت کرو۔ جاؤ شاباش گھر چلی جاؤ اور بھول جاؤ سب کچھ۔“

”خیر، میں گھر تو جارہی ہوں۔ لیکن اس شخص کو زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔ یہ دکھ میرے ساتھ رہے گا۔“

رخسانہ کے جانے کے بعد بہت دیر تک میں اس کے شوہر کے کردار کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ کیا آدمی تھا جس نے اپنے بیٹے کو اس طرح استعمال کیا تھا۔

ویسے ایک بات تو تھی۔ گرچہ کمال کو اس کے باپ ہی نے بھڑکایا ہو لیکن شاید خود کمال بھی میرا آنا جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کا لہجہ یہ بتارہا تھا کہ وہ لہجہ مصنوعی نہیں ہے۔

بہرحال اب مجھے ان لوگوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ رخسانہ واپس اپنے گھر چلی گئی تھی اور میری خواہش تھی کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ پُرسکون زندگی گزارے۔

پھر بہت دن ہوگئے۔ شاید ایک مہینا اور اس دوران ان لوگوں کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکا۔ پھر ایک شام اچانک خود نعمان میرے فلیٹ پہ آگیا۔

وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ اسے اس طرح اچانک اپنے دروازے پر دیکھ کر بہت حیرت ہوئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آئیں، اندر آجائیں۔" میں نے اسے کمرے میں لے جاکر بٹھایا۔ کئی طرح کے خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ وہ یوں ہی تو نہیں آیا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے زبان کھولی۔ "انجم صاحب، میں آپ سے شرمندہ ہوں۔"

"وہ کیوں۔" میں نے اس طرح حیرت ظاہر کی جیسے مجھے کچھ بھی نہ معلوم ہو۔

"میرے بیٹے نے میرے کہنے پر آپ کو فون کیا تھا۔" اس نے وہی بات بتائی جو رخسانہ بتا چکی تھی۔

"اوہ!" میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"جانتے ہیں کیوں؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"اب یہ بھی آپ ہی بتادیں۔" میں نے کہا۔

"اس سے پہلے ایک چیز دکھانا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنی ایک آستین الٹ دی۔ اس کی کلائی پر بلیڈ کے کئی نشانات تھے۔ "یہ دیکھیں، اس سے آپ کو اندازہ ہوجائے گا۔"

"نعمان صاحب! میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ کیا ہے یہ سب۔"

"میں نے شادی سے پہلے رخسانہ سے ایسی محبت کی تھی جس کو آپ جنونی محبت کہہ سکتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔ لیکن میرے والدین اس خاندان میں شادی کے مخالف تھے۔ اب اس کی وجہ بتانا نہیں چاہتا۔ بہرحال میں اپنے آپ کو زخمی کرتا رہا۔ میں نے رخسانہ کو کئی خط اپنے خون سے لکھے ہیں۔ پرانے وقتوں کے عاشقوں کی طرح۔ آخرکار یہی ہوا کہ والدین نے رخسانہ سے میری شادی تو کرادی لیکن مجھ سے قطع تعلق کرلیا جو آج تک برقرار ہے۔"

"اوہ! افسوس ہوا یہ سن کر۔" میں نے کہا۔

"انجم صاحب، میرا بہت بڑا خاندان ہے۔ باپ کا انتقال ہوچکا ہے۔ ماں ہیں، بھائی ہیں، بہنیں ہیں۔ لیکن کوئی بھی نہیں ہے سوائے رخسانہ کے۔ بس وہی میرے لیے سب کچھ ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔ پھر جب میرا تمہارے یہاں آنا جانا ہوا تو تم نے یہ سمجھا کہ میں اس کو تم سے چھیننے کے لیے آگیا ہوں۔"

"جی ہاں۔ ایسا ہی ہوا تھا۔" اس نے اعتراف کیا۔ "میں نہیں چاہتا تھا کہ آپ کا آنا جانا ہو۔ سوچتا رہتا کہ کیا کروں۔ کیسے منع کروں۔ میں اپنے عشق میں سچا ہوں اور یہ کہتا ہوں، میری رگوں میں بڑا زہر ہے رقابت کا۔ تو میں اندر ہی اندر سلگتا رہتا لیکن چونکہ ایک مہذب انسان ہوں۔ آپ سے کھل کر بات نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے میں نے کمال کو اس بات کے لیے راضی کرلیا اور اس نے آپ کو فون کردیا۔"

"آپ نے مجھے غلط سمجھا تھا نعمان صاحب۔" میں نے کہا۔ "میں تو اس لیے آیا جایا کرتا کہ آپ کے گھر میں مجھے گھر کا سا ماحول اور اپنائیت مل جاتی تھی۔ بس اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں تھی۔"

"اسی لیے تو شرمندہ ہوں۔ بس آپ چلیں میرے ساتھ۔" اس نے کہا۔

"نہیں نعمان صاحب! اب نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں انسانی نفسیات سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ اس کے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ نہ جانے کون سی ایسی گھڑی آجائے کہ کہانی پھر کوئی نیا رخ اختیار کرلے۔ آخر ہم بھی انسان ہی ہیں۔ ہم سے کوئی غلطی بھی سرزد ہوسکتی ہے۔ اسی لیے احتیاط بہتر ہے۔"

وہ افسردہ ہوگیا تھا۔ "اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے۔"

"یہ کس نے کہہ دیا۔ میں آپ سے ضرور ملوں گا۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہم باہر ملا کریں گے۔ میں آپ کے گھر نہیں آؤں گا۔ اور نہ ہی میں چاہتا ہوں کہ رخسانہ بھی میرے سامنے آئے۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔"

"ہاں سمجھ گیا ہوں میں۔"

"آئیں گلے مل کر ہم یہ شکوہ دور کرلیتے ہیں۔" میں نے اپنے بازو پھیلا دیے۔

وہ بھی بہت گرم جوشی کے ساتھ مجھ سے بغل گیر ہوگیا تھا۔

اس بات کو کئی برس ہوچکے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے ملا کرتے ہیں۔ لیکن رخسانہ کو دیکھے، اس سے ملے ہوئے برسوں ہوچکے ہیں۔ ایک تو وہ برسوں کے بعد میری زندگی میں آئی تھی اور اب پھر برسوں کے لیے میری زندگی سے جاچکی ہے۔

محبت زندہ ہے

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
میں پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہوں اس لیے لکھنے پڑھنے کا شوق ہوتے ہوئے بھی دل مار کر رہ جاتی ہوں۔ کالج لائف میں اخبارات میں لکھا کرتی تھی۔ کافی عرصہ بعد قلم اٹھایا ہے۔ خود اپنی آپ بیتی رقم کی ہے لیکن نام مقام تبدیل کردیا ہے۔ امید ہے میری روداد پسند آئے گی۔

ڈاکٹر شاہینہ
(راولپنڈی)

میں اپنے کمرے میں تھی جب نرس شہلا دستک دے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ کچھ پُرجوش اور بے چین بے چین سی دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے سسٹر شہلا۔" میں نے پوچھا۔ "تم کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو۔"

"نہیں ڈاکٹر صاحب، پریشان تو نہیں ہوں۔ بس ذرا سی ایکسائٹمنٹ ہورہی ہے۔" اس نے بتایا۔

"کس بات کی؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کسی پرائیویٹ کے نئے مریض کو دیکھ کر۔"

"کیا ہوا ہے اسے۔"

"دل کا مریض ہے ڈاکٹر صاحب۔" اس نے بتایا۔ "کیا آپ کے پاس اس کی فائل نہیں آئی۔"

"ہاں۔" میں نے سامنے رکھی ہوئی فائل کو دیکھا۔ "ڈاکٹر جواد اسٹڈی کے لیے دے تو گئے ہیں۔ شاید آذر نام ہے اس کا۔"

"جی ڈاکٹر صاحبہ، کچھ عجب سا نام ہے آذر۔ ویسے وہ بندہ بھی کچھ عجیب ہی سا ہے۔"

"وہ کیا۔"

"بہت اچھی باتیں کرتا ہے۔" شہلا بتاتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ "اسے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ ایک ہفتے بعد اس کی اوپن ہارٹ سرجری ہونے والی ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں تو شروع سے دل کا مریض رہا ہوں۔ ہر اچھی لڑکی نے میرے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب ہی کیا ہے۔"

شہلا سے یہ سن کر نہ جانے کیوں میرا دل دھڑک سا اٹھا۔ ایسی بات۔ ایسی بات شاید میں نے پہلے بھی کہیں سنی تھی۔ کچھ اسی قسم کی یا اس سے بھی اچھی۔

زندگی کے مختلف معنوں کو اجاگر کرتی ہوئی۔ دل کش باتیں۔ لیکن یہ شخص کون تھا۔ آذر! میرے لیے یہ نام اجنبی تھا۔

"شہلا، ایک بات بتاؤ۔ کیا اس شخص کا اصل نام آذر ہی ہے۔" میں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتی ڈاکٹر، لیکن اس نے تو یہی بتایا ہے، کیوں؟"

"کچھ نہیں، اب تم جاؤ۔ میں اسے چیک کرلوں گی۔"

کچھ دیر بعد میں نے اس کمرے کے دروازے سے جھانک کر دیکھا جس میں آذر نام کا وہ مریض بستر پر لیٹا کوئی کتاب دیکھ رہا تھا۔

میں دروازے پر کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ ذرا سی دیر کے لیے اس نے اپنے چہرے کے سامنے سے کتاب ہٹائی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ وہی تھا۔ شہریار۔

میں اسے کس طرح بھول سکتی تھی۔ اسے پہچاننے میں کیسے غلطی کرسکتی تھی؟ وہ شہریار ہی تھا۔ میرا دوست، میرا ہمدم لیکن وہ آذر کب سے ہوگیا تھا۔ ہم کالج میں ایک ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ اس وقت بھی بہت خوبصورت باتیں کیا کرتا۔ بہت اچھی شاعری کرتا لیکن اس وقت وہ صرف شہریار تھا۔

میں نے آگے بڑھتے ہوئے پاؤں روک لیے۔ میں اس کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ میرا اب اس سے رشتہ ہی کیا تھا۔

رشتے تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتے جاتے ہیں، گرفت سے نکل جاتے ہیں۔ وہ دل کا مریض ہوگیا تھا اور میں دل کی ڈاکٹر تھی۔ میرا فرض تھا کہ میں اسے اٹینڈ کروں لیکن مجھ میں اس کے سامنے جانے کی ہمت ہی نہیں تھی۔

میں اس کے پاس جانے کے بجائے اپنے کمرے میں واپس آگئی۔

میری حالت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ دل کی دنیا میں ایک زلزلہ سا آگیا تھا۔ میں کانپ رہی تھی۔ کتنے برسوں کے بعد دیکھا تھا اس شخص کو۔ جس کو دیکھے بغیر ایک دن بھی سکون سے نہیں گزرتا تھا۔

دروازے پر دستک کے ساتھ ڈاکٹر جواد کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ بہت سینئر ڈاکٹر تھے۔ میرے استاد بھی رہ چکے تھے۔ میرے لیے کسی باپ کی طرح شفیق اور مہربان۔

میں انہیں دیکھ کر جلدی سے کھڑی ہوگئی تھی۔

"کیسی ہو شاہینہ؟" ڈاکٹر جواد نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں سر۔"

"تم نے اس پیشنٹ کو چیک کرلیا۔ کیا نام ہے اس کا، آذر۔" ڈاکٹر جواد نے پوچھا۔

"نو سر۔"

"کیوں؟ تمہارے پاس اس کی میڈیکل ہسٹری تو خود میں رکھ کر گیا تھا۔"

"سر۔ شاید میں اس کو ٹریٹ نہ دے سکوں۔" میں نے کہا۔ "میری بجائے اس کا کیس کسی اور کو دے دیں۔"

"کیوں خیریت!" ڈاکٹر جواد نے حیرت ظاہر کی۔

"بس یوں ہی سر۔" میں ہکلا کر رہ گئی۔

ڈاکٹر جواد بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ "اوکے! ویسے یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ میں نہیں جانتا کہ تم اس کا کیس کیوں نہیں لینا چاہتیں۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ ایک ڈاکٹر جب مسیحائی کا حلف لیتا ہے تو پھر وہ صرف ایک مسیحا ہی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اچھی بری یادیں اس کو اپنے ذہن سے ہٹا دینی چاہئیں۔"

"تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس کیس کو ڈیل

کروں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ ویسے تمہاری مرضی۔"

"ٹھیک ہے سر۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "میں اس کیس کو لے رہی ہوں۔"

☆☆☆

"جانتے ہو شہریار کہ میں محبت کے ڈھونگ کو نہیں مانتی۔" میں نے شہریار سے کہا۔

"ہاں معلوم ہے۔" وہ مسکرا دیا۔ "اور مجھے یہ سن کر کوئی حیرت بھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا۔"

"اور وہ خاص دل کہاں سے آتے ہیں۔"

"ان کی افزائش درشت اور کھردرے مصنوعی ماحول میں نہیں ہوتی۔" اس نے کہا۔ "وہ صحراؤں، وادیوں آبشاروں اور جھیلوں کے کنارے پائے جاتے ہیں۔"

"کیا تمہارے پاس باتوں کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔" میں نے چڑ کر پوچھا۔

"ہاں ایک ایسا دل جو صرف محبت کے لیے پیدا ہوا ہے۔"

"تم خواہ مخواہ ڈاکٹر بننے میں اپنا وقت ضائع کررہے ہو۔" میں نے کہا۔ "تم کو تو شاعر ہونا چاہیے۔"

"ایک اچھا ڈاکٹر ایک خوبصورت محبت کی علامت ہوا کرتا ہے۔" شہریار مسکرا کر بولا۔ "اور جہاں تک شاعر ہونے کا تعلق ہے، وہ تو میں ہوں۔"

اس وقت ہم دونوں فارغ وقت میں کلاس روم سے باہر آکر لان میں بیٹھے باتیں کررہے تھے، ایک گھنے درخت کے سائے میں۔

ہمارے اردگرد دوسرے لڑکے لڑکیاں بھی تھیں۔ اپنی اپنی باتوں میں مگن۔ کون جانے وہ کن موضوعات پر باتیں کررہے ہوں، جبکہ میں اور شہریار ایک بار پھر محبت کی کیمسٹری پر بات کررہے تھے۔ یہ میرا محبوب موضوع تھا۔ شہریار ایک رومان پسند نوجوان تھا، جبکہ میں حقائق دیکھا کرتی۔

مجھے یاد ہے۔ ایک بار ایک استاد نے بتایا تھا۔ "دیکھو، یہ میرے ہاتھ میں گلاب ہے۔ اب میں اس کی تعریف پوچھنا چاہتا ہوں۔ فرض کرو، ایک سے پوچھتا ہوں۔ وہ یہ کہتا ہے کہ گلاب کئی رنگوں کے ہوتے ہیں۔ یہ رنگ کیمیکل تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ گلاب کے قلم لگائے جاتے ہیں۔ اس کا زیر دانہ بھی اس کی افزائش میں معاون ہوتا ہے۔

اب دوسرے سے پوچھتا ہوں تو وہ کہتا ہے کہ گلاب ایک خوبصورت پھول ہے۔ اس کی خوشبو مسحور کن ہوتی ہے۔ یہ پوری دنیا میں محبت کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ یہ وہ پھول ہے جس کو خوشی اور غم دونوں مواقع پر استعمال کیا جاتا ہے۔"

یہ دونوں تعریفیں اپنی اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ لیکن پہلی تعریف سائنٹفک اپروچ ہے اور دوسری تعریف آرٹسٹک اپروچ۔ غلط وہ دونوں نہیں ہیں۔

تو ہمارے درمیان اسی قسم کی بحث ہوا کرتی۔ شہریار مکمل آرٹسٹ تھا۔ اس کے خدوخال بھی آرٹسٹک ہی تھے۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں اس کے لیے آہیں بھرتی ہوں گی۔ لیکن وہ صرف مجھ سے قریب تھا۔ اور مجھے اپنی محبت کا احساس دلانے کی کوشش کیا کرتا۔

اور میں اس کی باتیں سن کر مسکرا دیتی۔ میرا خیال تھا کہ محبت کا جذبہ دراصل انسانی دماغ میں پہنچنے والے ہیجان کا نام ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

میں محبت کے خلاف تو تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر اس کے قریب بھی ہوتی جارہی تھی۔ اگر کسی دن وہ نہیں آتا تو بے چینی سی ہونے لگتی۔ اور جب آجاتا تو لڑنے لگتی۔ "آخر تم غائب کیوں ہوجاتے ہو۔ کیا بتا نہیں سکتے کہاں مرنے جارہے ہو۔"

"کیوں محترمہ! ایسی بے تابی کس لیے۔"

"اس لیے کہ تم دوست ہو۔"

"نہیں محترمہ، ایسی بے تابی صرف دوستی میں نہیں ہوا کرتی بلکہ اس سے آگے کی منزل ہوتی ہے۔ اسی منزل کو پیار کی منزل کہتے ہیں۔"

"بس تم اپنی بکواس کرتے رہو۔" میں مصنوعی خفگی کا اظہار کرتی۔

پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا یا جس کا خدشہ تھا۔ میں اس سے محبت کرنے لگی یا یہ کہنا چاہیے کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرنے لگے۔

ہم نے اپنے خواب مشترک کرلیے۔ اپنے دکھ سکھ ایک دوسرے کو دے دیے۔ اپنی راتوں کی نیندیں اور ان کی مصروفیات ایک دوسرے کے حوالے کردیں۔

ہم ٹوٹ کر ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ زندگی ان دنوں کتنی خوبصورت اور کتنی مہربان ہوا کرتی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے، ایک دوسرے سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

باتیں کرتے ہوئے، اپنی پسند کے اشعار سناتے ہوئے۔ سب کچھ کتنا اچھا لگتا تھا۔

پھر وہی ہوا جو صدیوں سے ہوتا چلا آیا ہے۔ ہم اپنے تعلیمی مراحل کے آخری سال میں تھے۔ ہم ڈاکٹر بننے جا رہے تھے۔ اس کے بعد ہماری اپنی زندگی ہوتی۔

ان ہی دنوں کچھ ایسا ہوا کہ ابو بیمار پڑ گئے بہت شدید۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنی موت سے پہلے میری شادی دیکھ جائیں۔

میں نے ان سے شہریار کا تذکرہ کر دیا۔ انہیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لیکن قسمت کو اعتراض تھا۔ اسی لیے اس نے شہریار کو غائب کروا دیا۔

ہاں شہریار اچانک لاپتا ہو گیا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں تھا۔ ہم اس کے کرائے کے فلیٹ میں بھی گئے۔ وہاں سے پتا چلا کہ کچھ دنوں پہلے ہی اس نے فلیٹ خالی کر دیا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ ہم اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے تھے۔

میں پاگلوں کی طرح اسے تلاش کرتی رہی۔ لیکن اس کا کوئی پتا نہیں چل سکا۔ یہ بہت حیرت کی بات تھی۔ اس نے اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کی تھی اور یوں ہی غائب ہو گیا تھا۔

پھر وہی ہوا جو ان حالات میں ہونا چاہیے تھا۔ گھر والے کب تک اس کا انتظار کرتے رہتے۔ جبکہ ابو کو اپنی آخری منزل کی طرف جانے کی جلدی تھی۔

میری شادی فیاض سے کر دی گئی۔ وہ ایک بزنس مین تھا۔ بہت سلجھا ہوا اور محبت کرنے والا شخص۔ فیاض سے شادی کے بعد میں شہریار کو بھولتی چلی گئی تھی۔

اس شخص نے بے پناہ پیار دیا تھا مجھے۔ شوہر ہونے کا حق ادا کر دیا تھا۔ اپنے نام ہی کی طرح فیاض... اور بے پناہ مہربان۔ دھیمے دھیمے لہجے میں گفتگو کرنے والا۔ ہمارے دو بچے بھی ہو گئے۔ ردا اور احمر۔ دو پیارے پیارے بچے۔ پھر اچانک شہریار دل کا مریض بن کر ہاسپٹل میں آ گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر جواد کے کہنے پر میں شہریار کے کمرے میں چلی گئی۔ صرف ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے۔ اس وقت وہ صرف میرا مریض تھا اور میں اس کی ڈاکٹر۔ کوئی رشتہ نہیں تھا میرے اور اس کے درمیان۔ ہم رشتوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

وہ جاگ رہا تھا۔ ایک کتاب اس کے ہاتھ میں تھی ہمیشہ کی طرح۔ کالج میں بھی کتاب اس کے ہاتھ میں ہوا کرتی۔ شاعری کی۔ ادب کی، تصوف کی۔ تاریخ کی۔ وہ ہر موضوع پڑھا کرتا۔

میری آہٹ سن کر اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی۔ پہلے تو وہ سکتے کے عالم میں میری طرف دیکھتا رہا، پھر اٹھ بیٹھا۔

"تم... شاہینہ تم۔ تم شاہینہ ہی ہو؟"

"ہاں، میں شاہینہ ہوں۔ تمہاری ڈاکٹر۔"

"میرے خدا! کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں۔" اس نے اپنا ایک ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے اس کے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ بتاؤ تم کیسا محسوس کر رہے ہو۔"

"اپنے کس دل کی کیفیت بتاؤں۔ اس دل کی جو گوشت کا ایک لوتھڑا ہے اور جس کا آپریشن ہونے والا ہے یا اس دل کی جو محبت کرنا جانتا ہے، جو ہمارے جذبات اور احساسات کو کنٹرول کرتا ہے۔"

"میں گوشت کے لوتھڑے کی کیفیت معلوم کرنے آئی ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ میں صرف ایک ڈاکٹر ہوں اور تم صرف ایک مریض۔"

"شاہینہ، میں تمہارا مریض تو برسوں سے ہوں۔"

"پلیز، مت کرو ایسی باتیں۔" میں نے کہا۔

"یہی تو پرابلم ہے۔" وہ مسکرا دیا۔ "لڑکیاں شادی کے بعد یہ سمجھتی ہیں کہ انہوں نے جو محبت کا رشتہ استوار کیا تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ اب انہیں کیا معلوم کہ بس یہی ایک رشتہ دائمی ہوتا ہے۔ درمیان میں چاہے جتنے ہی رشتے حائل ہو جائیں، اس کی تازگی برقرار رہتی ہے۔"

"شہریار... میں تمہاری یادیں بھلا چکی ہوں۔" میں نے کہا۔

"اول تو ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اور اگر ایسا ہے بھی تو یہ تمہاری طرف سے تو ہو سکتا ہے میری طرف سے نہیں۔ میں نے اپنے دل میں محبت کے اس چراغ کو ہمیشہ جلائے رکھا ہے۔"

"یہ بتاؤ تم شہریار سے آذر کیسے ہو گئے۔"

"میں تو شروع سے آذر تھا۔" اس نے کہا۔ "خواہشات اور خوابوں کے بت تراشنے والا۔"

"آذر، اگر میں تمہیں نہیں مل سکی تو اس میں سارا قصور تمہارا ہے، تم اچانک غائب ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے گھر والوں کو تمہارے لیے راضی بھی کر لیا تھا۔ پھر ہم سب تمہیں تلاش ہی کرتے رہ گئے۔ اب اتنے برسوں کے

بعد سامنے آئے ہو۔"

"ہاں، ٹھیک کہتی ہو تم۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں واقعی غائب ہو گیا تھا۔ لیکن اس میں میرے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میرے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا تھا۔"

"یقیناً کوئی فلمی قسم کی کہانی ہو گی۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔ فلمیں بھی تو زندگی کی عکاس ہوتی ہیں۔" اس نے کہا۔ "میری ماں کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی، مجھے ایمرجنسی میں بلا لیا گیا تھا۔ میری ماں بسترِ مرگ پر تھی۔ اور وہ صرف ...... اس وقت تک زندہ رہی تھی... جب تک میری شادی اپنی بہن کی بیٹی سے نہ کرا لے۔"

"اور تم اپنی ماں کی ضد کے سامنے مجبور ہو گئے ہو گے۔"

"ضد کے سامنے نہیں، اس کی خواہش کے سامنے۔ اس نے کہا تھا کہ اگر یہ شادی ہو جائے تو وہ سکون سے مر سکے گی۔ اس لڑکی کا باپ نہیں تھا۔ میرے خالو کی بہت پہلے ڈیتھ ہو چکی تھی۔ ماں کی اس آخری خواہش کے سامنے میں بے بس ہو گیا اور ریحانہ سے میری شادی ہو گئی، بہت جلدی میں۔ شادی کے چند دنوں بعد ہی ماں کا انتقال ہو گیا۔ شاید اس کو اسی کا انتظار تھا۔ اس کے بعد میری ہمت نہیں ہوئی کہ میں تمہارے سامنے آؤں۔ کس طرح آتا میں۔ میں نے اپنی تعلیم بھی چھوڑ دی۔"

"اور تمہاری بیوی، اس کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"شادی کے ایک سال بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا۔" اس نے بتایا۔ "اس کے گردے ناکارہ ہو گئے تھے۔ بہت علاج ہوتا رہا لیکن وہ زیادہ دنوں تک میرا ساتھ نہیں دے سکی، تم نے کہا تھا ساتھ نبھاؤں گی عمر بھر۔ وعدہ خلافی تم تو میری جان کر گئے۔"

شہریار نے پھر ایک شعر سنا دیا تھا۔ یہ اس کی پرانی عادت رہی تھی۔ اس کی کہانی سن کر افسوس ہونے لگا تھا۔ انسان وقت کے ہاتھوں کبھی کبھی کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔

وقت کیسی زنجیریں ڈال دیتا ہے کہ آگے بڑھنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ کیسا جابرانہ عمل ہوتا ہے۔ بس، بس! حکم آ گیا۔

"جانتی ہو شاہینہ اس کے بعد کیا ہوا۔" شہریار کہہ رہا تھا۔ "میں پاگلوں کی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر بھٹکتا رہا۔ آوارہ گرد کی طرح۔ کٹی ہوئی پتنگ کی طرح۔ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ میں جاتا تو کہاں جاتا۔ کس کے پاس جاتا۔ نہ جانے کیوں کچھ لوگوں کے لیے عذاب لکھ دیے جاتے ہیں۔

یوں زندگی گزار رہا تھا تیرے بغیر، جیسے کوئی گناہ کیے جا رہا تھا میں۔"

"پھر تم دل کے مریض ہو گئے۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں، پہلے جذباتی طور پر دل کا مریض تھا۔ اب میڈیکلی ہو گیا ہوں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا۔"

"چلو اب باتیں بند کرو۔ تمہیں ریسٹ کی ضرورت ہے۔"

"تمہیں دیکھ کر ریسٹ تو مل ہی چکا ہے۔" اس نے کہا۔ "برسوں کے بعد ایک قرار کی صورت سامنے آئی ہے۔"

میری آنکھوں میں آنسو آنے لگے تھے۔ اسی لیے میں نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا اور اس کے کمرے سے باہر آ گئی۔

جب اپنے کمرے میں پہنچی تو ڈاکٹر جواد وہاں پہلے سے موجود تھے۔

میں بتا چکی ہوں کہ وہ ایک مہربان اور شفیق انسان تھے۔ وہ انسانی فطرت کے بے پناہ نباض تھے۔ انہوں نے بہت غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا بات ہے، کیا تم روتی رہی ہو؟"

"بس سر... اس بے چارے مریض کی پریشانیاں سن کر دل بھر آیا تھا۔"

"نہیں ڈاکٹر شاہینہ، تمہاری آنکھوں کے یہ آنسو عمومی نہیں خصوصی ہیں۔" ڈاکٹر جواد نے کہا۔

"کیا مطلب سر۔"

"مطلب یہ کہ ایسی کیفیت ہر مریض کے لیے نہیں ہوا کرتی۔" ڈاکٹر جواد نے کہا۔ "یہ خاص لوگوں کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ میں نے انسان کی اسٹڈی کرنے میں ایک عمر گزاری ہے بیٹا۔ میں جانتا ہوں کہ کس وقت اور کن حالات میں کیسے تاثرات ہوتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں سر۔" میں نے ان کے آگے سرینڈر کر دیا تھا۔ "میں اس مریض کو برسوں سے جانتی ہوں۔"

پھر میں نے ڈاکٹر جواد کو سب کچھ بتا دیا۔ ان سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ وہ بھی یہ سب سن کر سنجیدہ سے ہو گئے تھے۔ "ہاں ڈاکٹر شاہینہ، انسان کے ساتھ اس قسم کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہانیاں لگی رہتی ہیں۔ محبت کوئی معمولی جذبہ نہیں ہوتا۔ یہ ظلم اور جبر کے خلاف ایک جہاد کا نام ہے۔ تمہارا اصل جہاد تو اب شروع ہوا ہے۔ تم اب ڈاکٹر ہو۔ تمہارے جہاد کا رخ اب مسیحائی کی طرف ہونا چاہیے۔ جاؤ، اس کی دیکھ بھال کرتی رہو۔ اس کی دل جوئی کرتی رہو۔ اس کو زندگی سے قریب لانے کی کوشش کرتی رہو۔ لیکن ایک خیال کے ساتھ کہ اب تمہارے پاس شوہر اور دو بچے ہیں۔ عشق و محبت ان سے کرنی ہے اور جہاد اپنے جذبوں سے۔"

☆☆☆

کاش یہ سب نہ ہوا ہوتا۔

شہریار کے ساتھ ایک بہت بڑا مرحلہ تھا۔ اوپن ہارٹ سرجری کا۔ حالانکہ سرجری بہت ترقی کر چکی ہے۔ ڈاکٹرز بھی بہت قابل ہیں۔ اس کے باوجود ہر آن اندیشہ لگا رہتا ہے۔

کسی وقت بھی دل کام کرنا چھوڑ سکتا ہے۔ کسی وقت بھی یہ کہانی ختم ہو سکتی ہے۔ یہ جدوجہد رائگاں جا سکتی ہے۔

کاش ڈاکٹر جواد نے مجھے دوبارہ شہریار کی طرف نہ بھیجا ہوتا۔

اس بار میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ اس کے اپنی طرف بڑھے ہوئے ہاتھ کو رد نہیں کر سکی تھی۔ اس وقت میں ڈاکٹر نہیں تھی بلکہ ایک عورت تھی۔ ایسی عورت جس کی طرف اس کے محبوب نے پیار کا ہاتھ بڑھا رکھا تھا۔ میں نے وہ ہاتھ تھام لیا تھا۔

ہم بہت دیر تک اسی طرح گم صم رہے۔ اپنے ماحول سے بے خبر۔ ایک دوسرے کو دیکھتے اور ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے۔ پھر شہریار نے سرگوشی کی۔ "شاہینہ، وعدہ کرو، ساتھ دیتی رہوگی میرا۔"

کچھ عجیب کیفیت ہونے لگی تھی۔

سب کچھ میرے سامنے تھا۔ میرا مہربان شوہر، دو پیارے بچے۔ ایک پُرسکون زندگی، اس کے باوجود نہ جانے کس سیلاب میں بہتی جا رہی تھی۔

جیسے اپنے آپ پر اختیار ہی نہ رہا ہو۔

"شاہینہ، میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" شہریار کہہ رہا تھا۔ "جبکہ تمہارے شوہر کے پاس زندگی کی ساری آسانیاں ہیں۔ اپنا گھر ہے، گاڑی ہے، بینک بیلنس ہے۔ اگر تم اس کے ساتھ نہ بھی رہیں تو بھی وہ اپنی زندگی آرام سے گزارے جائے گا۔ جبکہ میں... میں مر جاؤں گا۔ کیونکہ میرے پاس تمہاری یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔"

میں کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے اپنی باتوں کے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ وہ یہی تو کیا کرتا تھا۔

"شاہینہ، محبت سب سے طاقتور اور منہ زور جذبہ ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کسی رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔"

اس وقت اس کی کہی ہوئی بات درست دکھائی دے رہی تھی۔ واقعی شہریار کے سامنے اب کوئی بھی نہیں تھا۔ نہ جانے دوسرے جذبے کہاں چلے گئے تھے۔

اس رات ہاسپٹل سے گھر واپس آکر میں بہت دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ وہ گھر اجنبی سا لگ رہا تھا۔ شوہر اجنبی تھا۔ صرف بچے تھے جو کسی حد تک مجھے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ ورنہ اس گھر میں میرے لیے کیا تھا۔

ہر طرف شہریار کی یادوں کی پرچھائیاں تھیں۔ اس کی باتیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اس کی خوبصورت مدھم آواز کا جادو میرے وجود میں اترتا جا رہا تھا۔

میں اسے نہیں بھول سکتی تھی، کبھی نہیں۔ چار دنوں کے بعد اس کے دل کا بہت بڑا آپریشن ہونے جا رہا تھا۔ اس وقت اس کے دل کو توانائی کی ضرورت تھی۔ اسے سہارا چاہیے تھا۔ سہارا مل جاتا تو اس میں زندگی کے لیے لڑنے کی قوت پیدا ہو جاتی۔

اور وہ قوت مجھے دینی تھی۔ میں نے بھی تو اس سے محبت کی تھی۔ اور محبت کوئی ایسی بے معنی نہیں ہوا کرتی کہ ذرا سی دوری ذرا سا فاصلہ کسی کو بھول جانے اور چھوڑ دینے کے لیے مجبور کر دے۔

☆☆☆

اس وقت اس کے ہونٹوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔

وہ اپنی روشن اور پُرخیال آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کل صبح اس کا آپریشن تھا۔ اس سلسلے کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔

اس نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر کہا۔ "شاہینہ، جانتی ہو کل کیا ہونے والا ہے۔"

میں خاموش رہی۔ اس نے پھر کہا۔ "سن لو کہ میں کل آپریشن تھیٹر سے کامیاب واپس آؤں گا۔ محبت نے نیا حوصلہ دے دیا ہے مجھ میں۔ موت اب میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تم نے جو ساتھ نبھانے کا وعدہ کر لیا، بس میری زندگی کو وہی بہت ہے۔"

اس دن میں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس سے کہا تھا۔ "شہریار، میں ہمیشہ سے تمہاری تھی... اور آئندہ بھی رہوں گی۔"

"کیا تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔" اس کی آواز میں زندگی کی سرشاری تھی۔

"ہاں، میں فیصلہ کر چکی ہوں۔"

"اور وہ... وہ تمہارا شوہر؟"

"اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ بہت کھلا ہوا اور وسیع ذہن کا انسان ہے۔ وہ محبت کی مجبوریاں سمجھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ جذبہ کتنا طاقتور ہوتا ہے۔"

"سوال یہ ہے کہ کیا وہ اجازت دے دے گا۔"

"ہاں۔ اگر ہم الگ ہونا چاہیں تو اچھے دوستوں کی طرح الگ ہو جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک دوسرے کو الزام دیے بغیر۔ کسی تلخی کے بغیر۔ بچے بھی اس کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔"

"شکریہ دوست۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "اب دیکھ لینا۔ میں کس طرح موت کو شکست دے کر تمہارے پاس واپس آتا ہوں۔"

وہ رات اس کے لیے دعائیں مانگتے ہوئے گزر گئی تھی۔ ہاں میں نے اپنے اس فیصلے کے بارے میں بھی ڈاکٹر جواد کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ میں ان سے کچھ چھپانا نہیں چاہتی تھی۔

زندگی کے اس موڑ پر مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت تھی۔ اور سوائے ڈاکٹر جواد کے اور کون ہو سکتا تھا جس سے یہ راز شیئر کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر جواد یہ سن کر اس طرح خاموش ہو گئے تھے جیسے انہیں میرے اس فیصلے سے دکھ پہنچا ہو۔ پھر انہوں نے دھیرے سے کہا۔ "ڈاکٹر شاہینہ، مسئلہ یہ ہے کہ تم ایک پڑھی لکھی عورت ہو۔ اگر تم نے اس قسم کا کوئی فیصلہ کر ہی لیا ہے تو یقیناً بہت سوچ سمجھ کر کیا ہوگا۔"

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب، بہت سوچ سمجھ کر۔"

"تو پھر میں کچھ نہیں کہوں گا۔" انہوں نے کہا۔ "کیونکہ احساس ہوتا جا رہا ہے کہ یہ محبت کا جذبہ کیا ہوتا ہے۔ اس میں کیسی بلا کی طاقت ہوتی ہے۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب۔"

"دوسری صبح شہریار کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا۔ ظاہر ہے کہ میں تھیٹر میں نہیں جا سکی۔ اس کو آپریٹ ڈاکٹر جواد ہی نے کیا تھا۔

میں تو اپنے کمرے میں بیٹھی اس کے لیے دعائیں کرتی رہی تھی۔ کئی گھنٹے طویل آپریشن کے بعد جب ڈاکٹر جواد میرے کمرے میں آئے تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"مبارک ہو ڈاکٹر شاہینہ۔" انہوں نے کہا۔ "تمہارے مریض کا آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔"

خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اب جیسے جیسے شہریار صحت یابی کے مراحل سے گزرتا رہا۔ ویسے ویسے میری بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ فیصلے کی گھڑی آنے ہی والی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ ہاسپٹل چھوڑ جاتا، مجھے اپنی موجودہ زندگی چھوڑ دینی تھی۔ شہریار سے اس کی صحت یابی کے بعد جب ملی تو میرے اس جذبے کو مزید تقویت مل گئی تھی۔

اس کو دو دنوں بعد ہاسپٹل سے ریلیز ہونا تھا۔ جب ڈاکٹر جواد نے ایک بار پھر مجھ سے دریافت کیا۔ "ہاں بھئی... ڈاکٹر شاہینہ، کیا ارادے ہیں تمہارے۔"

"سر، اب اس قسم کے ارادے بار بار تبدیل تو نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک کہا تم نے۔ ویسے میں تمہارے اس جذبے کی قدر کرنے لگا ہوں۔"

"تھینک یو سر۔"

اس شام ایک عجیب بات ہوئی۔ میرے شوہر فیاض کا فون آگیا۔ وہ عام طور پر میری ڈیوٹی کے دوران مجھے فون نہیں کرتے تھے۔

"شاہینہ، تم جلدی سے گھر آجاؤ۔" فیاض نے کہا۔ ان کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا فیاض، خیریت تو ہے نا؟"

"میں فون پر نہیں بتا سکتا۔ تم جلدی آجاؤ۔"

میں حواس باختہ پریشان حال جب گھر پہنچی تو پتا چلا کہ میرے دونوں بچے ردا اور احمر کہیں غائب ہو چکے ہیں۔ میں اپنا سینہ تھام کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔ ذہن سن ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کہاں جا سکتے تھے بچے۔ فیاض پاگلوں کی طرح ٹہل رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ دونوں بچے لان میں کھیل رہے تھے۔ اس وقت گیٹ شاید کھلا ہوا تھا۔ آنے والا آیا اور میرے دونوں بچوں کو اٹھا کر لے گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"فیاض، خدا کے لیے کچھ کریں۔ مجھے اپنے بچے چاہئیں۔" میں اب پھٹ پڑی تھی۔

"صبر کرو۔ دعائیں کرتی رہو۔ آجائیں گے بچے۔"

"کہاں سے آئیں گے۔ کون لے گیا ان کو۔" میں ...... نڈھال ہوکر ایک طرف گر پڑی تھی۔

"خدا کے لیے شاہینہ خود کو سنبھالو۔" فیاض نے کہا۔ "اگر تم ہی حوصلہ ہار گئیں تو پھر کیا ہوگا۔"

"کہاں سے لاؤں حوصلہ، کہاں سے لاؤں۔"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور فیاض ہی نے اٹھایا تھا۔ "ہاں ہاں، میں بول رہا ہوں فیاض۔ او خدا! بتاؤ، کیا چاہیے تمہیں۔ کیا چاہتے ہو دیکھو میری بات سنو... بات سنو۔"

شاید دوسری طرف سے فون رکھ دیا گیا تھا۔ فیاض اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔

"ارے کیا ہوا بتائیں، کس کا فون تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟" میں لپک کر فیاض کے پاس پہنچ گئی تھی۔

"شاہینہ حوصلہ رکھو۔" فیاض دھیرے سے بولے۔

"جہنم میں گیا حوصلہ، آپ بتائیں کیا کہہ رہا تھا۔"

"پچاس لاکھ! پچاس لاکھ مانگ رہا ہے۔ کہہ رہا تھا دونوں بچے اسی کے پاس ہیں۔ پچاس لاکھ مل جائیں تو واپس کردے گا۔"

"خدا کے لیے دے دو پچاس لاکھ۔"

"کہاں سے دے دوں۔"

"مکان بیچ دو۔ گاڑی بیچ دو۔ میں اپنی ساری جیولریز دے رہی ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے صرف اپنے بچے چاہئیں، اور کچھ نہیں چاہیے مجھے۔"

"شاہینہ، اس نے مجھے بچوں کی آوازیں بھی سنوائی تھیں۔" فیاض نے کہا۔ "وہ دونوں تمہیں پکار رہے تھے۔ ماما کہاں ہیں آپ۔ ماما۔ آپ آجائیں ماما۔"

"اوہ خدا۔" میں بلک بلک کر رونے لگی۔ "میرے بچوں کو لے آئیں فیاض۔ بیچ دیں سب کچھ۔"

"یہ تو سوچو کہ تم اگر اس گھر کو اور مجھے چھوڑ کر چلی گئیں تو پھر کیا ہوگا۔" فیاض نے کہا۔ "یہ بچے تو زندگی بھر تمہیں پکارتے ہی رہ جائیں گے۔ ماما کہاں ہیں آپ۔ ماما کہاں ہیں آپ۔"

"نہیں، نہیں۔ میں کہیں نہیں جارہی۔ کہیں نہیں جارہی۔" میں بہت بری طرح رو رہی تھی۔ "خدا کے لیے میرے بچوں کو واپس لے آؤ۔"

"بچے کہیں نہیں گئے ہیں۔" فیاض نے کہا۔ "اگر تم ان کے پاس ہو۔ ان کے ساتھ ہو تو وہ بھی تمہارے پاس ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"دونوں بچے اس وقت تمہارے مہربان ڈاکٹر جواد کے پاس ہیں۔" فیاض نے بتایا۔

"کیا؟ جواد سر کے پاس۔"

"ہاں۔ یہ لو آگئے بچے۔" فیاض نے باہر گاڑی رکنے کی آواز سن کر کہا۔

میں حیران اور پریشان دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر جواد دونوں بچوں کے ساتھ اندر آگئے۔

میں بری طرح روتی ہوئی دونوں بچوں سے لپٹ گئی تھی۔

ڈاکٹر جواد نے آگے بڑھ کے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ہاں... اب بتاؤ ڈاکٹر شاہینہ، اہمیت کس رشتے کی ہوتی ہے۔"

"پیار کے رشتے کی۔"

"ہاں۔ پیار کا وہ رشتہ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی شکلیں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ جذبہ تو وہی ہوتا ہے لیکن شادی سے پہلے اگر محبوب سب کچھ ہوتا ہے تو شادی کے بعد پیار کے اس جذبے کا رخ شوہر اور بچوں کی طرف ہوجاتا ہے۔ پھر پیچھے رہ جانے والے رشتے ماند پڑتے چلے جاتے ہیں۔ میری بات سمجھ رہی ہو نا۔"

"یس سر۔ اب میں بالکل سمجھ گئی ہوں۔"

"خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں فیاض جیسا سمجھدار اور ٹھنڈے مزاج کا شوہر دیا ہے۔" ڈاکٹر جواد نے کہا۔ "یہ پلاننگ ہم دونوں نے مل کر بنائی تھی کہ تمہیں شوہر اور بچوں کے پیار کا احساس دلایا جائے.... خدا کا شکر ہے کہ ہم اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے ہیں۔"

میں نے فیاض کی طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے اور میں ڈاکٹر جواد کا خیال کیے بغیر فیاض سے جا کر لپٹ گئی۔ اس وقت میں بری طرح رو رہی تھی۔

اب ہم بھرپور محبتوں کے ساتھ ایک ساتھ ہیں۔ شہریار صحت یاب ہوکر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے.... میں ہر نماز کے بعد اپنے شوہر اور بچوں کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتی ہوں۔

انتہا

قابلِ احترام مدیر محترم!

سلام مسنون!

میں نے اپنی سرگزشت لکھی ہے۔ اسے کہانی کا انداز بھی دیا ہے لیکن یہ بتادوں کہ اس سرگزشت کا میں صرف ایک کردار ہوں۔ یہ سرگزشت میری ماتحت غزالہ کی ہے۔ مجھے یہ روداد دلچسپ اور عجیب لگی تھی اس لیے میں نے لکھ ڈالی۔ شائع کرنا آپ کی مرضی۔

سجاد حسین
(سیالکوٹ)

وہ میرے دفتر میں اپائنٹ ہوئی تھی۔

اس نے ماسٹر کر رکھا تھا، بہت خوبصورت اور اسمارٹ سی۔ جس کو دیکھ کر یہ اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ وہ شادی شدہ بھی ہوگی۔

اس کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ بہت ذہین اور خوش مزاج تھی۔ اس کی باتیں بہت دل چسپ ہوا کرتیں۔ خوش لباس تو ایسی تھی کہ جو بھی لباس پہن لیتی اس کے جسم پر خوش نما معلوم ہوتا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے آنے کے بعد دفتر میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ ورنہ پورے دفتر پر قنوطیت کا ماحول طاری رہتا، کسی سرکاری دفتر کی طرح۔ جہاں سال خوردہ لوگ گدھوں کی طرح گردن جھکائے کام کیا کرتے ہیں۔ کوئی زندگی نہیں، کوئی چارم نہیں۔

لیکن غزالہ کی آمد نے پورا ماحول بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب ہر طرف سے ہنسنے بولنے کی آوازیں آیا کرتیں اور میں اپنے کیبن میں بیٹھا یہ سب سنتا رہتا۔

ہمارا کلیئرنگ فارورڈنگ کا کام تھا۔ یہ ایک خشک مزاج کام ہے۔ سامان کی ترسیل اور وصولی۔ اس قسم کے کاموں میں وقت کی رفتار بہت مدھم ہو کر رہ جاتی ہے۔

یہ میرا ہی دفتر ہے۔ میں نے ہی یہ کاروبار شروع کیا تھا اور اب مارکیٹ میں اچھی خاصی ساکھ قائم ہو چکی تھی۔ دفتر میں ایک ریسپشنسٹ کی جگہ تھی۔ میں نے اخبار میں اشتہار دے دیا تھا۔

اشتہار کے بعد کئی لوگ آئے لیکن میرے معیار پر نہیں اتر سکے تھے۔ پھر غزالہ بھی آ گئی اور اس کو دیکھ کر آنکھوں میں برق سی لہرا گئی۔

میں نے اس کا انٹرویو لیا۔ اس نے اپنی سی وی میں اپنا نام غزالہ اکرم لکھا تھا۔ میں نے دریافت کیا۔ ''یہ اکرم کیا تمہارے والد ہیں۔''

''نہیں سر۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''میرے شوہر ہیں۔''

اس وقت یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ تو ایک لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنی سی وی میں اپنی تعلیم تو لکھی تھی لیکن تجربہ کوئی نہیں تھا۔

اس کا جواب اس نے اس طرح دیا۔ ''سر، جب تک کہیں کام نہیں کروں گی، تجربہ کہاں سے آئے گا۔ اس کے علاوہ ریسپشنسٹ کے لیے تجربہ اتنا ضروری بھی تو نہیں ہے۔ بس اس کو بات کرنے کا سلیقہ آنا چاہیے اور میں سمجھتی ہوں کہ مجھ میں یہ سلیقہ ہے۔''

میں نے تو پہلی نظر میں اسے ڈن کر دیا تھا۔ لہٰذا دو چار باتوں کے بعد اسے اپائنٹ کر لیا۔ اور سچ یہ ہے کہ اس کی آمد دفتر کے لیے بہت خوشگوار ثابت ہوئی تھی۔

وہ بہت محنتی ثابت ہوئی۔ اس نے دفتر کے اور بھی ایک دو کام سنبھال لیے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ میں اس سے ذہنی طور پر بہت قریب ہوتا جا رہا ہوں۔

جس دن وہ دفتر نہیں آتی، اس دن ایک کمی سی احساس ہونے لگتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئی تھی۔ اکثر ہم لنچ ایک ساتھ کیا کرتے۔

مجھے اس کی پروا نہیں تھی کہ میرا اسٹاف اپنے دل میں کیا سوچتا ہوگا۔ بس مجھے اس کے پاس بیٹھ کر یا اس سے باتیں کر کے ایک طرح کی خوشی محسوس ہوا کرتی اور میں اس خوشی کو انجوائے کرنا چاہتا تھا۔

اس نے اپنے شوہر کے بارے میں بتایا کہ پچھلے دو برسوں سے وہ بے روزگار ہے اور ابھی تک کوئی اولاد نہیں ہوئی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسے ملازمت کا مشورہ اس کے شوہر ہی نے دیا تھا۔

ایک دن اس نے بتایا۔ ''سر، کل شام ہم اپنی شادی کی چھٹی سال گرہ منا رہے ہیں۔''

''بہت مبارک ہو۔''

''اس طرح نہیں سر! آپ کو بھی آنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''میں اپنے شوہر سے آپ کو ملوانا چاہتی ہوں۔''

''چلو، آ جاؤں گا میں۔''

اس نے مجھے اپنا ایڈریس سمجھاتے ہوئے ایک دفعہ پھر تاکید کی۔ ''سر، دیکھیں، آپ کو ضرور آنا ہے۔''

میں دوسری شام کو ایک تحفہ لے کر اس کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ ایک چھوٹا سا گھر۔ لیکن خوبصورتی اور سلیقے سے سجا ہوا۔

اس نے مجھے ڈرائنگ روم میں لے جا کر بٹھا دیا تھا۔ ڈرائنگ روم بھی بہت اچھا تھا۔ جس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کی مالی حالت اچھی ہی رہی ہوگی۔

''آپ بیٹھیں سر، میں اکرم کو بلا کر لاتی ہوں۔''

دس منٹ کے بعد اس کا شوہر کمرے میں داخل ہوا اور اسے دیکھ کر میں لرز کر رہ گیا تھا۔ اس کا پورا چہرہ جھلسا ہوا تھا بہت بری طرح۔ یوں سمجھ لیں کہ اس کا چہرہ اچھا خاصا بھیانک ہو رہا تھا۔ اس چہرے پر دو چمکتی ہوئی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''سر، یہ ہیں میرے ہسبنڈ، اکرم اور اکرم یہ ہیں میرے باس سجاد حسین۔''

اکرم نے بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ ہم بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ باتوں کے درمیان اندازہ ہوا کہ وہ ایک پڑھا لکھا انسان ہے۔ حالات پر اس کی گہری نگاہ ہے۔ وہ سیاست اور معاشرت پر گفتگو کرنا جانتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی محسوس ہوئی۔ اور وہ یہ کہ غزالہ کے ساتھ اس کا رویّہ بہت خراب تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر غرانے لگتا... یا اسے جھڑک کر رکھ دیتا۔

جب وہ میرے سامنے اس قسم کی حرکتیں کر رہا تھا تو تنہائی میں نہ جانے کیا کرتا ہوگا۔ اس کے برعکس غزالہ کا رویّہ، وہ اس بھیانک انسان پر جیسے قربان ہوئی جا رہی ہو۔ ڈیئر، ڈارلنگ اور نہ جانے کیا کیا۔ اکرم کے غرانے اور جھڑکنے کے باوجود اس کی پیشانی پر بل نہیں آتا تھا۔ وہ یا تو ہنس کر ٹال دیتی، یا پھر خاموش ہو جاتی۔

سال گرہ کی اس تقریب میں صرف میں ہی شامل تھا۔ کیک بھی کاٹا گیا۔ اچھا سا ناشتا بھی ہوا پھر میں بہت کبیدہ خاطر سا ہو کر ان سے اجازت لے کر واپس آ گیا۔

اس رات مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں غزالہ اور اس کے شوہر کے بارے میں سوچتا ہی رہا تھا۔ کہاں غزالہ جیسی خوبصورت عورت اور کہاں اس کا شوہر۔

اگر وہ صرف بدصورت ہی ہوتا تو پھر بھی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ تو غزالہ کے ساتھ بہت بے رحم بھی تھا۔ بہت برا رویّہ تھا اس کا۔ نہ جانے غزالہ جیسی عورت ایسے آدمی کے ساتھ کس طرح گزارہ کر رہی تھی۔

اور غزالہ نہ صرف یوں ہی گزارہ کر رہی تھی بلکہ اس کے ناز بھی اٹھا رہی تھی۔ اس کی ہر جھڑکی کو برداشت کر رہی تھی۔ آخر کیوں؟

غزالہ جب دوسری صبح دفتر آئی تو کچھ دیر بعد وہ میرے پاس آ گئی۔ ''سر، میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ آپ کو ہمارے حالات دیکھ کر بہت حیرت ہوئی ہے۔''

''ہاں غزالہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''کچھ عجب سا محسوس ہوا۔ تمہارے شوہر کا رویّہ تو تمہارے ساتھ بہت خراب ہے۔ معاف کرنا یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن جو مجھے محسوس ہوا وہ ایسا ہی ہے۔''

''آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا ہے۔'' غزالہ نے کہا۔ ''آپ کو اس بات پر بھی حیرانی ہو رہی ہوگی کہ اکرم ایک بدنما انسان ہیں۔ اور میں...''

''ہاں۔'' میں نے گردن ہلا دی۔ ''لیکن میں یہ بات کہنا نہیں چاہتا تھا۔''

''اب میں آپ کو کچھ دکھانا چاہتی ہوں۔'' اس نے اپنے بیگ سے کچھ تصویریں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ ''ذرا ان تصویروں کو دیکھیں۔''

''کس کی تصویریں ہیں۔''

''میری اور میرے شوہر کی تصویریں ہیں۔'' اس نے بتایا۔

میں نے وہ تصویریں دیکھیں اور دنگ ہو گیا۔ اکرم تو بہت خوبصورت انسان تھا۔ غزالہ سے کہیں زیادہ خوبصورت۔ کیا مردانہ وجاہت تھی اس کے چہرے پر۔

کئی تصویریں تھیں۔ مختلف مواقع کی۔ سمندر کنارے، ہوٹل میں، ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہوئے۔ ہر تصویر میں دونوں بہت خوش دکھائی دیتے تھے۔

یہ درست ہے کہ وہ ایک مکمل جوڑا تھا۔ اکرم بھی اتنا ہی خوبصورت تھا۔ جتنا خود غزالہ، بلکہ وہ غزالہ سے زیادہ ہینڈسم تھا۔

''میرے خدا!'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تو اکرم ایسے ہوتے تھے۔''

''ہاں، ایسے ہی تھے۔ مجھ سے زیادہ حسین۔''

''تو پھر کیا ہوا تھا ان کے ساتھ۔ ان کا چہرہ ایسا کیوں ہو گیا؟''

''تیزاب۔'' وہ دھیرے سے بولی۔ ''ان کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا گیا تھا۔''

''خدایا! کس ظالم نے ایسا کیا تھا؟''

''یہ ایک لمبی کہانی ہے سر۔'' غزالہ نے کہا۔ ''کبھی فرصت ملی تو ضرور سناؤں گی۔''

''ضرور سناؤ۔ تم نے تو بے چین کر کے رکھ دیا ہے۔''

غزالہ کی کہانی پندرہ بیس دنوں کے بعد سننے کو ملی تھی۔ اس دن دفتر میں کام بہت کم تھا۔ میں نے غزالہ کو اپنے پاس ہی بلا لیا تھا۔ غزالہ مجھے آہستہ آہستہ اپنی داستان سناتی رہی تھی۔

☆☆☆

ابو نے صرف یہ بتایا تھا کہ اکرم ان کے کسی دوست کا بیٹا ہے اور وہ پنجاب کے شہر گجرات سے آ رہا ہے۔ اس نے گجرات یونیورسٹی سے ماسٹر کر رکھا ہے۔

میں مسکرا کر رہ گئی۔ کیا گجرات، اور کیا وہاں کی یونیورسٹی، رہنے والا بھی گجرات کا۔ بے چارہ پینڈو ہی ہوگا، جبکہ میرا حال یہ تھا کہ میں کالج کی کوئن بھی جانی جاتی تھی۔

کہنا تو نہیں چاہیے لیکن مجھے اپنے آپ پر فخر تھا۔ خدا

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے بہت کچھ دے رکھا تھا مجھے۔ ذہانت، حسن، خوش لباسی، خوش گفتاری، عام طور پر یہ سب ایک ساتھ نہیں ہوا کرتیں لیکن خدا نے مجھ پر خاص عنایت کی تھی۔

ان ہی باتوں نے مجھ میں ایک غرور سا پیدا کر دیا تھا۔ میرے خواب بہت شاندار اور دل کش ہوا کرتے۔ مجھے اپنی ورتھ کا اندازہ تھا۔ میں جانتی تھی کہ میرے لیے اگر رشتہ آیا تو بہت اچھا آئے گا۔ میرے مزاج اور میرے معیار کے مطابق۔ اسی لیے جب میں نے یہ سنا کہ ابو میرا رشتہ اپنے کسی دوست کے بیٹے سے کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں تو میں بھنا کر رہ گئی۔ کیسا ہوگا وہ! کہاں سے آرہا ہے۔ گجرات سے؟ اور اس کا نام بھی کیسا دقیانوسی ہے۔ اکرم، آج کے دور میں ایسے نام کون رکھتا ہے؟

میں نے امی کے ذریعے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ ’’نہیں امی، مجھے ایسے کسی پینڈو سے شادی نہیں کرنی۔ خود سوچیں، اکرم نام ہے اس کا۔ گجرات سے اس نے تعلیم حاصل کی ہے۔‘‘

’’تم تو پاگل ہوگئی ہو۔ ان علاقوں میں تعلیم کا بہت اچھا معیار ہے۔ اس کے باپ اور تمہارے ابو برسوں کے دوست ہیں۔‘‘

’’تو برسوں کی دوستی کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ بیٹی کو قربان کر دیا جائے۔‘‘

’’کیسی الٹی بات کر رہی ہو۔ ہم کیا تمہارے دشمن ہیں۔‘‘

’’میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ لوگ میرے دشمن ہیں۔ لیکن کم از کم میرے معیار اور مزاج کا تو خیال رکھیں۔‘‘

’’اچھا چلو، تم کم از کم ایک بار اسے دیکھ لو۔‘‘ اماں نے کہا۔ ’’اس کے بعد پھر جو تمہاری مرضی ہو۔‘‘

اکرم کو دوسرے دن گھر بلا لیا گیا تھا۔ اور جب میں نے اسے دیکھا تو بس دیکھتی رہ گئی۔ میں تو اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔ کیا خوبصورت اور اسمارٹ آدمی تھا۔

میں نے اس سے کچھ باتیں بھی کیں اور یہ پتا چل گیا کہ وہ ہر لحاظ سے مجھ سے بہتر ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے اس کو دیکھنے اور اس سے ملنے کے بعد ہاں کر دی تھی۔

شادی ہوگئی۔ اسی دوران اکرم کو ایک بڑی کمپنی میں بہت اچھی جاب بھی مل چکی تھی۔ یعنی اس کی ترقی کا سفر شروع ہوگیا تھا۔

زندگی بہت اچھی گزر رہی تھی۔ اکرم بہت محبت کرنے والا شوہر ثابت ہو رہا تھا۔ میں اس وقت یہ سوچا کرتی کہ اگر میں اس کو حاصل نہ کر پاتی تو کتنے بڑے نقصان میں رہتی۔

لیکن اچھے دن ہمیشہ قائم نہیں رہتے۔ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہو جاتا ہے کہ سب برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

ایک دن میں نے اکرم کو کسی لڑکی کے ساتھ ایک ہوٹل سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا۔ میں اتفاق سے اس وقت اسی طرف سے گزر رہی تھی۔

جب کسی کا بھید کھلنے والا ہوتا ہے تو اسی طرح کوئی بہانہ پیدا ہو جاتا ہے۔

بہانہ یہ بنا کہ ٹھیک اسی ہوٹل کے سامنے رکشے کا ٹائر خراب ہوگیا تھا۔ رکشے والا ٹائر ٹھیک کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اور یہ دونوں ہنستے ہوئے ہوٹل سے باہر نکل رہے تھے۔

میں سکتے میں رہ گئی تھی۔ شوہر کو دیکھ کر اور اس لڑکی کو دیکھ کر بھی جو اکرم کے ساتھ تھی۔ وہ لڑکی میری ہی سہیلی رافعہ تھی۔

ایک بار ہمارے گھر میں ایک چھوٹی سی تقریب ہوئی تھی۔ میں نے اس تقریب میں رافعہ کو بھی مدعو کیا تھا اور اکرم سے اس کا تعارف کروا دیا تھا۔

میں کیا جانتی تھی کہ اس طرح میں خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہی ہوں۔ نہ جانے کس طرح دونوں ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے اور اتنے قریب کہ ہوٹنگ بھی ہونے لگی تھی۔

میں ان کے سامنے نہیں آئی۔ ایک طرف رکشے کی آڑ میں ہوگئی۔ اس زمانے میں فرم کی طرف سے اکرم کو گاڑی بھی مل چکی تھی۔ دونوں اسی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے اور میں اپنا خون جلاتی رہ گئی۔

میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اس حرکت پر خاموش تو نہیں رہوں گی۔ نہ جانے کتنے گھر اس خاموشی میں برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اکرم سے بات کرنے سے پہلے میں اپنی دوست یا اپنی دشمن رافعہ سے بات کر کے اسے احساس دلانا چاہتی تھی کہ مجھے اس کی حرکتیں معلوم ہیں۔

میں نے اکرم سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی بلکہ ایک شام رافعہ کے گھر پہنچ گئی۔ مجھے دیکھ کر اس کا رنگ اتر گیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے دل میں چور تھا۔ پھر وہ اپنے آپ کو سنبھال کر بولی۔ ’’ارے غزالہ، تم۔ اور اس طرح اچانک، کم از کم فون ہی کر دیا ہوتا۔‘‘

’’پہلے بھی تو تمہارے پاس فون کے بغیر آتی رہی ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’ہاں، ہاں۔ کیوں نہیں، تمہارا گھر ہے، آؤ۔‘‘

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے آئی۔ جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ شاید اسے کسی طرح یہ احساس ہوگیا تھا کہ میں کڑے تیوروں کے ساتھ اس کے پاس آئی ہوں۔

پھر اس نے بات شروع کی۔ ’’کیا بات ہے غزالہ، آج تم کچھ اکھڑی اکھڑی لگ رہی ہو۔‘‘

’’تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہیں مبارکباد دوں۔‘‘ میں پھٹ پڑی۔ ’’یا تمہیں گلے سے لگاؤں یا تمہاری خدمت میں نذرانے پیش کروں۔‘‘

’’ارے، تم اتنی ناراض کیوں ہو رہی ہو۔‘‘ اس نے پوچھا۔

’’اکرم کے ساتھ تمہارے کیسے تعلقات ہیں۔ کیسی دوستی ہے میرے شوہر سے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ مت سمجھنا کہ تم مجھ سے کچھ چھپا سکوگی۔‘‘

’’نہیں غزالہ۔‘‘ وہ دھیرے سے بولی۔ ’’مجھے تم سے کچھ نہیں چھپانا۔‘‘

’’تو پھر کیا بات ہے۔‘‘

’’سچ سننے کی ہمت ہے تم میں۔‘‘

’’ہاں ہاں، میں تمہارے پاس سچ ہی سننے آئی ہوں۔‘‘

’’تو پھر سچ یہ ہے کہ اکرم ہم تینوں کو بہت اچھا لگتا ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔

’’ہم تینوں کو۔‘‘ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ’’کون ہم تینوں۔‘‘

’’میں، صائمہ اور عالیہ۔‘‘

میں سر تھام کر بیٹھ گئی۔ ’’کیا بکواس کر رہی ہو۔‘‘

’’ہاں غزالہ! یہ انسان کی فطرت ہے۔ چاہے وہ عورت ہو یا مرد۔ اسے اچھی صورتیں اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

پھر اس نے جو کچھ بتایا اس نے میری آنکھیں کھول دیں۔

میں نے ہی اکرم کو ان تینوں سے ملانے کی غلطی کی تھی۔ یہ تینوں ہی میری دوست تھیں۔ اسی دن پتا چلا کہ اپنے شوہر کو کبھی اپنی دوستوں یا کسی غیر لڑکی سے نہیں ملوانا چاہیے اور خاص طور پر اکرم جیسے شوہر کو۔ اس نے بتایا کہ اکرم کے لیے وہ تینوں ہی پاگل ہو رہی تھیں۔ تینوں ہی اسے پسند کرنے لگی تھیں۔ انہیں اتنے خوبصورت آدمی کی دوستی بہت اچھی لگتی تھی۔

وہ اس بات پر خوش ہوتی تھیں کہ اکرم ان کے ساتھ ہوٹلز جاتا ہے۔ ساحل کی سیر کرتا ہے۔ خوبصورت باتیں کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس سلسلے میں تینوں نے ایک طرح کا معاہدہ سا کر رکھا تھا کہ تینوں یہ راز غزالہ سے (یعنی مجھ سے) چھپا کر رکھیں گی اور اپنے اپنے حصے کی خوشیاں حاصل کرتی جائیں گی۔

’’کیا تم تینوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ کسی کا شوہر ہے۔‘‘ میں نے غصے سے پوچھا۔

سسپنس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی
سول ایجنٹ برائے یو۔اے۔ای
WELCOME BOOK SHOP
ویلکم بک شاپ
پی او بکس: 27869 کرامہ، دبئی
فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015
موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae

معیاری کتابوں کا اعلیٰ مرکز
WELCOME BOOK PORT
ویلکم بک پورٹ
ریٹیل، ہول سیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر
مین اردو بازار۔ کراچی
فون: 32633151, 32639581 (92-21) فیکس: 32638086 (92-21)
ای میل: welbooks@hotmail.com
ویب سائٹ: www.welbooks.com

"ہم تینوں اس موضوع پر بہت بحث کر چکے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "لیکن تینوں ہی اپنے دل سے مجبور ہیں۔ ہم اس کے لیے پاگل ہو کر رہ گئے ہیں۔ ہم تینوں ہی تمہارے سامنے شرمندہ ہیں۔ لیکن ہم بے بس ہیں۔"

"اور اگر وہ تم سے ملنا چھوڑ دے تو۔"

"ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔" اس نے کہا۔ "ہم نے اسے اپنا سب کچھ سمجھ لیا ہے۔"

"تم تینوں کمینی اور ذلیل ہو۔"

"غزالہ تم اس بات پر ہمیں مار بھی سکتی ہو۔ کیونکہ ہم تمہارے مجرم ہیں۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ "لیکن تم ہماری مجبوری بھی تو دیکھو۔"

"مت بکواس کرو۔ مجبوری۔" میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ "اب میری دوستی تم تینوں سے ختم ہو چکی۔ جہنم میں جاؤ تم تینوں۔"

"غزالہ ایک بات یاد رکھو۔ اگر اکرم ہم سے نہیں ملا، یا تم نے اس کو ہم سے دور لے جانے کی کوشش کی تو یہ اچھا نہیں ہوگا۔"

میں تو پاگل ہو کر رہ گئی۔ یہ کیسی دیدہ دلیری تھی۔ کوئی عورت اپنی دوست کے شوہر پر اپنا حق جتا رہی تھی اور وہ بھی ایک ساتھ تین تین عورتیں۔

ایسی داستان تو کم ہی سنی گئی ہوگی۔

میں لعنت ملامت کرتی ہوئی اس کے گھر سے واپس آ گئی۔ میں نے اکرم کو پھر بھی کچھ نہیں بتایا۔ ویسے میں جانتی تھی کہ رافعہ نے اسے ضرور بتا دیا ہوگا۔

چونکہ اس موضوع پر اکرم نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ اس لیے میں بھی خاموش رہی۔ البتہ اس کے رویے کا جائزہ لیتی رہی۔

وہ کچھ بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ میں نے ایک کام یہ کیا کہ ہر وقت اس کو اپنے ساتھ بزی رکھنے لگی۔ دفتری اوقات کے بعد میں کسی بہانے اس کے دفتر پہنچ جاتی اور اسے لے کر سیر کو نکل جاتی۔

بہانہ یہ بنایا تھا کہ آج کل میرا دل بہت گھبرایا گھبرایا سا رہنے لگا ہے۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اکرم دفتر کے بعد کہیں آیا جایا کرے۔

وہ جھنجلا کر رہ جاتا۔ اس کی کیفیت ایسے پرندے کی ہوتی، جس کو زبردستی پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ پھر وہ حادثہ ہو گیا جو آپ دیکھ چکے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھا۔ کس حادثے کی بات کر رہی ہو۔"

"اس کے چہرے پر تیزاب پھینکنے کا حادثہ۔" میں نے بتایا۔ "ایک شام جب وہ دفتر سے واپس آ رہا تھا۔ ایک سگنل پر ذرا سی دیر کے لیے گاڑی رکی اور کوئی اس کے چہرے پر تیزاب پھینک کر فرار ہو گیا۔"

"اوہ! تو یہ ہوا ہے اس کے ساتھ۔"

"جی ہاں۔" غزالہ دھیرے سے بولی۔ "اس کا چہرہ بالکل جھلس گیا۔ علاج کے باوجود ٹھیک نہیں ہو سکا۔ ہم نے پلاسٹک سرجری وغیرہ کا بھی سوچا لیکن چالیس پچاس لاکھ کہاں سے آتے۔ اسی لیے خاموش ہو کر رہ گئے۔ اور اب کل کا ایک خوبصورت آدمی بدصورتی کی مثال بنا ہوا زندہ ہے۔ اس کی نوکری بھی چلی گئی۔ اس نے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا۔ اسی لیے گھر چلانے کے لیے میں جاب کر رہی ہوں۔"

"کیا اس آدمی کا پتا نہیں چلا جس نے تیزاب پھینکا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"پتا کیا چلنا تھا۔ وہ کرائے کا آدمی تھا اور اس سے یہ کام میں نے لیا تھا۔"

"کیا؟" میں جیسے سکتے میں رہ گیا تھا۔ "تم نے... تم نے ایسا کروایا تھا۔"

"ہاں۔ اپنے سہاگ کو بچانے کے لیے ایسا کرنا پڑا تھا مجھے۔" اس نے کہا۔ "ساری خرابی اس کے چہرے ہی میں تو تھی۔ لڑکیاں اس کے چہرے ہی پر تو مرتی تھیں۔ اسی لیے میں نے وہ وجہ بھی ختم کروا دی۔ اس طرح وہ اب میرا ہے، صرف میرا۔ میرے علاوہ کوئی اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہے۔ اسی لیے میں اس کے ناز اٹھاتی ہوں۔ اس کی جھڑکیاں برداشت کرتی ہوں۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ چاہے کوئی بھی آ جائے۔"

غزالہ نے اپنی کہانی ختم کر دی۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ یہ محبت کا کیسا عجب پہلو تھا۔ لوگ اس قسم کی حرکتیں نفرت میں کرتے ہیں لیکن غزالہ نے محبت میں کیا تھا۔

سچ ہے کہ انسان کو سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ داستان مجھے آج تک یاد ہے۔ کئی برس گزر چکے ہیں، لیکن ایک خوبصورت عورت اور ایک بدنما چہرہ آج تک میرے تصور میں ہے۔

عشق عشق ہے

محترم عذرا رسول
السلام علیکم!
میں اپنے شوہر کی سرگزشت بھیج رہی ہوں۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گی کیونکہ میرے شوہر نے قربانی کی بے مثال روایت قائم کی ہے۔

منزہ
(لاہور)

اس کہانی کا انجام ابھی کچھ ایسا زیادہ پرانا نہیں ہوا لیکن میں انجام سے آغاز کی طرف چلوں تو ممکن ہے پڑھنے والوں کو سمجھنے میں دشواری پیش آئے۔ اس لیے میں اسے ابتدا سے ہی شروع کروں گی۔ اگرچہ مجھے تمام واقعات کا علم بہت بعد میں یعنی تقریباً اس وقت ہوا جب خود میری زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہونے والا تھا۔ میرے تعارف کے لیے سردست اتنا ہی کافی ہے کہ میرا نام منزہ ہے۔ ایک متوسط طبقے کے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ خدا کے فضل و کرم سے میرے

والدین، بہن بھائی سب ہی ہیں لیکن چونکہ ان کا اس کہانی سے کوئی براہِ راست تعلق نہیں اس لیے ان کے بارے میں کچھ کہنا نہ کہنا برابر ہے البتہ میرا بالواسطہ تعلق اس کہانی سے اس وقت ہوا جب میرے والدین نے میری شادی میرے چچازاد کزن شجاعت سے کرنے کا ارادہ کیا۔ شجاعت پولیس میں انسپکٹر تھے اور چند ماہ پہلے ہمارے شہر میں ٹرانسفر ہوکر آئے تھے۔ شروع میں آٹھ دس دن ہمارے گھر قیام کیا مگر پھر ایک کرائے کے مکان میں منتقل ہوگئے۔ انہیں روکنے کی بہت کوشش کی گئی مگر ان کا کہنا تھا کہ پولیس میں سروس کی وجہ سے وہ اپنی آمد و رفت میں کوئی باقاعدگی نہیں رکھ سکتے اور اس وجہ سے گھر والوں کو کوئی زحمت دینا نہیں چاہتے۔

شادی کا مسئلہ بزرگوں کے ذہنوں میں پہلے سے موجود تھا جس کا گاہے گاہے گھر میں تذکرہ بھی ہوتا رہتا تھا مگر شجاعت کے بارے میں ادھر کافی دنوں سے یہ سننے میں آرہا تھا کہ انہوں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جب بزرگوں نے ان سے میرے بارے میں رائے پوچھی تب بھی ان کا جواب یہی تھا کہ مسئلہ منزہ کو پسند کرنے یا نہ کرنے کا نہیں ہے، وہ شادی ہی کرنا نہیں چاہتے۔ جب ان سے اس کی وجہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تب بڑے اصرار کے بعد انہوں نے بتایا کہ ان دنوں امن و امان کی صورتِ حال بہت خراب ہے، چوروں اور ڈاکوؤں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں آئے دن پولیس اور ڈاکوؤں یا تخریب کاروں کے درمیان مقابلے ہوتے رہتے ہیں جن میں پولیس والے بھی مارے جاتے ہیں۔ وہ اپنے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتے کہ کس ڈاکو کی گولی پر ان کا نام لکھا ہے اس لیے ایک گھر کے بجائے دو گھروں کو ماتم کدہ بنانے سے بہتر ہے کہ حالات کے پُرامن ہونے کا انتظار کیا جائے۔

ظاہر ہے کہ ان کا یہ جواب منطقی اعتبار سے کتنا ہی درست کیوں نہ ہو عام طور پر ذہنوں کو مطمئن کرنے والا نہیں تھا۔ خاص طور پر میری کیفیت تو بالکل ہی مختلف تھی، جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنا نام ان کے نام سے وابستہ سنتی چلی آرہی تھی اور شاید اسی وجہ سے وہ میری تمام سوچوں کا مرکز و محور تھے۔ میں انہیں صرف پسند ہی نہیں کرتی تھی بلکہ دل و جان سے چاہتی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کے یہ خیالات سن کر مجھے دکھ ہوا تھا اور یہ دکھ اس وقت تک برقرار رہا جب تک میں نے خود ان کی زبان سے ان کی داستانِ حیات کا وہ ورق نہیں سن لیا۔ تو اب ان سطور کے بعد میں اپنے پڑھنے والوں کو اس آپ بیتی کے آغاز کی طرف لیے چلتی ہوں۔

☆☆☆

وہ ان دنوں کی بات ہے جب شجاعت بی اے فائنل میں پڑھ رہے تھے۔ ایک دوپہر کو جب وہ کالج سے واپس آرہے تھے انہوں نے ایک سنسان گلی میں دو تین آوارہ لڑکوں کو ایک شریف برقع پوش لڑکی کو چھیڑتے اور پریشان کرتے دیکھا۔ وہ غنڈے ان کی ایک ڈانٹ سنتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ لڑکی نے بتایا کہ اس کا نام غزالہ ہے، وہ سیکنڈ ائیر کی طالبہ ہے۔ عام طور پر وہ اپنی کسی نہ کسی سہیلی یا دوسری لڑکیوں کے ساتھ گھر واپس جاتی تھی۔ آج اتفاق سے اکیلی تھی تو ان غنڈوں نے کالج سے پیچھا کیا اور اس گلی کو سنسان دیکھ کر اسے ستانے لگے۔ غزالہ کافی سہمی ہوئی اور خوفزدہ تھی۔ شجاعت نے اسے گھر تک چھوڑنے کی پیشکش کی جو اس نے شکریہ کے ساتھ مان لی۔

گھر پہنچ کر شجاعت نے دروازے سے رخصت ہونا چاہا مگر غزالہ اصرار کر کے انہیں گھر میں لے گئی۔ اپنی ماں سے تعارف کروایا۔ حالات بتائے۔ غزالہ کی ماں کچھ بیمار تھیں، یہ سن کر رونے لگیں۔ شجاعت کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ شجاعت نے رونے کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ غزالہ کا ایک جوان بھائی تھا جس کے ساتھ وہ کالج آتی جاتی تھی مگر وہ بھائی پچھلے مہینے موٹر سائیکل کے ایکسیڈنٹ میں انتقال کر گیا۔ ظاہر ہے کہ اکلوتے جوان بیٹے کی موت ماں باپ کے لیے بہت بڑا حادثہ ہے۔ انہیں رونا اسی بات پر آیا تھا کہ اگر آج وہ زندہ ہوتا تو کسی غنڈے کی مجال نہ تھی کہ اس کی بہن کا راستہ روکتا۔ شجاعت نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ وہ انہیں اپنے بیٹے کی جگہ ہی تصور کریں۔

اس دن کے بعد سے شجاعت کی آمد و رفت غزالہ کے گھر میں رفتہ رفتہ بڑھتی گئی مگر عجیب اتفاق تھا کہ غزالہ کے والد سے کبھی ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ تعمیراتی ٹھیکیدار ہیں اور جب سے جوان بیٹے کا انتقال ہوا ہے وہ نہ صرف اپنے کام سے بیزار ہوگئے ہیں بلکہ کبھی کبھی شراب پی کر بھی گھر آنے لگے ہیں۔ یہ آنا جانا اپنا فطری اثر کیے بغیر نہیں رہا۔ غزالہ اور شجاعت ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔

بی اے کرنے کے بعد شجاعت نے پولیس فورس جوائن کرنے کا فیصلہ کیا اور انہیں پولیس ٹریننگ کے لیے منتخب بھی کرلیا گیا۔ ٹریننگ کی مدت کے دوران غزالہ اور شجاعت کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ برقرار رہا اور اسی

رابطے کی وجہ سے انہیں ایک دن معلوم ہوا کہ غزالہ کی ماں بھی بیٹے کے غم میں سدھار گئیں پھر دو تین خطوط سے معلوم ہوا کہ کوئی ابرار نامی نوجوان اس کے باپ کے ساتھ بہت رہنے لگا ہے۔ باپ کی شراب نوشی، ماں کے انتقال کے بعد سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ٹھیکے داری کا کام بالکل تباہ ہوگیا اور اب گھر کا خرچ قرض کے سہارے چل رہا ہے۔

شجاعت جواب میں یہی لکھتے کہ غزالہ حوصلہ نہ ہارے۔ ان کی ٹریننگ مکمل ہونے والی ہے۔ امید ہے کہ وہ کامیاب بھی ہوجائیں گے اور پھر جیسے ہی انہیں ملازمت ملی وہ اپنے والدین کو غزالہ کے والد کے پاس رشتے کے لیے بھیجیں گے جس کے بعد خدا نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ غزالہ کے جو خط آتے تھے ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بہت بے چینی سے شجاعت کی واپسی کی منتظر ہے۔

پھر اچانک غزالہ کے خط آنا بند ہوگئے۔ شجاعت نے پے در پے کئی خط لکھے مگر غزالہ نے کسی کا بھی جواب نہیں دیا یہاں تک کہ شجاعت اپنی ٹریننگ مکمل کر کے گھر واپس آگئے اور انہیں سرِدست اسی شہر میں سب انسپکٹر کی پوسٹ مل گئی۔

☆☆☆

شجاعت پہلی فرصت میں غزالہ سے ملنے گئے۔ غزالہ گھر میں بالکل اکیلی تھی۔

"اب تمہارے ابو کی طبیعت کیسی ہے؟" شجاعت نے پوچھا۔

"وہ بہت بیمار ہیں۔ کثرت سے شراب نوشی نے ان کے جگر اور گردوں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔" غزالہ نے جواب دیا۔ "ابرار صاحب نے انہیں اسپتال میں داخل کروادیا ہے۔"

"یہ وہی ابرار صاحب ہیں جن کا تم نے خط میں ذکر کیا تھا؟"

"ہاں۔" غزالہ نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا تم نے خط لکھنا کیوں بند کردیے تھے یہاں تک کہ میرے خطوط کا جواب بھی نہیں دیا۔"

"اس لیے کہ میرے خیال میں اب کسی خط و کتابت کی ضرورت باقی نہیں رہی۔" غزالہ نے لہجہ کو خشک بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔

"یہ کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کررہی ہو؟" شجاعت نے حیرت سے پوچھا۔ "ہمارے درمیان......"

"ہمارے درمیان جو کچھ بھی طے ہوا تھا۔" غزالہ نے بات کاٹی۔ "اب آپ اسے بھول جائیں۔"

"مگر کیوں، کیا اب تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی۔"

"سوال محبت کا نہیں، حالات اور ضرورت کا ہے۔"

"کیسے حالات، کیسی ضرورت؟"

"آپ صاف ہی سننا چاہتے ہیں تو سنیے، ابو نے میری شادی کسی اور کے ساتھ طے کردی ہے۔" غزالہ نے بظاہر سخت لہجے میں جواب دیا۔ "وہ بیمار ہیں قریب المرگ ہیں۔ میں ان کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتی۔ آپ نے ہم پر بہت احسان کیے ہیں، ایک احسان اور کریں کہ وہ تمام باتیں، وہ تمام عہد و پیمان بھلادیں جو کبھی ہمارے درمیان ہوئے تھے اور اب آئندہ کبھی یہاں آنے کی بھی زحمت نہ کریں۔ میں گھر میں اکیلی ہوتی ہوں اور دنیا کو رائی کا پہاڑ بناتے دیر نہیں لگتی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ کی وجہ سے میری یا میری وجہ سے آپ کی عزت پر کوئی حرف آئے۔"

"تم مجھ سے ضرور کچھ چھپا رہی ہو غزالہ؟" شجاعت نے کہا۔

"بالکل نہیں بلکہ جو کچھ حقیقت تھی من و عن بیان کردی ہے بہتر ہوگا کہ اب آپ تشریف لے جائیں۔"

"کیا یہ بھی نہیں بتاؤ گی کہ تمہاری شادی کس کے ساتھ ہورہی ہے؟"

"جی نہیں، یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے اور آپ اب کسی تعلق کے حوالے سے مجھ سے ایسے ذاتی سوال نہیں کرسکتے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" شجاعت نے افسردگی سے جواب دیا۔ "لیکن میری ایک بات یاد رکھنا زندگی میں جب کبھی اور کسی بھی موڑ پر تمہیں میری ضرورت محسوس ہو مجھے یاد کرلینا۔ میں جس حال میں ہوں گا سر کے بل آجاؤں گا۔"

"اس مہربانی کا شکریہ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے، خدا حافظ۔" غزالہ نے کہا اور گھر میں قدم رکھ کر دروازہ بند کردیا۔

یہ ساری باتیں اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے کی تھیں شجاعت کو گھر میں آنے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

قدرتی بات تھی کہ شجاعت کو غزالہ کے اس طرزِ عمل سے بہت افسوس ہوا تھا مگر یہ ان کی محبت کا خلوص تھا کہ وہ اب بھی غزالہ کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوئی ہے جس کی وجہ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

غزالہ کو اپنی مرضی کے خلاف ان سے قطع تعلق کا فیصلہ کرنا پڑا ہے مگر ظاہر ہے کہ جب تک وہ خود ہی ان سے تعاون اور مدد کی خواہش کا اظہار نہ کرتی وہ اس کے معاملات میں کس طرح دخل دے سکتے تھے لیکن اپنے طور پر انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جو جگہ ان کے دل میں غزالہ کے لیے تھی اور اب بھی ہے، وہ کسی دوسری لڑکی کو وہ مقام ..... نہیں دیں گے۔ اسی وجہ سے وہ شادی سے مسلسل انکار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تین سال سے زیادہ مدت بیت گئی۔ انہیں انسپکٹر کے عہدے سے ترقی مل گئی اور اسی کے ساتھ ان کا تبادلہ بھی ہمارے شہر میں ہوگیا۔

اس تبادلے کی وجہ سے دونوں گھرانوں میں ایک بار پھر شادی کا چرچا ہوا جس سے غالباً تنگ آکر شجاعت نے امن اور بدامنی کے جواز کی آڑ لینا چاہی اور ان کا انکار اس نکتے پر آکر ٹھہر گیا کہ جب امن وامان کی صورت بہتر ہوجائے گی تو اس مسئلے پر ضرور غور کریں گے۔

ان ہی دنوں اتفاق سے ایک سہ پہر کو شجاعت اپنی پولیس جیپ میں کسی کام سے کہیں جارہے تھے کہ تقریباً سو گز آگے انہوں نے گہرے نیلے رنگ کی ایک کار کھڑی دیکھی۔ فوراً ہی ایک نوجوان مکان سے نکل کر کار میں بیٹھنے لگا۔ اچانک اس کے دائیں بائیں دو آدمی نمودار ہوئے ایک نے اس کی کنپٹی سے ریوالور لگادیا دوسرے نے کھلے دروازے سے دھکا دے کر کار میں گرادیا۔ ساتھ ہی خود بھی تیزی سے اندر بیٹھ گیا۔ اتنی دیر میں اس کا ساتھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر دوبارہ اسے ریوالور کی زد پر لے چکا تھا۔ ایک لمحے میں کار جھٹکے سے آگے بڑھی۔

صاف ظاہر تھا کہ یہ اغوا کی کوئی واردات عمل میں لائی جارہی تھی۔ شجاعت نے جلدی سے اپنی جیپ میں لگا ہوا پولیس سائرن آن کیا اور اس کار کا تعاقب کرنے لگے۔ پولیس سائرن کی آواز سنتے ہی اغوا کرنے والوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ان میں سے جو آدمی اسٹیرنگ وہیل سنبھالے بیٹھا تھا اس نے کار کو اندھا دھند دوڑانا شروع کردیا۔ شجاعت نے بھی جیپ کی رفتار تیز کردی۔ روڈ پر چلتا ہوا ٹریفک گاڑیاں اور لوگ سائرن کی آواز سنتے ہی چونک کے راستے سے ہٹتے جارہے تھے۔ شجاعت نے تعاقب کو مختصر کرنے اور کسی ممکنہ حادثے سے بچنے کے لیے ریوالور نکال لیا اور کار کے پچھلے ٹائر کا نشانہ لے کر فائر کردیا۔ دو گولیاں ضائع گئیں تیسری نے ٹائر پنکچر کردیا۔ کار لہرانے لگی۔ ڈرائیور کو کنٹرول کرنا مشکل ہوگیا۔ اس نے ایک الیکٹرک پول سے کار ٹکرادی اور کار سے اتر کر بھاگ نکلا۔ اس کے ساتھی نے بھی پیروی کرنا چاہی مگر تب تک شجاعت اپنی جیپ روک چکے تھے۔ اس آدمی کے باہر نکلتے ہی انہوں نے وارننگ دی۔

''ٹھہر جاؤ ورنہ گولی چلادوں گا۔''

مگر وہ آدمی بھاگنے کی فکر میں تھا رکا نہیں۔ شجاعت نے ایک فائر اور کیا۔ یہ گولی بھی ہدف پر لگی اور بھاگنے والا اپنی ٹانگ پکڑے زمین پر گر گیا۔ اس نے پھر بھی اٹھ کر بھاگنا چاہا مگر اب شجاعت اس کے سر پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ایک ہاتھ مار کر اسے دوبارہ زمین پر گرادیا اور پھر دوسرے لمحے پھرتی سے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ دوسری طرف وہ نوجوان جسے اغوا کیا جارہا تھا خوف زدہ انداز میں کار سے باہر نکلا۔

''آپ تو خیریت سے ہیں؟'' شجاعت نے اس سے پوچھا۔

''جی ہاں، خدا کا شکر ہے۔'' نوجوان نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''آپ عین وقت پر پہنچ گئے ورنہ یہ بدمعاش خدا جانے مجھے کہاں لے جاتے اور کیا سلوک کرتے۔''

شجاعت ان دونوں کو ساتھ لے کر پولیس اسٹیشن آئے اور تب معلوم ہوا کہ وہ نوجوان شہر کے معروف بزنس مین اور صنعت کار شیخ کبیر الدین کا اکلوتا بیٹا رئیس الدین ہے۔ جو بدمعاش گرفتار ہوا تھا اس نے ذرا سی مار پیٹ کے بعد ہی اپنے گروہ کے بارے میں سب کچھ اگل دیا۔ پولیس نے شام ہونے سے پہلے گروہ کے اڈے پر چھاپا مارا اور معمولی مقابلے کے بعد سب کو گرفتار کرلیا۔ یہ ایک خاصا خطرناک گروہ تھا جو کئی ڈاکوں اور اغوا کی وارداتوں کے سلسلے میں پولیس کو مطلوب تھا۔ شجاعت کو ہر طرف سے شاباش اور مبارک باد دی گئی۔ خاص طور پر کبیر الدین صاحب تو جیسے احسان کے بوجھ سے جھکے جارہے تھے۔ انہوں نے شجاعت کو ایک لاکھ روپے نقد انعام دینا چاہا مگر شجاعت نے انکار کردیا کہ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کی ڈیوٹی تھی اور ڈیوٹی کی ٹھیک ادائیگی تعریف کی تو مستحق ہوسکتی ہے مگر کسی انعام کی نہیں۔ ہمیں جو تنخواہیں دی جاتی ہیں وہ اسی فرض کی بجا آوری کے لیے دی جاتی ہیں۔ ان خیالات نے شجاعت کو شیخ صاحب کی نظروں میں اور زیادہ پسندیدہ بنادیا۔

اب یہ اتفاق تھا کہ دوسرے ماہ رئیس کی شادی ہونے

والی تھی چنانچہ کبیر الدین صاحب نہ صرف بذاتِ خود شادی کا کارڈ دینے گئے بلکہ شرکت کے لیے اصرار کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ جب تک شجاعت نہیں آئیں گے نکاح نہیں ہوگا۔ شجاعت کو ایسی تقریبات میں خاص طور سے بڑے آدمیوں کی تقریب میں شریک ہونا کچھ پسند نہیں تھا مگر کبیر الدین صاحب نے اس قدر اصرار کیا کہ انہیں آنے کا وعدہ کرنا ہی پڑا۔

شہر کے ایک بڑے آدمی کا بیٹا اور بیٹا بھی وہ جو اکلوتا ہو اس کی شادی تھی، جو بھی دھوم دھام نہ ہوتی کم تھا۔ رخصتی کے بعد گانے بجانے کا پروگرام بھی رکھا گیا تھا اور سننے میں آیا تھا کہ شہر کی سب سے زیادہ خوب صورت گلوکارہ نگار سلطانہ نہ صرف اپنی آواز کا جادو جگائے گی بلکہ رقص کا مظاہرہ بھی کرے گی۔ شجاعت نے گانے کے بعد رخصت ہونا چاہا مگر کبیر صاحب نے انہیں اصرار کرکے ناچ گانے کی محفل تک روک لیا۔

گیارہ بجے رقص وسرود کی محفل آراستہ ہوئی۔ ابتدا میں کچھ شوقیہ فنکاروں نے رنگ جمایا اور پھر نگار سلطانہ شعلۂ جوالہ بنی سامنے آئی۔ شجاعت تیسری قطار میں بیٹھے بور ہورہے تھے مگر جیسے ہی ان کی نظر نگار سلطانہ پر پڑی وہ چونک گئے۔ دھوکا کھانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ ان کی نظروں کے سامنے غزالہ تھی۔

☆☆☆

غزالہ نے شجاعت کو دیکھا تھا یا نہیں یہ نہیں کہا جاسکتا لیکن اس کے بعد شجاعت سے محفل میں نہیں بیٹھا گیا۔ فطری بات تھی کہ انہیں غزالہ کو نگار سلطانہ کے نام سے تماش بین کے سامنے ناچتے گاتے دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر غزالہ پر ایسی کیا افتاد آپڑی کہ وہ ناچنے گانے کا پیشہ اپنانے پر مجبور ہوگئی اور ابھی تو یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ اس کا یہ شغل صرف ناچنے کی حد تک تھا یا وہ اس حد سے بھی آگے نکل گئی تھی۔

ہر چند آخری ملاقات میں غزالہ نے ان سے ربط وتعلق توڑلیا تھا مگر شجاعت کے دل کو ایک کریدی لگ گئی تھی کہ وہ کم سے کم اس سے مل کر یہ تو پوچھیں کہ آخر وہ کیا مجبوری تھی جس نے اسے اس مقام تک گرادیا تھا اور اگر یہ حالات کی ستم ظریفی تھی تو اس نے اس رسوائی کی دلدل میں قدم رکھنے سے پہلے انہیں آگاہ کیوں نہیں کیا، وہ اپنی جان کی بازی لگا کر بھی اسے اس ذلت سے بچانے کی پوری کوشش کرتے۔

ایک پولیس افسر کے لیے کسی ناچنے گانے والی فنکارہ کا پتا لگانا خواہ وہ کتنی ہی خاص الخاص کیوں نہ ہو کوئی مشکل بات نہ تھی۔ شجاعت نے بھی معلوم کرلیا تھا کہ وہ ایک مقامی ہوٹل کے کمرا نمبر 122 میں ٹھہری ہوئی ہے نیز اس کے ساتھ ایک آدمی بھی ہے جس کا نام ابرار احمد ہے اور جو خود کو اس کا منیجر کہتا ہے۔

ایک رات جبکہ غزالہ کا کہیں کوئی پروگرام نہیں تھا اور ابرار بھی موجود نہیں تھا وہ تقریباً نو بجے اس سے ملنے ہوٹل پہنچ گئے۔ وہ اس وقت سادہ لباس میں تھے۔ پولیس کی وردی میں کسی سے ہوٹل میں ملنے جانا لوگوں کو تجسس میں مبتلا کرسکتا تھا اس لیے شجاعت ڈیوٹی کے بعد گھر گئے اور وہاں سے عام لباس پہن کر ہوٹل پہنچے۔ کمرے کا نمبر انہیں معلوم تھا اس لیے استقبالیہ کاؤنٹر پر رکے بغیر فرسٹ فلور پر پہنچ گئے جہاں کمرا 122 واقع تھا۔ کمرے کا دروازہ بند نہیں تھا۔ شجاعت نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے غزالہ غالباً یہ سمجھی کہ ہوٹل کا کوئی بیرا وغیرہ ہے اور اس نے جواب میں کہہ دیا۔

''دروازہ کھلا ہے اندر آجاؤ۔''

شجاعت نے کمرے میں قدم رکھا تو غزالہ جو کپڑے استری کررہی تھی انہیں دیکھ کر بری طرح چونک گئی۔

''آپ...... آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی سوال میں تم سے کرنے آیا ہوں کہ تم یہاں کیسے پہنچیں کیونکہ جس غزالہ کو میں جانتا تھا بلکہ جانتا ہوں وہ تو مرجاتی مگر خود کو تماشا نہیں بناتی۔''

''تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں زندہ ہوں۔'' غزالہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں تو اس دن سے بھی پہلے مرگئی تھی جب آپ آخری بار مجھ سے ملنے آئے تھے۔''

''مگر یہ سب ہوا کیسے، اتنے بڑے انقلاب اچانک تو نہیں آجاتے۔''

''میری زندگی میں جو طوفان آیا تھا وہ اچانک ہی تھا۔ اتنا ہی اچانک کہ میں اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش بھی نہ کرسکی۔''

''کیا تم مجھے اپنے حالات نہیں بتاؤ گی؟''

''آپ جان کر کریں گے بھی کیا؟''

''یہ یا اس سے ملتا جلتا جواب تم نے اس وقت بھی دیا تھا جب میں بڑی امیدوں بھرا دل لے کر تمہارے پاس آیا تھا اور تم نے دیکھا کہ مجھے انجان رکھ کر تم کہاں تک آپہنچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو۔ کیا اب بھی تم مجھے اس قابل نہیں سمجھتیں کہ میں تمہارے کچھ کام آسکوں۔"

"میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتی کہ آپ گندگی کے اس ڈھیر کے کنارے بھی کھڑے ہوں جسے اب نگار سلطانہ کہتے ہیں۔"

"خدا کے لیے پہیلیوں میں باتیں مت کرو اور مجھے صاف صاف بتاؤ کہ جس غزالہ کو میں چار سال قبل جانتا تھا وہ آج کی نگار سلطانہ کیسے بن گئی؟"

"پرانے زخموں کو کریدنے سے ٹیس اٹھنے کے علاوہ اور کیا حاصل ہوگا۔" غزالہ نے بھیگی آنکھوں سے جواب دیا۔ "لیکن آپ جاننا ہی چاہتے ہیں تو میں ضرور بتاؤں گی۔ خاص طور سے اس لیے کہ شاید اسی طرح آپ مجھے بھول جائیں۔"

وہ چند لمحے خاموش رہی جیسے پرانی یادوں کو سمیٹ کر فیصلہ کر رہی ہو کہ کہاں سے ابتدا کرے۔

"یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بڑے بھائی کی اچانک موت نے ابو کو اتنا غمزدہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے دکھ کو بھولنے کے لیے شراب کا سہارا لینے پر مجبور ہوگئے تھے۔"

کچھ توقف کے بعد وہ بولی۔ "امی پہلے سے بیمار چلی آرہی تھیں۔ دو بیٹوں کی جدائی کے بعد بڑے بھائی کی جوانمرگی ان سے برداشت نہ ہوسکی اور وہ چند مہینوں کے اندر قبر میں جا سوئیں۔ اس حادثے نے ابو کو اندر سے بالکل توڑ پھوڑ دیا۔ وہ کاروبار سے بھی بے پروا ہوگئے، مجھے نہیں معلوم کہ ابرار سے ان کی ملاقات کہاں اور کیسے ہوئی مگر ایک رات وہ ابو کو شراب کے نشے میں مدہوش ہمارے گھر چھوڑنے آیا اور پھر اس کی آمدورفت رفتہ رفتہ اتنی زیادہ ہوگئی کہ ابو ایک طرح سے اس کے اشاروں پر ناچنے لگے۔ تب تک سارا کاروبار ختم ہوچکا تھا۔ ابو نے کمپنی کی گڈ ول بھی فروخت کر دی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ابرار مجھ سے غیر ضروری طور پر بے تکلف ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ میں نے ایک دو مرتبہ اسے ڈانٹ دیا پھر دبی زبان سے ابو سے بھی شکایت کی مگر وہ ابرار کو اپنا محسن خیال کرتے تھے پھر انہیں شراب کے نشے سے ہی فرصت نہ ملتی تھی کہ میری بات پر سنجیدگی سے غور کرسکتے پھر مجھے معلوم ہوا کہ ابو ہزاروں روپے کے مقروض ہوچکے ہیں۔ یہ قرض ابرار نے اتار دیا۔ ابو اس کے پہلے سے کہیں زیادہ احسان مند ہوگئے۔ تب ابرار نے ابو سے کہا کہ وہ میری شادی اس کے ساتھ کر دیں۔ اس کے بدلے اس نے وعدہ کیا کہ وہ ابو کو ساری زندگی کوئی پریشانی نہیں ہونے دے گا۔ شراب بھی جتنی وہ چاہیں پیتے رہیں، کبھی ان کے پینے پر پابندی نہیں لگائے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ تب ابو کا ذہن اس حد تک ماؤف ہوچکا تھا کہ اپنی ضرورت کے علاوہ کوئی چیز اہم نہیں معلوم ہوتی تھی۔ عمر بھر مفت شراب کے بدلے تو وہ شاید مجھے فروخت بھی کر دیتے اور ابرار نے صرف شادی کی بات کی تھی وہ فوراً تیار ہوگئے مگر میں نے سختی سے انکار کر دیا۔ میں جانتی تھی کہ قانوناً میں بالغ ہوچکی ہوں اور ابو یا کوئی اور میری مرضی کے خلاف.... کچھ نہیں کرسکتا۔ مجھے آپ کے واپس آنے کا انتظار تھا۔ آپ کی ٹریننگ کے آخری ایام تھے۔ میں یہ سب حالات آپ کو لکھ کر پریشان بھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر بالکل ہی مجبور ہوگئی تب یا تو آمادگی کا بہانہ کرکے اتنی مہلت لے لوں گی کہ آپ واپس آجائیں یا کسی وکیل کی معرفت عدالت میں پیش ہوکر خود مختاری حاصل کرلوں گی۔"

اتنا کہہ کر غزالہ خاموش ہوگئی۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔" آخر وہ دوبارہ بولی۔ "ایک رات جبکہ ابھی ابو گھر واپس نہیں آئے تھے ابرار آگیا اس نے مجھے کسی دوا سے بے ہوش کر دیا اور......اور...... جب میں ہوش میں آئی تو برباد ہوچکی تھی۔ ابرار نے صرف اتنا ہی ستم نہیں کیا بلکہ بے ہوشی کے عالم میں میری تصویریں بھی اتار لیں اور اس نے دھمکی دی کہ اس کا مقصد تو پورا ہو ہی چکا ہے اب بھی اگر میں نے اس سے شادی سے انکار کیا تو وہ مجھے بدنام کر دے گا۔ میں مجبور ہوچکی تھی تب پھر ایک دن آپ آگئے۔ میں آپ کے قابل نہیں رہ گئی تھی اس لیے میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ آپ سے سخت طرزِ عمل اختیار کرکے شادی سے انکار کردوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ آپ کے جانے کے بعد میں نے کس قدر آنسو بہائے مگر میں بے بس تھی۔ کچھ دن کے بعد ابرار سے میری شادی ہوگئی۔ ابو شادی سے پہلے ہی بیمار رہنے لگے تھے۔ وہ شادی کے بعد زیادہ دن تک زندہ نہ رہے اور ایک رات اسپتال میں انتقال کر گئے۔"

شجاعت بڑی افسردہ خاموشی کے ساتھ غزالہ کی کہانی سن رہے تھے۔

''ابو کے انتقال کے بعد ابرار نے ہمارا مکان فروخت کردیا۔'' غزالہ کہہ رہی تھی۔ ''وہ بھی ایک عیاش اور آوارہ آدمی تھا جب تک مکان کا روپیا رہا اس نے خوب عیاشی کی اور جب سب کچھ ختم ہوگیا تو اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں جسم فروشی کروں۔ اس مقصد کے لیے اس نے مجھے ناچنا اور گانا سکھایا۔ وہ مجھے کوٹھے پر بٹھانا چاہتا تھا مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ مرجاؤں گی مگر جسم فروشی نہیں کروں گی۔ اس نے مجھے اتنا مارا کہ میرے جسم پر نیل پڑ گئے۔ دنوں بھوکا پیاسا رکھا غرض کوئی ایسا ظلم نہیں تھا جو اس نے مجھ پر توڑا نہ ہو۔ ایک بار اتنا مارا کہ میں مرنے کے قریب ہوگئی۔ تب وہ سمجھ گیا کہ کم سے کم اس معاملے میں وہ مجھ سے نہیں جیت سکتا۔ آخر اس نے یہ تجویز رکھی کہ میں صرف ناچنے اور گانے کا ہی پیشہ کروں اور اگر میں اس پر آمادہ ہوجاؤں تو وہ مجھے کبھی جسم فروشی پر مجبور نہیں کرے گا۔ ناچار مجھے اس پر آمادہ ہونا پڑا کیونکہ میں بھی سمجھ گئی تھی کہ اگر وہ میری کمائی سے بالکل ہی مایوس ہوگیا تو جان سے بھی مار سکتا ہے اور میں اس وقت تک مرنا نہیں چاہتی تھی جب تک آپ سے معافی نہ مانگ لوں۔ نہ جانے کیوں مجھے امید تھی کہ زندگی میں کبھی نہ کبھی آپ سے ملاقات ضرور ہوگی اور آخر شیخ کبیرالدین کی محفل میں، میں نے آپ کو دیکھ لیا، مجھے احساس ہوگیا تھا کہ آپ بھی مجھے پہچان گئے ہیں مگر آپ اٹھ کر چلے گئے۔ تب مجھے پہلی بار یہ اندیشہ ہوا کہ شاید آپ مجھے اس حیثیت میں دیکھ کر اتنے متنفر ہوچکے ہیں کہ ملنا بھی پسند نہیں کریں گے۔ میری آخری امید بھی ٹوٹ گئی اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب میں کیا کروں کہ خدا نے آج آپ کو یہاں بھیج ہی دیا اور اب میں آپ سے خلوصِ دل سے معافی کی طلب گار ہوں کہ میں نے جو سلوک آپ کے ساتھ کیا اس کے لیے مجھے معاف کردیں۔''

اتنا کہہ کر غزالہ بے تحاشا رونے لگی۔ شجاعت کا دل بھی بے قابو ہوا جارہا تھا مگر انہوں نے بڑی کوشش سے خود کو سنبھالا۔ غزالہ کو تسلی دی۔ ''ضبط سے کام لو غزالہ جو کچھ بھی ہوا اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔'' وہ بولے۔ ''مگر کاش تم نے یہ تمام باتیں اس وقت بتادی ہوتیں جب میں تم سے ملنے آیا تھا۔''

''مجھے آپ سے نگاہ ملا کر بات کرنا مشکل معلوم ہورہا تھا۔'' غزالہ نے جواب دیا۔ ''اتنا حوصلہ کہاں سے لاتی کہ اپنے لٹنے کی داستان سناتی۔ اس کے علاوہ سناتی بھی تو کس امید پر، ابرار نے مجھے آپ کے قابل کہاں چھوڑا تھا۔''

''یہ صرف تمہارا خیال ہے۔'' شجاعت نے کہا۔ ''ایک ایسا کام جس میں تمہاری مرضی شامل نہ ہو جو جبر اور زبردستی سے کیا گیا ہو تمہیں کسی بھی طرح قصوروار نہیں بنا سکتا۔ خدا کی قسم میری نظروں میں تم آج بھی اتنی ہی پاکیزہ ہو جتنی کبھی تھیں۔ تم نے مجھے یہ باتیں بتادی ہوتیں تو میں پھر بھی تم سے شادی کرلیتا۔ اب یہ کام کچھ مشکل ہوگیا ہے کیونکہ پہلے تمہیں ابرار کے پنجے سے رہا کروانا ہوگا مگر کوئی بات نہیں تم کل ہی میرے ساتھ کورٹ چلنا ہم ابرار کے خلاف خلع کی درخواست دائر کردیں گے جس کی بنیاد یہی ہوگی کہ وہ تم سے تمہاری مرضی کے خلاف ناچنے گانے کا کام کرارہا ہے تاکہ تمہاری کمائی پر عیش کرتا ہے۔''

''یہ آپ کی عالی ظرفی ہے کہ مجھ گناہ گار کو اب بھی قبول کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔'' غزالہ آنسو خشک کرتے ہوئے بولی۔ ''مگر میں خود اپنی نگاہوں سے گرچکی ہوں۔ میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں کہ خود کو آپ کی محبت کے قابل بنا سکوں۔''

ابھی شجاعت نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ کمرے کا دروازہ پُرشور آواز کے ساتھ کھلا اور ابرار نشے میں جھومتا ہوا اندر داخل ہوا کمرے میں شجاعت کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور پھر ایک غصیلی نگاہ غزالہ پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تو میری غیر حاضری میں یہ عیش ہورہے ہیں اور اس پر یہ دعویٰ کہ مرجاؤں گی مگر اپنی عزت نہیں بیچوں گی۔''

''یہ شجاعت صاحب ہیں اور صرف مجھ سے ملنے آئے تھے۔'' غزالہ نے جواب دیا۔

''کون شجاعت......؟'' ابرار نے شجاعت کو گھورا اور پھر جیسے اسے یاد آگیا ہو۔ ''اوہ تمہارا وہ عاشق جس سے تم محبت کرتی تھیں۔''

''بکواس بند کرو۔'' شجاعت غصے میں کھڑے ہوگئے۔

''آپ اس سے نہ الجھیں۔'' غزالہ گڑگڑائی اور پھر ابرار کا بازو پکڑ کر بولی۔ ''تم اس وقت نشے میں ہو چپ چاپ جاکر اپنے کمرے میں لیٹ جاؤ۔''

''ہاں تاکہ تم یہاں اپنے پرانے یار کے ساتھ عیش کرو مگر حرامزادی تو بھول رہی ہے کہ تو میری بیوی ہے۔ اگر تو نے کسی کا پہلو گرمایا تو میں تیرا خون کردوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے ابرار نے غزالہ کو دو تین ہاتھ

ماردیے۔ بات اب شجاعت کے ضبط سے باہر ہوچکی تھی۔ وہ آگے بڑھے اور ابرار کے منہ پر اتنی زور سے مکا مارا کہ ابرار ایک قلابازی کھا کر فرش پر جاگرا۔ وہاں کچھ دیر تو وہ خونی نظروں سے شجاعت کو گھورتا رہا پھر پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکال لیا اور ایک کھٹکا دبا کر اس کا تیز دھار پھل کھولتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر شجاعت نے بھی پوزیشن لے لی۔ اچانک ابرار نے ایک جست مار کر ان پر حملہ کیا۔ شجاعت پہلے سے تیار تھے انہوں نے بائیں ہاتھ سے چاقو والے ہاتھ کی کلائی پکڑلی اور سیدھے ہاتھ سے گھونسا مارنا چاہا مگر ابرار کے حملے کے زور میں انہیں ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا تھا۔ پیچھے صوفہ سیٹ تھا وہ اس سے ٹکرا کر لڑکھڑائے اور ابرار کو ان کے اوپر آنے کا موقع مل گیا۔

چاقو کی نوک شجاعت کے گلے سے چند انچ ہی اوپر تھی۔ ابرار زور لگا رہا تھا کہ یہ فاصلہ بھی ختم ہوجائے اور شجاعت پوری طاقت سے روکنے کی کوشش کررہے تھے۔ غزالہ نے یہ منظر دیکھا تو گھبرا گئی۔ اِدھر اُدھر کسی ہتھیار کی تلاش کی اچانک اس کی نظریں لوہے کی استری پر پڑیں۔ وہ شجاعت کے آنے پر استری کررہی تھی۔ انہیں دیکھ کر بٹن آف کردیا تھا۔ استری اتنی دیر میں ٹھنڈی ہوگئی تھی۔ غزالہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ہینڈل سے استری کو پکڑا اس کا پلگ الگ کیا اور ابرار کے پیچھے پہنچ کر پوری طاقت سے ایک وار اس کی پشت پر اور دوسرا اس کے سر پر کیا اس وقت تک شجاعت بھی اپنے پیر سکیڑ کر اسے پنجوں پر لے چکے تھے انہوں نے زور سے دھکا دیا اور ابرار ہوا میں اچھل کر ایک دھماکے سے فرش پر جاگرا اور وہیں بے حس وحرکت پڑا رہ گیا۔ اس کے سر کے پچھلے حصے سے خون جاری تھا۔

شجاعت نے پہلے تو اس کے اٹھنے کا انتظار کیا مگر اسے بے حس وحرکت دیکھ کر قریب گئے۔ سر کا زخم دیکھا جو کافی گہرا تھا۔ استری کی نوک سر کی ہڈی توڑ کر دماغ میں گھس گئی تھی۔ انہوں نے نبض دیکھی۔ سینے پر ہاتھ رکھا نبض اور دل کی دھڑکن دونوں خاموش تھیں۔

''یہ تو مرگیا۔'' بے اختیار شجاعت کی زبان سے نکلا۔

''مرگیا۔'' غزالہ چونک اٹھی اور استری اس کے ہاتھ سے گرگئی۔

''ہمیں پولیس اور ایمبولینس کو فون کرنا پڑے گا۔'' شجاعت نے کہا۔ ''تمہارا فون کہاں ہے؟''

''دوسرے کمرے میں۔'' غزالہ نے جواب دیا۔

''یہاں اب کسی چیز کو چھونا یا چھیڑنا نہیں۔'' شجاعت نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

غزالہ تیزی سے ان کے پیچھے لپکی۔ شجاعت ریسیور اٹھا چکے تھے اور نمبر ڈائل کرنے ہی والے تھے۔

''آپ پولیس سے کیا کہیں گے؟'' اچانک غزالہ نے پوچھا۔

''یہی کہ میں تم سے ملنے آیا تھا تھوڑی دیر میں ابرار بھی آگیا وہ شراب کے نشے میں تھا۔ مجھے کمرے میں دیکھ کر اس نے تمہیں برا بھلا کہنا شروع کیا اور مارنے لگا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو وہ چاقو نکال کر مجھ پر حملہ آور ہوا۔ تم نے اضطراری حرکت کے طور پر استری اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری اور وہ مرگیا حالانکہ تمہارا ارادہ اسے مارنے کا نہیں تھا تم صرف مجھے بچانا چاہتی تھیں۔''

''آپ مجھ سے ملنے کیوں آئے تھے اور ایسی کیا بات تھی جس کی وجہ سے ابرار آپ کو دیکھ کر غصے میں آگیا؟'' غزالہ نے کہا۔ ''آپ کے خیال میں آپ کے افسران یہ سب کچھ جاننے کی کوشش نہیں کریں گے اور جب انہیں اصل حالات بتائے جائیں گے تو کیا ہمارے خلاف یہ شبہ پیدا نہیں ہوگا کہ ہم دونوں نے مل کر ابرار کو اپنے راستے سے ہٹادیا۔ میں اکیلی ہوتی تو اور بات تھی لیکن آپ کی موجودگی نہ جانے ایسے کتنے سوالات کو جنم دے گی جس کا جواب سچائی سے بھی دیا جائے گا تو کوئی تسلیم نہیں کرے گا۔'' شجاعت کچھ سوچ میں پڑگئے۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' انہوں نے کہا۔ ''مجھے اپنی کوئی فکر نہیں میں خود پولیس انسپکٹر ہوں اور اپنے بچاؤ کے لیے بہت سے جھوٹ تلاش کرسکتا ہوں مگر تمہاری موجودگی وہ تمام باتیں افشا کردے گی جو اب تک ایک راز میں ہیں اور پھر میرا کچھ بگڑے یا نہ بگڑے مگر قانون تمہارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں کرے گا۔ ابرار کے خلاف تمہارا بیان صرف ایک بیان ہی ہے اس کا کوئی ثبوت تم پیش نہیں کرسکتیں اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ لوگ۔ یہی سمجھیں کہ تم نے میرے ساتھ مل کر ابرار کو قتل کردیا۔ تمہارا ارادہ بھی یہی تھا کیونکہ تم اس کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی تھیں۔''

''آپ کا خیال ہے کہ پولیس انسپکٹر ہونے کی وجہ سے آپ جو کچھ بیان دیں گے وہ مان لیا جائے گا۔'' غزالہ بولی۔ ''اگر پولیس آتی ہے تو مجھ سے زیادہ آپ شک وشبے

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی زد میں ہوں گے۔"
"مجھے اپنی فکر نہیں ہے مگر میں تمہیں غلط طور پر اس حادثے میں ملوث کرنا نہیں چاہتا۔" شجاعت نے جواب دیا۔ "ابرار جس انجام کا مستحق تھا وہ اس تک پہنچ گیا۔ پولیس کو خود اس کا کیس حل کرنے دو۔"
"پھر آپ کیا کریں گے؟"
"کچھ نہیں، تم ایک چھوٹے سوٹ کیس میں اپنی ضروری چیزیں لے کر میرے ساتھ چلو۔"
"کہاں؟"
"میرے گھر وہاں میرے علاوہ کوئی اور نہیں رہتا۔"
"آپ میری وجہ سے کسی مصیبت میں نہ پڑیں۔" غزالہ نے کہا۔ "میرے نزدیک اس کا بہترین حل یہ ہے کہ آپ چلے جائیں آپ کے جانے کے نصف گھنٹے بعد میں پولیس کو فون کردوں گی اور میرا بیان یہ ہوگا کہ ابرار نے شراب کے نشے میں مجھ پر حملہ کیا، وہ پہلے بھی جسم فروشی کے لیے مجبور کرتا رہتا تھا آج پھر اس نے وہی مطالبہ کیا اور میرے انکار کرنے پر چاقو نکال کر مجھے مارنا چاہا۔ میں نے اپنے بچاؤ میں استری استعمال کی اور ابرار مرگیا۔"
"یہ بیان مانا جاسکتا ہے مگر حقائق اس کے خلاف ہیں۔ اگر ابرار نے تم پر چاقو سے حملہ کیا تھا تو اس کا رخ تمہاری طرف ہونا چاہیے تھا اور تم نے جو استری ماری وہ اس کے سینے اور سر کے سامنے والے حصے میں لگتی۔ پشت اور سر کے پچھلے حصے میں استری کے زخم ظاہر کرتے ہیں کہ ابرار پر پیچھے سے حملہ کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ضرور کسی دوسرے فرد سے الجھا ہوا تھا۔ نہیں غزالہ اس طرح کیس اور الجھ جائے گا۔ سردست یہ ہی ترکیب بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ چلو پھر بعد میں کوئی دوسری ترکیب سوچ لیں گے تم یہ بھی کہہ سکتی ہو کہ تم میرے ساتھ چلی گئی تھیں اس وقت ابرار کمرے میں نہیں تھا پھر وہ کب واپس آیا اکیلا آیا یا کوئی اور بھی اس کے ساتھ تھا تم نہیں جانتیں۔ ظاہر ہے کہ تمہارے جانے کے بعد کمرے میں کیا ہوا کیسے ہوا اس کا حال تمہیں کیسے معلوم ہوسکتا تھا۔"
"اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے رات میں کسی وقت آکر پولیس میں رپورٹ کرنا ہوگی۔"
"کوئی ضروری نہیں۔"
"پھر میرے پاس کیا جواب ہوگا کہ میں واپس کیوں نہیں آئی؟"

"میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تمہارے حالات کا علم نہیں تھا۔" شجاعت نے جواب دیا۔ "کبیر الدین صاحب کی محفل میں تمہیں ناچتے گاتے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی بعد میں میں تم سے ملنے آیا اور جب مجھے سارے حالات معلوم ہوئے تو میں تمہیں اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔ میں نے تم کو واپس جانے سے منع کردیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ اگر ابرار نے کوئی جوابی کارروائی کی تو میں تمہارا دفاع کروں گا۔"
"اور اس طرح میرا اور آپ کا تعلق خواہ وہ اپنی جگہ کتنا ہی پاکیزہ کیوں نہ ہو لوگوں کی نظروں میں آجائے گا۔" غزالہ نے کہا۔ "پھر جو جس کے دل میں آئے گا کہے گا آپ کس کس کی زبان بند کریں گے۔"
"تم تو کسی وکیل کی طرح جرح کررہی ہو۔" شجاعت نے بے تابی سے کہا۔ "یہاں سے تو نکلو پھر ٹھنڈے دل و دماغ سے کوئی مناسب ترکیب سوچ لیں گے۔ یہاں میرا یا تمہارا یا ہم دونوں کا ایک ساتھ پکڑے جانا کہیں زیادہ خطرناک ہوگا۔"

☆☆☆

اور یوں شجاعت غزالہ کو اپنے گھر لے گئے۔ ممکن تھا کہ ابرار کی لاش کئی دن تک پوشیدہ رہتی لیکن اتفاق سے کچھ دیر بعد ہی اس کا ایک ملاقاتی کسی پروگرام کے بارے میں بات کرنے آگیا۔ وہ اوپر کمرے میں گیا تو اسے لاش نظر آئی اور اس نے فوراً ہوٹل کے منیجر کو اطلاع دی۔ منیجر نے پولیس میں رپورٹ کردی اور ہوٹل جس پولیس اسٹیشن کی حدود میں آتا تھا اس کا انسپکٹر حمید فوراً جائے واردات پر پہنچ گیا۔ منیجر نے اسے بتایا کہ کمرا نمبر 122 میں نگار سلطانہ اور مسٹر ابرار شوہر اور بیوی کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے تھے۔ نگار سلطانہ اسٹیج کی اداکارہ تھی اور پرائیوٹ محفلوں میں ناچنے اور گانے کے پروگرام کرتی تھی۔ ان کے آنے یا جانے کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کیونکہ ہوٹل کے دو دروازے تھے اور جو جس دروازے سے چاہے جاسکتا تھا یا آسکتا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس وقت نگار سلطانہ کہاں ہے یا یہ کہ وہ واردات کے وقت کمرے میں موجود تھی یا نہیں۔ وہ ان دونوں کے باہمی تعلقات کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یوں کبھی کبھی آتے جاتے ان کا سامنا ہوجاتا تھا تو وہ بظاہر خوش ہی نظر آتے تھے۔ منیجر کے بیان کے برعکس ہوٹل کے بیروں نے جو بیان دیا اس سے ظاہر ہوا کہ نگار سلطانہ اور ابرار کے تعلقات اوپری سطح پر

ہی بہتر تھے ورنہ کمرے کی تنہائی میں وہ اکثر ایک دوسرے سے جھگڑا کرتے معلوم ہوتے تھے۔ ایک ویٹر نے بتایا کہ اس کے خیال میں نگار سلطانہ شام کے سات آٹھ بجے تک اپنے کمرے میں ہی تھی کیونکہ وہ اس کے لیے چائے لے کر گیا تھا۔ اس کے بعد بھی اس نے اسے کہیں باہر جاتے نہیں دیکھا البتہ یہ کہ دس گیارہ بجے کے درمیان ابرار صاحب کو ضرور اوپر جاتے دیکھا تھا اور وہ حسب معمول نشے میں معلوم ہوتے تھے۔ جس شام کہیں کوئی پروگرام نہیں ہوتا تھا اس رات وہ جب بھی واپس آتے ضرور نشے میں ہوتے تھے۔
انسپکٹر حمید نے آس پاس کے کمرے والوں سے بیان لیے تو یہ بات اور واضح ہوگئی کہ ابرار اور نگار سلطانہ میں صرف جھگڑا ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ مار پیٹ بھی ہوتی تھی۔ اسے مزید ایک اور گواہ ایسا مل گیا جس نے گیارہ بجے کے بعد کتنے بعد اس کا وہ صحیح اندازہ نہیں بتا سکا پھر بھی اس کا خیال تھا کہ سوا گیارہ سے زیادہ نہیں بجے تھے نگار سلطانہ کو ایک آدمی کے ساتھ ہوٹل کے دوسرے دروازے سے جاتے دیکھا تھا۔ دونوں کی پشت اس کی جانب تھی۔ اس کے باوجود وہ نگار سلطانہ کو بہ خوبی پہچان گیا کیونکہ اسے کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا مگر اس آدمی کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں بتا سکا کہ اس نے ہلکے رنگ کا کرتہ شلوار پہن رکھا تھا اور یہ کہ اس کا قد و قامت لگ بھگ چھ فٹ معلوم ہوتا تھا۔ صحت مند جسم تھا مگر اسے موٹا نہیں کہہ سکتے مزید یہ کہ اگر وہ اس کے سامنے دوبارہ بھی آجائے تب بھی دور سے پہچان نہیں سکتا۔
واردات کے کمرے میں پچھا استری تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ قاتل اور مقتول میں کچھ کشمکش بھی ہوئی تھی مگر زیادہ نہیں۔ استری جو اسی طرح فرش پر پڑی ہوئی تھی اس کا نوکیلا سرا قدرے خون آلودہ تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مقتول کے سر پر جس بھاری چیز سے ضرب لگائی گئی وہ یہ استری ہی تھی اور چونکہ وار پشت کی جانب کیا گیا اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ جو فرد مقتول سے الجھا ہوا تھا ضروری نہیں وہ قاتل بھی ہو۔ مقتول کے داہنے ہاتھ کے قریب گرے ہوئے چاقو سے واضح تھا کہ مقتول صرف اپنا بچاؤ نہیں کررہا تھا بلکہ اپنے مخالف کو جان سے مارنے کی کوشش میں تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ بھی ممکن تھا کہ مقتول کا ارادہ مارنے کا ہو مگر خود قتل ہوگیا ہو۔ یہاں تک پہنچ کر انسپکٹر حمید نے اس گواہ کے بیان پر غور کیا جس نے نگار کو کسی اجنبی کے ساتھ جاتے دیکھا تو اس کے ذہن میں واردات کا جو نقشہ ابھرا وہ کچھ یوں تھا کہ ابرار کی عدم موجودگی کوئی شخص نگار سے ملنے آیا وہ دونوں باتیں ہی کررہے تھے کہ ابرار نشے میں مدہوش آگیا۔ وہ غالباً اس آدمی کو جانتا تھا کہ اسے دیکھتے ہی غصے میں آگیا اور چاقو سے حملہ کردیا۔ یقیناً اچانک حملے کی صورت میں وہ شخص نیچے گرگیا ہوگا۔ ابرار اسے مارنا چاہتا ہوگا کہ نگار نے اس شخص کو بچانے کے لیے پیچھے سے استری اس کے سر پر دے ماری اور یوں وہ مرگیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر وہ شخص اور نگار گھبرا گئے اور بھاگ نکلے۔
انسپکٹر حمید نے موقع واردات سے اپنی تفتیش مکمل کرکے کمرا مقفل کردیا۔ استری اور چاقو کو پولیس لیبارٹری

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

میں معائنے اور تجزیے کے لیے محفوظ کرلیا اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کرکے خود بھی پولیس اسٹیشن لوٹ گیا۔

☆☆☆

اگلے روز اخبارات میں قتل کی اس واردات کا جو حال شائع ہوا اس سے ضرور ظاہر ہوتا تھا کہ پولیس نگار سلطانہ یا اس پُراسرار اجنبی پر ابرار کے قتل کا شبہ کررہی ہے مگر ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی جس سے معلوم ہوتا کہ پولیس کو شجاعت پر کسی قسم کا کوئی شبہ ہے یا یہ کہ وہ اس پُراسرار اجنبی کو پولیس کا کوئی آفیسر خیال کررہی ہے۔ اس سے شجاعت نے یہ نتیجہ نکالا کہ جب تک غزالہ ان کے گھر میں موجود ہے اسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

اور شاید اس اعتبار سے کوئی خطرہ تھا بھی نہیں لیکن ایک دوسرے رخ پر نہ شجاعت نے غور کیا تھا اور نہ ہی غزالہ نے کہ شجاعت اپنے گھر میں اکیلے رہتے تھے اس لیے ایک عورت کی موجودگی ہمسایوں اور پاس پڑوس والوں میں چہ میگوئیوں کی وجہ بن جائے گی۔ شجاعت تو دن میں اپنی ڈیوٹی پر چلے جاتے تھے لیکن کہنے سننے والوں سے غزالہ کا سابقہ پڑتا تھا اور اس نے دو تین دن میں اندازہ لگالیا تھا کہ چپکے چپکے ہونے والی سرگوشیاں اگر زیادہ بڑھیں تو کسی کے دماغ میں یہ بات بھی آسکتی ہے کہ غزالہ شجاعت کے گھر میں اسی صبح سے نظر آرہی ہے جس رات ہوٹل سے نگار اپنے کسی مددگار کے ساتھ بھاگی تھی اور اگر کہیں پولیس نے اس کی کوئی تصویر شائع کردی تو لوگوں کو پہچاننے میں بالکل بھی دیر نہیں لگے گی اور اگر ایسا ہوا تو اس کے ساتھ جو بھی سلوک کیا جائے لیکن شجاعت کا مستقبل ضرور برباد ہوجائے گا۔ اس نے جتنا اس پہلو پر غور کیا اتنا ہی اسے یقین ہوتا گیا کہ اب اس کا ایک پل بھی شجاعت کے گھر میں ٹھہرنا شجاعت کے لیے خطرناک ہوتا جارہا ہے اور اس نتیجے پر پہنچ کر اس نے خود کو پولیس کے سپرد کرنے کا ارادہ کرلیا۔ ایک دن شجاعت کے ڈیوٹی پر جاتے ہی وہ گھر سے نکل پڑی۔

جانے سے پہلے اس نے شجاعت کے نام ایک خط لکھ کر میز پر رکھ دیا۔ اس نے لکھا تھا۔

ہمدم دیرینہ!

ہماری قسمت میں ایک دوسرے کی رفاقت نہیں لکھی تھی۔ ابرار کو میں نے قتل کیا ہے۔ یہ بات جتنی جلد ظاہر ہوجائے اتنا ہی بہتر ہے۔ آپ نے مجھے بچانے کی بہت کوشش کی مگر میں محسوس کررہی تھی کہ محلے میں میرے بارے میں سرگوشیاں جلد یا بدیر آپ کو مبتلائے مصیبت کردیں گی۔ جو میں کسی قیمت پر گوارا نہیں کرسکتی۔ اس لیے آج خود کو قانون کے حوالے کرنے جارہی ہوں اور اگر آپ کے دل میں میرے لیے ذرا سی بھی محبت ہو تو اسی محبت کا واسطہ دیتی ہوں کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے اپنے حق میں قسمت کا ہر فیصلہ منظور ہوگا۔ میری وجہ سے آپ کو جو بھی اذیت یا پریشانی اٹھانا پڑی ہے اس کے لیے مجھے معاف کردیں۔

جو آپ کی نہ ہوسکی

غزالہ

☆☆☆

انسپکٹر حمید غزالہ کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

"میرا نام نگار سلطانہ ہے اور میں ابرار کے قتل کے سلسلے میں خود کو قانون کے سپرد کرنے آئی ہوں۔"

"بیٹھ جایئے۔" انسپکٹر حمید نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ اب تک کہاں تھیں؟"

"یہ میں آپ کو نہیں بتاسکتی۔"

"تو آپ کو اعتراف ہے کہ ابرار کو آپ نے قتل کیا ہے؟"

"مجھے ایسا کوئی اعتراف نہیں ہے۔ وہ مجھے جان سے مارنا چاہتا تھا۔ میں نے صرف اپنا بچاؤ کیا تھا۔"

"آپ کے ساتھ آپ کا مددگار کون تھا؟"

"خدا کے علاوہ میرا کوئی مددگار نہیں تھا۔"

"گویا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ابرار خود آپ کی جانب سے پیٹھ موڑ کر کھڑا ہوگیا تاکہ آپ آرام سے اس کے سر اور کمر پر استری مار سکیں؟"

"جی نہیں، استری میں نے بچاؤ کے لیے پہلے اٹھالی تھی۔ اس نے مجھ پر چاقو سے حملہ کیا میں ایک طرف ہوگئی وہ حملہ خالی جانے کی جھونک میں فرش پر گر گیا اور اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ اٹھ سکتا میں نے اس کے سر اور پشت پر استری دے ماری۔"

"پہلے سر پر ماری تھی یا پشت پر؟"

"پشت پر جس کی ضرب کھا کر وہ دوبارہ گرا اور میرے لیے سر پر حملہ کرنا آسان ہوگیا۔"

"آپ دونوں میں جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟"

"اسی بات پر جس پر ہمیشہ ہوتا تھا۔ مجھے ناچنا اور گانا پسند نہیں تھا جبکہ وہ مجھ سے جسم فروشی بھی کروانا چاہتا تھا۔"

"ابرار آپ کا شوہر تھا؟"

"جی ہاں میری بدقسمتی سے۔"

"پر ایک شوہر کس طرح اپنی بیوی سے جسم فروشی کے لیے کہہ سکتا ہے؟"

"یہ آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ اس کی گندی فطرت سے واقف نہیں تھے۔ میں تو بیوی تھی اسے کوئی مناسب معاوضہ دیتا تو شاید وہ اپنی ماں اور بہن کو بھی بازار میں کھڑا کردیتا۔"

"آپ دونوں کے درمیان جھگڑا ہوا تو آپ کا مددگار ساتھی پہلے سے موجود تھا یا عین جھگڑے کے وقت آگیا تھا؟"

"میں کہہ چکی ہوں کہ کمرے میں میرے اور ابرار کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔"

"مگر ہمارے پاس ایک گواہ ہے جس نے آپ کو کسی مرد کے ساتھ ہوٹل کے دوسرے دروازے سے جاتے دیکھا تھا۔"

"میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ آپ کے گواہ کو دھوکا ہوا ہے۔ میں ہوٹل کے دوسرے دروازے سے ضرور گئی تھی مگر میرے ساتھ کوئی نہیں تھا۔" غزالہ نے جواب دیا۔ "ممکن ہے اس وقت میرا مطلب ہے کہ میرے جانے کے فوراً بعد کوئی اور بھی اس دروازے سے نکلا ہو اور آپ کے گواہ نے اسے میرے ساتھ جاتا ہوا تصور کرلیا ہو۔"

"تو کیا ایسا ہوا تھا؟"

"ممکن ہے ہوا ہو اس وقت میں اپنے گردوپیش سے بالکل بے خبر تھی۔"

"یہاں آنے سے پہلے آپ کہاں تھیں؟"

"حیدرآباد میں۔"

"اور یہاں سے رخصت ہوکر آپ کہاں گئی تھیں۔"

"یہ میں آپ کو نہیں بتاؤں گی۔"

"تو کیا آپ کا خیال ہے کہ پولیس آپ کے انکار سے یہ بات مان لے گی۔ ہم حیدرآباد سے آپ کی گزشتہ زندگی کے تمام واقعات معلوم کرسکتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ وہاں آپ کہاں رہتی تھیں۔ آپ کی زندگی کس طرح بسر ہوتی تھی، آپ کے والدین یا عزیز واقارب موجود ہیں یا نہیں یا کہ وہاں آپ کے کس کس سے تعلقات تھے۔ ابرار کے ساتھ آپ کی شادی کن حالات میں ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ۔"

غزالہ یہ سن کر سوچ میں پڑگئی۔ بلاشبہ پولیس کے پاس ایسے ذرائع ہوتے ہیں کہ وہ اس کے تمام ماضی کو بے نقاب کرسکتے ہیں اور اس ضمن میں اس کا اور شجاعت کا تعلق بھی سرعام آسکتا تھا۔ غزالہ خود تو بدنام ہو ہی رہی تھی مگر وہ شجاعت کو کسی طرح بھی رسوا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"میں نے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا۔" وہ بولی۔ "اب آپ کا جو دل چاہے کریں۔"

"پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ آپ ایک بار پھر غور کرلیں۔ اس میں شک نہیں کہ آپ نے بیشتر باتیں سچائی سے بیان کی ہیں مگر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ کچھ چھپا رہی ہیں۔ مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور میرا مشورہ ہے کہ آپ ایک بار پھر اچھی طرح غوروفکر کرکے کوئی فیصلہ کریں۔"

"میرا بھی یہ خیال تھا کہ شاید آپ میرے ادھورے بیان سے مطمئن نہیں ہوں گے۔" غزالہ نے ایک گہری سانس لی۔ "اس لیے میری درخواست ہے کہ حوالات میں مجھے کاغذ اور قلم کی رعایت فراہم کی جائے میں غور کرنے کے بعد اپنا بیان خود تحریر کرنا چاہتی ہوں۔"

☆☆☆

شجاعت گھر واپس آئے تو بیرونی دروازے میں قفل لگا دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ غزالہ نے آخر وہی کیا جو چاہتی تھی۔ یہ قفل عقبی دروازے کا تھا جس کی ایک چابی شجاعت نے احتیاطاً غزالہ کو دے دی تھی کہ اگر کبھی ان کی عدم موجودگی میں کوئی مسئلہ پیش آئے تو وہ عقبی دروازے میں قفل لگا کر باہر نکل جائے اور پھر کہیں سے بھی انہیں فون کردے لیکن بیرونی دروازے میں قفل لگے ہونے کا مقصد واضح طور پر یہی تھا کہ غزالہ کسی افتاد کے نتیجے میں نہیں بلکہ اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر گئی ہے اور اپنی مرضی سے گھر چھوڑنے کا مطلب یہی تھا کہ اس نے خود کو پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔

بات اب شجاعت کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ اگر وہ غزالہ کو بچانے کے لیے خود بھی ابرار کو قتل کرنے کا اعتراف کرلیتے تب بھی ان کا بیان تسلیم نہیں جاسکتا تھا کیونکہ آلہ قتل یعنی اس استری پر صرف اور صرف غزالہ کی انگلیوں کے ہی نشانات موجود تھے پھر بھی شجاعت کو یقین تھا کہ غزالہ کے مکمل بیان کو دیکھتے ہوئے کوئی بھی عدالت اسے موت یا عمر قید کی سزا نہیں دے سکتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت شجاعت کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے وہ جان سکتے کہ غزالہ خود کو صرف پولیس کے حوالے کرنے ہی نہیں گئی ہے بلکہ اس نے جب گھر سے قدم نکالا ہے تب ہی سے وہ ایک دوسرا فیصلہ بھی کرچکی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆☆☆

شجاعت پر جب ہر طرف سے شادی کے لیے زور پڑا اور اس سلسلے میں ان کے تمام اعتراضات نہ صرف مسترد کردیے گئے بلکہ والدین ناراض بھی ہونے لگے کہ آخر وہ شادی کرنے سے کیوں بھاگ رہا ہے اگر وہ اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائے گا تو اس کی شادی زبردستی کردی جائے گی۔ شجاعت نے میری ایک سہیلی کے ذریعے دونوں طرف کے بزرگوں سے پوشیدہ مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ملاقات کا انتظام بھی اسی سہیلی کے گھر پر کیا گیا۔

''میں اِدھر اُدھر کی باتیں کیے بغیر براہِ راست مقصد پر آتا ہوں۔'' شجاعت بولے۔

میرا یہ حال تھا کہ بڑی مشکل سے خود کو ان کے سامنے بیٹھنے پر آمادہ کرسکی تھی۔ دل بری طرح دھڑک رہا تھا مگر جیسے جیسے وہ باتیں کرتے گئے میری گھبراہٹ دور ہوتی گئی۔

''تم نے غالباً سن لیا ہوگا کہ میں شادی سے انکار کرتا رہا ہوں۔'' شجاعت کہہ رہے تھے۔ ''مگر انکار کا سبب تم نہیں تھیں۔ تم جیسی اچھی ذہین اور سمجھ دار لڑکی کی رفاقت کسی خوش نصیب کو ہی میسر ہوگی۔ میرے انکار کرنے کی وجہ کچھ اور تھی۔ ابھی چند روز پہلے تم نے اخبار میں پڑھا ہوگا کہ پولیس اسٹیشن کی حوالات میں غزالہ نام کی ایک لڑکی نے خودکشی کرلی تھی۔ اخبار میں اس کا آخری بیان بھی شائع ہوا تھا جو اس نے مرنے سے قبل لکھا تھا۔ اس سے پہلے وہ ایک مختصر سا خط میرے نام لکھ چکی تھی۔ میری زندگی میں اس لڑکی کی ایک خاص اہمیت تھی۔ اخباری اطلاعات ابھی تمہارے ذہن میں تازہ ہوں گی۔ انہیں پس منظر میں رکھتے ہوئے اس کا وہ خط بھی پڑھ لو جو اس نے میرے گھر سے روانگی کے وقت میرے نام لکھا تھا۔ ہوٹل سے نکل کر وہ دو تین دن جہاں رہی تھی اور جہاں کے بارے میں اس نے کبھی کسی کے سامنے ایک لفظ نہیں کہا وہ میرا ہی گھر تھا۔ اب تم یہ خط پڑھ لو باقی باتیں اس کے بعد ہوں گی۔''

شجاعت نے غزالہ کا مختصر خط مجھے پڑھنے کے لیے دیا اور جیسا کہ شجاعت کو بھی امید تھی اخباری خبروں کے ساتھ اس خط کو ملا کر دیکھنے سے میں وہ تمام باتیں سمجھ گئی جو اس داستان میں ان کہی تھیں۔ میں نے جان لیا کہ شجاعت اور غزالہ کے درمیان کیسی پاکیزہ، بے لوث اور گہری محبت تھی۔ عجیب بات تھی یہ جان کر بھی میرے دل میں غزالہ کے لیے کوئی رشک وحسد کا جذبہ نہیں ابھرا۔ شاید اس لیے کہ اس نے اپنی محبت کی خاطر جو قربانیاں دی تھیں انہوں نے اس کی ذات کو بہت محترم بنادیا تھا۔ خط پڑھ کر میں نے شجاعت کو واپس کردیا۔

''جب تک غزالہ زندہ تھی۔'' شجاعت پھر بولے۔ ''تب تک مجھے امید تھی کہ کبھی نہ کبھی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ہم ضرور ملیں گے اور تب میں اس سے پوچھوں گا کہ اس نے میری محبت مسترد کیوں کی۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہوگیا ہے کہ ایک موڑ پر ہم پھر ملے اور تب مجھے علم ہوا کہ غزالہ نے میری محبت مسترد نہیں کی تھی بلکہ اسی کی خاطر اس نے اپنی ذات قربان کردی۔ ممکن تھا کہ اس حادثے کے بعد میں حتمی طور پر یہ فیصلہ کرلیتا کہ اب کبھی کسی اور کو غزالہ کی جگہ نہیں دوں گا لیکن میری ذات پر تنہا میرا ہی حق نہیں، میرے والدین اور معاشرے کے حقوق بھی واجب ہیں۔ میں کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرکے اپنے والدین کو صدمہ نہیں پہنچا سکتا اور جب شادی کرنا ہی ٹھہرا تو اس کے لیے تم سے اچھی رفیقِ حیات کہاں مل سکتی ہے۔ میں چاہتا تو خاموش رہ سکتا تھا مگر میں نے خاموشی کو منافقت سمجھا اور طے کیا کہ اگر سارے حالات جاننے کے بعد تم مجھے قبول کرسکو تب میں بھی انکار نہیں کروں گا۔''

''آپ کی اور غزالہ بہن کی محبت ایک مثالی محبت تھی بلکہ ہے۔'' میں نے بڑے حوصلے سے جواب دیا۔ ''اگر وہ زندہ ہوتیں اور آپ کی زندگی میں شامل بھی اور تب مجھ سے پوچھا جاتا تو میں اس وقت بھی یہی کہتی کہ مجھے آپ کے دل میں نہ سہی آپ کے قدموں میں جگہ مل جائے تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔ اب وہ نہیں ہیں تو آپ یقین کیجیے کہ ہمارا گھر ان کی یادوں سے ان کے وجود سے کبھی خالی نہیں ہوگا اور میری زندگی کا مقصد یہ ہوگا کہ اپنی محبت کو بھی اس معیار تک لانے کی کوشش کرسکوں جو آپ نے اور غزالہ بہن نے قائم کیا ہے۔''

اس گفتگو کے تقریباً ایک ماہ بعد ہماری شادی ہوگئی اور خدا کا شکر ہے میں نے شجاعت کے بارے میں جو اندازے قائم کیے تھے وہ ان سے کچھ زیادہ ہی اچھے اور بہتر ثابت ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اپنے بچوں اور دنیا والوں کے خیال سے غزالہ کا ذکر بہت کم کرتے ہیں۔ بظاہر نہ ہونے کے برابر مگر خدا بہتر جانتا ہے کہ ہمارے دل اس کی یادوں سے کبھی خالی نہیں ہوئے۔

یارِ عیار

جناب ایڈیٹر صاحب!
آداب عرض!
لوگ دوسروں کی کہانیاں لکھ کر بھیجتے ہیں۔ میں خود اپنی کہانی لکھ رہا ہوں صرف اس لیے کہ لوگ ہوشیار ہوجائیں۔ عیاری ومکاری کا بھیس بھر کر کوئی ذیشان جیسا دوست سامنے نہ آجائے۔ میری آپ بیتی پڑھ کر یقیناً لوگ ایسے دوستوں سے بچنے کی کوشش کریں گے اس لیے اسے ضرور شائع کریں۔

نعمان
(کراچی)

اس صبح میری آنکھ خود کھل گئی ورنہ اس سے پہلے ہمیشہ امی آواز دیتی تھیں اور کئی بار دیتیں تب میں اٹھتا تھا۔ مگر آج میرا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا اور آج میری آنکھ خود کھل گئی۔ میں نے ایک سال پہلے آئی کام کرلیا تھا مگر کالج میں داخلہ نہیں لیا کیونکہ میں ایک نجی یونیورسٹی میں پڑھنا چاہتا تھا۔ میرے مارکس کم آئے تھے۔ اس لیے مجھے داخلہ نہیں مل سکا۔ میں نے اپنے چند پیپرز جن میں توقع سے کم نمبرز آئے تھے انہیں پھر سے دیا اور اس بار اتنے نمبرز حاصل کر

لیے کہ مجھے یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا تھا۔ جن دنوں میں آئی کام کررہا تھا ان دنوں میری دوستی اس یونیورسٹی میں پڑھنے والے ایک لڑکے سے ہوگئی اور میں کئی بار اس سے ملنے یونیورسٹی گیا تھا۔ آج سے بارہ سال پہلے ماحول اتنا آزاد نہیں تھا جتنا اب ہوگیا ہے لیکن اس یونیورسٹی میں ماحول اس وقت بھی خاصا آزاد تھا۔ لڑکے لڑکیاں گروپ کی صورت میں پھرتے تھے اور لڑکیاں جدید مغربی انداز کی ڈریسنگ کرتی تھیں۔ ماحول دوسرے اعتبار سے بھی اچھا تھا۔ شاندار عمارت اور صاف ستھرے لان اور راستے۔ ایک نوجوان کی حیثیت سے میرے لیے یہ سب اتنا متاثر کن تھا کہ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ میں اسی یونیورسٹی میں داخلہ لوں گا۔

یونیورسٹی کا معیار بہت اونچا تھا۔ یہاں تمام شعبوں میں نہ صرف اچھے مارکس مانگے جاتے تھے بلکہ داخلے کا ٹیسٹ بھی ہوتا تھا۔ میں نے پچھلی بار بھی ٹیسٹ پاس کیا تھا بس نمبرز کی کمی سے رہ گیا مگر اس بار یہ مسئلہ بھی نہیں تھا۔ فیس اس وقت بھی اچھی خاصی تھی مگر ابو کا اپنا بزنس تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی لیدر گارمنٹ فیکٹری چلارہے تھے۔ ابو زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنا بزنس جدید خطوط پر استوار کیا ہوا تھا اور یہی وجہ تھی انہیں باہر سے آرڈر ملتے تھے اور ابو کی فیکٹری سارے سال کام کرتی تھی۔ ابو کی خواہش تھی کہ ہم تینوں بھائی بزنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور ان کا ہاتھ بٹائیں بلکہ بزنس کو آگے لے جائیں۔ میرے بڑے بھائی عرفان ابو کے ساتھ شامل بھی ہوگئے تھے۔ انہوں نے ایم بی اے کیا تھا اور دو سال بعد ابو نے انہیں دبئی بھیج دیا جہاں وہ ورلڈ بزنس کے لیے آفس چلاتے تھے اور آرڈرز حاصل کرتے تھے۔ مجھ سے بڑے کامران بھائی ایم کام کررہے تھے۔ جب میرا یونیورسٹی میں داخلہ ہوا تو کچھ عرصے بعد وہ بھی ابو کے ساتھ کاروبار میں شامل ہوگئے تھے۔

مجھ سے بڑی دو بہنیں تھیں اور دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ امی ابو لڑکیوں کی جلدی شادی کے قائل تھے اس لیے ادھر انہوں نے گریجویشن کیا اور ادھر مناسب رشتہ دیکھ کر ان کی شادی کردی گئی۔ عرفان بھائی بھی شادی شدہ تھے اور ایک سال بعد کامران بھائی کی شادی کا پروگرام تھا۔ میں نے ابھی بی بی اے آنرز میں داخلہ لیا تھا اور شادی کا مرحلہ بہت دور تھا۔ پھر میں ابھی یونیورسٹی لائف کو انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر خوشی ہورہی تھی کہ میں کم سے کم پانچ سال یونیورسٹی میں پڑھوں گا۔ میں تیار ہوکر نیچے آیا اور ناشتے کے بعد عجلت میں یونیورسٹی روانہ ہوگیا۔ پہلا دن بہت مصروف گزرا۔ تعارف اور کلاسز جاننے کے لیے جگہ جگہ جانا پڑا تھا۔ اپنے ٹیوٹرز کے بارے میں جاننا کیونکہ یہ بھی طلبا کی ذمے داری تھی۔ پھر کلاسز اور کورس کی فکر لگ گئی کہ آنے والے ٹرمز کے لیے سلیبس کیا ہوگا۔ وہ جو سوچ کر گیا تھا کہ جاتے ہی انجوائے منٹ شروع ہوجائے گی تو یہ خواب دھرا کا دھرا رہ گیا لیکن اس روٹین لائف اور تعلیم کا بھی اپنا ایک مزہ تھا پھر رفتہ رفتہ دوسروں سے تعارف ہونے لگا۔ کچھ لڑکے لڑکیوں سے سلام دعا ہوئی۔ فارغ وقت میں ہم ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔ مگر اس سے آگے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ سب سلجھے ہوئے اور اچھے گھرانوں کے لڑکے لڑکیاں تھے جو اپنی حد جانتے تھے اور یہاں پڑھنے کے لیے آئے تھے۔

دوسری قسم کے طلبا کی کمی نہیں تھی جو اصل میں یہاں کے کھلے ماحول سے فائدہ اٹھا کر افیئر کرنے آتے تھے۔ ان میں لڑکے اور لڑکیاں برابر تھے۔ جب میں نے دیکھا تو مجھے بھی یہ سب بہت رومانٹک لگا تھا لیکن جب میں خود یونیورسٹی آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اسے اتنا پسند بھی نہیں کیا جاتا ہے۔ سلجھے ہوئے اور سنجیدہ طالب علم اس قسم کی سرگرمیوں سے الگ رہتے تھے۔ وہ آپس میں ہنستے بولتے تھے دوستیاں تھیں اور سنگ بھی ہوتی تھی لیکن اس میں جنس کا جذبہ شاذو نادر ہی شامل ہوتا تھا اور اگر ہوتا تو اس میں وقت گزاری کے بجائے سنجیدگی شامل ہوتی تھی۔ میں جس گروپ کے ساتھ تھا اس سے میری دوستی گہری ہوتی جارہی تھی اور اگر شاید میں کچھ عرصے اور ان کے ساتھ رہتا تو ان کے رنگ میں رنگ جاتا مگر ان ہی دنوں میری ملاقات ذیشان سے ہوگئی۔

اس دن اتفاق سے میرے گروپ کا کوئی فرد نظر نہیں آ رہا تھا اور پیریڈ بھی خالی تھا۔ میں لان میں ایک درخت تلے بنچ پر بیٹھا ہوا آنے والے ٹیسٹ کے نکات تیار کررہا تھا کہ ایک شخص آکر میرے برابر میں بیٹھ گیا۔ وہ سگریٹ پی رہا تھا۔ سردی بہت زیادہ نہیں تھی لیکن اس نے سرخ رنگ کی ہلکی لیدر جیکٹ پہن رکھی تھی جو اس کے بالوں کے رنگ سے میچ کررہی تھی۔ وہ تیکھے نقوش اور سرخ و سفید رنگت والا تقریباً تیس برس کا مرد تھا۔ اس وقت میں سمجھا کہ وہ یونیورسٹی کا کوئی ملازم ہے یا کسی سے ملنے آیا ہے۔ اس نے اچانک کہا۔ ”مجھ سے دوستی کروگے؟“

میں حیران ہوا کیونکہ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں

دیکھا تھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

”ذیشان رضا۔“ اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”حال ہی میں مائیگریٹ کرکے یہاں آیا ہوں۔ ماسٹر کررہا ہوں ماس کمیونیکیشن میں۔“

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ خاصی عمر میں ماسٹر کررہا تھا۔ یہ کام اسے پانچ چھ سال پہلے کرلینا چاہیے تھا۔ اس نے میری حیرت بھانپ لی۔ ”ہاں کچھ لیٹ ہوا ہوں اصل میں ماں باپ نے بگاڑا ہے۔ پیسا بے حساب ہے اور مجھے کھلا دیا، اسی وجہ سے کچھ بگڑ بھی گیا تھا مگر اب تعلیم کی طرف توجہ ہے تم اچھے لگے اس لیے تم سے دوستی کا کہہ دیا۔“ اس نے کہتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ویلکم ٹو یونیورسٹی۔“

اس نے سگریٹ پھینک کر بجھایا اور کھڑا ہوگیا۔ ”آؤ اسی پر کچھ ہوجائے کیفے ٹیریا چلتے ہیں۔“

لنچ کا وقت تھا اس لیے میں نے اس کی پیشکش قبول کرلی۔ کیفے ٹیریا میں اس سے بات ہوئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بہت اچھا بولنے والوں میں سے ہے، وہ دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتا تھا اور انہیں اپنے ٹرانس میں لے آتا تھا۔ وہ بہت بے تکلفی سے بولتا تھا۔ اس کی باتوں میں ایک خاص چاشنی اور تجربہ تھا جس سے میں محروم تھا اس لیے جب میں اگلے پیریڈ کے لیے اس کے پاس سے اٹھا تو اس سے دوستی پکی ہوچکی تھی۔ میں یونیورسٹی کی بس میں گھر آتا جاتا تھا کیونکہ امی بائیک کی سخت مخالف تھیں اور انہوں نے ہم میں سے کسی بھائی کو بائیک چلانے یا رکھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ہم دوستوں کے ساتھ چوری چھپے شوق پورا کرلیتے تھے لیکن کھل کر نہیں چلا سکتے تھے۔ گھر میں دو گاڑیاں تھیں ایک ابو اور کامران بھائی دفتر آنے جانے کے لیے استعمال کرتے تھے دوسری گھر کے لیے ہوتی تھی۔ اگر میں ابو سے کہتا تو مجھے گاڑی مل جاتی مگر مجھے اس کا شوق نہیں تھا اور بس میں آنا جانا ٹھیک تھا۔ لیکن اس روز میں گیٹ تک آیا تو پیچھے سے ایک سیاہ اسپورٹس کار آکر میرے برابر میں رکی اور ذیشان نے جھانکا۔ ”وانا لفٹ؟“

”شیور۔“ میں اس کے برابر میں آبیٹھا۔ مجھے اس کی یہ کار اچھی لگی تھی۔ یہ بہت جدید ماڈل تو نہیں تھا لیکن اس نے اسے بہت سجا سنوار کر رکھا تھا۔ کار میں مہنگا میوزک سسٹم لگا ہوا تھا۔ راستے میں اس نے اسے چلا کر دکھایا۔ مجھے میوزک کا شوق تھا۔ اس کے بعد اکثر ایسا ہونے لگا کہ میں اس کے ساتھ ہی واپس گھر آتا تھا۔ ہم ڈیفنس کمرشل ایریا کے پیچھے رہتے تھے اور ذیشان کی رہائش کلفٹن میں تھی۔ بے تکلف تو وہ پہلے دن ہوگیا تھا لیکن لڑکیوں پر بات ذرا دیر سے شروع ہوئی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس معاملے میں گرو تھا اور ایک زمانہ تھا جب لڑکیاں اس کے گرد یوں منڈلاتی تھیں جیسے مکھیاں گڑ پر منڈلاتی ہیں۔ مگر پھر اس نے یہ سب چھوڑ دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے گہری سانس لی۔

”یار یہ سب عمر کے ساتھ اچھا لگتا ہے، میں اب اکتیس برس کا ہوچکا ہوں اور مجھ پر یہ حرکتیں سوٹ نہیں کرتی ہیں۔“

”لیکن تم یونیورسٹی میں بھی تو پڑھ رہے ہو؟“ میں نے یاد دلایا۔ ”یہ عمر بھی نہیں ہے ماسٹر کی، لیکن تم کررہے ہو۔“

وہ مجھ سے پورے بارہ سال بڑا تھا لیکن اب میں اس سے تم سے بات کرتا تھا۔ اس نے خود مجبور کیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ میں نے آپ جناب کیا تو ہماری دوستی ختم ہوجائے گی۔ اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں لیکن پڑھنے کے لیے کوئی عمر مخصوص نہیں ہے لیکن ان سرگرمیوں کے لیے انسان کو جو جذبہ اور توانائی چاہیے ہوتی ہے وہ اب مجھ میں نہیں ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ”تم نے اب تک کوئی گرل فرینڈ نہیں بنائی ہے۔“

میں شرمندہ ہوگیا۔ ”نہیں اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔“

”تو یار سوچنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اپنے آس پاس دیکھو اور جو لڑکی خوب صورت اور ذرا کھلی ہوئی ہو اس سے بات کرو اگر مان گئی تو ٹھیک ہے ورنہ لڑکیوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔“

میں نے اس وقت ذیشان کی بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ مگر آنے والے چند مہینوں میں ذیشان کی اور بھی چند لڑکوں سے دوستی ہوئی تھی اور یوں ہمارا ایک گروپ بن گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے گروپ میں شامل سب لڑکے شکل و صورت کے لحاظ سے اچھے تھے۔ وہ لڑکیوں کے لیے پُرکشش تھے۔ یہ سب میرے مقابلے میں زیادہ تیز اور بولڈ تھے۔ ذیشان کی شاگردی میں آئے تو جلد انہوں نے... پر پُرزے نکالنا شروع کردیئے تھے۔ شروع میں ذیشان اور مجھ سمیت صرف پانچ افراد کا گروپ تھا مگر جلد اس میں لڑکیاں بھی شامل ہوگئیں اور یہ سب ویسی تھیں جن سے ذیشان نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

افیئر چلانے کا مشورہ دیا تھا۔

مجھے کئی بار ذیشان کے ساتھ اس کی رہائش پر جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ کلفٹن کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ تین کمروں کے اس فلیٹ میں کوئی خاص بات نہیں تھی سوائے اس کے کہ یہ نہایت مہنگے علاقے میں تھا اور ذیشان کی ضرورت کے لحاظ سے کافی تھا۔ اس میں دو بیڈ رومز اور ایک لاؤنج تھا۔ ایک بیڈ روم جس کا دروازہ الگ سے باہر کھلتا تھا اس نے سٹنگ کے لیے مخصوص کیا ہوا تھا۔ اس میں ایک صوفہ سیٹ، قالین اور ایک طرف دیوار پر بہت بڑا سا ریک تھا جس میں ٹی وی، سی ڈی پلیئر، سی ڈیز، کتابیں، رسائل، شوپیش اور بہت کچھ رکھا ہوا تھا۔ میں یا دوسرے لڑکے جاتے تو ذیشان ہمیں یہیں بٹھاتا تھا۔ اس سے دوستی ہوئے چھ مہینے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا لیکن آج تک مجھے یا کسی لڑکے کو اس کے گھر والوں کا پتا نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے گھر والے اندرون سندھ رہتے ہیں لیکن لہجے سے وہ اندرون سندھ کا رہنے والا نہیں لگتا تھا۔ اس سے زیادہ اس نے کبھی بتایا نہیں، اگر کبھی اس کے گھر والوں پر بات ہوتی تو وہ اسے گھما جاتا تھا۔

اب تک میں نے کسی لڑکی سے دوستی نہیں کی تھی لیکن گروپ کے دو لڑکوں زوہیب اور وقاص نے دوستیاں کر لی تھیں۔ شانزا اور ماہم ہمارے گروپ میں شامل ہوئی تھیں۔ کچھ عرصے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ یونیورسٹی کے علاوہ بھی زوہیب اور وقاص کے ساتھ ڈیٹ پر جاتی تھیں۔ ان کا افیئر چند مہینے چلا اور پھر سب نے اپنی اپنی راہ لی تھی، اس دوران میں تیسرے لڑکے فراز نے ایک لڑکی سمیرا سے دوستی کر لی تھی۔ یہ سب دیکھ کر مجھے بھی شوق ہونے لگا کہ میں کسی لڑکی سے دوستی کروں مگر ایک تو میری ہمت نہیں ہوتی تھی دوسرے اب تک مجھے کوئی لڑکی اپنے معیار کی نظر نہیں آئی تھی، میں اس معاملے میں خاصا انتخاب پسند ہوں۔ دوسری طرف ذیشان اور لڑکوں کی طرف سے مجھ پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ وہ ڈھکے چھپے انداز میں اور ہلکا مذاق کرتے ہوئے ایسی باتیں کہہ جاتے تھے جو میرے دل میں رہ جاتیں اور میں سوچتا کہ میں بھی کچھ کر کے دکھاؤں گا۔ مگر کچھ ہمت نہیں تھی اور کچھ موقع نہیں ملا۔

زوہیب اور وقاص نے دوسری لڑکیوں سے دوستیاں کر لی تھیں اور یہ بھی پہلے والیوں کی طرح فلرٹ تھیں۔ وہ خود پسند کے لڑکوں سے دوستی کرتیں اور جب دل بھر جاتا تو بائی بائی کہہ کر رخصت ہو جاتی تھیں۔ اکثر کا تعلق اپر کلاس یا اپر مڈل کلاس سے تھا اور ان کے نزدیک یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ان گھرانوں میں لڑکے اور لڑکیوں کی سرگرمیوں میں خاص فرق نہیں تھا۔ ہاں اس وقت فرق پڑتا تھا جب کسی افیئر کا نتیجہ برآمد ہونے لگتا۔ ایک دن زوہیب کچھ پریشان دکھائی دیا اس کی گرل فرینڈ تانیہ بھی دو دن سے غائب تھی۔ ذیشان نے پوچھا تو پہلے زوہیب ٹالتا رہا پھر اس نے اگل دیا۔ اتفاق سے وہاں بس ہم تین تھے۔ زوہیب نے ذیشان کے اصرار پر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”یار مجھ سے اور تانیہ سے غلطی ہوئی۔ وہ اب پریگنینٹ ہے۔“

میں جانتا تھا کہ میرے ساتھی اپنی گرل فرینڈز سے جسمانی تعلق رکھتے تھے لیکن بات اس حد تک پہنچ جائے گی یہ میں نے سوچا نہیں تھا۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”یہ تو برا ہوا یار۔“

ذیشان نے میری طرف دیکھا اور کسی قدر مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا۔ ”برخوردار تمہیں ان معاملات کا کیا پتا..... یہ تو عام سی بات ہے۔“ پھر وہ زوہیب کی طرف مڑا۔ ”تو معاملہ ختم کرو..... دوا سے کام چل جائے گا یا سرجری کرانا پڑے گی؟“

”آپریٹ ہی ہوگا۔“ زوہیب مردہ لہجے میں بولا۔

”تانیہ کے گھر والوں کو پتا ہے؟“

”اگر انہیں پتا ہوتا تو اب تک وہ مر چکی ہوتی اُس کا باپ پکا ’مذہبی‘ ہے۔“

ذیشان نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”باپ اتنا ’شریف‘ بیٹی بن بیاہی ماں بننے والی ہے۔“

”یار کوئی حل بتاؤ..... میرا تو سر گھوم رہا ہے۔“

زوہیب کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا۔ درحقیقت ہم سب ہی کھاتے پیتے گھرانوں سے تھے، کوئی بھی غریب یا متوسط گھر کا نہیں تھا۔ ذیشان نے سوچ کر کہا۔ ”ایک ڈاکٹر ہے میرا جاننے والا ہے وہ یہ کام کر دے گا مگر فیس اچھی لیتا ہے۔“

”مرد ڈاکٹر ہے۔“ زوہیب نے غور کیا۔

”یار وہ وقت گیا جب اس قسم کے معاملات لیڈی ڈاکٹر دیکھتی تھیں اب تو مرد ڈاکٹر آپریشن کر رہے ہیں اور ڈلیوری بھی کراتے ہیں۔ بہرحال میرا ایک جاننے والا ہے، آدمی قابلِ اعتماد ہے۔“

”میں تانیہ سے بات کرتا ہوں۔“ زوہیب نے کہا،

پھر اگلے روز اس نے ذیشان سے کہا کہ وہ بات کر لے۔ ایک دن بعد تانیہ کا صبح سویرے آپریٹ ہوا اور وہ شام تک اس ڈاکٹر کے کلینک میں رہی تھی۔ دوپہر تک تو یونیورسٹی کا بہانہ تھا اس کے بعد اس نے ایک دوست کے گھر سالگرہ کی بات کی ہوئی تھی۔ دواؤں اور ڈرپ سے اس کی حالت شام تک اتنی بہتر ہوئی کہ وہ گھر جانے کے قابل ہو گئی تھی۔ یوں یہ معاملہ صفائی اور خاموشی سے ختم کر دیا گیا۔ زوہیب کا تقریباً ستر ہزار روپے کا خرچ ہوا تھا مگر وہ خوش اور مطمئن تھا۔ اس کے بعد اس کی اور تانیہ کی دوستی ختم ہو گئی۔ غالباً زوہیب خود بھی اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا اس کا کام تو نکل چکا تھا۔ کچھ دن بعد وہ ایک اور لڑکی کے ساتھ نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

”ایکسکیوز می!“ میرے برابر میں بیٹھی لڑکی نے سرگوشی میں کہا۔ آج ایک وزیٹر پروفیسر کا ہال لیکچر تھا، یہ یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں ہو رہا تھا۔ یہ لڑکی کسی اور شعبے میں تھی۔ ”آپ کے پاس ایکسٹرا پین ہوگا میں اپنا پین بھول آئی ہوں۔“

”کیوں نہیں۔“ میں نے اسے پین دیا۔ سب نوٹ اتارنے میں مصروف تھے۔ اس وقت میں نے توجہ نہیں دی تھی لیکن جب لیکچر ختم ہوا اور میں اٹھنے لگا تو اس نے پین واپس کرنا چاہا۔

”تھینک یو آپ کی مدد سے یہ لیکچر نوٹ ہو گیا۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے آپ رکھیں آج مزید نوٹ بھی لکھنے ہوں گے مس.....“ میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھا اور کچھ دیر کے لیے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اتنی حسین اور معصوم صورت لڑکیاں میں نے بہت کم دیکھی تھیں مطلب کہ حسین بھی دیکھی تھیں اور معصوم بھی لیکن ان دونوں کا امتزاج بہت کم دیکھا تھا اور ایسا تو پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

”مہک نار۔“ اس نے کہا۔

”آپ کا نام آپ کی طرح منفرد ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے نعمان کہتے ہیں۔“

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ اس نے بے تکلفی سے ہاتھ آگے کیا اور میں نے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام لیا تھا۔ ”کس شعبے میں ہیں؟“

”میں مارکیٹنگ میں ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں فنانس میں ہوں۔“ وہ بولی۔ ”میرے بی بی اے آنرز کا پہلا سمسٹر ہے۔“

”میرا تیسرا ہے۔“

ہم باہر آئے اور بات کرتے ہوئے بے خیالی میں لان پر جا بیٹھے، وہ بات کرتے کرتے اچانک چونکی اور اس نے اپنی سنہری کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی۔ ”میری کلاس کا وقت ہو گیا ہے۔“

”میری بھی۔“ میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔ ”مگر جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔“

اس کا چہرہ گلابی ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے کسی لڑکی سے اکیلے میں اتنی دیر بات کی تھی اور مجھے ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مہک سے دوسری ملاقات چند دن بعد ہوئی حالانکہ میں روز اسے تلاش کرتا تھا کہ وہ کہیں نظر آئے بس اس کے شعبے میں نہیں گیا تھا۔ وہ لائبریری میں ملی وہاں وہ کمپیوٹر پر کچھ کر رہی تھی۔ میں اس سے کچھ دور جا کر بیٹھ گیا۔ جب وہ کام کر کے اٹھی تو میں اس کے پاس آیا۔ ”ہیلو.....“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں میں چمک آئی تھی۔ ”ہائے..... کیسے ہیں آپ؟“

”اب فائن ہوں۔“

”کیوں پہلے کیا ہوا تھا؟“ وہ ذرا پریشان ہوئی۔

”آپ کو دیکھا نہیں تھا تین دن سے.....“

اس کا چہرہ گلابی ہوا پھر اس نے کسی قدر شوخی سے کہا۔ ”آپ تو مجھے تین دن سے جانتے ہیں اس سے پہلے کیسے فائن رہتے تھے؟“

”تین دن پہلے جب جانتا ہی نہیں تھا تو فائن رہنا مسئلہ نہیں تھا مگر اب جان گیا ہوں تو فائن رہنا مشکل ہو گیا ہے۔“ اس کے ردِعمل نے مجھے حوصلہ دیا تھا کہ میں ذرا کھل کر بات کروں۔

”کیا جان گئے ہیں؟“

”یہ کہ آپ کو دیکھے بغیر فائن نہیں رہ سکتا۔“

ہم لائبریری سے باہر آئے۔ اس نے اپنے شریر بال سمیٹے۔ ”میں یہیں تو ہوتی ہوں۔ آپ تلاش کر لیتے۔“

”تلاش کیا بس آپ کی کلاس تک آنے کی کسر رہ گئی تھی۔“

”میں نے آپ کو کئی بار دیکھا۔ آپ کے بارے میں پتا چلا۔“

”اچھا کیا پتا چلا؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یہی کہ آپ کا گروپ تو ایسے ہی ہے لیکن باقی سب آپ کی تعریف کرتے ہیں۔"

"ایسے ہی گروپ سے کیا مراد ہے؟"

وہ جھجکی۔ "یہاں یہ شکاری گروپ مشہور ہے۔ اس کے لڑکے لڑکیوں سے چکر چلاتے ہیں۔"

"تو وہ جن لڑکیوں سے چکر چلاتے ہیں کیا وہ شریف اور سیدھی لڑکیاں ہوتی ہیں؟" میں سنجیدہ ہوگیا۔ "کیا وہ خود فلرٹ نہیں ہوتی ہیں۔ جن لڑکیوں کی بات کی جاتی ہے وہ خود کیا کر رہی ہیں اور اب تک کرتی رہی ہیں۔"

"میں نہیں جانتی، میں تو وہ بتا رہی ہوں جو میں نے دوسروں سے سنا ہے۔"

"یہ دوسرے میری کس بات پر تعریف کرتے ہیں؟"

"یہی کہ آپ کا کسی لڑکی سے افیئر نہیں ہوا اور آپ ان لوگوں کے ساتھ ہونے کے باوجود اپنی اسٹڈی پر پوری توجہ دیتے ہیں۔"

"یہ لوگوں کی مہربانی ہے کہ وہ میرے بارے میں ایسی رائے رکھتے ہیں۔" میں اس بار ہنسا۔ "سوری، مجھے دوسرے کی بات پر ذرا غصہ آ گیا تھا۔"

میرا موڈ اچھا ہوا تو اس نے بھی سکون کا سانس لیا تھا وہ بھی ہنسی۔ "جو میں نے کہی۔"

"یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ کی رائے میرے لیے اچھی ہوئی۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ "میری رائے کسی کے کہنے یا نہ کہنے سے اچھی یا بری نہیں ہوگی۔"

اس دن اتفاق سے ہم دونوں کے پیریڈز خالی تھے یا پھر ہم جان کر نہیں اٹھے۔ ہم باتیں کرتے رہے۔ مہک نے اپنے بارے میں بتایا اس کے پاپا ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں تھے اور دبئی میں ہوتے تھے۔ مہک کی امی اور چھوٹے بہن بھائی بھی دبئی میں ہوتے تھے، وہ خود یہاں اپنے شادی شدہ بھائی اور بھابی کے ساتھ رہ رہی تھی۔ انٹر اس نے بھی دبئی سے کیا تھا پھر ایم بی اے کے لیے کراچی آ گئی تھی۔ صبح اس کے بھائی دفتر جاتے ہوئے یونیورسٹی چھوڑ جاتے تھے اور دوپہر میں وہ پوائنٹ سے چلی جاتی تھی۔ اس کا بھابی سے نارمل تعلق تھا نہ بہت دوستی تھی اور نہ ہی کوئی ٹینشن والی بات تھی۔ اس لیے وہ خوش تھی مگر کبھی کبھی بور بھی ہوتی تھی۔ سات سال کی عمر سے دبئی میں تھی اس لیے یہاں اس کی دوستی بھی کسی سے نہیں تھی۔ ذہنی لحاظ سے براڈ مائنڈڈ تھی مگر لڑکوں سے لیے دیے رہتی تھی میں پہلا لڑکا تھا جس سے وہ بے تکلف ہوئی تھی اور بات کر لیتی تھی۔ چند دن بعد میں گھر سے گاڑی لے کر آیا اور جب چھٹی کا وقت آیا تو اسے لفٹ کی پیشکش کی۔ وہ مان گئی اور راستے میں کہا۔

"میرا تو خیال تھا کہ آپ پوائنٹ سے آتے جاتے ہیں۔"

"ہاں لیکن کبھی کبھی گاڑی بھی لے آتا ہوں اگر کہیں اور جانا ہو لیکن آج میں صرف اس لیے لایا کہ آپ کے ساتھ یونیورسٹی سے باہر بھی کچھ وقت گزار سکوں۔"

"آپ میرا ساتھ کیوں چاہتے ہیں؟" اس نے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"شاید اس لیے کہ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔" میں نے ہچکچا کر کہا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ میں آپ کو کیسا لگتا ہوں۔"

"آپ بھی مجھے اچھے لگتے ہیں۔" اس نے ایک دبی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں خوش ہوگیا۔ آنے والے چند دنوں میں ہم خاصے قریب ہوگئے تھے لیکن میں نے یہ احتیاط کی تھی کہ مہک کو اپنے گروپ سے دور رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ان سے ملے اور ساتھ بیٹھے کیونکہ میں مہک کے ساتھ فلرٹ نہیں کر رہا تھا۔ میں اس کے لیے اپنے اندر سچ مچ اچھا جذبہ رکھتا تھا۔ اس لیے کبھی ایسا ہوتا کہ میں مہک کے ساتھ ہوتا اور میرے گروپ میں سے کوئی دیکھ لیتا تو میں بہانے سے مہک کے پاس سے اٹھ جاتا تھا۔ مہک سے ملنے کے بعد میں نے ذیشان اینڈ کمپنی سے ملنا جلنا بھی کم کر دیا تھا۔ گزشتہ کچھ عرصے سے میں خود کو ان میں مس فٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ خاص طور سے جب سے زوہیب تانیہ والا واقعہ ہوا تھا، مجھے لگا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔ بے شک میں کسی چیز میں ان لوگوں کے ساتھ شامل نہیں تھا لیکن ان کے ساتھ تو رہتا تھا۔ مہک کی باتوں سے مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ یونیورسٹی کے کھلے ماحول میں بھی ہمارے گروپ کے بارے میں کیسی باتیں ہو رہی تھیں اور میرے بارے میں لوگ کیا رائے رکھتے ہیں؟

ایک دن میں کلاس سے نکلا تو زوہیب اور وقاص مل گئے۔ میں ان کے ساتھ کیفے ٹیریا میں آیا جہاں ذیشان اور فراز بھی آ گئے۔ توقع کے عین مطابق ان کا موضوع مہک تھی۔ جیسے ہی انہوں نے اس پر ذرا کھل کر بات کی میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پلیز..... یہ فلرٹ نہیں ہے۔"

"تو بھائی سحرش کا انتخاب کرنا تھا۔" وقاص نے طنزیہ انداز میں ایک لڑکی کا نام لیا جو معمولی سی شکل و صورت کی اور بہت چھوٹے قد کی تھی جب کسی گئی گزری لڑکی کی مثال دینی ہوتی تو سحرش کا نام لیا جاتا تھا۔

"یہ انتخاب نہیں اتفاق ہے۔" میں نے کہا۔ "دوسرے یہ صرف دوستی ہے۔"

"ہم بھی دوستی کرتے ہیں۔" فراز ڈھٹائی سے بولا۔ "بس ذرا پاس آ کر کرتے ہیں۔ تم دور دور ہوا بھی صرف باتیں کر رہے ہو۔"

ذیشان خاموش تھا اور اس نے میرا موڈ دیکھا تو اچانک بولا۔ "چھوڑو یار نعمان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ اچھی لڑکی ہے۔"

"ساری لڑکیاں اچھی ہوتی ہیں۔" زوہیب ہنسا۔ "بعد میں زیادہ اچھی ہو جاتی ہیں۔"

وہ کچھ دیر مجھے چھیڑتے رہے پھر ذیشان کے کہنے پر بہ مشکل خاموش ہوئے تھے۔ میں نے سکون کا سانس لیا کیونکہ میں ان لوگوں سے بھی بات نہیں خراب کرنا چاہتا تھا۔ کچھ بھی صحیح وہ بہر حال میرے دوست تھے۔ بعد میں ذیشان نے اکیلے میں مجھے تسلی دی۔ "فکر مت کرو یار، میں سمجھتا ہوں مہک اچھی لڑکی ہے اور تم اس سے ہٹ کر ٹریٹ کر رہے ہو۔"

"میں بھی بس یہ چاہتا ہوں کہ ہم اسے اس طرح نہ لیں جیسے دوسری لڑکیوں کو لیتے رہے ہیں وہ ان سے الگ ہے۔"

ذیشان نے سر ہلایا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن نعمان ایک بات یاد رکھو۔ محبت کے معاملے میں سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں، نادان اور مجبور، اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان کا کردار اور سوچ کیا ہے۔ وہ مان بھی جاتی ہیں اور جھک بھی جاتی ہیں۔"

"لیکن مہک ایسی نہیں ہے۔"

"دیکھتے ہیں۔" اس نے سر ہلایا۔

زوہیب کی گرل فرینڈ تانیہ نے ابارشن کے کچھ عرصے بعد یونیورسٹی چھوڑ دی تھی۔ زوہیب اسے پہلے ہی چھوڑ چکا تھا اس لیے اس کی کوئی خیر خبر نہیں آئی۔ ایک دن میں اور مہک یونیورسٹی لان میں بیٹھے ہوئے تھے کہ تانیہ غیر متوقع طور پر آئی اور اس نے آتے ہی مہک سے کہا۔ "یہ تم کس کے چکر میں آ گئی ہو، یہ بھی اس خبیث کا ساتھی ہے۔"

تانیہ کی حالت عجیب ہو رہی تھی وہ بہت کمزور اور پیلی لگ رہی تھی۔ اس کے بال روکھے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ مہک شاید اسے جانتی تھی اس نے پریشان ہو کر کہا۔ "یہ تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے۔"

"اس کا ذمے دار اس کا ساتھی ہے۔" تانیہ نے میری طرف اشارہ کیا تو مجھے غصہ آ گیا۔

"میں ہوں یا تم خود ہو..... تم نے اس سے فلرٹ کیا اور اس کا یہی انجام ہونا تھا، اب تم مجھے یا کسی اور کو الزام نہیں دے سکتیں۔"

"میں زوہیب کی بات نہیں کر رہی ہوں۔" اس نے نفرت سے کہا اور جیسے اچانک آئی تھی اسی طرح اچانک ہی چلی بھی گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل تھی اور وہ شاید کسی کام سے یونیورسٹی آئی تھی۔ مہک اٹھ کر اس کے پیچھے گئی لیکن وہ گاڑی میں بیٹھ کر نکل گئی۔ مہک کو اس کا قصہ نہیں معلوم تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے ہچکچاتے ہوئے بتا دیا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ مہک دنگ رہ گئی اس نے کہا۔ "میں اسے جانتی ہوں یہ اچھی لڑکی ہے اور اس کے ساتھ اتنا برا ہوا۔"

"ہاں مجھے بھی اس کا افسوس ہے لیکن اس میں وہ برابر کی قصوروار تھی۔"

"وہ کہہ رہی تھی کہ اس کا اشارہ زوہیب کی طرف نہیں ہے پھر وہ کس کی طرف اشارہ کر رہی تھی؟"

میں بھی سوچ میں پڑ گیا اگر تانیہ کا اشارہ زوہیب کی طرف نہیں تھا تو پھر وہ کسے خبیث قرار دے رہی تھی اور کیوں کہہ رہی تھی جب کہ جو ہوا اس میں اس کی مکمل رضامندی شامل تھی۔ اس کا میں گواہ ہوں اس کے ساتھ ذرا بھی زیادتی نہیں ہوئی۔ بہر حال کچھ دیر بعد میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا تھا البتہ چند دن بعد سب بیٹھے تھے کہ مجھے یاد آیا تو میں نے پوری بات سنائی۔ زوہیب اور باقی سب چونک گئے تھے۔ ذیشان نے پوچھا۔ "اس نے بتایا نہیں کہ وہ کسے خبیث قرار دے رہی تھی؟"

"نہیں، وہ بہت پریشان اور بکھری ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔ "کمزور اور بیمار بھی لگ رہی تھی۔"

"ایسے کرتوت ہوں گے تو آدمی کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔" ذیشان نے بے پروائی سے کہا۔

"پر یار اس میں ہم مردوں کا زیادہ قصور ہوتا ہے۔ ہم ہی تو انہیں پیار کے جال میں پھنساتے ہیں۔"

"بھائی یہ پھنسنے کو تیار ہوتی ہیں تو پھنساتے ہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

نا۔" وقاص نے کہا۔

"میں ایسی دس لڑکیوں کو جانتا ہوں جو اچھے کردار کی ہیں لیکن انہیں دھوکے سے پھنسایا گیا۔"

"میں بھی ایسی دس لڑکیوں کو جانتا ہوں جو اتنے مضبوط کردار کی ہیں کہ لڑکے تمام جتن کر کے رہ گئے اور وہ ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔" فراز نے کہا۔ "یار یہ تو خود پر ڈیپینڈ کرتا ہے نا.... پھر اس چکر میں لڑکے اکیلے تو مزہ نہیں کرتے ہیں یہ لڑکیاں بھی پورا انجوائے کرتی ہیں اور پھر معصوم بن جاتی ہیں کہ وہ لٹ گئیں یا ان کے ساتھ دھوکا اور زیادتی ہوئی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میرا خیال ہے لڑکوں کی ذمّے داری زیادہ ہے۔" میں نے کہا تو ذیشان نے مسکرا کر کہا۔

"لگتا ہے آج کل تم باقاعدگی سے جمعہ پڑھنے جا رہے ہو۔"

میں جھینپ گیا۔ "ایسی بات نہیں ہے، سب کہہ رہے تھے تو میں نے بھی اپنی بات کہہ دی، ضروری تو نہیں ہے جیسے تم لوگ سوچتے اور کرتے ہو میں بھی اسی طرح سوچوں اور کروں۔"

"میرے دوست دوستی اسی کا نام ہے ورنہ پھر دوستی کہاں رہی۔" ذیشان نے اصرار کیا۔

"یہ کہاں سمجھے گا اس کی لو اسٹوری تو ابھی تک پاکیزہ ہے۔" فراز نے طنز کیا۔

"سمجھ جائے گا ابھی تو آغاز ہے۔" ذیشان نے کہا۔ "محبت اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔"

میں چپ ہو گیا اور پھر موضوع بدل گیا۔ چند مہینے بعد مہک کی برتھ ڈے تھی اور میں پہلی بار اسے باہر لے گیا۔ وہ گھر سے سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کر کے آئی تھی اور ہم سی ویو پر ایک ریستوران میں گئے تھے۔ وہاں ڈنر کیا، میں نے مہک کو ایک چھوٹا سا لاکٹ گفٹ کیا۔ پھر اس کے اصرار پر میں اسے جلدی اس کے گھر کے پاس چھوڑ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہم باہر ملے تھے لیکن آخری موقع نہیں تھا۔ ایک بار آدمی کوئی کام کر لیتا ہے تو یہ اسے دوبارہ اور بار بار کرنے کا سب سے مضبوط جواز بن جاتا ہے۔ مہک بڑی مشکل سے اس ڈنر کے لیے مانی تھی لیکن اس کے بعد جب میں اسے باہر ملنے کو کہتا تو وہ معمولی سی ہچکچاہٹ اور مزاحمت کے بعد مان جاتی تھی۔ ہم ہر ہفتے ہی باہر ملنے لگے تھے۔ ایک بار ذیشان نے ہمیں باہر دیکھ لیا لیکن وہ ہمارے پاس نہیں آیا۔ اگلے دن یونیورسٹی میں اس نے کہا۔ "تم مہک سے باہر ملتے ہو؟"

میں نے ہچکچا کر سر ہلایا۔ "ہاں ہم کبھی کبھی باہر ملتے ہیں۔"

"اور مجھے بتایا بھی نہیں، اچھے دوست ہو۔" اس نے شکوہ کیا۔

"سوری یار، مجھے خیال نہیں رہا۔"

"اٹس او کے۔" اس نے کہا پھر پوچھا۔ "کہاں لے جاتے رہے ہو؟ میرا مطلب ہے ان ڈور بھی لے کر گئے یا آؤٹ ڈور لے کر گھومتے رہے ہو؟"

"نہیں یار انڈور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے جواب دیا۔ "وہ اس قسم کی لڑکی نہیں ہے۔"

"لڑکی صرف لڑکی ہوتی ہے۔" اس نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "اس کی کوئی قسم نہیں ہوتی ہے۔"

"میں نے کہا نا وہ اس قسم کی لڑکی نہیں ہے۔" میں جھنجلا گیا۔

"برا کیوں مناتے ہو یار میں نے ایک جنرل بات کی ہے۔" ذیشان نے نارمل لہجے میں کہا۔ ویسے تمہارا دل نہیں چاہتا کہ اس سے اکیلے میں ملو ذرا بے تکلف ہو کچھ رومان ہو۔"

"میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔"

"تو سوچو یار کیا خالی خولی محبت کرتے رہو گے یار کچھ مزہ تو ہونا چاہیے۔"

"پلیز تم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"او کے جیسی تمہاری مرضی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "لیکن اگر میرے فلیٹ کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دینا۔"

"مجھے کبھی اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" میں نے یقین سے کہا۔

ذیشان نے بات بدل دی یعنی اب وہ اس پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب مہک سے اگلی ملاقات ہوئی تو مجھے خیال آیا کہ اگر ہم اکیلے میں ملیں تو کیا میں اور وہ خود پر قابو رکھ سکیں گے۔ ہم محبت کرنے لگے تھے اور ایک بار مرد عورت ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں تو جسمانی یکجائی

میں بھی جھجک باقی نہیں رہتی ہے۔ میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ مہک اور میری یونیورسٹی سے باہر ملاقات عام طور پر کسی پبلک پلیس پر ہوتی تھی اور وہ بھی شام سے پہلے کیونکہ مہک اس کے بعد گھر سے باہر نہیں رہتی تھی۔ اقرار و پیمان کے بعد میں نے اس سے کہا کہ جیسے ہی میرا آنرز مکمل ہو گا میں اپنے گھر والوں کو اس کے رشتے کے لیے بھیجوں گا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں مہک کے گھر والے قبل از وقت ہی اس کا رشتہ کہیں طے نہ کر دیں لیکن اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ اس کے ماں باپ کھلے ذہن کے تھے اور وہ اس سے پوچھے بغیر اس کا رشتہ طے نہیں کریں گے۔

میرا چوتھا سمسٹر تھا اور مہک کا دوسرا تھا۔ اس کے یقین دلانے پر میرا خدشہ کم ہوا تھا پھر وہ پڑھ رہی تھی اس لیے مجھے امید تھی کہ ابھی تو رشتے پر غور کرنے کا سوال بھی پیدا نہیں ہو گا۔ اس بات کے بعد بھی سب ٹھیک چلتا رہا۔ لیکن جب پانچواں سمسٹر شروع ہوا تو ایک بار اچانک ہی مہک یونیورسٹی سے غائب ہو گئی وہ دو دن نہیں آئی تھی اس کے پاس موبائل تھا لیکن وہ بھی بند جا رہا تھا اس کے گھر میں فون لگا ہوا تھا۔ میرے پاس نمبر تھا لیکن میں کال کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ نہ جانے کون کال ریسیو کرے اور میں اس سے کیا کہوں گا۔ لیکن تیسرے دن مہک آ گئی اور وہ بہت پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "نعمان میں بہت مشکل میں آ گئی ہوں؟"

"کیا ہوا؟"

"شبانہ بھابی نے مجھے اور تمہیں کہیں دیکھ لیا تھا انہوں نے یہ بات بھائی کو بتا دی اور انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا اور یونیورسٹی آنے سے روک دیا۔"

میں پریشان ہو گیا۔ "یہ بہت برا ہوا۔"

"لیکن پھر ابو نے بھائی سے بات کی تو انہوں نے اجازت دی، میرا موبائل بھی لے کر بند کر دیا تھا۔"

"تم سے میرے بارے میں پوچھا؟"

اس نے سر ہلایا۔ "امی نے پوچھا تھا میں نے کہہ دیا کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں اور تم نے وعدہ کیا ہے کہ جلد اپنے امی ابو کو میرے گھر بھیجو گے۔ پلیز نعمان اب کچھ کرو۔ میں اپنے گھر والوں کے سامنے جھوٹی نہیں بننا چاہتی اگر میری بات پوری نہ ہوئی تو میں ان کی نظروں سے گر جاؤں گی۔"

"ایسا نہیں ہو گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "میں آج ہی امی ابو سے بات کرتا ہوں۔ میرے گھر والے بھی کھلے ذہن کے ہیں وہ میری بات نہیں ٹالیں گے۔"

"تو بس جلدی سے بات کر لو۔ مجھے شبانہ بھابی سے ڈر لگتا ہے۔ ان کا ایک نکما بھائی ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ میری شادی اس سے ہو جائے تاکہ پاپا اسے باہر بلوا لیں اور وہ سیٹ ہو جائے لیکن میں اس سے کیا کسی سے بھی شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تم فکر مت کرو ایسا کرو دبئی کا نمبر مجھے دو میرے امی ابو پہلے فون پر ہی بات کریں گے۔"

مہک نے مجھے نمبر دے دیا اور میں نے اسی رات امی سے بات کی۔ اگرچہ ابو سے بھی بے تکلفی تھی لیکن ان سے یہ بات کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوئی تھی۔ میری توقع کے عین مطابق امی خوش ہوئی تھیں۔ "بس اب تو ہی بچا ہے اچھا ہے میری زندگی میں تو بھی ٹھکانے لگ جائے، اب اس بڑھاپے میں کہاں لڑکی تلاش کرتی پھرتی۔ تو نے میرا کام آسان کر دیا۔"

"امی اس کے گھر میں مسئلہ ہوا ہے اس کی بھابی نے کچھ ہنگامہ کیا ہے اور وہ اپنے بھائی کی شادی اس سے کرنا چاہتی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ مہک کے گھر والوں سے ابھی بات کر لیں اور رشتہ طے کر لیں شادی بے شک میرے سیٹ ہونے کے بعد کیجیے گا۔"

امی نے ابو سے بات کی اور انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ دو دن بعد ہی امی ابو نے مہک کے امی ابو سے بات کی اور انہوں نے بھی بہت خوشدلی سے جواب دیا۔ طے پایا کہ دو مہینے بعد وہ پاکستان عید کرنے آئیں گے اور اسی موقع پر دونوں خاندان مل کر اس رشتے پر بات کریں گے۔ اگرچہ انہوں نے اقرار نہیں کیا تھا مگر یہ اطمینان ضرور دلایا تھا کہ اگر کوئی اعتراض والی بات نہ ہوئی تو ان کے لیے ان کی بچی کی خوشی سب سے اہم ہے۔ یہی بات امی ابو نے بھی کی ہے۔ اس حوصلہ افزا صورتِ حال پر میں اور مہک دونوں خوش تھے۔ البتہ اس کی بھابی شبانہ خوش نہیں تھی کیونکہ اس کا اپنے بھائی کو دبئی پہنچانے کا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ اس کا بھائی نصیر صرف انٹر پاس تھا اور ایک کمپنی میں معمولی سی نوکری کر رہا تھا۔ خوش شکل تھا مگر حرکتوں اور اس کے ذہنی معیار کی وجہ سے مہک اس سے چڑتی تھی اور جب وہ ان کے گھر آتا تو وہ اس کے سامنے نہیں جاتی تھی۔

دو مہینے بعد میری اور مہک کی بات طے ہو گئی لیکن

WWW.PAKSOCIETY.COM

مہک کے کہنے پر میں نے یہ بات اپنے گروپ کے دوستوں کو بھی نہیں بتائی تھی۔ اگرچہ میری اب ان کے ساتھ سٹنگ کم ہوگئی تھی لیکن ملنا تھا۔ مجھے خود بھی ان لوگوں کو بتانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میرے اور مہک کے مخصوص تعلق کی وجہ سے اب وہ اس کے بارے میں بات بھی نہیں کرتے تھے۔ البتہ زوہیب، فراز اور وقاص کا وہی معمول تھا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے کسی نئی لڑکی سے چکر چلاتا اور اپنا کام نکال کر اسے بائے بائے کرتا اور کسی نئی لڑکی کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ ذیشان ان کا گرو تھا، وہی ان کو گائیڈ کرتا تھا۔ اپنے فلیٹ میں ملاقات کی سہولت دیتا تھا اور اگر کوئی پریشانی آجاتی تو ان کا ساتھ دیتا تھا۔ جیسے ایک لڑکی کے گھر والے فراز کے خلاف یونیورسٹی تک چلے آئے تھے، اتفاق سے فراز اس روز نہیں آیا تھا ورنہ وہ جس طرح بھرے ہوئے تھے لگتا تھا کہ وہاں جھگڑا ہوگا۔ انہوں نے فراز کے خلاف ایف آئی آر بھی لکھوائی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ فراز نے ایسا کیا کیا تھا۔ وہ لوگ بہت کم ہی کسی سیدھی سادی لڑکی کو جال میں پھنساتے تھے۔ اکثر ان کا نشانہ وہ لڑکیاں بنتی تھیں جو خود بھی فلرٹ کے کھیل کی ماہر ہوتی تھیں اور ان کے لیے کسی لڑکے سے تعلقات کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ بھی ایک ایسی ہی لڑکی تھی پھر اس کے گھر والے اتنا کیوں اچھل رہے تھے۔ میں نے فراز سے پوچھا لیکن وہ خاموش رہا اور اس نے بس اتنا کہا کہ وہ گھر میں بہت پاکباز بنتی تھی اور اس نے پکڑے جانے پر سارا الزام اس پر رکھ دیا تھا اس لیے اس کے گھر والے اس حد تک چلے گئے۔ مگر کچھ دنوں بعد معاملہ ختم ہوگیا۔ لڑکی کے گھر والوں نے ایف آئی آر واپس لے لی اور فراز کی جان چھوٹ گئی۔ بات اس وقت بھی نہیں کھلی تھی۔ اس معاملے میں ذیشان کا رویہ بھی پُراسرار تھا۔ وہ عام طور سے دوسروں کے معاملات میں بہت زیادہ دخل دیتا لیکن اس معاملے میں اس کا کہنا تھا کہ فراز نے اسے بھی کچھ نہیں بتایا اور مجھے اس بات پر ذرا بھی یقین نہیں آیا تھا۔

ذیشان کو یونیورسٹی آئے ہوئے دو سال ہونے کو آئے تھے اور اس نے اس دوران میں شاذ ہی کبھی پڑھا ہو۔ اس کا زیادہ وقت کیفے ٹیریا میں گزرتا تھا۔ وہ جب سے آیا تھا اس نے ایک سمسٹر بھی کلیئر نہیں کیا تھا۔ یہ اس کے پاس آخری موقع تھا اور اگر وہ اس بار بھی مطلوبہ پوزیشن حاصل نہیں کرتا تو وہ یونیورسٹی سے خارج کردیا جاتا۔ کم سے کم اس ڈگری میں اسے مزید داخلہ نہیں ملتا۔ مگر اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ ”کیا ہوگا یار زیادہ سے زیادہ نکال دیں گے۔ نکال دیں میں کہیں اور داخلہ لے لوں گا۔“

پھر ایسا ہی ہوا اگلے سمسٹر میں وہ رہ گیا اور اس کا داخلہ ختم کردیا گیا۔ اس کے جانے کا سن کر سارا گروپ اداس تھا مگر وہ خوش و خرم تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ہم سے ملتا رہے گا اور اس کا گھر ہمیشہ ہم لوگوں کے لیے کھلا رہے گا۔ اس کے جانے کے بعد رفتہ رفتہ ہمارا گروپ بھی بکھر گیا۔ درحقیقت یہ ذیشان تھا جس نے ہمیں جمع کیا تھا اسی نے سب سے دوستی کی اور پھر ہماری آپس میں ملاقات ہوئی تھی۔ ہفتے عشرے میں وہ یونیورسٹی آتا اور ہم سے ملتا تھا اس کے علاوہ ہم کم ہی آپس میں ملتے تھے۔ کبھی ملاقات ہوتی تو ہمارے درمیان زیادہ تر ذیشان کے بارے میں بات ہوتی تھی۔ ہمیں اس بات پر حیرت تھی کہ اس سے اتنے قریبی تعلق کے باوجود ہم نہیں جانتے تھے کہ اس کا تعلق کہاں سے تھا؟ اس کے خاندان والے کہاں ہوتے تھے؟ اور اس کی گزراوقات کس طرح ہوتی تھی؟ اگرچہ اس کا کہنا تھا کہ وہ بہت دولت مند خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن دولت مند خاندان کے لڑکے تین کمروں کے فلیٹ میں نہیں رہتے ہیں۔ اس کے پاس گاڑی اچھی ہوتی تھی۔ وہ اچھے کپڑے پہنتا تھا اور اچھا کھاتا پیتا تھا۔ مگر ہمیں کبھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ بہت زیادہ پیسے والا ہے۔

دو سال اس نے یونیورسٹی میں گزارے اور بیکار میں گزارے، نہ تو اس نے تعلیم حاصل کی اور نہ ہی دوسرے لڑکوں والی سرگرمیاں اپنائیں۔ وہ لڑکیوں سے دور رہتا تھا اور اس پورے عرصے میں کسی ایک لڑکی کا نام بھی اس کے ساتھ نہیں آیا تھا۔ نہ ہی ہم نے اسے کسی سے ملتے دیکھا تھا۔ البتہ ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا یونیورسٹی سے ہٹ کر کسی لڑکی سے تعلق تھا یا نہیں کیونکہ اس کا اور ہمارا ساتھ عام طور سے یونیورسٹی کی حد تک رہتا تھا۔ اس کے بعد اس سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی اور اگر گروپ میں سے کسی کو اس کا فلیٹ استعمال کرنا ہوتا تھا تو وہ اسے اطلاع کردیتا تھا۔ دوست اور اس کی گرل فرینڈ کی آمد پر ذیشان فلیٹ سے چلا جاتا تھا اور جب وہ لوگ رخصت ہوجاتے تب واپس آتا۔ بہت کم ایسا ہوا کہ کسی کی موجودگی میں وہ بھی فلیٹ میں موجود رہا۔ باقی دوست یونیورسٹی کے بعد بھی آپس میں ملتے تھے اور ایکٹی وٹیز کرتے تھے۔ مل کر گھومنے اور کھانے پینے جاتے تھے مگر ذیشان بہت ہی کم ان کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شام کا وقت اس کا اپنا ہوتا تھا اور اسے کسی دوسرے کے ساتھ کم شیئر کرتا تھا۔

ایک دن مجھے خیال آیا اور میں نے تینوں ساتھیوں سے پوچھا۔ ”کبھی ذیشان نے تم تینوں کی کسی گرل فرینڈ میں دل چسپی لی؟“

”نہیں یار اس پر تو حیرت ہے حالانکہ میں نے جتنی لڑکیوں سے دوستی کی، ان کی طرف ذیشان نے ہی متوجہ کیا تھا۔“ فراز نے انکشاف کیا۔

”ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔“ وقاص بولا۔

”اور میرے ساتھ بھی۔“ زوہیب نے سر ہلایا۔

”حیرت ہے اتنی اہم بات اب تک کسی کو پتا ہی نہیں تھی۔“ میں نے کہا تو ان تینوں نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

”اس میں اہم بات کیا ہے؟“ زوہیب نے کہا۔

”اہم بات یہ ہے کہ آخر اسی نے لڑکیاں کیوں چنیں؟ کیا تم لوگ خود یہ کام نہیں کرسکتے تھے۔“

وہ تینوں سوچ میں پڑے تھے پھر فراز نے کہا۔ ”یار وہ ہمارا دوست اور گرو ہے اس لیے اس نے.....“

”معذرت کے ساتھ، یہ بات میری سمجھ میں تو نہیں آئی۔ گرل فرینڈ چوائس تو بالکل پرسنل معاملہ ہے آخر وہ کیوں کرتا تھا اور تم لوگ مان بھی جاتے تھے۔“

”پتا نہیں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔“ وقاص نے بیزاری سے کہا۔ ”مجھے تو اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آ رہی۔“

اس وقت خود میری سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی بس مجھے لگا تھا کہ یہ بہت عجیب بات ہے۔ میں مہک کے ساتھ اب اکثر باہر جانے لگا تھا جب سے وہ منگیتر بنی تھی دل سے خوف نکل گیا تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔ مہک کے گھر والے اگرچہ انجان تھے لیکن اگر ان میں سے کوئی دیکھ لیتا تو اب اتنا بڑا ایشو بھی نہیں بنتا۔ اس دن بھی میں مہک کو لے کر یونیورسٹی کے بعد سی ویو کی طرف گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اسے چار بجے تک واپس گھر چھوڑ دوں اس لیے ہم ساڑھے تین بجے وہاں سے واپس چل پڑے۔ اس روز موسم صبح سے ابر آلود تھا اور تیز ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اس لیے بہ ظاہر بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن جب ہم کلفٹن سے گزر رہے تھے اچانک ہی بہت تیز بارش شروع ہوگئی۔ ذرا دیر

کیا آپ
موذی مرض شوگر
سے نجات چاہتے ہیں؟

آج کل تو ہر انسان شوگر کی مرض سے بیزار پریشان فکرمند ہے۔ ہم نے ایک طویل عرصہ دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں پر ریسرچ کر کے ایک ایسا خاص قسم کا ہربلز شوگر نجات کورس ایجاد کر لیا ہے جو کہ انشاء اللہ آپ کو شوگر سے نجات دلا سکتا ہے۔ شفا منجانب اللہ پر ایمان رکھیں کیونکہ مایوسی تو گناہ ہے۔ یاد رکھیں شوگر کی مرض تو انسان کو اندر ہی اندر دیمک کی طرح کھوکھلا کمزور بے جان بنا دیتی ہے۔ اگر آپ بھی شوگر سے نجات چاہتے ہیں تو آج ہی فون پر تمام علامات بیان کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک VP وی پی شوگر نجات کورس منگوالیں۔ خدارا ہمارا شوگر کورس آزما کر تو دیکھیں

المُسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون اوقات
صبح 9 بجے سے دوپہر 1 بجے تک
عصر 4 بجے سے رات 10 بجے تک
آپ صرف فون کریں شوگر کورس ہم پہنچائیں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں ہم پانی میں شرابور ہو گئے اور سڑکوں پر پانی جمع ہو گیا۔ اس میں بائیک چلانا خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ جگہ جگہ مین ہول کھلے ہوتے ہیں۔ مجبوراً میں نے بائیک روک لی اور ہم ایک دکانوں کے شیڈ تلے آ گئے۔ مہک نے لان کا سوٹ پہنا ہوا تھا وہ بھیگ کر اس کے بدن سے چپک گیا۔ دوپٹا بھی اسے چھپانے میں ناکام تھا۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔

"نعمان مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

"مجبوری ہے۔" میں نے کہا اور اسی وقت مجھے خیال آیا۔ "سنو یہاں سے کچھ دور ذیشان کا فلیٹ ہے وہاں چلیں؟"

وہ ذیشان کا نام سن کر ہچکچائی لیکن پھر اسے اپنی حالت کا خیال آیا تو وہ مان گئی اور ہم ذیشان کے فلیٹ پہنچ گئے جو ایک سڑک پیچھے تھا۔ مہک کچھ سہمی ہوئی تھی۔ میں نے کال بیل بجائی تو کچھ دیر بعد ذیشان نکلا اور مجھے مہک کے ساتھ دیکھ کر حیران ہوا۔ "یار تم کہاں سے راستہ بھول گئے۔"

"بھولنا پڑا یار یہاں سے گزر رہے تھے کہ بارش ہو گئی۔"

"اوہ تم دونوں بھیگ گئے ہو اندر آؤ۔" اس نے نشست گاہ والا دروازہ کھولا اور ہم اندر آ گئے۔ اس نے ہمیں تولیے لا کر دیئے کہ خود کو خشک کر لیں اور تولیے دے کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ مہک نے اطمینان کا سانس لیا اور جلدی جلدی تولیے سے اپنا لباس خشک کرنے لگی۔ میں نے بھی اپنے بال خشک کیے باقی پینٹ اور شرٹ اتنی آسانی سے خشک ہونے والے نہیں تھے۔ چند منٹ بعد ذیشان آیا تو اس کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک ٹن تھے۔ اس نے ٹن مجھے تھما دیئے۔ "سوری یار تم جانتے ہو میرے گھر میں یہی کچھ ہوتا ہے۔"

"تم نے زحمت کی... ہم بس کچھ دیر کے لیے آئے تھے۔"

"بارش اتنی جلدی رکنے والی نہیں لگ رہی ہے اور ابھی سڑکوں پر پانی ہو گا۔ بائیک کا سفر خطرناک ہو سکتا ہے تمہیں کچھ دیر رکنا ہو گا۔"

"نہیں ہم جلدی نکل جائیں گے۔" مہک نے مداخلت کی۔

"جیسی تم دونوں کی مرضی۔" ذیشان مسکرایا۔ "سوری یار میں ایک کام سے نکل رہا تھا۔ ہو سکتا ہے مجھے دیر ہو جائے تو تم جاتے ہوئے دروازے اندر سے لاک کر کے بند کر لینا۔"

"اگر ضروری کام ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اتنے دن بعد ملے ہیں۔"

"ہاں یار ضروری ہی ہے بائے۔" وہ انگلیاں ہلاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد مہک نے گویا سکون کا سانس لیا جب تک ذیشان رہا وہ جیسے ٹینس تھی۔ وہ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

"کمرا تو بہت سجایا ہوا ہے۔" مہک نے کہا۔ وہ ریک کے قریب جا کر سی ڈیز اٹھا کر دیکھنے لگی اور پھر اس نے جلدی سے واپس رکھ دیں۔ میں نے دیکھ لیا وہ کسی واہیات فلم کی سی ڈی تھی کور پر بنے پوسٹر سے ہی ظاہر تھا۔ مجھے یاد آیا ایک بار وقاص نے بتایا تھا کہ ذیشان کے پاس ٹرپل ایکس موویز کا بہت بڑا کلیکشن ہے اور اس میں مقامی موویز بھی ہیں لیکن میں نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ مہک گھبرائی ہوئی تھی اس نے یقیناً دوسری سی ڈیز کے پوسٹر بھی دیکھ لیے تھے جو سب اسی قسم کے تھے اس نے مجھ سے کہا۔ "پلیز چلو یہاں سے۔"

"چلتے ہیں کولڈ ڈرنک تو پی لو۔" میں نے ٹن کھول کر اسے تھمایا اور اپنا بھی کھول لیا۔ کولڈ ڈرنک ہم دونوں کو پسند تھی۔ میں نے چند گھونٹ لیے تو مجھے اپنا جسم گرم ہوتا محسوس ہوا۔ مہک نے زیادہ تیزی سے ختم کیا تھا۔ اس نے تعریفی انداز میں کہا۔

"بہت اچھی کولڈ ڈرنک ہے دماغ پر لگی ہے جا کر۔"

"اور یخبل ہو گی۔" میں نے بھی اپنا ٹن ختم کیا۔ مہک کا لباس خاصی حد تک خشک ہو گیا تھا اور اب بدن سے نہیں چپک رہا تھا وہ کھڑی ہو گئی۔

"اب چلیں۔"

"جلدی کیا ہے۔" میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ "میرے کپڑے بھی ذرا خشک ہو جائیں۔"

"یہ اتنی جلدی خشک نہیں ہوں گے۔" وہ بولی۔

"ہو جائیں گے تم یہاں آ کر بیٹھو نا۔" میں نے اچانک اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے برابر میں کھینچ لیا۔ وہ دھم سے گری اور ہنسی۔

"نعمان کیا ہو گیا ہے آج آپ کچھ زیادہ بے تکلف نہیں ہو رہے ہیں؟"

"ہاں آج پہلی بار بس ہم ہیں اور تنہائی ہے۔" میں نے گہرے لہجے میں کہا۔ پہلی بار مہک کے حوالے سے دل میں انوکھی خواہشات جنم لے رہی تھیں۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔ "مہک کیا تمہیں خیال نہیں آتا کہ ہم جلدی سے ایک ہو جائیں ہمارے درمیان پھر کوئی پردہ نہ رہے۔"

"آتا ہے۔" اس نے میرے شانے پر سر رکھ دیا۔ اس کے بعد یہ سب کیسے ہوا میں سمجھ نہیں پایا تھا۔

مہک کے خلاف توقع رویے نے میرا حوصلہ بڑھایا اور میں نے پیش قدمی کی۔ مہک نے مزاحمت نہیں کی اور وہ سب ہو گیا جو ہونا نہیں چاہیے تھا۔ مجھے ہوش آیا تو مہک گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے چپ کیسے کراؤں۔ ہمت کر کے میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "مہک پلیز چپ ہو جاؤ۔"

"مت چھوئیں مجھے۔" اس نے تڑپ کر ہاتھ ہٹا لیا۔ "اس وقت مجھے خود سے نفرت ہو رہی ہے۔"

"تمہارا قصور نہیں ہے یہ سارا میرا قصور ہے نہ میں تنہائی میں یہاں لاتا نہ یہ سب ہوتا پلیز چپ ہو جاؤ۔"

مہک روتی رہی پھر اس نے آنسو صاف کیے۔ "مجھے گھر چھوڑ دیں۔"

ہم وہاں سے نکلے اور شرمندگی کے شدید احساس کے ساتھ میں نے اسے اس کے گھر کے پاس چھوڑا تو میں اسے اللہ حافظ بھی نہ کہہ سکا تھا میں اسے گلی کے سرے تک جاتا دیکھتا رہا اور اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ اس کی آخری جھلک ہو گی جو اس وقت میں نے دیکھی تھی۔ میں نے بوجھل دل کے ساتھ بائیک واپس موڑ لی۔ مہک اگلے دن یونیورسٹی نہیں آئی تھی وہ میری کال بھی ریسیو نہیں کر رہی تھی اور نہ ہی میرے ایس ایم ایس کا جواب دے رہی تھی۔ اس زمانے میں ایس ایم ایس کی سروس نئی نئی شروع ہوئی تھی۔ ہر گزرتے لمحے میرا اضطراب بڑھ رہا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میری مہک سے بات ہوئی تو میں اس سے کہوں گا کہ میں اپنے امی ابو سے ابھی شادی کے لیے کہتا ہوں۔ میرے لیے ضروری نہیں تھا کہ میں تعلیم مکمل کر کے اور سیٹ ہو کر شادی کرتا۔ ابو کا بزنس بہت اچھا جا رہا تھا اور میں اکثر دفتر جا کر دیکھتا تھا۔ مالی مسئلہ نہیں تھا مگر مہک سے بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔ تیسرے دن اس کے گھر سے اطلاع آئی کہ مہک نے خواب آور گولیاں کھا لی تھیں اور وہ اسپتال کے آئی سی یو میں تھی۔ میں اور امی ابو بھاگم بھاگ وہاں پہنچے تو مہک دنیا سے جا چکی تھی۔

میری حالت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر خود ایسی گزری ہو۔ میں پاگل ہو گیا تھا اور اسپتال میں ہی چیخ چیخ کر روتا رہا تھا۔ میری حالت ایسی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر کو مجبوراً مجھے انجکشن دے کر سلانا پڑا تھا۔ شاید میں مہک کی موت کے دکھ سے زیادہ اپنی حرکت پر ندامت سے رویا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو مہک کو اس کے گھر والے لے جا چکے تھے اور وہاں اس کا جنازہ تیار تھا۔ میں جنازے میں شریک ہوا تھا۔ مہک کی قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے میرا دل چاہا کہ میں خود بھی اسی قبر میں دفن ہو جاؤں۔ یہ سب میرا قصور تھا۔ مہک کے ساتھ جو ہوا تھا اس کا ضمیر اسے برداشت نہیں کر سکا اور اس نے اپنی جان لے لی تھی۔ حالانکہ مجرم میں تھا مگر وہ مر گئی اور میں زندہ تھا۔ اس وقت مجھے لگا کہ میں بھی مر گیا تھا۔ کتنے دن سوگ میں اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ گھر سے کیا کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ صبر آنے لگا تھا۔ اس دوران میں امی ابو سمیت سب متجسس تھے کہ مہک نے خودکشی کیوں کی۔ اس نے کوئی نوٹ نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی بظاہر کوئی وجہ تھی۔ مہک کی امی نے روتے ہوئے مجھ سے پوچھا تھا کہ کہیں ہمارے درمیان لڑائی تو نہیں ہوئی تھی اور میں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ لڑائی نہیں ہوئی تھی جو اصل بات تھی وہ میں بتا نہیں سکتا تھا۔ اس حقیقت سے خود آنکھیں چار نہیں کر پا رہا تھا کسی اور کے سامنے کیسے اعتراف کرتا۔

دو ہفتے بعد میں یونیورسٹی گیا جہاں دوستوں نے تعزیت کی اب سب جان گئے تھے کہ مہک میری منگیتر تھی۔ میرے گروپ کے دوست اس بات پر ناراض بھی تھے کہ میں نے انہیں بتایا بھی نہیں کہ مہک سے میری منگنی ہو گئی تھی۔ ذیشان بھی آیا تھا۔ وہ دیر تک میرے گلے لگا رہا اور میری پشت تھپکتا رہا۔ وہ سب بھی متجسس تھے کہ مہک نے خودکشی کیوں کی اور میں ان کو بھی اس کا سبب نہیں بتا سکتا تھا۔ میں مہک کا راز فاش نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کی بھی عزت کا سوال تھا۔ اس لیے خود کو لاعلم ظاہر کرتا رہا۔ پھر سمسٹر کے پیپرز قریب آ گئے تو اس میں مصروف ہو گیا لوگوں سے ملنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ یہ میرا سیکنڈ لاسٹ سمسٹر تھا مزید چھ مہینے بعد آنرز مکمل ہو جاتا تو ایک سال بعد میرا ایم بی اے ہو جاتا۔ پیپرز کے بعد کچھ دن یونیورسٹی جانا نہیں ہوا اور جب گیا تو زوہیب اور فراز سے ملاقات ہوئی۔ وقاص کا یہ آخری سمسٹر تھا۔ اس کا اپلائیڈ کیمسٹری ایم ایس سی مکمل ہو گیا تھا۔

"ذیشان کہاں ہے بہت دنوں سے نہیں آیا۔" میں نے پوچھا۔

فراز نے شانے اچکائے۔ "پتا نہیں اب اس نے ہم سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے نہ کال کرتا ہے اور نہ اٹینڈ کرتا ہے۔ اس کے فلیٹ جاؤ کال بیل کا کوئی جواب نہیں ملتا۔"

"تمہارا مطلب ہے وہ اندر ہوتا ہے لیکن جواب نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیتا؟" میں نے پوچھا تو زوہیب نے سر ہلایا۔

"اکثر ایسا ہی لگتا ہے کیونکہ اس کی گاڑی نیچے پارکنگ میں ہوتی ہے۔"

"تو صاف بات ہے وہ اب ہم میں سے کسی سے ملنا نہیں چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا کوئی بات ہوئی تھی کوئی جھگڑا ہوا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" فراز نے جواب دیا۔ "اس سے اتنی ملاقات ہی کہاں ہوئی کہ کوئی بات ہو سکے۔"

اچانک مجھے خیال آیا۔ "سنو تم لوگ اپنی گرل فرینڈز کو اس کے فلیٹ پر لے جاتے تھے؟"

"تو اور کہاں لے جاتے، اپنے یا گرل فرینڈ کے گھر لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس قسم کی ملاقات کے لیے۔" زوہیب نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"میرا خیال ہے تم سب جاتے ہو گے، میرا مطلب ہے وقاص بھی وہیں جاتا تھا۔" میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ "تمام گرل فرینڈز سے اس قسم کی ملاقاتیں وہیں کی ہوں گی؟"

"اس فلیٹ میں بہت یادگار وقت گزارا۔" فراز نے اعتراف کیا۔ "ذیشان نے ہمارے لیے بہت کیا یار اس طرح اپنا گھر کون دیتا ہے ایسی سرگرمیوں کے لیے اور پھر وہ بے چارہ اکثر ہمیں چھوڑ کر باہر چلا جاتا تھا تاکہ ہم بلا کھٹکے دل کھول کر اپنے ارمان نکالیں۔"

مجھے یاد آیا کہ جب میں اور مہک اس کے فلیٹ میں گئے تھے تو وہ ہمیں اسی طرح چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ پہلی بار ہم اس بارے میں کھل کر بات کر رہے تھے اور کچھ نئی چیزیں سامنے آ رہی تھیں۔ اب وہ بھی سوچ رہے تھے کہ ذیشان تقریباً ہر بار ایسا ہی کرتا تھا اور پھر کبھی ان کی موجودگی میں واپس نہیں آتا تھا چاہے یہ لوگ اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ کتنی ہی دیر وہاں رہیں۔ پھر وہ جاتے ہوئے اپنے فلیٹ کے باقی حصے لاک کر جاتا تھا۔ میں نے اور مہک نے تو دیکھا نہیں تھا کہ باقی دروازے کھلے ہیں یا نہیں لیکن ان لوگوں نے کئی بار چیک کیا اور ہر بار فلیٹ کے اندر کھلنے والے دروازے کو لاک پایا تھا صرف باہر والا دروازہ کھلا ہوتا تھا گویا وہ ذیشان کے فلیٹ کے اسی کمرے میں رہنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ یہ سب باتیں سوچنے پر مجبور کرتی تھیں کہ ذیشان ایسا کیوں کرتا تھا۔ وہ اتنے لاتعلقانہ انداز میں اپنے دوستوں کو یہ سہولت کیوں دیتا تھا اور پھر وہ بعد میں ان سے پوچھتا بھی نہیں تھا کہ انہوں نے اس کے فلیٹ میں کیسے وقت گزارا؟

"دوستو، مجھے یہ سب بہت مشکوک لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا مشکوک لگ رہا ہے؟" فراز نے پوچھا۔

"میں کہہ نہیں سکتا لیکن بس میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔" میں نے کہا۔

"کیسی گڑبڑ۔" زوہیب نے پوچھا۔ "ہمارے لیے تو سب ٹھیک رہا ہے۔"

ان کے لیے سب ٹھیک تھا لیکن میری تو دنیا اجڑ گئی تھی۔ مہک کی واپسی ممکن نہیں تھی لیکن میں معلوم تو کر سکتا تھا کہ اس نے دنیا سے منہ کیوں موڑا؟ مگر میں یہ بات ان لوگوں سے کہہ نہیں سکتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ذیشان تقریباً ایک مہینے سے ان کے رابطے میں نہیں تھا۔ ان کے پاس سے اٹھ کر میں نے ذیشان کو کال کی۔ مہک کے بعد یہ اس سے میرا پہلا رابطہ تھا۔ خلافِ توقع اس نے کال ریسیو کر لی۔ میں نے حال احوال دریافت کیا اور پھر اس سے پوچھا کہ وہ باقی تین سے کیوں نہیں بات کر رہا ہے۔ اس نے ٹالنے والے انداز میں کہا کہ بس اس کا دل ان تینوں سے ہٹ گیا ہے۔ اس نے وجہ نہیں بتائی۔ میں نے کہا کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں اس کے فلیٹ پر آ کر۔ اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ "کیا کسی کے ساتھ آنا ہے؟"

میں انکار کرنے والا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے اثبات میں جواب دیا۔ "ہاں یار ایک لڑکی ہے۔"

"تم بہت تیز ہو یار۔" اس بار وہ بے تکلفی سے بولا۔ "اتنی جلدی دوسری لڑکی بھی تلاش کر لی۔"

"بس یار تم جانتے ہو مرنے والے کے ساتھ کوئی مرتا نہیں ہے۔" میں نے دل پر جبر کر کے کہا۔ "دوسری تلاش کرنی پڑی۔"

"بس تو جب چاہو لے آؤ۔" اس نے کہا اور پھر تجسس سے بولا۔ "ویسے ہے کیسی؟"

"مہک کو دیکھا تھا نا سمجھو بس اسی جیسی ہے۔"

"فیملی کیسی ہے؟"

"یار اتنے سوال کیوں کر رہے ہو آج؟"

"سمجھا کرو یار تم لوگ یہاں آ کر ملو گے اگر کسی ایسے ویسے گھر کی لڑکی ہوئی اور بعد میں اس نے پھوٹ دیا تو تمہارے ساتھ میں بھی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔"

"نہیں یار اچھے گھر سے ہے کھاتے پیتے لوگ ہیں اور اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"تب ٹھیک ہے۔" اس نے مطمئن ہو کر کہا۔ "کب آنے کا ارادہ ہے؟"

"دیکھو موقع دیکھ کر بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے آنے سے ایک گھنٹا پہلے کال کر دینا۔ اگر میں کہیں باہر ہوا تب بھی آ جاؤں گا۔"

"تھینک یو یار۔" میں نے کہا اور اگلے دن میں زوہیب اور فراز سے ملا اور انہیں ذیشان سے ہونے والی گفتگو سنائی۔ وہ حیران ہوئے۔

"تمہاری کون سی گرل فرینڈ ہے جس کے ساتھ جاؤ گے۔" فراز نے پوچھا۔

"یہی تو مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "دیکھو میں کسی لڑکی کو لے کر ہی اس کے فلیٹ میں جا سکتا ہوں۔"

"چلو لڑکی کا بندوبست ہو جائے تب بھی تم وہاں جا کر کیا کرو گے؟"

"میرے ذہن میں کچھ سوالات ہیں میں ان کے جواب تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ اور پتا ہے اس نے تم لوگوں کے بارے میں کیا کہا ہے، اس کا کہنا ہے اس کا دل تم لوگوں سے ہٹ گیا ہے آخر ایسی کیا بات ہے؟"

وہ دونوں حیران ہوئے تھے۔ ان کی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ کسی قدر مشتعل ہوئے تھے۔ فراز نے کہا۔ "ایسی کم تیسی اس کی..... کیا ہم مرے جا رہے ہیں اس سے دوستی کے لیے جو وہ ایسی بات کر رہا ہے۔"

"تب میرا ساتھ دو مجھے ایک لڑکی کی ضرورت ہے۔"

"یہ مسئلہ نہیں ہے ایک لڑکی سے دوستی ہے بہت بولڈ ہے اپنے گھر بلا کر ملتی ہے۔" فراز نے بائیں آنکھ دبائی۔ "میں کہوں گا تو مان جائے گی۔"

"تب اس سے بات کرو اور پھر ہم ذیشان کے فلیٹ چلتے ہیں۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

فراز نے اسی شام زوبی سے ملاقات کرائی، وہ بہت خوب صورت لڑکی تھی اور فراز ٹھیک کہہ رہا تھا وہ بہت بے باک اور لمحوں میں بے تکلف ہو جانے والی لڑکی تھی۔ وہ آسانی سے اس کام کے لیے راضی نہیں ہوئی تھی۔ جب تک فراز اور پھر میں نے اسے پوری بات نہیں بتائی تھی۔ حقیقت سن کر اسے بھی دل چسپی ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "یہ تو کوئی چکر باز لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے تم لوگوں کو استعمال کر رہا ہے۔"

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

”یہ بات اب ہماری سمجھ میں آ رہی ہے اور ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ کیا چکر بازی کر رہا تھا۔“

سب طے ہونے کے بعد میں نے اگلے دن ذیشان کو کال کی۔ ”یار مجھے آج شام کے وقت تمہارا فلیٹ چاہیے۔“

”نو پرابلم، بلکہ تم چاہو تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔“ اس نے پیشکش کی جس کی مجھے پہلے سے توقع تھی۔

میں نے خوش ہو کر کہا۔ ”یہ تو اور اچھی بات ہے لڑکی ذرا شرمیلی ہے ممکن ہے تمہارے فلیٹ میں ہوتے ہوئے وہ شرمائے۔“

”فکر کیوں کرتا ہے ہم یاروں کے یار ہیں۔“ ذیشان ہنسا۔ ”میں چلا جاؤں گا تم کھل کر عیاشی کرنا۔“

”ہم شام چار بجے تک آ رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یونیورسٹی کی لڑکی ہے اسے پہلے لنچ پر بھی لے جانا ہوگا۔“

میں نے چار بجے کا اس لیے کہا کہ زوہیب، وقاص اور فراز نے بھی وہاں آنا تھا لیکن وہ ذیشان کے باہر جانے کے بعد آتے۔ میں اور زوبی چار بجے وہاں پہنچ گئے۔ اتفاق سے زوبی ذیشان کے جانے کے بعد یونیورسٹی میں آئی تھی اس لیے وہ اسے نہیں جانتا تھا اور وہ شرمیلی اور معصوم لڑکی کی اداکاری کر رہی تھی۔ اس نے ڈریسنگ بھی اسی لحاظ سے کر رکھی تھی ورنہ یونیورسٹی میں وہ بڑے کھلے حلیے میں آتی تھی۔ ذیشان نے ہمیں اسی کمرے میں چھوڑا اور بہانہ بنا کر فلیٹ سے رخصت ہو گیا۔ مجھے خیال نہیں آیا کہ آج اس نے ہمیں کولڈ ڈرنک یا کوئی ایسی آفر نہیں کی تھی۔ اس بار بھی وہ اندر والا دروازہ بند کر گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں نے یہ دروازہ چیک کیا تھا۔ اسی لمحے زوبی کے موبائل نے بیل دی اور اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف فراز تھا اس نے بتایا کہ ذیشان ان کے سامنے اپنی کار میں بیٹھ کر رخصت ہو گیا ہے اور وہ اوپر آ رہے ہیں۔

چند منٹ میں وہ سب آ چکے تھے۔ زوہیب نے اضطراب سے کہا۔ ”یہ اچھا نہیں ہے یار اگر وہ آ گیا تو بے عزتی ہوگی۔“

”وہ نہیں آئے گا۔“ میں نے یقین سے کہا۔ ”اب ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ یہ سب کیوں کرتا ہے۔“

”کیا دیکھیں.... وہ دروازہ لاک کر گیا ہے۔“ وقاص نے دروازہ کھینچ کر دیکھا۔ ”مجھے تو لگ رہا ہے، تم لوگ بے کار میں اس پر شک کر رہے ہو۔“

میں انہیں نہیں بتا سکتا تھا کہ میں کیوں شک کر رہا تھا۔ میں نے کئی بار ذیشان کے فلیٹ کے تالوں کی چابیاں دیکھی تھیں اور میں آتے ہوئے ایسی بہت سی چابیوں کا ایک گچھا لے آیا تھا۔ میں انہیں آزما کر دیکھ رہا تھا جبکہ وہ تینوں باقی کمرے کا معائنہ کر رہے تھے۔ لاک خاصا پرانا تھا بالآخر ایک چابی اس میں فٹ آئی میں اسے ہی آگے پیچھے کر کے گھماتا رہا۔ اچانک ہی لاک کھل گیا۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہ سب بھی بے تابی سے پیچھے آئے تھے۔ ان لوگوں نے بھی فلیٹ کا لاؤنج دیکھا تھا اور انہیں آج تک ذیشان کا بیڈ روم دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا ایک بار فراز نے اسے چیک کیا لیکن اس کا دروازہ لاک تھا۔ مگر اس وقت یہ ان لاک تھا شاید ذیشان باہر والا دروازہ بند کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔ ہم اندر آئے پھر ساکت رہ گئے۔ وہاں ایک جدید ترین کمپیوٹر اور کئی مانیٹرز موجود تھے۔ یہ سب آن تھے اور یہ دیکھ کر ہم شاکڈ رہ گئے کہ دو مانیٹرز پر باہر والے کمرے کا منظر آ رہا تھا۔ کیمرے مل کر پورا کمرا دکھا رہے تھے اور کوئی حصہ ان سے باہر نہیں تھا۔ ہمیں یہ دیکھ کر سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ یہ سب کیا تھا۔ فراز کے منہ سے ایک گندی گالی نکلی اور زوبی نے منہ بنا کر کہا۔

”ڈونٹ بی سلی.... تم جیسے احمقوں کے ساتھ ایسا ہی ہونا تھا۔ تم لوگ یہاں عیاشی کرنے آتے تھے اور وہ تمہاری موی بناتا تھا۔“

دونوں کیمرے بڑی اسکرین والے ٹی وی کے پیچھے لگے تھے اور ٹی وی ڈمی تھا کیونکہ اس کے اندر کوئی مشینری نہیں تھی۔ صرف کیمرے لگے تھے اور ان کا تعلق کمپیوٹر سے تھا یہ نہ صرف مانیٹرز پر براہِ راست ویڈیو دکھاتے تھے بلکہ اس کو ریکارڈ بھی کر رہے تھے۔ ٹی وی کے نچلے حصے میں طاقتور مائیک تھے جو سانسوں کی آواز بھی ریکارڈ کرتے تھے۔ بیڈ روم میں موجود الماری کا ایک خانہ ان سی ڈیز سے بھرا ہوا تھا جو ذیشان نے یہاں ریکارڈ کی تھیں اور ان میں میری اور مہک کی ویڈیو بھی تھی۔ ہم ذیشان کو گالیاں دے رہے تھے اور اپنی اپنی ویڈیوز تلاش کر رہے تھے کیونکہ ابتدائی مناظر عام سے تھے اس لیے ہم بلا کھٹکے لگا کر دیکھ رہے تھے۔ جو ویڈیو جس کی نکلتی وہ اس پر قابض ہو جاتا تھا۔ بعض ویڈیوز دوسرے لوگوں کی تھیں انہیں میں ایک طرف رکھتا جا رہا تھا بالآخر میری اور مہک کی آئی تو سب چونک گئے تھے اور میں نے ان سے نظریں چرا کر وہ سی ڈی اپنے قبضے میں کر لی۔ کسی نے کچھ کہا نہیں کیونکہ اس حمام میں سب ایک سے

تھے.... احتیاطاً ہم ایک ایک سی ڈی چیک کر رہے تھے کہ کہیں اس نے کاپیاں نہ بنا رکھی ہوں۔ مگر اس نے کوئی کاپی بنائی بھی تھی تو وہ یہاں نہیں تھی۔

”ہم اس کمینے کو چھوڑیں گے نہیں۔“ زوہیب نے غصے سے کہا۔ ”اس نے ہمیں استعمال کیا۔“

”صرف استعمال ہی نہیں کیا بلکہ مزے بھی کیے ہوں گے اور اس نے کمایا بھی ہوگا۔“ زوبی بولی۔

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اس کا گیم سمجھ گئی ہوں۔ وہ تم لوگوں کو موقع دیتا رہا اور ویڈیو بناتا رہا پھر وہ لڑکی کو ویڈیو یا اس کے کلپ دکھا کر بلیک میل کرتا ہوگا۔ وہ نہ صرف اسے منہ مانگی رقم دیتی ہوگی بلکہ اس کی خواہشات بھی پوری کرتی ہوگی۔ وہ دونوں طرح سے لوٹتا ہوگا۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔“ زوہیب بولا۔ ”اس کی انکم اسی طرح سے ہوتی ہوگی وہ ایک نمبر کا فراڈیا نکلا۔ لیکن اس نے ہمیں تو کبھی بلیک میل نہیں کیا۔“

”تم لوگ اس کے ٹولز تھے اور دوسرے تم لوگ مرد ہو اور کھاتے پیتے گھروں سے تعلق رکھتے ہو اگر اس کے خلاف ہو جاتے تو اس کے لیے مشکل کر سکتے تھے۔ لڑکیاں آسانی سے قابو میں آ جاتی ہوں گی جو لڑکیاں نہیں مانتی ہوں گی پھر یہ ان کے گھر والوں کو بلیک میل کرتا ہوگا۔“

میں جان گیا تھا کہ مہک نے کیوں خودکشی کی تھی۔ یقیناً ذیشان نے اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہوگی اور اس نے اپنی جان لے لی۔ کاش وہ ایک بار مجھے بتا دیتی تو.... میرا خون کھول رہا تھا اور اگر ذیشان اس وقت میرے سامنے آ جاتا تو میں اسے قتل کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر اس کی قسمت یا چالاکی تھی کہ وہ نہیں آیا۔ ہم نے اس کا سارا سامان برباد کر دیا دوسری سی ڈیز توڑ ڈالی تھیں۔ پھر ہم باہر آئے اور بہت دیر تک ذیشان کی واپسی کا انتظار کرتے رہے پھر مایوس ہو کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اس وقت کا اشتعال ذرا ٹھنڈا ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ ہم ذیشان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے کیونکہ معاملہ ہماری اور بہت ساری لڑکیوں اور ان کے گھر والوں کی عزت کا تھا۔ اگر ہم ذیشان کو مارتے پیٹتے یا قتل بھی کر دیتے تب بھی بات تو کھلتی اور ایک بار سب سامنے آتا تو بہت سے لوگ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتے۔ زوہیب، فراز اور وقاص پہلے ہی اس معاملے میں نہ پڑنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور انہوں نے مجھے بتا بھی دیا۔

میکائیل علیہ السلام

چار بڑے فرشتوں میں سے ایک، حضرت جبرائیلؑ کے بعد حضرت میکائیلؑ کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ لوگوں کو رزق پہنچاتا ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جو اس کے نبی کا، فرشتوں کا، جبرائیل کا، میکائیل کا، دشمن ہے اللہ اس کا دشمن ہے۔ سورۂ بقرہ اس کا نام میکال آیا ہے۔ اس کی تشریح میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک میں بتایا گیا ہے کہ ایک یہودی نے آپؐ کی سچائی دیکھنے کے لیے متعدد سوال کیے۔ جن کے درست جوابات ملے۔ آخر میں اس نے پوچھا کہ یہ آپؐ تک کس نے پہنچائے۔ آپؐ نے کہا: حضرت جبرائیل نے۔ یہودی یہ سن کر ناراض ہو گیا۔ اس نے کہا کہ یہ جبرائیل ہمارا دشمن ہے۔ اگر میکائیل جو ہمارا دوست مونس ہے پہنچاتے تو ہم آپؐ کی صداقت پر ایمان لے آتے۔ عیسائیت میں بھی میکائیلؑ اور جبرائیلؑ دونوں کو برگزیدہ تصور کیا جاتا ہے۔ ڈینیل میں جبرائیل کو عظیم شہزادہ اور اسلام کے محافظ کے طور پر یاد کیا گیا ہے۔ انجیل کی روایت کے مطابق یہ بنی نوع انسان کے محافظ ہیں۔ جب اللہ نے انسان بنانے کے بعد فرشتوں کو سجدوں کا حکم دیا تو سب سے پہلے حضرت جبرائیل اور پھر حضرت میکائیل نے ہی سجدہ کیا۔

مرسلہ: کائنات فاطمہ کراچی

”ہمیں ہماری ویڈیوز مل گئی ہیں ہمارے لیے یہی کافی ہے وہ جائے جہنم میں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

”بس تو اسے بھول جاؤ دوست۔“ انہوں نے مشورہ دیا۔ اگرچہ یہ بہت مشکل تھا مجھے رہ رہ کر مہک کا خیال آتا تھا وہ غیرت مند تھی اپنی غلطی کا نتیجہ دیکھ کر اس نے اپنی جان لے لی میں اتنا غیرت مند نہیں تھا اس لیے آج بھی زندہ ہوں۔ پھر مجھ سے برداشت نہیں ہوا اور میں تیسرے دن ذیشان کے فلیٹ پر گیا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا نیچے یونین آفس سے پوچھنے پر پتا چلا کہ وہ ایک دن پہلے ہی فلیٹ سے اپنا سامان لے کر فلیٹ خالی کر گیا تھا اور یہ اس کا فلیٹ نہیں تھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

بلکہ اس نے اسٹیٹ ایجنسی کے توسط سے چار سال پہلے کرائے پر لیا تھا۔ یقیناً وہ بھانڈا پھوٹنے پر وہاں سے فرار ہوا تھا۔ میں ناکام وہاں سے واپس آگیا۔

ڈیڑھ سال بعد مجھے ڈگری مل گئی اور میں نے ابو کے ساتھ کام شروع کیا انہوں نے ایک فیکٹری اور قائم کی تھی وہ انہوں نے میرے حوالے کر دی۔ کچھ عرصے بعد میری شادی بھی ہو گئی۔ میرے تین بچے ہیں میری بیوی بہت خوب صورت ہے لیکن مجھے مہک جب یاد آتی ہے تو اس کی خوب صورتی نہیں اس کی مظلومیت یاد آتی ہے۔ بے شک اسے خودکشی پر مجبور ذیشان نے کیا تھا لیکن اس کا محرک تو میں تھا۔ جب میں سوچتا تو میرے دل میں جیسے تیر سا لگتا تھا۔ پھر وہ واقعہ پیش آیا جو اس سچ بیانی کو آپ کے سامنے پیش کرنے کی وجہ بنا۔ میں کورنگی میں واقع اپنی فیکٹری سے نکلا تھا۔ ایک سگنل پر میں نے کار روکی تو ایک ریڑھی پر بیٹھے بھکاری پر میری نظر پڑی تھی میں چونکا تھا۔ لیکن اس سے پہلے میں کچھ کرتا یا کہتا سگنل کھل گیا اور مجھے گاڑی آگے بڑھانا پڑی ورنہ پیچھے والے ہارن دے کر آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ میرے اندر بھونچال سا آگیا تھا۔

اگلے دن میں فیکٹری سے نکلا اور اس سگنل سے ذرا پہلے ایک جگہ گاڑی پارک کر کے پیدل روانہ ہوا تھا۔ صبح آتے ہوئے بھی میں نے یہاں دیکھا مگر وہ یہاں نظر نہیں آیا تھا۔ البتہ شام کو وہ مل گیا۔ وہ چھوٹے پہیوں والی اس ریڑھی میں بیٹھا ہوا بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کا دایاں چہرہ، گردن، شانہ اور ہاتھ جلا ہوا تھا۔ ہاتھ تو اس طرح جلا ہوا تھا کہ آخر میں انگلیاں غائب تھیں، ان کی جگہ ایک تڑا مڑا سا پنجہ تھا۔ سر پر نصف بال غائب تھے اور جلی ہوئی جلد تھی۔ میں اس کے پاس آیا تو اس نے اپنا بایاں ہاتھ پھیلایا۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ ''ذیشان۔''

وہ بری طرح چونکا اور پھر اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پہچان لیا اس نے آہستہ سے کہا۔ ''نعمان.... تم نے مجھے تلاش کر لیا۔''

''نہیں اتفاق سے پالیا۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''میں بزدل تھا اس لیے خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔''

''اب تم کیا کرو گے مجھے مارو گے.... پولیس کے حوالے کر دو گے؟'' اس کے لہجے میں خوف تھا۔

''ڈرو مت.... جس طرح تم مجرم ہو اسی طرح میں بھی مجرم ہوں، نہ تم سچ کا سامنا کر سکتے ہو نہ میں کر سکتا ہوں۔ میں تم سے انتقام بھی نہیں لے سکتا کیونکہ اس کے لیے ضروری ہوگا کہ میں خود سے بھی انتقام لوں اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔''

''پھر کیوں آئے ہو میرے پاس؟''

''صرف چند سوال کرنے.... اول اُس روز فلیٹ میں مجھے اور مہک کو کیا ہوا تھا.... دوسرے مہک نے خودکشی کیوں کی؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ جواب دے یا نہ دے پھر اس نے کہا۔ ''میں سچ کہوں گا۔ میں نے کولڈ ڈرنک ٹن میں ایک دوا ملا دی تھی جو مرد عورت کے جنسی جذبات ابھارتی ہے۔ اسی وجہ سے تم لوگ بے قابو ہوئے تھے اور جب میں نے مہک کو بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو اس نے خودکشی کر لی۔ میں نے اسے سی ڈی کی ایک کاپی بھجوائی تھی۔''

وہ کاپی یقیناً مہک نے خودکشی سے پہلے ضائع کر دی ہوگی۔ میں نے سوچا اور ذیشان کی طرف دیکھا۔ ''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا۔ یقیناً یہ قدرت کی سزا ہے اور میں یقیناً اس لیے نہیں بچا کہ مجھ میں کوئی خوبی ہے بلکہ میرے ساتھ کچھ اور لوگ ہیں جن کی وجہ سے اللہ نے مجھے اس دنیا میں بخشا ہوا ہے لیکن دوسری دنیا میں مجھے جواب دینا ہوگا۔'' میں کھڑا ہو گیا اور واپس گاڑی کی طرف چل پڑا تھا۔

اگلے دن اخبار میں ایک فقیر کی موت کی خبر تھی جو سڑک سے گزرنے والے ایک ٹرک کی زد میں آگیا تھا۔ صرف میں جانتا تھا کہ یہ حادثہ نہیں ایک اور خودکشی تھی۔

شمارہ دسمبر 2013ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش.... آپ کا انتخاب

☆ اول: خدارا.... ثوبیہ فہد (کراچی)

☆ دوم: بٹوارا.... سعدیہ احمر (لاہور)

☆ سوم: محبت کی خاطر.... نعمان نومی (لاہور)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بیتی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM